

دین

اکتوبر 2015

PDFBOOKSFREE.PK

www.pdfbooksfree.pk



کارآمد گھریلو ٹوٹکے

صفحہ نمبر 287 سے کارآمد گھریلو ٹوٹکے ملاحظہ فرمائیں

اب کرن ڈائجسٹ برائے ماہ اکتوبر اور کرن کتاب کارآمد گھریلو ٹوٹکے برائے ماہ اکتوبر یکجا

PDFBOOKSFREE.PK

چاندنگر روپہ افہ پبلیکیشنز

دکن

رکن آل پاکستان نوزبچہ زوسمائی
رکن کونسل آف پاکستان نوزبچہ زایڈیٹرز
MEMBER
APNS
CPNE

بانی ————— محمود بابر فیصل
بیکران ————— محمود ریاض
مدیرہ ————— نادرہ خاتون
مدیر اعلیٰ ————— عامر محمود
نائب مدیرہ ————— شعاع عمیر
مدیرہ خصوصی ————— اصتہ الصبور
اشتہارات ————— خالدہ جیلانی



11 احمد اشراف علی ہے پوری
11 نعمت ماسر القادری

بیکھو اور پھیلو

12 کون دیس سدھار گئے راجیلہ بلوچ

انٹرویو

14 دیارِ عمر کی عیدِ الاضحیٰ شاہین رشید
20 زینب جمیل شاہین رشید
25 میری بھی سنئے محمد بلال قریشی
29 مقابل ہے آئینہ سیدہ نسبت زہرا

ناول

32 تراویح ریاض
236 فرحین اطفر

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اے ڈی ونگلز کراچی

ذمہ داری کے لیے
پاکستان (سالانہ) --- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ --- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے

مسل ناول

176 میں گمان نہیں نہیںلہ بر لاجہ
96 تمہارا اکسیر شہناز صدیق

ناول

70 شاید فائرہ افتخار
198 محبت ہم سفر میری شہناز سوکت
152 جیت صدقہ آصف

افسانے

56 ابد کے برس عید صدقہ ریحان
222 میں ہوں نا دیا شیرازی
148 قریبانی نظر قاطمہ
229 تعویذ امت العزیز
265 خلش، سیما بنت عام
259 بازی الٹ گئی، آسیہ مظہر چوہدری
167 من کے عید متائیں عابدہ احمد

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے یہ ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی نوعی جھٹیل سے ڈرنا ڈرامائی تھکیل اور سلسلہ وار قطع کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے، بلاشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ کا کوئی حصہ جعلی کاپی رکھتا ہے۔



282	روہیتہ شریف	مُسکراتی کرتیں	271	شعاع عمیر	کِرِن کِرِن خوشبو،
284	ذوالقسنین	نہلے پہ دہلا	274	بشری محمود	یادوں کے دیکھے سے
285	مدیرہ کرن	ناع منیکر نام	276	شگفتہ سلیمان	مجھے شعر لپیٹتے
			269	ادارہ	موتی پختے ہیں
			278	خالہ جیلانی	کِرِن کا دسترخوان
			280	ادارہ	حُسن و صِحّت

اکتوبر 2015

جلد 38 نمبر 7

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کِرِن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، تاریخہ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com



مٹا کا اکتوبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
عید قربان اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وطن عزیز میں بخیریت گزری۔ سنت ابراہیمی کی پیروی کرتے ہوئے۔
رس کریم کی رضا و خوشنودی کی خاطر اپنی استطاعت کے مطابق قربانی کی گئی اور تمام عالم اسلام میں وحدت و
یکجا نکت کا عظیم الشان مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔
حج اجتماعی طہارت ہے۔ تمام عالم اسلام سے لوگ مکہ معظمہ میں حاضر ہو کر حج کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔
اس بار اس بابرکت موقع پر سانحہ صفا و مروہ اور سانحہ منی پیش آیا جس میں سینکڑوں حجاج کرام — مناسک حج
کی ادائیگی کے دوران شہید ہو گئے۔ ہم ان تمام شہدائے لواحقین کے عم میں برابر کے شریک ہیں اور اللہ تعالیٰ
سے دعا کرتے ہیں کہ انہیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ اور ان تمام شہداء کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔ (آمین)

محمود بابر فیصل (ذوالقرنین)

محمود بابر فیصل کو دنیا سے رحمت ہوئے دو عشروں سے زیادہ گزر گئے لیکن ان کی یادوں کے نقوش آج بھی اسی طرح
تازہ ہیں۔
محمود بابر فیصل نے ناول بھی لکھا اور افسانے بھی لیکر ذوالقرنین کے روپ میں ان کی شخصیت کا ایک عظیم
ہی رنگ تھا۔ ان کے شوخ، برجستہ جملے پڑھنے والوں کے لبوں پر مسکرائیں بکھر دیتے تھے۔ وہ جو سب کو ہنساتے تھے
25 اکتوبر 1993ء کو دنیا سے رحمت ہو کر سب کی آنکھوں کو اشک بار کر گئے۔
ان کی برسی کے موقع پر بہنوں سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- بیاد محمود بابر فیصل،
- عید الاضحیٰ پر پردیس میں رہتے والوں کے احساسات کے حوالے سے شاہین رشید کا خصوصی سروے،
- ادا کا رہ ذہن جمیل سے شاہین رشید کی ملاقات،
- ادا کا رطل قریشی کہتے ہیں "میری بھی سینیہ"،
- "اس ماہ میں" سیدہ نسبت زہرا کے مقابل ہے آئینہ،
- "دا پنزل" منزلیہ ریاض کا سلسلے دار ناول،
- "ردائے وفا" فرمین اظفر کا سلسلے دار ناول،
- "میں گمان نہیں یقین ہوں" نبیلہ ابرار کا مکمل ناول اختتام کی طرف،
- "تمہارا اسیر" شہناز صدیق کا مکمل ناول،
- "شاید" فائزہ افتخار کا دلکش ناولٹ،
- "محبت ہم سفر میری" شبانہ شوکت کا ناولٹ،
- "جیت" صدف آصف کا ناولٹ،
- صدف رحمان گیلانی، سیما بنت عاصم، نظیر فاطمہ، امت العزیز شہزاد، دیا شیرازی، عابد احمد اور
آسیہ منظر جوہری کے افسانے اور مستقل سلسلے،

ہفتت،

کرن کتاب "کارآمد گھریلو ٹونکے" ہر شمارے کے ساتھ مفت حاصل کریں۔

﴿... کرن 10 اکتوبر 2015﴾



رسول مجتبیٰ کیسے، محمد مصطفیٰ کیسے
 خدا کے بعد بس وہ ہیں پھر اس کے بعد کیا کیسے
 جبین و رخ عماد کے تجلی ہی تجلی ہیں
 کسے شمس لفظی کیسے، کسے بدرالدجی کیسے
 جب ان کا ذکر ہو دنیا سراپا گوش بن جٹے
 جب ان کا نام آئے مرحبا صل علیٰ کیسے
 سرے سرکار کے نقش قدم شمع ہدایت ہیں
 یہ وہ منزل ہے جس کو مغفرت کا راستہ کیسے
 محمد کی نبوت دائرہ ہے جلوہ حق کا
 اسی کو ابتدا کیسے، اسی کو انتہا کیسے
 مدینہ یاد آتا ہے تو پھر آنسو نہیں رکتے
 سری آنکھوں کو ماہر چشمہ آب بقا کیسے
 ماہر القادری



تری حمد خالقِ دو جہاں، میں بیاں کروں بھی تو کیا کروں
 ہیں ہزاروں جلوے ترے عیاں میں بیاں کروں بھی تو کیا کروں
 کہیں برگ گل میں عیاں ہے تو، کہیں بوئے گل میں تنہا ہے تو
 تو کبھی عیاں تو کبھی نہاں، میں بیاں کروں بھی تو کیا کروں
 یہ زمین پہ لالہ و نسرین، یہ فلک پہ نور کی انجمن
 ترے حسن کی یہ نشانیاں میں بیاں کروں بھی تو کیا کروں
 یہ جہاں جن و بشر ترا، یہ نظامِ شمس و قمر ترا
 ترا حکم چاروں طرف رواں میں بیاں کروں بھی تو کیا کروں
 کہیں بلبلوں کے ہیں چہچہے، کہیں قمریوں کے ہیں رنرے
 سبھی ذاتِ پاک کے ہیں مدح خواں میں بیاں کروں بھی تو کیا کروں
 تو ہی بے کسوں کی امید ہے، تو ہی بے نواؤں کی عید ہے
 ترا لطف و جود ہے بکراں میں بیاں کروں بھی تو کیا کروں
 اثر فاضلی جے پوری

گوں دیں سدھار کے

راحیلہ بلوچ

”راحیلہ بی بی! ”کرن“ آپ بہنوں کا پرچا ہے،
اسے سنواریے، نکھاریے، کھلی اجازت ہے۔
تمہارے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم اچھا لکھتی ہو، تو
لکھو، خوب لکھو، اب جلدی سے ایک افسانہ بھیج دو۔
انتظار رہے گا۔“

یہ خط مجھے ان کی وفات سے ڈیڑھ ماہ پہلے ملا، کیا
معلوم تھا، میرے لیے یہ ان کی پہلی اور آخری تحریر
ثابت ہوگی۔

بہت چاہتے ہوئے بھی میں افسانہ جلد نہیں لکھ
سکی۔ یہی سوچا کہ بہترین افسانہ لکھ کر بابر بھائی کو
بھیجوں گی تاکہ جو اندازہ انہوں نے میری تحریر سے لگایا
ہے، وہ مجروح نہ ہو۔ لیکن میں اچھا لکھنے کے بارے
میں سوچتی رہی اور بابر بھائی، ہم سب کو چھوڑ کر چل
سیے یوں اچانک خاموشی سے۔

سب انتظار میں رہے اور وہ ایک شخص محفل سے
خاموشی سے اٹھ کر چل دیا۔ ساری محفل اب بھی
اداس سے منتظر رہے کہ ابھی کہیں سے ہنستا مسکراتا چہرہ
نظر آئے گا اور سب کو اسی طرح شادمان کر دے گا۔

پھر میں افسانہ ”کرن“ کو روانہ نہ کر سکی۔ جس
شخص نے محبت، شفقت اور اپنائیت سے لکھنے کو کہا،
جب وہ نہیں رہا تو پھر میں اپنے دل کو افسانہ لکھنے کے
لیے کس کے لیے تیار کرتی۔

پھر دل چاہا بابر بھائی کی برسی پر ان کی محبت، شفقت
پر کچھ الفاظ صفحہ قرطاس پر بکھیروں مگر ہمت ہی نہیں
ہوئی جب بھی لکھنے کو قلم تھاما بس آنکھوں میں آنسو،
اور گلے میں آنسوؤں کا گولہ سا اٹک جاتا جو مسلسل
ازیت دیتا دکھ دیتا اور میں قلم رکھ دیتی۔

اب بہت ہمت سے قلم تھاما ہے۔ ان کی ہر برسی پر
یوں ہی لگتا ہے جیسے کل کی بات ہو، وہ ایک شخص جسے

25 اکتوبر کا دن، ایک چاند کے بدلیوں میں چھپ
جانے کا دن، ایک پھول کے مرجھا جانے کا دن۔ کیا کیا
سانحہ نہیں توڑا اس دن نے۔ بیٹا روٹھا، بھائی پھڑا،
باپ چھوٹا، دوستوں کا دوست گیا۔

مجھے وہ الفاظ نہیں مل رہے، جس سے بابر بھائی کی
ہمہ گیر شخصیت کا احاطہ کر سکوں۔ یہ تو کبھی سوچا بھی نہ
تھا کہ ایسا وقت بھی آئے گا کہ ہم بابر بھائی کو خود سے
جدا دیکھیں۔

یہ دکھ بھی عجیب ہوتے ہیں، جب ایک بار انسان
کے اندر گھر بنا لیں۔ پھر دنیا کی کوئی طاقت بھی انہیں
نکال نہیں سکتی۔ لاکھ اس دکھ کا ازالہ کریں، آنسو
بہا کر، قلم کا سہارا لے کر لیکن ان کا وجود، ان کا نشان
اندر کہیں نہ کہیں رہ ضرور جاتا ہے۔

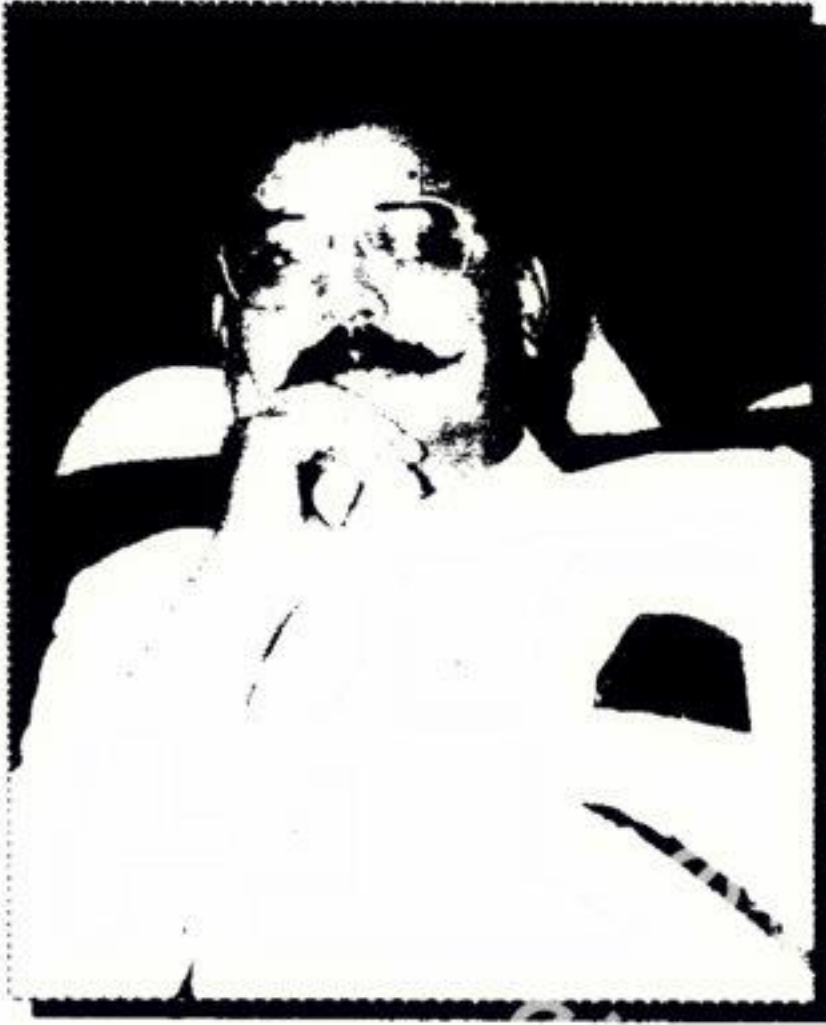
اب بھی لگتا ہے جیسے وہ کہیں سے آجائیں گے،
ہنستے مسکراتے، سگریٹ کے کش لگاتے، اپنی کرسی
سنبھال لیں گے، اپنا پرچا سنبھال لیں گے، نئی لکھنے
والیوں کو خط کا جواب لکھیں گے۔

”بی بی! ”کرن“ آپ بہنوں کا ہی پرچا ہے، اسے
سنواریے، نکھاریے۔“

آپ کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے بابر بھائی کہ
”نہلے یہ دہلا“ کے پرانے سلسلے نہیں پڑھے جاتے،
آپ نے ہمیشہ آگے اور آگے بڑھنے کا درس دیا ہے۔
اب ہم یہ ماضی کے سلسلے کیسے پڑھیں۔

بابر بھائی سے پہچان اس وقت ہوئی تھی جب ہم
نے ”کرن“ پڑھنا شروع کیا۔ ان ہی دنوں لکھنے کا شوق
چرایا اور پھر ہم نے بابر بھائی کو ایک طویل خط لکھا۔
پورے ایک مہینے بعد تک خط کا جواب نہ پا کر افسوس
سا ہوا لیکن جب خط کا جواب ملا تو خوشی سے پاؤں زمین
پر نہ ٹکتے تھے۔ بابر بھائی نے لکھا تھا۔

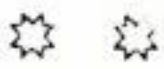
بیادِ محمودِ بابر فیصل



ایسا اچانک اور بے ارادہ سنبڑ کوئی بھی نہیں کرتا۔ انشاءِ جی نے جو نوحہ اپنے دوست کی جدائی میں لکھا تھا، جب پہلی بار پڑھا تھا تو میں، سرت راہی تھی۔ کیا خبر تھی کہ یہ جدائی کے الفاظ پارے اور راج دلارے بھائی کے لیے بھی لکھنے پڑیں گے کہ آج پڑھتے ہوئے بھی دور ہے ہیں اور لکھتے ہوئے بھی۔

نہ آپ کے نام خط لکھتے ہوئے خوشی ہوئی تھی۔ آج آپ کی جدائی پر یہ تحریر لارہی ہے۔ آنکھوں میں برسات ہے اور ہاتھ بھی لرزاں ہیں۔ آپ کی جدائی نے سب کو نڈھال کر دیا ہے بابر بھائی۔

خدا ہمیں اور آپ کے تمام عزیز واقارب کو صبر دے اور آپ کو میرے پار۔ بھائی کو خدا جنت کے بلند درجات پر پہنچا دے۔ (آمین ثم آمین)



سردرق کی شخصیت

ماڈل ----- صائمہ
میک اپ ----- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ----- موسیٰ رضا

میں نے رویداد دیکھا بھی نہیں، صرف ایک قاری کی حیثیت سے ان کی تحریروں کی مداح رہی، ان کے بارے میں پڑھتی رہی اور صرف ایک خط وہ مجھے لکھ سکے اور اتنی سی پر خلوص رفاقت میں بھول نہیں پا رہی، تو وہ لوگ بابر بھائی کو کیسے بھول پائیں گے، جن کے درمیان بابر بھائی رہے، ہنسے کھیلے، لمحہ لمحہ ساتھ رہے، جس گود میں انہوں نے بچپن گزارا، جس آنگن میں وہ کھیلے، بہنوں اور بھائیوں کا پیارا بھائی، باپ کا سہارا بلا خراس دیا میں نہ رہا۔

اچھے اور مخلص لوگوں کو کون بھول پاتا ہے اور پھر بابر بھائی جیسی شخصیت، جن کی شخصیت کی تابانی اور تنوع ان کی تحریروں میں بھی نمایاں ہے۔ خدا ایسے پیارے شخص کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے عزیز واقارب کو صبر جمیل عطا کرے۔ (آمین)

بابر بھائی یاد آئیں گے، ہر بل، ہر لمحے، جب ہم کرن ہاتھ میں آئے گا ان جیسا کسی کا نام سننے کو لے گا تو چونکیں گے۔ ان جیسی شکل نظر آئے گی تو ٹھنکیں گے۔ ان کے لفظوں جیسا کوئی لفظ بڑھنے کو ملا تو دل دھڑکے گا، چلے، وقت کی لہروں پر زندگی کے کتنے دن بیت جائیں، کتنی ہی چلتی ہوئی ویران اور سنسان دوپہریں آکر ڈھل جائیں اور کتنی ہی شامیں اپنی فنا گاہوں میں ڈوب جائیں، جریوں چپ چپ چلے جاتے ہیں، وہ کبھی بھلائے نہیں بھولتے۔ امن و فافور دوستی کا پیغام دینے والا شخص کبھی بھول سیر پائے گا۔

بابر بھائی! آپ تو ہمارے افسانوں کے منظر رہتے تھے اور کہتے تھے۔

”دیکھو! افسانے کا اینڈ خوشگوار ہونا چاہیے۔“

اب آپ خود افسانہ بن گئے ہیں اور ہمیں روتا چھوڑ گئے۔ آپ تو بڑے انصاف پسند تھے، پھر یہ بے انصافی کیوں؟ اس قدر جلد رخت سفر تو نہ باندھا ہوتا۔

ہم چاہے ساری دنیا گھوم لیں۔ باہر کی خوب صورتی اور لاء اینڈ آرڈر سے کتنا ہی متاثر کیوں نہ ہو جائیں۔ باہر کی فضا کتنی ہی پرسکون کیوں نہ ہو کوئی ٹینشن بھی نہ ہو اور نہ ہی کسی قسم کی چوری چکاری ڈاکہ زنی اور اسٹریٹ کرائم ہوں۔ مگر پھر بھی ”ماں کی گود“ کی طرح اپنے وطن کے لیے دل مچلتا رہتا ہے اور جس طرح ”ماں کی گود“ میں سر رکھ کر سکون اور اپنائیت کا احساس ہوتا ہے اس طرح اپنے ملک میں آکر بھی سکون اور اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔

ہمارے بہت سے بہن بھائی اور بچے ملک سے باہر زندگی گزار رہے ہیں کوئی جا بکے لیے گیا۔ کسی نے بزنس سیٹ کر لیا اور کسی کی شادی ہو گئی اور اپنا ملک چھوڑنا پڑا۔ لیکن جب پاکستان میں کوئی تہوار ہو یا اپنوں میں کوئی دکھ سکھ ہو تو پاکستان کے لیے اور اپنوں کے لیے دل بے چین ہو جاتا ہے۔ عید الاضحیٰ کا موقع ہے وطن سے دور رہنے والے کس طرح عید مناتے ہیں۔ آئیے ذرا معلوم تو کریں۔

سوال کچھ یوں ہیں کہ۔

- (1) کتنے سال سے ملک سے باہر ہیں؟ آخری بار کب پاکستان میں عید منائی تھی۔
- 2 پاکستان میں قربانی گھر کے باہر اور دوسرے ملک میں Slaughter House سلاٹھ ہاؤس میں ہوتی ہے۔ آپ کے خیال میں کیا بہتر ہے اور کیوں؟

دیباغی کی عید الاضحیٰ

شاہین رشید

سے میں لندن میں ہوں لیکن میری کوشش ہوتی ہے کہ بقر عید میں پاکستان میں ہی کروں کیونکہ اپنے ملک میں بقر عید کرنے کا جو مزا ہے وہ اور کہیں نہیں ہے۔

2 سوائے پاکستان کے پوری دنیا میں حتیٰ کہ مسلم ممالک میں بھی گھر قربانی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ مجھے یاد ہے کہ لندن میں ایک صاحب نے اپنے گھر کے باہر قربانی کا جانور ذبح کیا تو اسے پولیس پکڑ کر لے گئی۔ کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ تو میں حیران ہوتی ہوں کہ پاکستان میں اس کی اجازت کیوں ہے۔ خیر جب ملک سے باہر عید کرنی ہوں تو پھر بھی ہوتا ہے کہ اپنے ارد گرد جو فیملیز ہوتی ہیں ان کے ساتھ مل کر گھر میں ہی پکوان پکا کر عید کا مزا لے لیتے ہیں۔ لیکن کچھ بھی ہو عید کا مزا اپنے ملک میں اور اپنوں کے ساتھ ہی ہے۔



رضوانہ پرنس :- فری لانس رائٹر، قیام لندن (برطانیہ)

1 بے شک میرا قیام لندن میں ہے اور کافی سالوں



ڈاکٹر ثاقب صادق :- (لوٹیکنکل
ایڈوائزر مکینکل - قیام ہوسٹن ٹیکساس
امریکہ)

ہو تو گوشت کی دوکان والے بگنگ کر لیتے ہیں اور ہم بعد
میں جا کر گوشت گھر لے آتے ہیں۔ یہاں قربانی کے
موقع پر یہ بات اچھی لگتی ہے کہ چاہے کتنے بھی جانور
ذبح کیے گئے ہوں، باہر کوئی گندگی نظر نہیں آتی۔ یہی
کچھ پاکستان میں بھی ہونا چاہیے۔ قربانی کے بعد گندگی

کے جو ڈھیر سڑکوں پہ نظر آتے ہیں اور جو تعفن اٹھتا ہے
اسے دیکھ کر بھلا کون ہمیں منہ بکھے گا جہاں اگر ہم
گورنمنٹ کو مورد التزام ٹھہراتے ہیں وہاں شہری بھی
اتنے ہی ذمہ دار ہیں۔ ہم بھی تو صفائی ستھرائی اپنے طور
پر کر سکتے ہیں جہاں ہم جانور کی خریداری اور عید کی
تیاریوں میں اتنا پیسہ لگا دیتے ہیں کیا ہی اچھا ہو کہ ہم
صفائی کے لیے بھی پہلے سے ہی انتظام کر لیں۔ دنیا بدل
گئی ہے ہمیں بھی بدل جانا چاہیے۔

فاخرہ گل :- (رائٹر + شاعرہ - قیام اٹلی)

1 میں تقریباً 12 سال سے اٹلی میں ہوں اور یہ یاد
نہیں کہ آخری بار کب پاکستان میں عید الاضحیٰ منائی
تھی البتہ 2015ء کی عید الفطر پاکستان میں ہی کی
تھی۔

2 مجھے تو عید الاضحیٰ کے لیے پاکستان کا سٹم اس
لیے پسند ہے کہ کم سے کم مہینہ نہیں تو ہفتہ پہلے تو
قربانی کے جانور گھرا کر ان کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔
ناز خرے اٹھائے جاتے ہیں۔ اور مجھے یاد ہے کہ ہم
قربانی کے جانور سے اس حد تک مانوس ہو جاتے تھے کہ
جانور کو قربانی کے لیے بھیجتے ہوئے دل بو جھل ہو رہا ہوتا
تھا۔ تب امی ابو سمجھاتے تھے کہ قربانی کا تو اصل مقصد
ہی یہی ہے کہ اپنی پیاری چیز کو اللہ کی راہ میں قربان کیا
جائے۔ بیرون ملک تو نہ جانور کو گھرا کر رکھا جاسکتا
ہے۔ اور نہ ہی بچوں کو قربانی کی اصل روح سمجھائی جا
سکتی ہے۔ سارا ٹراؤس میں صفائی ستھرائی کے لحاظ سے تو
بہتر ہوتا ہے۔ مگر میرے لحاظ سے تو بہترین طریقہ
پاکستان والا ہی ہے۔ جب بچوں کے سامنے گوشت
کے تین حصے کر کے انہیں بتایا جاتا ہے کہ ہمارے مال

1 ماشاء اللہ سے تقریباً 14، 15 سال سے ملک
سے باہر ہیں اور آخری بار ہم لوگوں نے 2001ء میں
عید الفطر منائی تھی۔ اس عید کا مزہ ہی کچھ اور تھا سب
لوگوں کے ساتھ صبح کی نماز سے پہلے سویاں کھانا، محلے
کے لوگوں کے ساتھ نماز پڑھنا، نماز کے بعد مسجد کے
باہر سب کا آپس میں عید ملنا، سب کچھ اچھا لگتا ہے۔
مگر ظاہر ہے کہ جہاں ”رزق“ ہوتا ہے وہیں جانا ہوتا
ہے، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں بہت سے لوگوں
سے اچھا رکھا ہوا ہے۔ مگر پھر بھی اپنوں کے ساتھ عید
کرنے کا بہت دل چاہتا ہے۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے
کہ ہر بار چھٹی مل جائے۔ ہم ارادہ تو کرتے ہیں مگر ہر
دفعہ کچھ نہ کچھ مسئلہ ضرور ہو جاتا ہے۔

2 عید الفطر یا بقرہ عید اگر ویک اینڈ پہ آئے تو پورا
دن عید کی مصروفیات میں گزرتا ہے لیکن اگر عید ویک
ڈیز میں آئے تو نماز کے بعد آفس چلے جاتے ہیں،
پاکستان میں بقرہ عید کی تیاری بکروں کی خریداری سے
ہی ہوتی ہے اور تب تک چلتی ہے جب تک جانور
حلال نہ ہو جائیں سب سے بڑا مسئلہ قصائی ڈھونڈنے
کا ہوتا ہے جو کہ یہاں نہیں ہوتا، یہاں اگر قربانی کرنی

میں رشتے داروں اور غریبوں کا بھی حق مقرر کیا گیا ہے۔
اور بچپن میں سیکھی گئی باتیں ہمیشہ ذہن میں محفوظ رہتی
ہیں۔



راحیلہ فروس :- (بانی بزم مصطفیٰ
امریکہ - قیام نیوجرسی امریکہ)

1 میں گزشتہ 15 سال سے یو ایس اے میں ہوں
اور عید الفطر تو ہر سال پاکستان میں مناتی ہوں۔ البتہ
عید الاضحیٰ منائے ہوئے کافی سال ہو گئے ہیں۔ اس
لیے اپنے حصے کی قربانی پاکستان میں کرواتے ہوں۔
کیونکہ وہاں اپنے رشتے دار بھی ہیں اور غریب غریب بھی
تو جو حصے خدا نے مقرر کیے ہیں رشتے داروں، غریبوں
اور اپنے لیے اس کی تقسیم منصفانہ انداز میں ہو جاتی
ہے۔

2 یہاں بھی لوگ قربانی کرتے ہیں، لیکن پاکستان
میں تو آپ جانور گھڑ لاتے ہیں اس کی خدمت خاطر
کرتے ہیں۔ تو قربانی کا جو تصور ہے وہ پورا ہو جاتا ہے
یہاں تو ”میٹ شاپ“ پر رقم دے دی جاتی ہے اور عید
کے دن گوشت لے آتے ہیں مگر باتیں کیسے؟۔۔۔
پاکستان میں قربانی کرنا مجھے زیادہ پسند ہے۔ اب کچھ
سالوں میں جب بقرا عید گرمیوں میں آئے گی تو چھٹیاں
ہوں گی تب میں پاکستان آکر بقرا عید کروں گی ان شاء
اللہ اور آخر میں میری طرف سے سب پڑھنے والوں کو
دلی عید مبارک کہہ دیں۔

نبیلہ ابرار راجہ :- (رائٹر)

1 میں اس سال جدہ شفٹ ہوئی ہوں۔ تو یہاں
میری پہلی بقرا عید ہوگی پاکستان میں گزارنی عیدیں
اب میرے لیے یادگار عیدیں بن جائیں گی۔
2 گھر کے باہر قربانی کرنے کا اپنا ہی مزا ہے۔ لیکن یہ
صحیح ہے کہ ایسا کرنے سے گندگی بہت ہو جاتی ہے اور
ہفتوں جانوروں کی لاشیں سڑکوں پہ پڑی رہ جاتی ہیں
جبکہ سلاٹر ہاؤس میں قربانی کرنے سے گندگی سڑکوں پہ
نہیں پھیلتی۔ اگر ایسا پاکستان میں بھی ہو جائے تو کیا
بات ہے۔



ڈاکٹر شرمیلا قریب :- (یورک ان امریکن
ریڈ کراس انٹرنیشنل سوسٹی سروس اینڈ
ریسٹورنگ فیمیلی - قیام ہووسٹن ٹیکساس)

1 اگر دل سے پوچھیں تو جو مزا پاکستان میں عید
کرنے کا ہے وہ مزا ہمیں بھی نہیں آیا ہمیں پاکستان
سے نکلے ہوئے تقریباً 14 سال ہو گئے ہیں اور
پاکستان میں عید بھی نکلنے سے پہلے ہی منائی تھی۔
پاکستان سے آنے کے بعد پہلی عید تو جتنی پھسکی ہو سکتی
تھی اتنی ہی تھی۔ جب سے چھٹی انورڈ نہیں کر سکتے
تھے۔ ویسے بھی یہاں پرانے دوستوں کے سرکل میں
جو پہلے سے رہ رہے ہوں زیادہ دیکھ نہیں کیا جاتا۔ اپنا

1 تقریباً 25 سال سے میں ملک سے باہر قیام پذیر ہوں اور آخری بار بقرہ عید میں نے گزشتہ سال ہی کی

2 گھر کے باہر قربانی کرنے کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم اپنا مذہبی تہوار منا رہے ہیں۔ پھر ہمارے قریبی رشتے دار ہمارے قریب ہوتے ہیں۔ ہم اپنے ہاتھوں سے قربانی کا گوشت مستحق لوگوں میں تقسیم کر سکتے ہیں یا کرتے ہیں۔ لیکن بچوں کے سامنے قربانی کا یہ عمل بچوں کے لیے بہت ہی Drammatic ہوتا ہے اور پریشان کن ہوتا ہے اور یہ ایک پریشان کن بات ہے کہ بچے اسے دیکھیں اور اگر حفظانِ صحت کے اصولوں کو مد نظر رکھ کر صفائی ستھرائی کا خیال رکھا جائے تو گھر میں قربانی کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔



سحرش فاطمہ :- (فری لانس رائٹر۔ قیام
مدینہ سعودی عرب)

1 تمام پڑھنے والوں اور تمام مسلمانوں کو میری طرف سے عید مبارک۔ میں گزشتہ ایک سال سے ملک سے باہر ہوں۔ اس لیے آخری بار کب عید کی کا سوال کا جواب شاید چند سال بعد دے سکوں گی۔ اور ویسے بھی عید الفطر ہو یا عید الاضحیٰ اپنے ملک پاکستان میں ہی کرتی ہوں۔

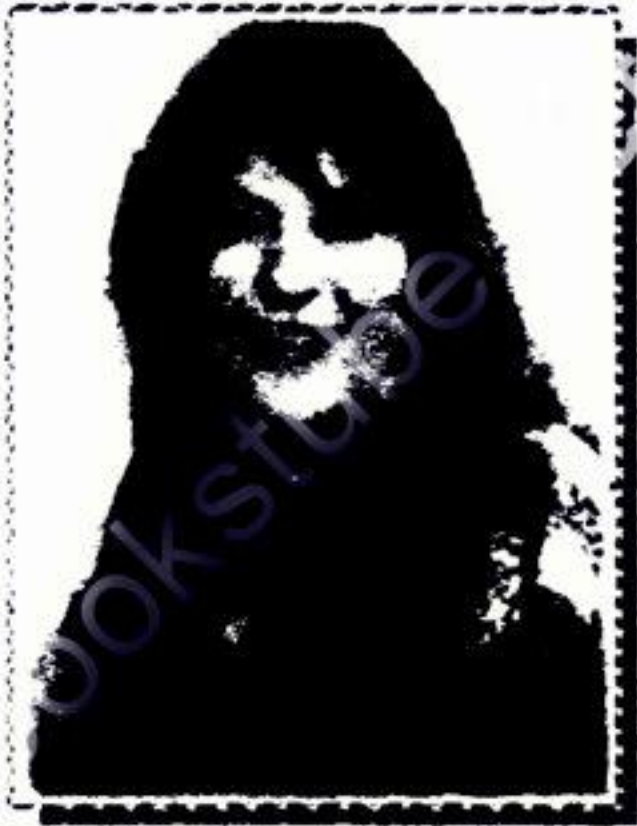
سرکل بنانے میں ٹائم لگتا ہے۔ اب تو پھر بھی عید عید لگتی ہے۔ کینیڈا میں سات سال رہ کر اب امریکہ میں عید کا کوئی خاص فرق نہیں لگتا۔

2 بقرہ عید بھی ہماری عید الفطر جیسی ہی ہوتی ہے۔ نہ تو بکروں کی سے سے اور نہ ہی بچوں کی رونقیں جو جانوروں کو گھمانے پھرانے کے چکر میں گھر سے گھنٹوں غائب رہتے ہیں نہ ہی وہ صبح صبح انتظار کہ کب قربانی ہو اور کب کبھی پکا میں یہاں گوشت والے کے یہاں پہلے جانور کی بکنگ گراؤ پھر کنفرم کر کے تیسرے دن گوشت لاؤ اور پھر بانٹو، تو کیا عید کا مزا۔ یہاں دور دور گھر ہوتے ہیں تو گوشت بانٹنے کے لیے بھی سستی آتی ہے۔ تو قربانی کا اصل مقصد تو پورا ہوتا نہیں ہے۔ یہاں تو صحیح معنوں میں کوئی حق دار ہی نظر نہیں آتا۔ اس لیے ہم تو پاکستان میں قربانی کے پیسے اپنے عزیزوں کو بھیج دیتے ہیں۔ تاکہ وہ ہمارے نام کی قربانی کر دیں۔ اور غرباء اور مساکین میں گوشت تقسیم کر دیں۔ ہم یہاں گوشت اور خاص طور پر کبھی پکا کر عید اشائل میں عید منا لیتے ہیں۔ بس عید کے دن اپنے دوستوں، رشتے داروں اور پاکستان کی رونقیں بہت یاد آتی ہیں۔



ڈاکٹر اعجاز رحمن :- (NHS Trust)
Consultant at - قیام ہانچسٹر

کیونکہ یہاں حفظانِ صحت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ بندہ گندگی سے محفوظ رہتا ہے پاکستان میں گھر کے باہر ہوتا ہے جس سے بہت زیادہ گندگی ہو جاتی ہے روڈ پر خون پھیل جاتا ہے۔ آلائشیں اٹھانے والے دیر سے آتے ہیں اور بہت بدبو پھیل جاتی ہے۔ سلاٹ ہاؤس میں اگرچہ قربانی منگنی پڑتی ہے مگر انسان بکرے کی خریداری، قصائی کی منت سماجت سے بچ جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان گھر میں اور گھر سے باہر پھیلنے والی گندگی سے بچ جاتا ہے۔



بینی زیدی :- (آرٹسٹ۔ قیام امریکہ)

1 مجھے ملک سے دور رہتے ہوئے 17 سال ہو گئے ہیں اور سترہ سال پہلے برائے میں نے پاکستان میں عید منائی ہوگی۔ درمیان میں عید منانے کی کبھی پاکستان نہیں گئی۔
2 قربانی کا طریقہ جو پاکستان میں ہے وہ سب سے الگ ہے بلکہ سب جگہ ایک سا ہی ہے۔ لیکن جو مزا پاکستان میں عید کرنے کا ہے وہ کہیں نہیں کوئی تہوار ہو یا عید یا بقر عید ہو اس کا مزا پاکستان میں ہی ہے۔ یہاں تو عجیب سی بے رونق ہوتی ہے۔ تو میں تو پیسے بھجوا دیتی ہوں پاکستان میں اور قربانی میرے نام کی ہو جاتی ہے۔ اور زیادہ تر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ کچھ ہی لوگ ہیں جو یہاں قربانی کرنے ہیں اور کس طرح کرتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ سلاٹ ہاؤس میں کرتے ہیں یا کہیں اور۔

2 پاکستان کی عید کی تو بات ہی کچھ اور ہے سب ایک ساتھ ہو کر ایک دوسرے کو عید کی مبارک باد دیتے ہیں۔ پاکستان میں عید قربان کرنے کا یہ فائدہ کہ جانور گھرا کر اس کی خاطر مدارات کر کے اسے قربان کیا جاتا ہے جیسا کہ ہمارے مذہب میں حکم ہے اور پھر اپنے ہاتھوں سے غریب، مساکین اور ورثے دار جو قربانی انورڈ نہیں کر سکتے گوشت تقسیم کرتے ہیں۔ ویسے بھی عید اپنوں میں ہی اچھی لگتی ہے۔ باہر کے ملکوں میں گھر سے باہر قربانی کی اجازت نہیں ہوتی۔ لہذا مسلم کمیونٹی مل جل کر عید مناتے ہیں۔ اور یہ بھول جاتے ہیں کہ کون کس ذات کا اور رنگ و نسل کا ہے۔ باہر سلاٹ ہاؤس ہوتے ہیں لیکن بہتر یہی ہے کہ اپنے گھر میں اپنی آنکھوں کے سامنے قربانی کی جائے۔ اپنے ہاتھ سے ادا کیے گئے فرض کی خوشی ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

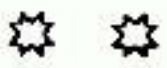


شیخ تنزل :- (آئی ٹی فنکشنری۔ انارٹسٹ۔ قیام دہلی)

1 پاکستان سے باہر دہلی میں رہتے ہوئے 3 سال ہو گئے ہیں اور آخری بار عید الاضحیٰ 2011ء میں لاہور میں کی تھی۔
2 دوسرے ملکوں میں سلاٹ ہاؤس میں قربانی ہوتی ہے اور میرے خیال میں یہ ایک بہترین طریقہ ہے

گزارہ - آخری بار عید 18 سال پہلے پاکستان میں گزارا تھی یا منانی تھی۔

2 پاکستان میں گھر کے باہر قربانی ہوتی ہے۔ مذہبی لحاظ سے یہ ہی طریقہ ہے مگر اس سے گندگی بہت ہو جاتی ہے۔ بدبو، کھیاں، ہر طرف خون اور پھران کے حصے بنانا۔ بے چاری خواتین بھی بہت تھک جاتی ہیں۔ اگر صفائی ستھرائی کا خیال رکھا جائے تو یہ بہترین طریقہ ہے قربانی کا، بچے اور نئی نسل قربانی کے Concept سے آگاہ ہوتے ہیں۔ سلاٹر ہاؤس میں قربانی سے ٹائم کی بہت بچت ہو جاتی ہے اور اس ٹائم کو ہم اپنے رشتے داروں کے ساتھ گزار سکتے ہیں کیونکہ لائف آج کل بہت مصروف ہو گئی ہے۔ جدہ میں ہم سلاٹر ہاؤس میں قربانی کرتے ہیں اور کھالیں حکومت کی منظور شدہ چیرٹی آرگنائزیشن لے جاتی ہیں۔



سمیرا عزیز :- (فلم میکر + آر جے اینڈ
Activist + صحافی۔ قیام جدہ سعودی
عرب)

1 میں سعودی نیشنل ہوں اور پہلی سعودیہ کی فلم
میکر ہوں بالی ووڈ کی۔ بچپن کا کچھ عرصہ کراچی میں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ساری بھول
ہماری تھی



راحت جنیں

قیمت - 300 روپے

شریک سفر



زہرہ ممتاز

قیمت - 550 روپے

کسی راستے کی
تلاش میں



میمونہ خورشید علی

قیمت - 350 روپے

میرے خواب
لوٹاؤ



نگہت عابدانہ

قیمت - 400 روپے

فون نمبر:
32735021

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

بندہ کرن 19 اکتوبر 2015

زینب جیل سے ملاقات

شاہین رشید

کچھ شروع ہونے والے ہیں۔“
* ”مطلب کافی کام کر رہی ہیں تو سیریل“ آپ کی کنیز“
میں آپ کا کام دیکھا تھا تو کیا وہ پہلا پروجیکٹ تھا آپ
کا؟“

☆ ”نہیں نہیں وہ میرا تیسرا پروجیکٹ تھا“ پہلا
سیریل ”مل کے بھی ہم نہ ملے“ تھا وہ فیصل بخاری کا تھا۔“

* ”مزا آ رہا ہے اس فیلڈ میں؟“ آپ کی کنیز میں
”بہت بولڈ دکھائی گئیں۔ عام زندگی میں کیسی ہیں؟“
☆ ”ہاں بہت مزا آ رہا ہے اور عام زندگی کی بات کی تو
عام زندگی میں بولڈ اور شائے (shy) کا مکسچو ہوں
۔ اور ایک اور ڈرامے میں“ آپ کی کنیز“ سے
مختلف رول میں آؤں گی جو پوزیٹو ہو گا۔“

”خبرناک“ سے اپنی پہچان بنانے والی زینب
جیل کو آپ آج کل ”سسرال میری بہن کا“ اور
”پارس“ میں دیکھ رہے ہیں۔ زینب کے ابھی چند ہی
سیریلز آن ایر ہوئے ہیں اور سب میں ان کا رول مختلف
ہی رہا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زینب کردار لیتے
وقت خاص طور پر اس بات کا خیال رکھتی ہیں کہ کردار
کا ٹکراؤ نہ ہو۔

* ”کیسی ہیں زینب اور کیا مصروفیات ہیں؟
”سسرال میری بہن“ کے علاوہ؟ کیا آن ایر ہے کیا انڈر
پروڈکشن ہے؟

☆ ”آن ایر تو آپ کو پتا ہی ہے“ سسرال میری بہن
کا“ اور ”پارس“ ہے اور جہاں تک انڈر پروڈکشن کی
بات ہے تو کچھ ڈرامے تکمیل کے مراحل میں ہیں اور





* ”خبرناک میں تو بہت shy نظر آتی تھیں؟“
 * ”اصل میں تو شائے ہوں مگر کچھ جگہیں ایسی ہوتی ہیں جہاں بولڈ ہونا پڑتا ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو پھر لوگ آپ کو انڈر اسٹیمٹ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔“

* ”نام آپ کا زینب جیل ہے۔ لڑکی آپ آج کے دور کی ہیں تو نام پرانا کیوں؟“
 * ہنستے ہوئے۔۔۔ ”بالکل اگر پرانا ہے تو کیا ہوا۔۔۔“

لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے اپنا نام بہت پسند ہے اور مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے نام کی وجہ سے ہی بہت اسٹونگ ہوا۔ کیونکہ نام کا اثر آپ کی شخصیت پر بہت ہوتا ہے۔ اور میرا نام میرے والدین نے ہی رکھا تھا۔ اور پیار سے مجھے گھر والے ”زینبی“ بلاتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ کس نے میرا نام پگاڑا نہیں۔“

* ”کب کہاں پیدا ہوئیں؟“

* ”30 مارچ 1990ء میں میں اور 3 بھائیوں میں پیدا ہوئی کیونکہ میرا خیال وہاں تھا۔ جبکہ میری تعلیم و تربیت تو لاہور میں ہی ہوئی ہے۔ میرا ستارہ T-ices ہے جبکہ میرا ایک بھائی اور میرے علاوہ دو بہنیں ہیں۔ میرا نمبر پلاٹ ہے اور میں گریجویٹ ہوں۔“

* ”اس فیڈ میں آپ ہی ہیں یا گھر میں کوئی اور بھی ہے؟“

* ”کوئی نہیں ہے۔ مرزا میں ہی ہوں۔“

* ”اچھا۔۔۔ گھر والے سپورٹ کرتے ہیں آپ کی؟“

* ”گھر والے بہت سپورٹ کرتے ہیں۔ بہت خوش ہیں اور بہت حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ زینب نے میں کام کرتی ہوں اور نہ کہاں کر سکتی تھی۔“

* ”گریجویٹ ہیں۔ کیا سوچا تھا کہ کیا بنتا ہے؟“

* ”سچ بتاؤں۔۔۔ ہاؤس وائف بننے کا سوچا تھا اور ہاؤس وائف بنوں گی مگر ابھی نام نہیں ہے۔“

* ”اپنی پسند سے ہاؤس وائف بنتا ہے یا والدین کی پسند سے؟“

* ”جی ہم تو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ فیصلے تو کہیں اور ہوئے ہوئے ہوتے ہیں ہم تو کچھ بھی نہیں کر سکتے۔“
 * ”اس فیڈ میں آپ کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ تو پھر آپ کیسے آگئیں اس فیڈ میں؟“

* ”میں نے انٹرنشپ کی تھی ”جیو“ میں تو پھر ”خبرناک“ کے لیے آفر آگئی تو میں نے جوائن کر لیا یہ پروگرام۔“

* ”تو ٹیلنٹ کا بہن آبا یا آپ کی خوب صورتی کام آئی۔“

* ”میری اپرنس Appearance کام آئی۔ انہوں نے کہا کہ کام کریں گی تو میں۔۔۔ کہا کروں گی۔ اور ”خبرناک“ دیکھنے کے بعد ”فیصل بخاری“ نے مجھ سے رابطہ کیا اور یوں میرا پہلا سیریل ”مل کے بھی ہم ملے“ تھا۔“

* ”خبرناک میں شوپس کی طرح تھیں۔ بہت کم بونٹے کام رقع ملتا تھا۔ اور معلومہ بھی کچھ ملتا تھا یا نہیں؟“

* ”شوپس تو نہیں۔ اچھی خاصی پرفارمنس دینی پڑتی تھی تب ہی تو معلومہ ٹھیک ٹھاک ملتا تھا مجھے ایک

14 اگست کے دن بہت جذبہ ہوتا ہے تو گرین سوٹ پہن کر باہر گھومنے پھرنے بھی نکلی تھی تیو ایر چھی مناتی ہوں اور عید تو بہت ہی بھرپور طریقے سے مناتی ہوں۔ ہاں روزهوں کے لیے میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ پورے رکھوں۔“

* ”دن رات شوٹ گھبراتی ہیں۔ بھوک ستاتی ہے؛ برداشت کرتی ہیں یا چڑچڑی ہو جاتی ہیں؟“

☆ ”شوٹ سے نہیں گھبراتی مزا آتا ہے۔ اور بھوک نہیں ستاتی، کیونکہ مجھے زیادہ بھوک لگتی ہی نہیں ہے تو چڑچڑی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ویسے بھی میرے پاس ایسی چیزیں ہوتی ہیں جنہیں کھا کر میں اپنی بھوک کو قابو میں رکھتی ہوں۔“

* ”اسنے ڈرامے دیکھتی ہیں؟“

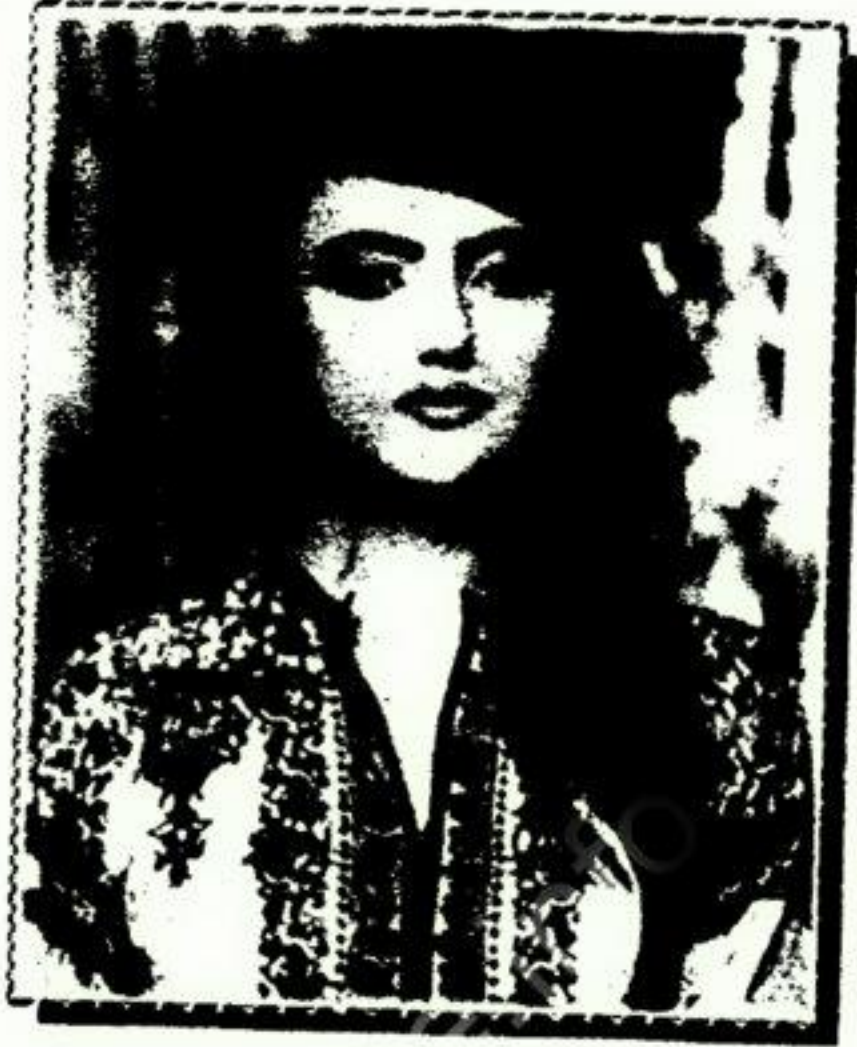
☆ ”بالکل جی۔ بہت شوق سے دیکھتی ہوں۔ مجھے اپنے ہر ڈرامے کے آن ایئر ہونے کا انتظار رہتا ہے۔ بہت غور سے اپنے ڈرامے دیکھتی ہوں کہ کہاں غلطی کی ہے تاکہ اپنے آپ کو سدھار سکوں اور لوگوں کی تنقید کو بھی بہت غور سے سنتی ہوں تاکہ خامیوں کو دور کر سکوں۔“

* ”کبھی سوچا تھا کہ اس فیلڈ میں آئیں گی، نام کمائیں گی؟ سین کے لیے ڈائریکٹر کو تنگ کرتی ہیں یا جلدی اوبے ہو جاتا ہے؟“

☆ ”نہیں کبھی نہیں سوچا تھا۔ بالکل سب کچھ اچانک ہی ہو گیا کہ ایک دم سے خبرناک کے لیے آفر آ گئی اور پھر ڈرامے کے لیے آفر آ گئی۔ اور ڈائریکٹر کو تنگ نہیں کرتی، اچھی بچی ہوں۔ ہاں ایک سین جو کہ سیریل ”آپ کی کنیز“ کا تھا اس میں مشکل ہوئی تھی جب دکھایا جاتا ہے کہ والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے تو۔ کیونکہ اللہ کا شکر ہے کہ میں ایک ہی لائف گزار رہی ہوں۔ تو بس رونے دھونے والے سین کرنے ذرا مشکل لگتے ہیں۔“

* ”اور رومانٹک؟“

☆ ”نہیں۔۔۔ وہ بھی بس ٹھیک ہو ہی جاتے ہیں۔“



یروگرام کے 22 ہزار ملتے تھے اور مجھے تو شوہر کی لائف بہت اچھی لگ رہی ہے اور برائیاں کہاں نہیں ہوتیں ہر جگہ ہوتی ہیں اور اب تو اس فیلڈ میں بہت پڑھے لکھے لوگ آگئے ہیں۔“

* ”لاہور میں آپ کی فیملی ہوتی ہے اور آپ یہاں کراچی میں۔ تو مسئلہ تو نہیں ہوتا؟ اور اپنے گھر جاتی ہیں تو کیسا لگتا ہے؟“

☆ ”نہیں جانے آنے کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا اور میرا دل چاہتا ہے کہ جب میں جاؤں تو اپنے گھر والوں کے ساتھ ہی وقت گزاروں اور میرا دل چاہتا ہے کہ میرے جانے سے پہلے گھر والے اپنے کام ختم کر لیں تاکہ وہ مجھے پر اپر ٹائم دے سکیں۔ تو کبھی کبھی اس بات پر مجھے تھوڑی پریشانی ہوتی ہے۔“

* ”سوشل ہیں، دل چاہتا ہے بلکہ گلہ کرنے کو لاہور جا کر؟“

☆ ”نہیں ایسا بلکہ گلہ کرنے کو دل نہیں چاہتا میں سوشل تھی اور ہوں بھی لیکن جو مزا کالج کے زمانے کا تھا وہ اب نہیں ہے کالج میں تھی تو دوستوں کے ساتھ وہلنٹائن ڈے بھی مناتی تھی۔ لال کپڑے بھی پہنتے تھے مگر اب تو سارا وقت شوٹ میں ہی گزارتا ہے۔ ہاں

* ”فلمیں کس قسم کی پسند ہیں؟۔ آفر آئی؟“
 ☆ ”مجھے ہر طرح کی فلمیں پسند ہیں اور فلم میں کام کرنے کا شوق بھی ہے اور ہمایوں سعید کی ایک فلم ”یہ جوانی پھر نہیں آئے گی“ میں کام بھی کر رہی ہوں۔“
 * ”رول کس طرح کے کرنا چاہیں گی؟“

☆ ”ہر طرح کے کروں گی، لیکن زیادہ تر پوزیٹو رول ہی کروں گی، ایک دل میں نگہبٹو کے ہیں۔ مگر کوئی خاص مزا نہیں آیا۔ ویسے ابھی تک کوئی کردار ایسا نہیں کیا کہ کر کے پچھتاوا ہوا ہو۔“

* ”بچپن کی کوئی برائی جواب تک برقرار ہے؟“
 ☆ ہنستے ہوئے ”ہاں ہے مجھے بچپن سے ہی عادت نہیں ہے وقت کی پابندی کرنے کی اور یہ عادت آج تک برقرار ہے۔ اور چونکہ پاکستان میں کسی کو بھی یہ عادت نہیں ہے۔ اس لیے مجھے مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔“

* ”ڈرامے کے کردار حقیقی ہوتے ہیں؟“
 ☆ ”نہیں بالکل نہیں۔ اور ہم حقیقت کے برعکس پر فارم کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کو تو اداکاری کہتے ہیں۔ اور زندگی میں کون سچ سچ تھپڑ کھاتا ہے مگر

میں نے ڈرامے میں تھپڑ کھایا۔“
 * ”ہاؤس وانف بننے کے علاوہ کیا بننے کی خواہش ہے؟“

☆ ہنستے ہوئے ”ہاؤس وانف کے لیے بھی ابھی ٹائم چاہیے۔ ویسے میرا ارادہ بزنس کرنے کا اور فیوچر میں پروڈکشن ہاؤس کھولنے کا ہے۔“
 * ”کوکنگ سے لگاؤ ہے؟“

☆ ”نہیں کوئی خاص نہیں، لیکن اگر کبھی پکانا پڑ بھی جائے تو آلو گوشت اور قیمہ آلو اچھا پکالتی ہوں۔“
 * ”ویسے کھانا اور ناشتا کس کے ہاتھ کا پسند ہے اور غصہ کس پہ اترتا ہے۔ کھانے پر یا کسی اور پہ؟“

☆ ”اپنی ماں کے ہاتھ کا۔ وہ بہت اچھا پکاتی ہیں۔ اور میں تو پہلے ہی بہت کم کھاتی ہوں، اگر غصے میں بھی کھانا پینا چھوڑ دوں گی تو نقصان میرا ہی ہو گا۔“
 * ”لوگ عام جگہوں پہ ملتے ہیں تو کیا فرمائش کرتے ہیں؟“

☆ ”بھئی آج کل تو ایک ہی فرمائش ہوتی ہے کہ پلیز ایک سیلفی ہو جائے تو میں سب کے ساتھ تو سیلفی نہیں بنوائی جو لڑکیاں یا خواتین مجھے بہتر لگتی ہیں ان





کے ساتھ بنواتی ہوں۔“

میں زیادہ اچھی لگتی ہو اس لیے مجھے اتنی پروا نہیں ہوتی۔“

* ”شادی کی رسومات میں شوق سے جاتی ہیں؟“
 ☆ ”اگر مہندی ماپوں کا فنکشن ہو تو۔۔۔ اگر یہ رسومات نہ ہوں تو پھر نہیں جاتی بشرطیکہ کوئی مجبوری نہ ہو۔“

* ”اپنے عادت و اطوار میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں؟“

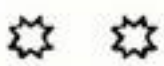
☆ ”مجھے لگتا ہے کہ مجھ میں مستقل مزاجی کی کمی ہے۔۔۔ تھوڑی ضدی بھی ہوں فیصلے کرنے میں سوچتی بہت ہوں۔“

* ”غلطی تسلیم کر لیتی ہیں؟“

☆ ”ہاں۔۔۔ جی بالکل۔“

* ”اپنی شخصیت کے لیے کیا کتنا چاہیں گی؟“
 ☆ ”میں خوابوں میں رہنے والی لڑکی ہوں۔ مجھے

خواب دیکھنا اور پھر ان کو اصلی کر دکھانا پسند ہے۔“
 اور اس کے ساتھ ہی ہم نے نہ نب جیل سے اجازت چاہی۔



* ”لوگوں کو انڈین فنکاروں سے شکلیں ملانے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ آپ کو لوگوں نے کس سے ملایا؟“

☆ ہنستے ہوئے ”جی میرے لیے کہتے ہیں کہ تمہاری شکل انوشے شرما سے ملتی ہے۔ تو میں خوش نہیں ہوتی بلکہ بس سن لیتی ہوں اور مسکرا دیتی ہوں۔“

* ”اگر انڈین فلم سے آفر ہو تو کس کے ساتھ کام کرنے کو ترجیح دیں گی؟“

☆ ”مجھے سلمان خان بہت پسند ہیں اور میری خواہش ہوگی کہ میں جب بھی انڈین فلم میں کام کروں تو سلمان خان کے ساتھ کروں۔“

* ”نیند باری ہے یا کام؟“

☆ ”کام تو سب کو ہی پارا ہوتا ہے۔ لیکن مجھے نیند بھی پیاری ہے۔ لیکن کام کے معاملے میں بہت ایکٹیو Active ہوں اور ذرا لیٹ ہو جاؤں اور بیڈ پر ہوں تو چھلانگیں مارتی ہوئی اٹھتی ہوں اور فوراً ”تیار ہو کر چلی جاتی ہوں۔“

* ”تیار ہونے میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہوتا؟“
 ☆ ”نہیں بالکل نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ تم سلوگی

محمد بلال قریشی

سٹائینرشید



وقت میں تو سب نصیبحتیں ہی کرتے ہیں۔“

14 ”میں ڈرتا ہوں؟“

”اے ہی غصے سے۔ بہت تیز ہے میرا غصہ۔“

15 ”کس کا غصہ مجھ میں ٹرانسفر ہوا؟“

”شاید میری امی کا۔“

16 ”مجھے کوئی شوق نہیں؟“

”اپنا فون نمبر بار بار بدلنے کا۔ دس سال سے ایک

ہی نمبر ہے میرے پاس۔“

17 ”کس کو نمبر دے کر نہیں پچھتا تا؟“

”تقہ۔۔۔ ٹرکیوں کو۔ مگر اب سنبھل گیا ہوں۔“

”شادی جو ہو گئی ہے۔“

1 ”نام؟“

”محمد بلال قریشی۔“

2 ”پیار کا نام؟“

”صرف بلال۔۔۔ یا پھر کبھی کبھی مدنی بھی کہہ دیتے

ہیں۔“

3 ”جنم دن؟/ شہر؟“

”9 فروری / سعودی عرب (جدہ)۔“

4 ”بہنیں اور بھائی؟“

”چار بہنیں، ہم دو بھائی۔“

5 ”تعلیم؟/ شادی؟“

”گریجویٹ / الحمد للہ ہو گئی ہے۔“

6 ”شوہر کا سفر؟“

”بہت مشکل سے طے کیا ہے تب کہیں جا کر جگہ

بنی ہے۔“

7 ”آج کل آن ایئر سیریل؟“

”کالنج کی گڑیا۔“

8 ”پہچان بنا؟“

”نٹھاسا دل۔۔۔ مطلب ٹیلی فلم تھی۔“

9 ”میری نیند کا ٹائم؟“

”پہلے صبح سوتا تھا۔ شادی کے بعد روٹین بدل گئی

ہے۔“

10 ”صبح اٹھ کر پہلا کام؟“

”پانی پینا۔“

11 ”کونسا وقت زندگی میں ضرور آتا ہے؟“

”اچھا اور برا۔۔۔ برا پہلے آجائے تو اچھے وقت کی

بہت قدر ہوتی ہے اور بندہ بار بار شکر کرتا ہے۔ میں

نے بھی برے کے بعد اچھا ٹائم دیکھا تو بہت قدر کرتا

ہوں۔“

12 ”کیا برا لگتا ہے؟“

”لوگوں کی نصیبحتیں۔۔۔ نصیحت بچوں کے لیے کار

آمد ہوتی ہیں، بڑوں کے لیے نہیں اور میں اب بڑا ہو

چکا ہوں۔“

13 ”برے وقت میں کوئی کام آتا ہے؟“

”سب اچھے وقت کے ساتھی ہوتے ہیں۔ برے

- 18 "کس کے ساتھ اداکاری کرنے کی خواہش ہے؟"
"شاہ رخ خان کے ساتھ۔"
- 19 "ذریعہ خواہش؟"
"فلم میں کام کرنا۔ جنون کی حد تک خواہش ہے۔"
- 20 "میں نے سوچا تھا کہ؟"
"کہ ولین ٹائن ڈے پر شادی کروں گا اور میں نے ایسا ہی کیا 14 فروری کو ہی شادی کی میں نے۔"
- 21 "ایک خواہش جو پوری ہوئی؟"
"کہ جب میں رات کو تھکا ہوا گھر آؤں تو میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہو۔ سو ایسا ہی ہوتا ہے۔"
- 22 "میری ایک اچھی عادت سے؟"
"مجھے تو یہی لگتی ہے کہ میں اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتا ہوں۔"
- 23 "کون بزدل ہوتا ہے؟"
"جو خود کشی کرتا ہے۔ حالات سے مقابلہ کرنا چاہیے۔ لڑنا چاہیے۔"
- 24 "معاف کرنے کی خوبی کس میں ہوتی ہے؟"
"میرے خیال میں مرد کی۔ عورت میں ذرا کم ہوتی ہے۔"
- 25 "بہت خوش ہوتا ہوں؟"
"جب چھٹی کے دو چار دن ملنے پر لاہور جاتا ہوں اپنے والدین کے پاس۔ میری مستقل رہائش لاہور میں ہے۔"
- 26 "کیا برداشت نہیں کر سکتا؟"
"بھوک اور نیند۔ نیند تو کانٹوں پہ بھی آجاتی ہے اور بھوک شدید ہو تو بس۔ فوراً کھانا چاہیے ہوتا ہے۔"
- 27 "ایک بری عادت جس پر قابو پانا سیکھ لیا ہے؟"
"پہلے غصے میں بے قابو ہو کر اپنے آپ کو زخمی کر لیتا تھا۔ اب ایسا نہیں ہے۔ شکر الحمد للہ۔"
- 28 "کن کی بہت عزت کرتا ہوں؟"
"خواتین کی عورت کا برتاؤ تباہ ہے خواہ وہ ماں کے بہن کے یا بیوی کے روپ میں ہوں۔ یا پھر بیٹی کے روپ میں۔"
- 29 "مہمانوں کی آمد؟"
"بہت اچھی لگتی ہے۔ میں بہت مہمان نواز ہوں۔"
- 30 "خرچ کرتا ہوں؟"
"دوسروں پر۔ اپنے اوپر خرچ کرنے کا شوق نہیں ہے۔"
- 31 "کھانے کا اصل مزہ؟"
"فیملی کے ساتھ چٹائی پہ بیٹھ کر کھانے کا جو مزہ ہے وہ کہیں بھی نہیں ہے۔"
- 32 "مجھے نشہ ہے؟"
"انٹرنیٹ اور فیس بک کا وہ نہیں سکتا ان کے بغیر۔"
- 33 "مستقبل میں میرے ارادے؟"
"میاں بیوی اور بچے۔ خوشحال گھرانہ۔ اور ٹوٹ کر یعنی جان لگا کر محنت کرنا۔"
- 34 "چھٹی کا دن گزارتا ہوں؟"
"اپنے بیڈ پر۔ اور کہیں نہیں۔"
- 35 "Sms الرٹ کس کے لیے رہتا ہوں؟"
"ظاہر ہے بیوی کے لیے۔ اور کس کے لیے رہتا ہے۔"
- 36 "لوگ سمجھتے ہیں کہ؟"
"ہم کوئی بہت خاص لوگ ہیں، جبکہ ایسا نہیں ہے۔ ہم بھی عام لوگوں کی طرح ہی ہیں۔ جیسے عام لوگ کھاتے پیتے، اٹھتے بیٹھتے اور کھاتے پیتے ہیں، ہم بھی ویسے ہی کرتے ہیں۔ بس ٹی وی کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ اور تو کوئی خاص بات نہیں۔"
- 37 "گھر سے نکلتے وقت نہیں بھولتا؟"
"موبائل فون اٹھانا۔ آخر بیگم کے Sms کے جواب بھی تو دینے ہوتے ہیں۔"
- 38 "مذہب سے میری قربت؟"
"بہت زیادہ ہے۔ اور مزید قریب ہونا چاہتا ہوں مذہب کے۔"
- 39 "چوٹ لگ جائے تو؟"
"چوٹ لگ جائے تو؟"

”سوائے امی کو پکارنے کے اور کوئی زبان پر نام نہیں آتا۔“

40 ”تو تازہ محسوس کرتا ہوں؟“

”جب کام کر کے گھر آتا ہوں۔ عموماً شام کو اور رات کو اپنے آپ کو تازہ محسوس کرتا ہوں۔“

41 ”فقیر کونتا ہوں؟“

”ایک فقیر دوسرے فقیر کو کیا دے سکتا ہے۔ پھر بھی حسبِ وقت کچھ دے ہی دیتا ہوں۔“

42 ”کب بہت خوش ہوتا ہوں؟“

”جب کوئی دل کھول کر میری تعریف کرتا ہے۔“

43 ”گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟“

”پورے گھر میں۔ کیونکہ گھر ہے ہی سکون کی جگہ۔“

44 ”لڑکیاں گھوریں تو؟“

”گھورتی رہیں۔ ہر اچھے اور خوب صورت انسان کو لوگ گھورتے ہی ہیں (تعمیر)۔“

45 ”خوشی میں پہلا جملہ؟“

”شکر الحمد للہ۔“

46 ”ملک سے باہر جا کر کیا سیکھا؟“

”سیکھا تو بہت کچھ تھا۔ پر پھر جیسا دلیس و سیا بھیس۔“

47 ”شاہِ دل یا کنجوس؟“

”اپنے لیے کنجوس دوسروں کے لیے شاہِ دل۔“

48 ”تحفہ میں میری ترجیح؟“

”پرفیوم۔ میرے خیال میں اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں۔“

49 ”میری کوشش ہوتی ہے کہ؟“

”میری وجہ سے کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور سب مجھ سے خوش رہیں۔“

50 ”جھوٹ بولتا ہوں؟“

”ہاں، ہاں بولتا ہوں۔ مگر دوسروں کو مشکل سے نکلنے کے لیے ورنہ ذرا کم ہی جھوٹ بولتا ہوں۔“

51 ”پہلی ملازمت؟“

”جب یو ایس پڑھنے گیا تھا تو چھوٹی سی ملازمت کی

تھی جس کے 100 ڈالر ملے تھے۔“

52 ”شاپنگ پہلی ترجیح؟“

”گھر سے باہر نکلتا ہوں تو پہلے کچھ نہ کچھ کھانے کو ترجیح دیتا ہوں پھر شاپنگ کرتا ہوں۔“

53 ”شاپنگ کے لیے پسندیدہ جگہ؟“

”جہاں سے کچھ پسند آجائے خرید لیتا ہوں۔ کوئی خاص جگہ نہیں ہے شاپنگ کے لیے۔“

54 ”غصے میں پہلا لفظ؟“

”اب یہ تو نہ پوچھیں۔ ستر ہو جائے گا۔“

55 ”کیا وقت سے پہلے ملا؟“

”کچھ بھی نہیں۔ ہمیشہ جو ملا دیر سے ہی ملا۔ پھر بھی رب کا شکر ادا کرتا ہوں۔“

56 ”باہر جا کر کیا چیز متاثر کرتی ہے؟“

”ان کی ایمانداری، چیزوں کا خالص ہونا، جھوٹ نہ بولنا، مسکرا کر بات کرنا اور قوانین کو فالو کرنا۔“

57 ”کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟“

”کچھ خاص نہیں۔ پرفیومز مجھے پسند ہیں۔ سواسی کی ایکسٹرا خریداری ہو جاتی ہے۔“

58 ”کیا چیزیں اس دنیا میں نایاب ہیں؟“

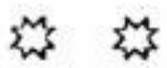
”محبت، خلوص اور دوسروں کے لیے اچھی سوچ۔“

59 ”زندگی کی ساری جدوجہد کس کے لیے؟“

”اپنے لیے ہرگز نہیں۔ انسان بہ ذاتِ خود تو دو وقت کی روٹی اور ساہ لباس میں بھی گزارہ کر لیتا ہے۔ یہ ساری جدوجہد تو دوسروں کو سکھ دینے کے لیے ہی ہوتی ہے۔“

60 ”زندگی نے کب کروٹ لی؟“

”زندگی تو ہر وقت کروٹیں بدلتی رہتی ہے کبھی اچھا وقت آجاتا ہے تو کبھی برا۔ زندگی تو اتار چڑھاؤ کا نام ہے۔ دن اور رات کا نام ہے۔ عروج و زوال کا نام ہے۔“



سیدہ نسبت زہرا

ادارہ

ملتے۔ اے کاش! کہ میرے دوست مجھ سے پھر ایک بار آئیں دوست کبھی نہیں پھرتے وہ ”آج“ بھی زندہ ہیں اور ہمیشہ رہیں گے (آہ)۔“

س ”آپ کے لیے محبت کیا ہے؟“

ج ”میرے لیے محبت، محبت خواہش کے موسم میں کیف آگئی بارش ہے جس لمحے برس جائے زندگی اسی لمحے میں قید ہو جاتی ہے۔ پھر اس ٹھہرے ہوئے لمحے میں اپنا آپ مڑ مڑ کر دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ محبت تو وہ ہے جو انسان کو زمین سے اٹھا کر آسمان تک لے جاتی

ہے جو ”من“ اور ”تو“ فرق منا کے عشق مجازی سے عشق مجازی سے عشق حقیقی کا سفر طے کراتی ہے۔ زمین کے سفر میں اگر کوئی شے آسمانی ہے تو وہ ”محبت“ ہے جو دلوں پر چلنے سے ”وحی“ کی مانند اترتی ہے اور وجود کو اپنا گرویدہ کر لیتی ہے۔“

س ”مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہو؟“

ج حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فرمان ہے ”میں نے خدا کو پہچانا، ارادوں کے ٹوٹ جانے، نیتوں کے بدل جانے اور ہمتوں کے پست ہو جانے سے۔“ تو میں کوئی بھی منصوبہ نہیں بناتی جب کرنا اس ذات نے ہے تو راضی بہ رضا۔“

س ”پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور کیا ہو؟“

ج ”میرے بھائی اکیم بی بی ایس کھلمٹ ہو اسید آصف رضا (U.K) اور ڈائجسٹ میں پھر سے لکھنا

س ”آپ کا پورا نام گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟“

ج ”سیدہ نسبت زہرا۔ گڑیا اتنا مشہور اور فارملی ہو چکا ہے کہ اکثر لوگوں کو نہیں پتا کہ میرا نام کیا ہے۔ فرینڈز البتہ نسبت ہی کہتی ہیں۔“

س ”کبھی آئینے نے آپ سے یا آپ نے آئینے سے کچھ کہا؟“

ج ”ہا ہا ہا۔۔۔“ کچھ پوچھ کہا ہم تو اکثر آئینے کو ستاتے رہتے ہیں ڈنکے کی چوٹ پر با آواز بلند۔

حسن والوں کو سنورنے کی ضرورت کیا ہے سادگی میں بھی قیامت کی ادا ہوتے ہیں اور یہ بھی اکثر

معصوم نظر بھولا مکھڑا، چہرے پر تبسم تصویر کا جب یہ عالم ہے تو حسن مجسم کیا ہوگا اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے سب کچھ دیا کبھی کسی بات کی کمی نہیں لگی اللہ نے بہت جنہنسس بنایا ہے (آہم)۔“

س ”آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟“

ج ”میرے مام، ڈیڈ، برادرز، سسٹرز، ذریت حسن (بھانجا)۔“

س ”آپ اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں؟“

ج ”2002ء میں جب میرے ماموں سید سجاد بخاری کی ڈیٹھ ہوئی، وقت جلدی بیت جاتا ہے اور پچھڑ جانے والے دوست ڈھونڈنے سے بھی کہیں نہیں

ج ”میری نانو‘ میری مام شاہدہ بخاری۔“
 س ”سائنسی ترقی نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر کے
 کالہ کر دیا ہے یا واقعی یہ ترقی ہے؟“
 ج ”کام جلدی ہو جاتا ہے‘ زندگی آسان اور سہل
 ہے لیکن انسان ست ہو گیا ہے۔“
 س ”کوئی عجیب خواہش یا خواب؟“

ج
 ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
 بہت نکلے میرے ارمان مگر پھر بھی کم نکلے
 ”ایک خواہش کاش کہ بہت پیاری سی اپنی شاعری
 کی کتاب کہ پبلٹ کروں۔“
 س ”برکھارت کیسے انجام دے کرتی ہیں؟“

ج
 پھر سزا بن رت کی پون چلی تم یاد آئے
 پھر پتوں کی پازیب بجی تم یاد آئے
 بارشوں کے اداس موسم میں خود کو دیکھو تو یاد آئے کوئی
 کاش ایک باریوں بھی ہو جائے میں پکاروں تو لوٹ آئے کوئی

انکوائری کے لیے ہر طرف سے ہاتھ دھوئے

سائبر سولنگ

راحت حسین

قیمت - 300 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ فونیشن
 37، اردو بازار، کراچی۔ 730021

اشارت کیا۔“
 س ”آپ اپنے گزرے کل‘ آج اور آنے والے
 کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟“
 ج ”اللہ پر ہمیشہ بھروسہ وہ بہتری کرنے والا ہے۔
 خوش امید کی ترنگ۔“

س ”آپ اپنے آپ کو بیان کریں؟“
 ج ”حساس برداشت کرنے والی اور ہر کسی کا ادب
 و احترام چاہنے والا ہونا غیر چھوٹا ہونا ہونا۔“
 س ”کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے پنچے آپ
 میں گاڑے ہوں؟“

ج ”2010ء میں میں بہت بیمار ہوئی‘ سوچوں تو
 آج بھی کانپ جاتی ہوں۔“
 س ”آپ کی کمزوری۔ آپ کی طاقت کیا ہے؟“
 ج ”چیزوں میں پوچھا تو پوٹری‘ ذریت حسن
 (بھانجا) طاقت‘ میرے بھائی راقم رضا اکاؤنٹنس منیجر
 اور ڈاکٹر آصف۔“

س ”آپ خوشگوار لمحات کیسے گزارتی ہیں؟“
 ج ”بہت ہنستی ہوں‘ اچھا کھانا بناتی ہوں۔ شعر

سناتی ہوں (کوئی سنتا ہی نہیں ہا ہا۔) اور فیملی اکٹھی
 ہو کر انجام دے کرتے ہیں۔“

س ”آپ کے نزدیک دولت؟“
 ج ”اچھی لائف گزارنے کے لیے ضروری ہے۔
 لفٹی لفٹی۔“

س ”گھر“ آپ کی نظر میں؟“
 ج ”تحفظ“ ملتا ہے گھر میں پر سکون ہونے کی جگہ۔“

س ”کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کر دیتی ہیں؟“

ج ”میری میموری بہت تیز ہے مجھے کچھ بھی کبھی
 نہیں بھولتا‘ ویسے معذرت قبول کرنے میں ہی بہتری
 ہوتی ہے۔“

س ”اپنی کامیابیوں میں کس حصہ وار ٹھہراتی ہیں؟“

اچھی بات نہیں۔“

س ”کوئی ایسی شکست جو آج بھی اداس کر دیتی ہے؟“

ج ”میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونے لگتی ہوں۔ اکثر ساری ساری رات میں روتی ہوں پتا نہیں کیوں مجھے دکھ ہوتا ہے۔ کاش میں بھی بے حس ہو جاؤں۔“

س ”کوئی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی جو آپ کو حسد میں مبتلا کر دیتی، دو؟“

ج ”نہیں، نہیں، کبھی بھی نہیں۔ مجھے ہمیشہ خوشی ہوتی ہے کامیاب لوگوں کو دیکھ کر۔ ہاں! البتہ محسن نقوی کی شاعری پڑھ کر دل چاہتا ہے ایسے اشعار میں بھی کہہ سکتی کبھی۔ یہ رشک ہے۔“

س ”مطالعہ آپ کی نظر میں؟“

ج ”تنہائی سے بچاتا ہے۔ زندگی کا شعور سکھاتی ہے اور اچھے برے راستے کے تعین میں اچھی کتاب بہترین ساتھی ہے۔“

س ”آپ کی پسندیدہ شخصیت؟“

ج ”زوجہ حیدر کرار بی بی فاطمہ الزہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔“

س ”ہمارا پورا پاکستان خوب صورت ہے آپ کا خاص پسندیدہ مقام؟“

ج ”پاکستان کو بہت خوب صورت کہنا بے جا نہیں، پاکستان بہت خوب صورت ملک ہے۔ بس امن و امان

تھی قائم ہو جائے تو کیا کہنا۔ مجھے ہر سکون جگہ اچھی لگتی ہے چاہے وہ گاؤں ہو، شہر ہو یا کوئی وادی کا خوب صورت دلکش حسین منظر۔

یہ اشک تیرے میرے رائیگاں نہ جائیں گے
ان ہی چراغوں سے روشن محبتیں ہوں گی

❦ ❦

اب بس یادیں بن گئیں یہ سب تو۔

س ”آپ جو ہیں وہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟“

ج ”اس بات سے خوش ہوں کہ اللہ نے جیسا بنایا۔ کوئی خواہش نہیں کہ ایسی ہوتی، ویسی ہوتی۔۔۔ پر سکون ہوں اپنی پر سنالٹی سے اتنا منفرد بنایا سب سے۔ ہاں منفرد لوگوں کو ہمیشہ مار سنی پڑتی ہے۔ طعنوں کی یا تنہائی کی (بابا بابا)۔“

س ”آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب؟“

ج ”جب تلاوت کرتی ہوں تو لگتا ہے کہ کوئی سن اور دیکھ رہا ہے۔ جب اکثر راتوں کو رو کر اس ذات سے دعا مانگتی ہوں تو دل سے آواز آتی ہے۔

آج دی رات میں کلاں وان

آج دی رات نے میرے سونہڑے ربا

نیڑے ہو کے بول

س ”آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟“

ج ”خلوص اور محبت کبھی کبھی اچھی، سنی ہوئی پوسٹری۔“

س ”اپنی خوبی یا خالی جو آپ کو مطمئن یا مایوس کرتی ہے؟“

ج ”میری سب سے بڑی خوبی یا خالی ہر کسی کی عزت، پیار، محبت کرنا لوگ نہ جانے پھر کیا سمجھتے ہیں کہ شاید مجھے کچھ سمجھ نہیں۔ ضرورت سے زیادہ حساس۔“

س ”آپ کیا مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں؟ یا خوف زدہ ہو جاتی ہیں؟“

ج ”اگر کوئی مجھے چیلنج کرے تو پھر اس کو دکھاتی ہوں کہ دیکھو میں نے ایسا کر لیا۔ بہت پاور فل ہوں میں۔

اسٹرانگ۔“

س ”متاثر کن کتاب، مصنف، مووی؟“

ج ”سبح البلاغہ، لہذا جدون، تیری راہ میں رل گئی، مووی کی جگہ کہانی دی۔ موویز نہیں دیکھتی۔“

س ”آپ کا غرور؟“

ج ”فیملی، میرا قلم، ویسے آپس کی بات ہے غرور کرنا

راپنزل

مہر کو کمانیاں سننے کا بے حد شوق ہے۔ اسکول کے فینسی ڈریس شو میں وہ شہزادی راپنزل کا کردار ادا کر رہی ہے، اس لیے اس نے اپنے پاپا سے خاص طور پر شہزادی راپنزل کی کہانی سنانے کی فرمائش کی۔ کہانی سنا تے ہوئے اسے کوئی یاد آجاتا ہے، جسے وہ راپنزل کہا کرتا تھا۔

نینا اپنے باپ سے ناراض رہتی ہے اور ان کو سلام کرنا بھی گوارا نہیں کرتی، وہ ابا سے جتنی نالاں اور متنفر رہتی، لیکن ایک بات حتمی تھی کہ امی سے اسے بہت محبت تھی، لیکن اسے محبت کا مظاہرہ کرنا نہیں آتا تھا۔ اس کی زبان ہمیشہ کڑوی ہی رہتی۔ نینا اپنے خرچے مختلف ٹیوشن پڑھا کر پورے کرتی ہے۔ اس کی بہن زری ٹیلی فون پر کسی لڑکے سے باتیں کرتی ہے۔

سلیم کی محلے میں چھوٹی سی دکان تھی۔ چند سال پہلے میٹرک کارزلٹ پتا کر کے وہ خوشی خوشی گھر واپس آ رہا تھا کہ ایک گاڑی سے اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے اور وہ ایک ٹانگ سے معذور ہو جاتا ہے۔ ذہنی بیمار ہونے کی وجہ سے اس کی ماں نے مثبت قدم اٹھاتے ہوئے محلے میں ایک چھوٹی سی دکان کھلوادی، سلیم نے پرائیویٹ انٹر کر کے بی ایے کا ارادہ کیا۔ سلیم کی غزل احمد علی کے نام سے ایک ادبی جریدے میں شائع ہو جاتی ہے، جو اس نے نینا کے ہاتھ بھجوائی تھی۔

صوفیہ کا تعلق ایک متوسط گھر سے تھا۔ وہ اپنی بہنوں میں قدرے دبی رنگت کی مالک، لیکن سلیقہ شعاری میں سب سے آگے تھی۔ صوفیہ کی شادی جب کاشف نثار سے ہوئی تو پورے خاندان میں اسے خوش قسمتی کی علامتی مثال بنا دیا گیا۔ کاشف نہ صرف چلتے ہوئے کاروبار کا اکلوتا وارث تھا، بلکہ وجاہت کا اعلا شاہکار بھی تھا۔ کاشف خاندان کی ہر لڑکی اور





دوستوں کی بیویوں سے بہت بے تکلف ہو کر ملتا، جو صوفیہ کو بہت ناگوار گزر تا تھا۔ صوفیہ کو خاص کر اس کے دوست مجید کی بیوی حبیبہ بہت بری لگتی تھی۔ جو بہت خوب صورت اور مارڈرن تھی اور اس کی خاص توجہ کاشف کی طرف رہتی۔ حبیبہ کی وجہ سے کاشف اکثر صوفیہ سے کیے ہوئے وعدے بھول جاتا تھا۔ صوفیہ کے شک کرنے پر کاشف کا کہنا تھا کہ یہ اس کا کاروباری تقاضا ہے۔

بی بی جان صوفیہ کی ساس کو کاشف سے جھگڑا کرنے سے منع کرتی ہیں، لیکن صوفیہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی اور اکثر و بیشتر کاشف سے بحث کرنے لگتی جو کاشف کو ناگوار محسوس ہوتا۔ صوفیہ پر یگننت ہو جاتی ہے اور بی بی جان کاشف سے صوفیہ کا خیال رکھنے کو کہتی ہیں۔

شہرین نے ضد کر کے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف جا کر سمیع سے شادی تو کر لی، لیکن پچھتاوے اس کا پچھا نہیں چھوڑتے۔ حالانکہ سمیع اسے بہت چاہتا ہے، اس کے باوجود اسے اپنے گھر والے بہت یاد آتے ہیں اور وہ ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے اور زیادہ تر پلزلے کر اپنے بیڈ روم میں سوئی رہتی ہے۔ سمیع نے اپنی بیٹی ایمین کی دیکھ بھال کے لیے دور کی رشتہ دار اماں رضیہ کو بلا لیا جو گھر کا انتظام بھی سنبھالے ہوئے تھیں۔ سمیع اور شہرین دونوں ایمین کی طرف سے لاپرواہی اور ایمین اپنے والدین کی غفلت کا شکار ہو کر ملازموں کے ہاتھوں پل رہی ہے۔ اماں رضیہ کے احساس دلانے پر سمیع غصہ ہو جاتا ہے اور ان کو ڈانٹ دیتا ہے۔ شہرین کے بھائی بسن راستے میں ملتے ہیں اور سمیع کی بہت بے عزتی کرتے ہیں۔

اب آگے پڑھئے

چوتھی قسط

”زری یہ تو لیا تمہارا ہے یا نہینا کا؟“ امی نے کمرے میں آتے ہوئے سوال کیا تھا۔ زری نے فوراً ہاتھ میں پکڑا موبائل تکیے کے نیچے اڑسا۔

”مجھے تو ہمیشہ بھول جاتا ہے کہ سفید تو لیا نہینا کا ہے یا گلابی والا۔ تم ہی بتاؤ۔“ امی نے اس کے آگے سفید تو لیا رکھا تھا۔ ان دونوں بہنوں نے چند دن پہلے ہی نئے تو لیے خریدے تھے اور امی کو پہچان نہیں ہو رہی تھی۔ آج کپڑے دھالے تھے اور وہ ان کے کپڑے وغیرہ الگ الگ کر کے تہ لگا کر الماریوں میں رکھ رہی تھیں۔

”امی سفید والا اس کا ہے۔ گلابی والا میرا ہے۔ گلابی بڑا ہے۔ سفید چھوٹا ہے۔ میرے بال لمبے ہیں اس لیے میرا ٹاول بڑا ہے۔ آپ یہ نشانی یاد کر لیں نا“ زری نے مشورہ دیا تھا۔

”یہ بھی اچھی کسی کہ میں یاد کر لوں۔ تم لوگ خود ہی اپنی چیزیں سنبھال کر رکھ لو تو مجھے یاد کرنے کی ضرورت ہی نا پڑے۔ دسپرسے کپڑے تار سے اتار کر وہاں صوفے پر رکھے ہوئے ہیں۔ رات ہو گئی۔ مجال ہے دونوں میں سے کسی نے ہاتھ بھی لگایا ہو۔ اتنا سا کام نہیں ہوتا تم دونوں سے کہ اپنے کپڑے ہی تہ لگا کر الماریوں میں رکھ لو۔ دھونا تو دور کی بات ہے۔ لوگوں کی بیٹیاں تو نا صرف ماؤں کے ساتھ کپڑے دھلواتی ہیں بلکہ استری کر کے الماریوں میں سجاتی بھی ہیں اور یہاں میری شہزادیاں خود الماریوں میں رکھنے تک کی روادار نہیں۔“ امی کا یہ روز کا سبق تھا جو وہ انہیں پڑھاتی رہتی تھیں۔

”امی میں تو کتنے ہی کام کرتی ہوں۔ مجھے کیوں ڈانٹ رہی ہیں۔ نہینا کو ڈانٹا کریں نا۔ وہ تو مل کر پانی بھی نہیں پیتی۔“ زری ناراضی سے بولی۔ اس کا خیال تھا کہ نہینا کی لاپرواہی کی وجہ سے اسے بھی بلا وجہ امی سے ڈانٹ پڑ جاتی ہے۔

”ارے ان محترمہ کی بھی خوب کمی۔ وہ خود اٹھ کر یونیورسٹی چلی جاتی ہیں۔ سمجھو قلعے فتح کرتی ہیں۔ ایم اے نہیں کر رہیں۔ ہمارے سر احسان کر رہی ہیں۔“ امی انتہائی چڑ کر بولی تھیں پھر انہیں یک دم احساس ہوا کہ نہینا موجود نہیں تھی۔

”ہیں کدھر تمہاری بہن صاحبہ۔ سو گئی کیا؟“ انہوں نے اس کے بستر کی طرف دیکھا جس پر لحاف کھلا پڑا تھا جو یقیناً ”شام کو سوتے وقت کھولا گیا تھا اور ابھی بھی تہ لگا کر رکھا نہیں گیا تھا۔ اس کی کتابیں کپڑے اور دوسری اشیا ایسے ہی بکھری رہتی تھیں۔

”نہینا کہاں ہے؟“ انہوں نے زری سے سوال کیا تھا۔ چہرے پر کچھ تفکر۔ ما نظر آیا۔ ردی نے سوال سے زیادہ چہرے کے تاثرات پر غور کیا تھا۔

”وہ خالہ کی طرف گئی ہے۔ کہہ رہی تھی سلیم سے کتابیں لینی ہیں دس منٹ پہلے ہی سیڑھیاں اتری ہے۔“ اس نے وضاحت کی۔

”یہ ہر وقت منہ اٹھا کر خالہ کی طرف کس خوشی میں چلی جاتی ہے۔ ہر دو گھنٹے بعد اسے سلیم سے کوئی نیا کام یاد آجاتا ہے۔“ امی کے چہرے پر بڑھتی ہوئی پریشانی کی لیکریں زری کو حیران کر رہی تھیں۔ خالہ کا گھر نہینا کے لیے اس کا اپنا ہی گھر تھا۔ وہاں جانے کے لیے وہ وقت اور اجازت دونوں کی کبھی محتاج نہیں رہی تھی۔ امی نے بھی کبھی ٹوکا نہیں تھا لیکن اب نجانے کیوں اس طرح پریشان ہوئی چلی جا رہی تھیں۔ پہلے بھی اسی بات پر ناراض ہو رہی تھیں اور اب بھی برا مان رہی تھیں۔

”زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ ابھی چند منٹ پہلے ہی۔“ زری نے مزید کچھ کہنا چاہا لیکن امی نے اس کی بات کاٹ دی۔

”تم کس لیے صفائیاں پیش کر رہی ہو؟ وضاحتیں دے رہی ہو۔ چپ کرو۔ عیسیٰ کا گواہ موسیٰ۔ جاؤ جا کر اسے بلا کر لاؤ۔“ امی اسے ڈپٹ کر بولیں۔

”امی آجائے گی۔ کون سا پہلی بار گئی ہے۔ آپ تو بلا وجہ ہی ناراض ہوئی جا رہی ہیں۔ کوئی بات ہوئی ہے کیا۔ پہلے تو آپ نے کبھی نہیں ٹوکا نہینا کو۔“ وہ حیران تھی۔ امی نے اسے گھڑ کر دیکھا۔

”جتنا کہا ہے ناسا کر۔ وکیل بن کر ماں سے سوال جواب ناسا شروع کر دیا کرو۔ اٹھو جاؤ۔“ وہ پہلے سے زیادہ ناراضی لہجے میں سمو کر بولی تھیں۔

زری کا موڈ بھی خراب ہوا۔ خالہ کا گھر ایک گھر چھوڑ کر ہی تھا لیکن اس وقت وہ سیڑھیاں اتر کر جانے کا سوچ کر ہی اکتا گئی تھی لیکن چونکہ امی غصے میں تھیں اس لیے وہ مزید بحث کیے بنا ان کے رویے میں آنے والی تبدیلی کے متعلق قیاس لگاتی اٹھی اور سہانے پر بڑا دھنڈا کندھے پر رکھ کر دروازے کی سمت بڑھی۔ چند لمحوں بعد وہ خالہ کے دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا ہی تھا۔ ان کے گھر کا دروازہ کھلا ہی رہتا تھا۔

خالہ کی ایک بیٹی اور چار بیٹے تھے۔ بیٹی کی انہوں نے شادی کر دی ہوئی تھی اور اب گھر میں صرف لڑکے ہی تھے جن کا ہر وقت اندر باہر آنا جانا لگتا تھا اس لیے دروازہ بند ہوتا ہی نہیں تھا۔ وہ اطمینان سے اندر آگئی۔ بیٹی کی آوازیں باہر تک آرہی تھیں۔ خالہ پاکستانی چھینلز پر آنے والے سیریلز بڑے شوق سے دیکھنے کی عادی تھیں اور پھر ان سیریلز پر سیر حاصل بحث بھی کرتی تھیں۔ زری اس وقت کسی سیریل کی پوری روئیداد سننے میں انٹرسٹڈ نہیں تھی۔ سلیم کا گھر بیرونی دروازے کے بالکل ساتھ تھا۔ وہ خاموشی سے سلیم کے گھرے کی جانب بڑھی تھی۔

”یہ ممکن نہیں ہے سلیم“ اس نے نہینا کو کہتے سنا۔ اس کے قدم وہیں جم سے گئے۔ یہ نہینا کے الفاظ نہیں تھے

بلکہ یہ اس کا اندازہ تھا جس نے اسے باہر رک جانے پر مجبور کیا۔ وہ اتنی بے چارگی سے سلیم کو کس "ہنا ممکن امر" کے متعلق بتا رہی تھی۔ زری نے دروازے کی اوٹ میں ہوتے ہوئے کان اندر جاری گفتگو کی جانب لگاتے ہوئے مزید کچھ سننے کی کوشش کی۔



"انسان ختم ہو جاتے ہیں۔ زندگی باقی رہتی ہے۔" حبیبہ نے افسردگی سے پھر پور لمبی گہری سانس بھری تھی۔ صوفیہ کے دل کو عجیب سے دھڑکے نے آکھیرا۔ ہلکے گلابی رنگ کے کرتا شلوار میں بنا کسی آرائش کے سادہ چہرے کے ساتھ بھی اس کا رنگ روپ کسی کا بھی دل موہ لینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس کی دیکھتی ہوئی گندی رنگت اس کی چمک دار گہری آنکھیں، عنیابی ہونٹ اس کا گلابی لباس اور کھائی میں موجود واحد سنہرا کنگن۔ سفید کفن میں لپٹی مجید بھائی کی میت سامنے پڑی تھی۔ صوفیہ دیکھتی رہ گئی۔ بے رنگ بیوگی نے تو حبیبہ کو مزید رنگ دار بنا دیا تھا۔

اس نے سر پر ڈوٹیا اوڑھ رکھا تھا لیکن اس نزاکت کے ساتھ کہ اس کا چہرہ اس ڈوٹے کے ہالے میں مزید دکھتا ہوا لگتا تھا۔ لباس ریشم کا تھا اور ریشم کا لباس ہلکے رنگ کا ہو تو بھی دیکھنے والوں پر بڑا گہرا تاثر چھوڑتا ہے۔ ہر آنکھ اشکبار تھی، ہر چہرہ افسردہ تھا اور ان سب کے ساتھ بیٹھی صوفیہ، حبیبہ کو ہی دیکھتی جاتی تھی۔

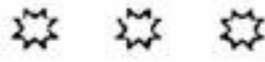
حادثے کی اطلاع ملنے ہی اس کے حواس جیسے گم ہو گئے تھے۔ اس کا دل لرز کر رہ گیا تھا۔ اسے حبیبہ سے نفرت تھی لیکن اس کو کبھی پیدعا تو نادی تھی اس نے۔ وہ اس کا براتو نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کبھی اس کا سہاگ چھن جانے کی دعا نہیں کی تھی لیکن مجید بھائی کی حادثاتی موت نے اسے ڈرا دیا تھا۔ اس کے ضمیر نے بہت ملامت کی تھی اسے۔ جنازے میں شرکت سے پہلے تک وہ اپنے بیڈروم میں بیٹھی کاشف کی لمبی زندگی کی دعائیں مانگتے ہوئے بے آواز روتی رہی تھی اور حبیبہ کے شوہر کی مغفرت کے لیے دعا بھی کرتی رہی تھی۔ جنازے میں شرکت سے پہلے تک اس نے حبیبہ کے اجرے ہوئے سراپے کو کئی بار خیالوں ہی خیالوں میں اپنے ارد گرد منڈلاتے دیکھا تھا اور اسے دل ہی دل میں اس پر ترس آیا تھا۔

اس کا سہاگ چھن گیا تھا۔ اب کیا بیچ گیا تھا اس کے پاس۔ صوفیہ کے خیال میں حبیبہ نام کا قصہ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے خاندان میں عزیز و اقارب میں حتیٰ کہ فلموں ڈراموں میں بھی "بیوگی" مضمون کا وہ جملہ تھی جس کے بعد فل اشاپ لگا دیا جاتا ہے اور فل اشاپ کے آگے تو کچھ نہیں ہوتا۔ صوفیہ کے خیال میں بھی حبیبہ اب "کچھ" نہیں رہی تھی۔ اس لیے اس کی ہمدردی میں صوفیہ کا دل کافی افسردہ تھا۔ وہ اس کے دل کے صبر و قرار کے لیے بھی دعائیں کرتی رہی تھی لیکن جب جنازے میں شرکت کے لیے پہنچی تو سارا منظر جیسے اس کی توقعات کے برعکس تھا۔

حبیبہ افسردہ تو تھی لیکن اس کا حلیہ ویران نہیں تھا۔ اس کے بال بکھرے نہیں تھے۔ اس کی کلائیاں خالی نہیں تھی اور اس کا حسن ماند نہیں ہوا تھا۔ صوفیہ کو نجانے کس نے کہہ ڈالا تھا کہ بیوگی حسن کے چھن جانے کا نام ہے اور وہ حبیبہ کے حسن سے ہی تو خائف تھی جو مزید نکمیر کر سامنے آ گیا تھا۔ صوفیہ کو اس کی جانب دیکھتے ہوئے یہ تک بھول گیا کہ وہ موجود کہاں ہے۔ وہ کسی ملکہ کی طرح سنگھاسن پر بیٹھی نظر آتی تھی اور اس کا ہر انداز ثابت کر رہا تھا کہ ملکہ یہ وہ ہو کر بھی ملکہ رہتی تھی۔

وقفے وقفے سے کاشف کو اس کے پاس آنا پڑ رہا تھا۔ اسپتال کے معاملات تھے۔ پولیس کی کارروائی تھی۔ قبرستان اور گورکن کے انتظامات تھے۔ کاشف مرنے والے کا بزنس پارٹنر تھا۔ اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ یہ سب معاملات سنبھالتا لیکن نجانے کیوں صوفیہ کو لگا کہ وہ سب سے زیادہ حبیبہ کو سنبھالنے کے لیے ہلکان ہوا جا رہا ہے۔

وہ عورتوں والے حصے کی طرف آتا تھا تو حبیبہ کی سسکیاں برہ جاتی تھیں۔ کاشف اسے دلا سہ دیتے ہوئے اپنے بانوؤں میں بھر لیتا تھا اور وہ بھی اس کے کندھے پر سر رکھ کر مرے ہوئے شوہر کا دکھ جی بھر کر روتی جاتی تھی۔ صوفیہ کا دل مزید ڈرنے لگا۔ یہ کیا ہو رہا تھا یہ کیا ہونے جا رہا تھا۔



”یہ ناممکن ہے سلیم“ نینا نے پست لہجے میں گردن ہلاتے ہوئے اسے کہا تھا۔
 ”میں جانتا ہوں۔ اور اس بات کے لیے میں تم سے شکایت کروں گا نا کوئی جرح۔ میں اپنی اوقات سے واقف ہوں۔“ سلیم نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔ اس کی آواز بھی پست تھی اور شاید حوصلہ بھی۔ نینا اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔

”اچھی بات ہے۔ امید ہے اب یہ محبت و حبت والی شاعری کرنے سے توبہ کر لو گے تمہ“ نینا نے کوئی تاثر ظاہر کیے بنا عام سے لہجے میں کہا تھا۔

”توبہ کا وقت گزر چکا ہے نینا۔ میں اب اس دلدل میں مکمل طور پر دھنس چکا ہوں۔ اب تو سزا کاٹنے کے دن ہیں۔“ وہ یہ اعتراف بھی آرام سے کر گیا تھا۔ نینا کے سامنے اعتراف نا کرنا تو کس کے سامنے کرتا۔ نینا چپ رہی۔ بالکل چپ۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا کہے۔ اپنے اس معصوم سے کزن کو کس طرح سمجھائے کہ وہ دکھی ہوئے بغیر اس راہ سے ہٹ جائے۔

”یہ ٹھیک نہیں ہوا۔ میں تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن۔۔۔“ وہ بمشکل اتنا ہی کہہ پائی۔
 ”نینا۔ تم اب میرے ساتھ یہ سب کرو گی۔ وضاحتیں دو گی۔ دلائل جمع کرو گی میرے لیے۔ مجھے یہ بتاؤ گی کہ تم مجھے ہرٹ نہیں کرنا چاہتی۔ کیا میں یہ بات جانتا نہیں ہوں؟“ وہ چڑھا گیا تھا۔ نینا چپ ہو گئی۔ اس کے پاس الفاظ ختم ہو گئے تھے اور بعض اوقات جہاں الفاظ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر اختتام کی جانب گامزن ہوتے ہیں وہیں سے آنسو اپنے سفر کی ابتدا کر دیتے ہیں۔ نینا کی آنکھوں میں نمی سے مرچیں سی بھرنے لگیں۔ وہ کسی کے سامنے نہیں روتی تھی۔ اسے کسی کے سامنے رونے سے چڑھی۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی۔

”یہ کتابیں رکھی ہیں تمہارے لیے۔ لے جاؤ“ سلیم نے اشارے سے تپائی پر پڑی کتابوں کی جانب اس کی توجہ مبذول کروائی۔ نینا پھر مڑی اور تپائی پر پڑی وہ گائیڈ بکس اٹھالیں۔
 ”شکریہ سلیم۔“ نجانے کس چیز کی تلافی کے لیے اس نے اظہار تشکر کا مظاہرہ کیا تھا جو کہ سلیم کے سامنے پہلے کبھی نہیں کیا تھا اس نے۔

”دفع ہو جاؤ نینا۔ تم پر مرتے ہیں تو کیا مار ہی ڈالو گی ہمیں۔“ وہ مصنوعی خفگی سے بولا تھا۔ نینا دروازے سے نکل رہی تھی۔

”دل تو یہی چاہتا ہے کہ تمہیں مار ہی ڈالوں۔“ وہ مڑتے ہوئے کہتا نا بھولی تھی۔ پھر نجانے کیا سوچ کر دوبارہ اندر آگئی۔

”مرے ہوئے کو کون مارتا ہے۔“ سلیم نے اسے واپس آنا دیکھ کر کہا۔
 ”سلیم ان باتوں میں کچھ نہیں رکھا۔ تم ابھی بھی واپس پلٹ سکتے ہو۔“ وہ اسے سمجھا رہی تھی۔ سلیم مسکرا دیا۔
 ”نینا! محبت ناسور ہے۔ یہ اپنی ابتدا میں سمجھ ہی نہیں آتی اور جب سمجھ میں آتی ہے تو واپسی کے سب امکانات ختم ہو چکے ہوتے ہیں۔“ وہ اتنی لا چاری سے بولا کہ نینا کا دل پھر رونے کے لیے ٹھنڈے لگا۔ وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کا بھرم رکھ رہے ہیں۔

”میں کچھ نہیں جانتی سوائے اس کے کہ محبت نقصان کا سودا ہے۔ مجھے افسوس ہے تمہارے نقصان پر اور مجھے افسوس ہے کہ تم نے اپنا نقصان خود کیا ہے۔“ وہ اب کی بارر کی نہیں تھی بلکہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ بیرونی دروازے کی جانب بڑھے ہوئے اس نے کسی سمت نہیں دیکھا تھا بلکہ سر جھکائے باہر آئی۔ ایک آنسو لڑھکتا ہوا اس کے گال سے پھسل کر نیچے جاگرا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا اور کچھ دیر دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہوں میں آنسو ہی نہیں تھے شکوہ بھی در آیا تھا۔ وہ واقعی سلیم کو دکھی نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن یہ سب اس کے اپنے اختیار کی بات بھی نہیں تھی۔



”ڈاکٹر بشری! بہت اچھی ہیں۔“ شہرین نے طمانیت بھری گہری سانس لیتے ہوئے سمیع سے کہا تھا۔ وہ اسپتال سے گھر واپس جا رہے تھے۔ شام کو کافی ہوا چلتی رہی تھی جس کی بنا پر موسم کافی خوش گوار تھا، لیکن ہوا کے ساتھ کافی گرد بھی فضا میں اکٹھی ہو گئی تھی جس سے سمیع کو ابھن ہوتی تھی اس لیے اس نے گاڑی کا اے سی آن کر رکھا تھا۔ شہرین کو اے سی کی وجہ سے اکثر متلی کی کیفیت محسوس ہونے لگتی تھی، لیکن آج وہ ایسا کچھ محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اس کا کریڈٹ بھی وہ ڈاکٹر بشری کو ہی دے رہی تھی۔ انہوں نے اسے ایک چوس کر کھانے والی ٹیبلٹ اپنے کلینک میں ہی کھانے کو دی تھی۔ ان سے مل لینے کے بعد وہ ذہنی طور پر کافی پرسکون ہو گئی تھی۔ ایک طرف اسے یہ اطمینان تھا کہ وہ دوبارہ پریگنٹ نہیں ہوتی تھی اور دوسری جانب اس بات کی بھی خوشی تھی کہ اسے کوئی بیماری نہیں تھی۔ ایک ذرا سا ڈپریشن تو تھا اور ڈاکٹر بشری نے کافی سبزیایا تھا۔

”ڈپریشن کوئی بیماری نہیں ہے۔ یہ زندگی کی طرف ہمارا عمومی رویہ ہے۔ ہم اگر شکر گزاری کا جذبہ اپنالیں اور یہ سوچتے رہیں کہ اللہ سب سے بہتر سبب الاسباب ہے تو ہم کبھی ڈپریشن نہ ہوں، لیکن ہم بلا ضرورت ان مسائل کو بھی سر پر سوار رکھتے ہیں جنہیں ہم خود حل ہی نہیں کر سکتے تو مایوسی ہمیں گھیرے رکھتی ہے اور یہی مایوسی ڈپریشن کا باعث بنتی ہے۔ اللہ پر بھروسہ رکھیں اور کسی منفی سوچ کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دیں۔“ وہ بہت اچھے طریقے سے اسے سمجھاتی رہی تھیں۔

ان کے کلینک سے نکلے ہوئے شہرین نے دل میں تہیہ کیا تھا کہ وہ اب کسی الٹی سیدھی سوچ میں گھر کر پریشان نہیں ہوگی اور نہ ہی ان باتوں پر کڑھے گی جو اس کے اختیار سے باہر تھیں۔ وہ جب بھی کسی نئی ڈاکٹر سے ملتی تھی ابتدا میں اسی طرح پر جوش ہوتی پھر آہستہ آہستہ سب بھولتی جاتی تھی۔ اسی لیے واپس گھر جاتے ہوئے وہ خود کو بہت فریش محسوس کر رہی تھی۔ کیوں کہ ڈاکٹر بشری کی باتیں اسے اچھی لگی تھیں۔

”تمہیں میرے علاوہ سب اچھے لگتے ہیں نا۔“ سمیع نے چڑایا۔
 ”یہ میں نے کب کہا؟“ وہ ہنسی تھی۔

”اچھا ذرا یاد کر کے بتاؤ کہ لاسٹ ٹائم کب تم نے میرے لیے ایسے کہا تھا کہ سمیع تم بہت اچھے ہو۔“ وہ موڑ کاٹنے کے بعد اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

”یہ تو میں دن میں کئی بار کہتی ہوں کہ سمیع تم بہت اچھے ہو۔“ وہ حیران ہوئی تھی۔

”سو تے ہوئے کہتی ہوگی شاید۔ کیوں کہ میں نے جاگتے ہوئے تو کبھی تمہیں اپنی تعریف میں ایک جملہ بولتے نہیں سنا۔ ہاں یہ ضرور سنتا رہتا ہوں کہ اماں رضیہ بہت اچھی ہیں۔ فہمیدہ (ملازمہ) بہت اچھی ہے۔ ڈاکٹر بشری بہت اچھی ہیں۔ بانی داوے کیا کبھی تم نے ان لوگوں کے سامنے یہ کہا ہے کہ سمیع بہت اچھا ہے۔“ وہ جتا کر بولا۔
 شہرین ہنسی۔

”تمہارے بارے میں اب میں ہر ایک سے بات تو نہیں کر سکتی نا۔ تم تو میرا انتہائی پرسنل میٹر ہو۔ میری ڈائری پر لکھی ہوئی وہ محبت بھری لکھم جسے میں ہر ایک کے سامنے نہیں پڑھ سکتی۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔ سمجھنے والے نے دند آسکرین سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہا۔

”ڈاکٹر بشری واقعی بہت اچھی ہیں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ شہین نے آنکھیں سیکڑ کر مسکراتے چہرے کے ساتھ دیکھا پھر زور سے ہنسی۔

”کیوں اب کیا ہوا۔؟“

”انہوں نے ایک ہی وزٹ میں میری بیوی کی کھوئی ہوئی یادداشت واپس لوٹا دی۔ اللہ کا شکر ہے کہ تمہیں یاد آ گیا کہ میں تمہاری محبت بھری لکھم ہوں۔ میں تو اسے معجزہ ہی کہوں گا۔“ وہ اسی انداز میں بولا تھا۔

شہین ہنستی رہی۔

”جتنے مرضی طنز کرنے ہیں کر لو، لیکن اب تم دیکھنا میں خود کو بالکل پہلے جیسا کر لوں گی۔ خوش باش رہنے والی شہین۔ ہمہ وقت ہنسنے کھیلنے والی شہین۔ میں ان لوگوں کے بارے میں سوچوں گی بھی نہیں۔“ اس نے اپنی امی یا گھر والوں کا نام نہیں لیا تھا، لیکن سمجھ گیا تھا کہ وہ ”کن“ لوگوں کی بات کر رہی ہے۔ اس نے جواباً ”کچھ نہیں کہا۔ شہین کے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے دل ہی دل میں سخت خار کھانے لگا تھا۔ اس کے دل میں ان کے لیے اب کوئی عزت باقی نہیں رہی تھی۔

”پہلے ہی میں الٹی سیدھی سوچوں میں گھر کر بہت وقت ضائع کر چکی ہوں۔ ایمن کو اور تمہیں وہ توجہ دے سکی ہوں نہ محبت جو تم دونوں ڈیزو کرتے ہو۔ بس بہت ہو گئی۔ اب مزید وقت ضائع نہیں کرنا مجھے۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولی تھی۔ سمجھنے والے نے آجانے پر گاڑی روک دی تھی۔ وہ کچھ بھی نہیں بولا تھا۔

”اب تم کیا سوچ رہے ہو؟“ شہین نے اس کی خاموشی سے اکتا کر پوچھا۔ سمجھنے والے نے گردن موڑ کر اسے دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

”یہی کہ ڈاکٹر بشری واقعی بہت اچھی ہیں۔“ اس نے سارا زور ”واقعی“ پر لگا کر کہا تھا۔ شہین ایک بار پھر زور سے ہنسی۔



وہ بہت بوجھل دل کے ساتھ میٹرھیاں چڑھ کر اوپر آئی تھی۔ امی لاؤنچ میں بیٹھیں دھلے ہوئے کپڑے تہ لگا رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ انہیں مخاطب کیے بنا اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگی۔

”کہہ جا رہی ہو۔ ادھر آؤ نہ ذرا۔“ امی نے اسے پکارا تھا۔ نہنہانے مڑ کر انہیں دیکھا۔ اس نے ایک دو آنسو ہی بہائے تھے اور چہرہ اور آنکھیں اچھی طرح پونچھ کر اوپر آئی تھی، لیکن پھر بھی اسے لگا کر اگر اس نے امی کی جانب دیکھا تو وہ جان جائیں گی کہ وہ کسی بات پر افسردہ ہے۔

”جی۔“ اس نے ان کی جانب دیکھے بنا کہا تھا۔

”یہ تم ہر وقت منہ اٹھا کر سلیم سے کیا لینے چلی جاتی ہو؟“ وہ سخت ناراضی بھرے لہجے میں سوال کر رہی تھیں۔ نہنہا کا دل مزید ٹوٹ گیا۔ اسے شکوہ تھا کہ امی کو کبھی اس کے چہرے سے اس کی دلی کیفیت سمجھ نہیں آتی تھی جبکہ زری ذرا سا اداس ہو جاتی تھی تو امی کو فوراً ”پتا چل جاتا تھا۔“

”آئندہ جاتے وقت منہ اٹھا کر نہیں جاؤں گی بلکہ یہیں میز پر رکھ جایا کروں گی۔ ٹھیک ہے۔“ اس نے بد تمیزی سے کہا تھا۔ امی کو اس کے انداز پر اتنا غصہ آیا کہ چند لمحے وہ کچھ بول ہی نہیں پائی تھیں۔

”پڑھ لکھ کر سہی سیکھا ہے کہ ماں سے بد تمیزی کیسے کرتے ہیں۔ کتابوں میں سر کھپا کھپا کرتا ہی علم حاصل ہوا کہ بٹوں کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ ماں ہوں تمہاری۔ اتنا ہی یاد رہ جایا کرے تمہیں تو ہم سب کی زندگی میں سکون ہو جائے۔ بد تمیز، ناہنجار۔ ڈھیٹ لڑکی۔ اتنی تمیز بھی نہیں ہے کہ ماں سے بات کیسے کرتے ہیں۔“ امی انتہائی برامان کر بولی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اٹھ کر اس کے منہ پر دو پھٹرا دیں۔

”آپ بھی اس طرح مت پوچھیں نا۔ میں زری کو بتا کر گئی تھی۔“ وہ اچھی بھی ان کی جانب دیکھے بنا بول رہی تھی۔

”زری تمہاری ماں نہیں ہے۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ تم مجھ سے اجازت لینے کی پابند ہو۔ مجھ سے پوچھ کر نہیں جاسکتی تھی۔“ وہ سابقہ انداز میں بولی تھیں۔ ان کے ہاتھ اب بہت تیزی سے کپڑے کی تہ لگا رہے تھے جو ان کی سخت خفگی کو ظاہر کر رہا تھا۔

”امی میں حج پر نہیں گئی تھی۔ سلیم کے پاس گئی تھی۔ جس کے پاس دن میں سات مرتبہ جاتی ہوں میں۔ سات مرتبہ اجازت لوں آپ سے؟“ وہ چڑھ گئی اور یہ تو اس کا مشغلہ تھا۔ وہ ہر بات پر چڑھ جاتا کرتی تھی۔

”سات مرتبہ جانے کی ضرورت کیا ہے۔ ایسا کون سا راجا مہاراجا ہے وہ کہ جو اتنی مرتبہ حاضری دینی پڑتی ہے اس کے دربار میں۔“ امی بہت غصے میں تھیں۔ نینا نے کچھ حیرانی سے انہیں دیکھا۔ امی نے پہلے تو اس طرح اسے کبھی کہیں آنے پر نہیں ٹوکا تھا۔ وہ پہلے ہی بوجھل دل لیے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ امی کی خفگی نے مزید دل توڑ ڈالا۔ وہ کچھ کے بنا اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ اس کا کسی سے بات کرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔



”تم نے حبیبہ کو فون کیا تھا بیٹی۔“ لی بی جان نے زرمن کے پنگوڑے کی ڈوری کو ہلاتے ہوئے اس سے سوال کیا تھا۔ صوفیہ اپنی ناگواری چھپا نہیں پائی تھی۔ اس کا کون سا دوستانہ رہا تھا حبیبہ سے کہ وہ فون کرتی۔

”لی بی جان! میں کیا کروں گی فون کر کے؟“ اس نے ان سے بھی وہی کہہ دیا تھا جو اس کے منہ میں آیا تھا۔

”صوفیہ۔“ انہوں نے سرزنش بھرے انداز میں تا صرند پکارا بلکہ اس کی جانب دیکھا بھی تھا۔

”وہ عدت میں ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ گاہے بگاہے اسے فون کر کے اس کی خیریت دریافت کرتی رہو۔ بہت سے کام ہوتے ہیں جو عدت میں بیٹھی عورت نہیں کر سکتی۔ تمہیں پوچھنا تو چاہیے اس سے۔“ انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ صوفیہ نے ان کی بات کا شہی۔

”لی بی جان کاشف ہیں نا پوچھنے کے لیے۔ حبیبہ اور اس کے تمام امور کا خیال رکھنے کے لیے۔ وہ مجھ سے زیادہ اچھی طرح اس کی ذمہ داریاں بانٹ رہے ہیں۔“ وہ اپنی دلگرفتگی اور بے زاری کو حتی الامکان چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی تھی۔ کئی دن ہو چلے تھے مجید بھائی کی وفات کو اور کئی دنوں سے اس کی نیند اڑی ہوئی تھی۔

”اب کیا ہوگا؟“ یہ وہ سوال تھا جو ہمہ وقت اس کے اعصاب پر سوار رہنے لگا تھا۔ لی بی جان اور کاشف کو حبیبہ سے ہمدردی کا اتنا تیز بخار چڑھا تھا کہ حرارت اسے اپنے وجود تک محسوس ہونے لگی۔ حبیبہ کا بھرا بڑا میکا تھا سسرالی رشتے دار بھی کم نہیں تھے، لیکن کاشف اور لی بی جان ہمہ وقت اسے ”کیلا“ اور ”عدت میں بیٹھی مجبور عورت“ قرار دیتے ہوئے اس کی ساری ذمہ داریاں بانٹنے کے لیے ہمہ وقت بے تاب رہتے تھے اور یہ بات صوفیہ کو کاٹنے کی طرح چبھتی تھی۔

”صوفیہ وہ بیوہ ہے۔ اس کا خیال رکھنا ہم سب کی ذمہ داری ہے بیٹی۔“ لی بی جان کو کافی دکھ ہوا تھا اس کی بات

سن کر۔ وہ اپنی ناپسندیدگی چھپا نہیں پائی تھیں۔

”یہی تو میں آپ کو سمجھانا چاہ رہی ہوں بی بی جان۔ وہ بیوہ ہے۔ اس کے شوہر کو دنیا سے رخصت ہوئے دس دن بھی نہیں ہوئے۔ وہ عدت میں ہے۔ اسے غیر مردوں سے نہیں ملنا چاہیے۔ اس لیے اسے کچھ دیر اکیلا چھوڑ دیں۔ اپنے شوہر کے لیے مغفرت کی دعائیں مانگنے دیں۔ احسان کریں اس پر بھی اور مجھ پر بھی۔“ وہ چڑ کر بولی تھی۔

”کیا کہنا چاہتی ہو تم صوفیہ۔ مجھ سے اشاروں میں باتیں مت کرو۔ اس عمر میں ایسی ذہنی مشقت کے قابل نہیں ہوں میں۔“ بی بی جان نے چیتتی بہو کے انداز گفتگو کو بغور دیکھا تھا۔ وہ نرم و نازک سی ٹھہر ٹھہر کر سمجھ داری سے گفتگو کرنے والی صوفیہ جو انہیں پہلی نظر میں اپنے بیٹے کے لیے بھاگتی تھی جیسے کہیں گم ہو کر رہ گئی تھی۔

”بی بی جان کاشف ہر روز جیبہ کے گھر کیوں جاتے ہیں۔؟“ اس کا ارادہ نہیں تھا کہ وہ یہ سوال ان سے کرے گی، لیکن اس سے صبر نہیں ہوا تھا اور پھر ساس کے علاوہ تھا ہی کون جن سے وہ بات کر سکتی۔

”روز صرف یہ پوچھنے جانا کہ اسے کوئی کام یا کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے اور پھر دو گھنٹے وہاں قیام کرنا۔ یہ کون سی نئی مذہبی رواداری ہے جس کا کسی کتاب میں ذکر آج تک میں نے تو نہیں پڑھا۔ یہ کوئی مناسب بات ہے کیا۔ لاکھ وہ دوست کی بیوہ کی حیثیت سے اس کی بھلائی کے لیے اس سے ملتے ہوں گے، لیکن کیا یہ بات جائز ہے۔ آپ خود بتائیں۔“ اب کی بار وہ چڑ کر نہیں بولی تھی بلکہ عجیب طرح کا خردشہ تھا جو اس کے چہرے سے پھلکنے لگا تھا۔

”صوفیہ! آج پہلی مرتبہ مجھے بھی یہ احساس ہو رہا ہے کہ کاشف صحیح کہتا ہے۔ تم بلاوجہ ہر بات کو سر پر سوار کے شوہر کے ساتھ لڑائی جھگڑے کا سامان پیدا کرتی ہو۔“ بی بی جان بہت لاچار سے انداز میں بولی تھیں۔ حقیقت یہ بھی تھی کہ وہ اس روز روز کی بحث سے اکتانے لگی تھیں۔ انہوں نے خود جوانی میں بیوگی کالی تھی اس لیے ان کے دل میں یک دم جیبہ کے لیے بہت ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ یہ بات سن کر ہی کافی ناراض ہو رہی تھیں کہ صوفیہ ایک عدت میں بیٹھی عورت پر بھی شک کر سکتی ہے۔

”میری بات سنو بیٹی۔ جیبہ کا بہت نقصان ہوا ہے۔ شوہر کی اچانک حادثاتی موت نے اسے اعصابی طور پر بہت دھچکا پہنچایا ہے۔ اسے دوست احباب کے سہارے کی ضرورت ہے۔ زبانہ جو بھی کہے، لیکن میں جانتی ہوں کہ شوہر کے چلے جانے سے جو خلا پیدا ہو جاتا ہے وہ عورت کو بہت کمزور کر دیتا ہے۔ اسے جذباتی سہارے کی بھی ضرورت ہے اور پھر ظاہر ہے وہ اب مالی طور پر کاشف کی محتاج ہے کیوں کہ اس کے شوہر کا خطیر سرمایہ کاشف کے کاروبار میں لگا ہے۔ لین دین اور بینک کے معاملات کے لیے کاشف کو طوعاً کرہاً وہاں جانا ہی پڑتا ہے۔ تم یہ بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتی۔ اپنے دل اور ذہن کو کشادہ رکھو۔ اب تو تم ماں بن چکی ہو۔ تمہارا قلعہ بہت مضبوط ہے میری بیٹی۔“ وہ ہمیشہ کی طرح بہت شفقت بھرے انداز میں اسے نصیحت کر رہی تھیں۔ صوفیہ کچھ نہیں بولی۔ اسے اب بی بی جان کے پند و نصائح والے سب ابواب ازیر ہو چکے تھے۔ اسے ان میں دلچسپی محسوس نہیں ہوتی بلکہ اس کا دل دکھتا تھا کہ وہ کبھی اس کا ساتھ دینے کی بجائے اپنے بیٹے کی حمایت کرتی ہیں۔

”ہم چلیں گے کسی دن اس کی طرف۔ میں تمہارا انکار نہ سنوں۔“ ان کی بات حتمی اور آخری تھی۔ صوفیہ کا دل چاہا کہ صاف انکار کر دے، مگر احتراماً خاموش رہی، لیکن چہرے پر جو بے زاری چھائی تھی وہ ان سے چھپی نہیں رہی تھی۔

”اللہ کے یہاں صلہ رحمی کا بہت درجہ ہے میری بچی۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔



نہینا کو سلیم کے کمرے سے نکلنے دیکھ کر زری مزید دروازے کے پیچھے ہو گئی کہ کہیں نہینا کی نظر اس پر نہ پڑ جائے۔ اس نے ان دونوں کی ساری گفتگو سن اور سمجھ بھی لی تھی۔ اس کے لیے یہ بہت حیران کن بات تھی۔ سلیم کو اس نے کبھی اسے ہنونی کے طور پر نہیں سوچا تھا۔ اسے سلیم کبھی پسند رہا ہی نہیں تھا۔

وہ نہینا کے جانے کے پانچ منٹ بعد نکلی تھی اور پھر گھر کی سیڑھیوں میں بھی پانچ منٹ رک کر انتظار کرتی رہی تھی۔ وہ یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ وہ نہینا کو بلانے گئی تو تھی، لیکن خالہ نے اسے اپنے پاس بٹھالیا تھا۔ نہینا کو اگر بھٹک پڑ جاتی کہ وہ ان کی باتیں سن چکی ہے تو ایک معرکہ الارا جھگڑا ہو سکتا تھا اور جھگڑوں سے وہ بڑا بچتی تھی۔ اس کی اور نہینا کی زیادہ بنتی نہیں تھی، لیکن اس میں اس سے زیادہ نہینا کا ہی قصور ہوتا تھا۔ اس کی کسی سے بھی نہیں بنتی تھی۔ اس نے کزنز اور کلاس فیلوز کو بھی کبھی گھاس نہیں ڈالی تھی اور انہوں نے بھی اس کی غیر موجودگی میں ایک نام رکھ چھوڑا تھا۔ سب اسے ”نہینا پھڈے باز“ کہہ کر بلاتے تھے۔

جبکہ زری کزنز کلاس فیلوز حتیٰ کہ ماں باپ کی بھی ہر دلعزیز رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو اس کی بے مثال خوب صورتی تھی پھر اس کی عادتیں اور شوق بھی سب کی توجہ جلدی اپنی جانب مبذول کروا لیتے تھے۔ اسے کپڑے پہننے اور ڈھننے کا سلیقہ تھا۔ اس نے بہت چھوٹی عمر میں سلائی سیکھ لی تھی۔ کسی بھی شادی بیاہ یا دعوت پر جاتے ہوئے وہ اپنے کپڑے خود ڈیزائن کرتی تھی اور ایسے کرتی تھی کہ سب تعریف کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ میک اپ اتنا اچھا کرتی تھی کہ اس کی سہیلیاں اسے اپنا بیوٹی پارلرنے کا مشورہ دیتی تھیں۔ خاندان کی ہر شادی پر دلہن کی مہندی اس کے ذمے رہتی تھی۔

ان ہی وجوہات کی بنا پر وہ لڑکیوں اور ان کی ماؤں میں مقبول ہو جاتی تھی جبکہ نہینا کو ایسے شوق نہیں تھے۔ وہ بچپن سے آدم بے زار ٹائپ تھی۔ وہ تو زری کی عادتوں سے بھی چڑتی تھی جبکہ زری کو اس کی عادتوں پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ تو دل سے دعا کرتی تھی کہ نہینا نارمل لڑکیوں کی طرح میک اپ مہندی چوڑیوں میں دلچسپی لیا کرے، اسی لیے یہ ساری باتیں سن کر اسے یہ کم از کم ضرور اچھا لگ رہا تھا کہ نہینا کی زندگی میں کوئی بات نارمل لڑکیوں والی بھی تھی، لیکن سلیم پھر بھی اسے پسند نہیں تھا۔ اسی لیے اسے نہینا کا دھوکا انکار بھی تسلی بخش لگا تھا۔ یہی سب سوچتی وہ سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔



”نہینا۔ زری۔ اٹھو نماز کا وقت نکل رہا ہے۔“ امی نے قرآن پاک شلیف پر رکھتے ہوئے بیٹیوں کے کمرے کی جانب منہ کر کے آواز دی تھی پھر باسی روٹیاں، سوکھی ڈبل روٹی اور رات کے بچے ہوئے تھوڑے سے چاول ایک برات میں لے کر باہر صحن میں آگئیں۔ یہ گھر کافی بڑا، لیکن پرانی طرز کا بنا تھا۔ نیچے کا سارا پورشن گودام کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور وہ انہوں نے نے کرایے پر چڑھا رکھا تھا جبکہ پہلی منزل پر ان لوگوں نے رہائش اختیار کی ہوئی تھی۔ چار کشادہ کمروں، ٹی وی لاؤنج، ڈرائنگ روم اور ایک بڑے سے بچن پر مشتمل وہ پورشن ان کی ضرورت کے لیے کافی سے زیادہ تھا۔ مسئلہ صرف ایک تھا کہ سیڑھیاں چڑھ اتر کر باہر اندر آنا جانا پڑتا تھا جس سے وہ خار کھاتی تھیں، لیکن اچھی بات یہ تھی کہ صحن کافی بڑا تھا۔

امی نماز فجر کے بعد اطمینان سے وہاں چہل قدمی کر سکتی تھیں۔ یہ ان کی بہت بڑی روٹین تھی۔ نماز کے بعد باسی روٹیوں کے ٹکڑے قینچی سے کاٹ کاٹ کر چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر چڑیوں کو ڈالتی جاتی تھیں اور ساتھ

ساتھ اسم الہی کا ورد بھی کرتی رہتی تھیں۔

ان کاموں سے فراغت کے بعد وہ چائے چولھے پر رکھ دیتیں۔ نہینا سب سے پہلے گھر سے نکلتی تھی اور اکثر زری اطمینان سے ڈٹ کر ناشتا کرنے کی عادی تھیں۔

انہوں نے معمول کے مطابق سب کام انجام دیے۔ چڑیوں کو روٹیاں ڈال کر انہوں نے چائے بنائی پھر دوبارہ بیٹیوں کے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ زری کا بیڈ مخاف سے ڈھکا ہوا تھا جس کا مطلب تھا وہ سو رہی تھی جبکہ نہینا نظر نہیں آئی تھی۔ وہ یقیناً "باتھ روم" میں تھی۔ امی دوبارہ لاؤنج میں آکر بیٹھ گئیں۔

"امی میں جا رہی ہوں۔ اللہ حافظ۔" نہینا کمرے سے نکلتے ہوئے بولی تھی۔ امی نے اسے دیکھا۔ وہ اسے اطمینان سے اپنے پاس بٹھا کر اپنا موقف سمجھانا چاہتی تھیں کہ وہ سلیم کے ساتھ اتنا بے تکلف مت ہوا کرے۔ اس کے ابا کو یہ سب پسند نہیں ہے۔ وہ مناسب الفاظ ہی منتخب کر رہی تھیں۔ جوان اولاد سے بات کرتے ہوئے بھی سو قسم کی احتیاطیں درکار ہوتی ہیں سو قسم کے پیر پھیر کر کے انہیں باتیں سمجھانی پڑتی ہیں، لیکن نہینا کا بچھا ہوا چہرہ اور متورم سرخ آنکھیں دیکھ کر امی کے دل کو کچھ ہوا۔ نہینا بد مزاج چڑچڑی تھی۔ منہ پھٹ بھی تھی، لیکن ایک بات وہ حلفیہ کہہ سکتی تھیں ان کی بیٹی کی ریزاری کی بہت اچھی تھی۔ اسکول کالج تک لڑکوں کے ساتھ بڑھی گئی اور مجال ہے اس نے کبھی انہیں شکایت کا موقع دیا ہو۔ ایک سلیم ہی تو تھا جس سے وہ ذرا ہنس کر بات کر سکتی تھی ورنہ باقی سارے زمانے کو تو کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی اور انہیں یقین تھا کہ سلیم کے ساتھ اس کی صرف کزن کی حیثیت سے بے تکلفی تھی۔ ان کے شوہر کا ذہن جس بچ پر سرچ رہے تھے اس سے وہ اتفاق نہیں کرتی تھیں۔

انہیں اس کے اپنی خالہ کے گھر جانے یا سلیم کے ساتھ بے تکلفی پر بھی اعتراض نہیں تھا، لیکن ان کے دل میں شوہر کا بھی اس قدر احترام اور عزت تھی کہ وہ ان کی بات سے انکار نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ کام تو زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اور اپنی طرف سے انہیں شکایت کا موقع بھی کبھی نہیں دیا تھا انہوں نے۔ اگر انہیں اس بات پر اعتراض تھا کہ نہینا اور سلیم کے درمیان ضرورت سے زیادہ بے تکلفی ہے تو پھر امی کو بھی اعتراض تھا۔ حالانکہ انہوں نے اشاروں میں صرف ابھی اس بات کی نشاندہی کی تھی، لیکن امی چاہتی تھیں کہ ان کے شوہر کو

مزید کسی شکایت کا موقع نہ ملے اسی لیے انہوں نے رات کو نہینا کو ٹوکا تھا، لیکن اب اس کی حالت دیکھ کر انہیں بہت افسوس ہوا۔ اولاد کتنی ہی بد مزاج یا منہ پھٹ کیوں نہ ہو ماں کی محبت کو نہیں دبا سکتی۔ اولاد کی ذرا سی بے چینی ماں کو بھی بے چین کر دیتی ہے۔ نہینا کا بے چین انداز دیکھ کر امی کو دل ہی دل میں افسوس ہو رہا تھا کہ وہ شاید ان کے ڈانٹنے کی وجہ سے اتنی اپ سیٹ نظر آتی ہے۔

"نہینا! چائے بنی ہوئی ہے۔ پی کر جاؤ۔" انہوں نے رات والی ساری ناراضی بھلا کر اسے پکارا۔ نہینا جاگرز کے تسمے باندھ رہی تھی۔

"امی دل نہیں چاہ رہا۔" اس نے انکار کیا تھا۔ اس کی آواز میں کسمندی تھی۔ امی کو مزید دکھ ہوا۔ اتنا تو کبھی ان کی بات کا برا نہیں منایا تھا اس نے۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے رات بھر روتی رہی ہے۔

"آدھا کپ ہی پی لو۔ خالی پیٹ مت رہا کرو۔ اتنے لمبے دن ہیں آج کل کے۔ کچھ کھا کر نہیں جاتی۔ پتا نہیں یونیورسٹی میں کبھی کبھی کھاتی ہو کہ نہیں۔ واپس بھی چار بجے ہوتی ہے۔ کچھ تو کھا جایا کرو۔" امی نے محبت سے چور کبچے میں کہا۔ وہ خاموشی سے سیڑھیوں سے ملحقہ دیوار پر لگے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر ڈیٹا سیٹ کر رہی تھی۔ امی کو ایک بار پھر افسوس ہوا۔ اتنی سادہ اور لاپرواہی بیٹی تھی ان کی۔ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی مگر انہوں نے اسے

کبھی دوسری لڑکیوں کی طرح سجتے سنورتے نہیں دیکھا تھا۔ یونیورسٹی میں ایڈمیشن کے وقت سفید ٹراؤزرز کے ساتھ درجن بھر مختلف پرنٹس کی کالر والی جو شرتس سلوائی تھیں وہی بدل بدل کر پہنتی رہتی۔ ڈوپٹے بھی سفید ہی لے لیتی تھی اور وہ بھی مرضی تھی۔ کبھی سر پر ڈال لیتی کبھی کندھے پر نکا کر نکل جاتی۔ کبھی رسی بنا کر گردن میں لٹکالیتی اور کبھی کبھی اسکارف بھی لے لیتی تھی۔

امی کو بس اس کا رویا رویا چہرہ دیکھ کر افسوس ہوئے چلا جا رہا تھا۔ اس کی ساری پڑمردگی اور کسلمندی انہیں اپنی ڈانٹ کا شاخسانہ لگ رہی تھی۔ وہ پہلے بھی اسے اس کی بد مزاجی اور بد زبانی پر ٹوکتی ڈانٹتی رہتی تھیں اور ان کی ڈانٹ کے جواب میں وہ پہلے کبھی روئی تو نہیں تھی۔ وہ اگر روئی ہوئی نالگ رہی ہوتی تو انہیں بھی اس قدر افسوس نا ہو رہا ہوتا۔ امی اپنی جگہ سے اٹھیں اور دم پر رکھی چائے میں سے اس کے لیے ایک پیالی نکال کر ساتھ ہسکٹس بھی رکھ لائیں کہ شاید سامنے رکھ دیں تو وہ کھالے۔

”امی واقعی دل نہیں چاہ رہا۔“ اس نے انہیں چائے لاتا دیکھ کر کہا۔

”میری خاطر تھوڑا سا کھا لو خالی پیٹ گھر سے نکلتی ہو تو میرے دل کو کچھ ہوتا ہے۔“ انہوں نے محبت بھرے لہجے میں تاکید کی۔

”اللہ خیر۔ آج تو بہت مہربان ہو رہی ہیں آپ۔ دیکھوں ذرا سورج کس طرف سے نکلا ہے۔“ اس نے بلاوجہ کھڑکی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ چہرے کے تاثرات ابھی بھی پہلے جیسے افسردہ تھے ان میں خوشگواریت کی کوئی جھلک ڈھونڈنے سے بھی نظر نہیں آتی تھی۔

”ماں اولاد کے لیے ہمیشہ ہی مہربان ہوتی ہے۔ تم یہ بات وقت آنے پر سمجھو گی۔“ وہ دوبارہ سے صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔ نہننانے کچھ نہیں کہا۔ امی کن انکھیوں سے بار بار اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”یہ وہی بادام کے بسکٹ ہیں جو تمہیں بہت پسند آئے تھے۔ اسی لیے تمہارے ابا سے دوبارہ منگوائے ہیں میں نے۔“ امی نے اسے للچانے کی کوشش کی۔ گزشتہ بار جب یہ بسکٹ آئے تھے تو سب سے زیادہ اس نے ہی کھائے تھے نہننانے انکار میں سر ہلایا۔

”امی بھوک نہیں ہے۔“ وہ لاچار سے بولی۔ چہرے کی طرح لہجہ بھی الجھا ہوا تھا لیکن امی کے اصرار پر صوفے پر میز کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔

”بھوک ہوگی بھی کیسے۔ تمہارے معدے کی عادت ہی نہیں رہی وقت پر کھانے کی۔ ناشتانا کرنے کی عادت اور خالی پیٹ چائے پی پی کر معدہ جلا لیا ہے تم نے اپنا۔ اور پھر یہ جو سارا دن چپس اور الم غلم کھاتی رہتی ہو۔ یہ ٹھیک نہیں ہے نہننا۔ جوان بچی ہو۔ بھوک نالگنے کا تو کوئی جواز نہیں بنتا۔ اس عمر میں دوپراٹھے اور اتنا برا سا آلیٹ کھایا کرتی تھی میں ناشتے میں۔“ اس کے آگے ہسکٹس والی پلیٹ کرتے ہوئے وہ ٹوکتے ہوئے مسکرائیں تھیں۔

”اس کا مطلب زری بالکل آپ جیسی ہے۔“ نہننا سادہ سے لہجے میں بولی تھی۔ زری کو ڈٹ کر ناشتانا کرنے کی عادی تھی۔ امی نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ مسکراہٹ ان کے چہرے سے یکدم غائب ہوئی۔

”ہاں۔ شاید۔“ انہوں نے تصدیق کی تھی لیکن تردید کے انداز میں نہننانے بادام والا ایک بسکٹ اٹھا ہی لیا تھا۔



”رانی یہ والا بیڈ کور اتار کر یہ گرین اور زرد پھولوں والا بچھا دو۔“ اس نے بیڈ کور نکال کر رانی کو پکڑاتے ہوئے کہا تھا۔ رانی نے سر ہلا کر بیڈ کور پکڑ لیا تھا۔ شہرین کی طبیعت کیا ٹھیک ہوئی تھی سارے گھر میں تھر تھلی سی مچ گئی تھی۔

اس نے آج سارے گھر کی صفائی اپنی نگرانی میں کروائی تھی پھر ماں رضیہ کے ساتھ مل کر کھانا بھی بنایا تھا۔ اس نے ہاتھوں سے سمج کے لیے رس ملائی بنائی تھی اور اب وہ یہ سوچ سوچ کر خوش تھی کہ یہ سب دیکھ کر سمج کتنا خوش ہوگا۔ آج اس نے کسی قسم کی منفی سوچ کو قریب پھٹکنے بھی نہیں دیا تھا۔ ڈاکٹر بشری کی ہدایت کے مطابق وہ اپنے معمولات تبدیل کرنے کی حتی الامکان کوشش کر رہی تھی۔ رانی آرام سے سرہانے کا کورا اتارتی ہوئی اس کے انداز و اطوار ملاحظہ کر رہی تھی۔

”ارے تم نے ابھی تک کور ہی تبدیل نہیں کیا۔ لاؤ مجھے دو۔ میں کرتی ہوں۔ تم ذرا بھاگ کر لان میں جاؤ اور جتنے بھی سرخ گلاب ہیں تاسب توڑ لاؤ۔“ اس نے اگلا حکم صادر کیا۔ شہرین کے ہاتھ کافی پھرتی سے چل رہے تھے۔

”میں یہ بدل کر چلی جاتی ہوں باجی۔ ابھی ایک منٹ میں۔“ رانی نے جلدی جلدی ہاتھ چلانے شروع کیے تھے۔ شہرین نے اس دوران میں دو سرے سرہانے کا کورا اتار کر نیا چڑھانا شروع کر دیا تھا۔ رانی کے کور چڑھانے تک وہ بیڈ پر چادر ڈال کر بچھانے لگی تھی۔

”باجی! آپ رہنے دیں میں کسکتی ہوں۔ سمج بھائی کو ہتھیلے گا تو وہ بہت ناراض ہوں گے۔ غصہ کریں گے۔“ رانی نے اس کے ہاتھ سے چادر پکڑنی چاہی تھی۔ اماں رضیہ کے حکم کے مطابق اب وہ مالکوں کے لیے باجی اور بھائی کے القابات استعمال کرنے لگی تھی۔ وہ شہرین کے سامنے کافی مستند نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے حیرانی بھی ہو رہی تھی کہ باجی شہرین حاملہ ہونے کے بعد اتنی پھرتی کیسے ہو گئی تھیں۔ کہاں وہ سارا دن اپنے کمرے میں سر پکڑ کر بیٹھی رہتی تھیں اور کہاں صبح سے سارے گھر میں تکی بنی اڑتی پھر رہی تھیں۔ اس نے حکم کے مطابق تیزی سے ہاتھ چلانے شروع کیے تھے۔

اس نے اگر اس دن ماں رضیہ اور شہرین کی باتیں سنی ہوتیں تو اسے کوئی پروانا ہوتی لیکن اب وہ جانتی تھی کہ گھر کی مالکن جلد ہی گھر میں ننھے مہمان کا اضافہ کرنے والی ہے تو وہ اس کا خیال رکھنے کی بھی زیادہ کوشش کر رہی تھی۔ اسے پتا کچھ بھی نہیں تھا۔ نو عمر سی لڑکی تھی لیکن فلمیں ڈرامے دیکھ دیکھ کر کافی کچھ سیکھ چکی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ان دنوں مالکن کا خیال رکھے گی تو وہ خوش ہو کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دے گی اور ہو سکتا ہے ریشمی ستاروں والا سوٹ بھی دیوا دے۔ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ جو خبر اس نے دروازے کی اوٹ سے سنی تھی اس میں ذرا سی بھی صداقت نہیں تھی۔

”سمج تم لوگوں پر غصہ کرتا ہے؟“ شوہر کے ذکر پر شہرین کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی تھی۔

”نہیں جی زیادہ نہیں۔ بس وہ ایسے ہی۔“ رانی کو سمجھ نہیں آیا کہ مزید کیا کہے۔ مالکن باجی اپنے میاں کو شکایت بھی کر سکتی تھی۔

”ڈرو مت۔ میں تمہاری شکایت نہیں کروں گی سمج سے۔“ شہرین نے اسے تسلی دی تھی پھر اسے بیڈ پر چادر ٹھیک سے بچھاتا دیکھ کر وہ مطمئن ہو کر وارڈ روم کی سمت برہ گئی تھی۔ اب اسے اچھا سا لباس نکال کر تیار ہونا تھا۔

”نہیں باجی جی۔ شکایت والی بات تو نہیں ہے جی۔“ رانی نے ہتھیلیوں کی مدد سے چادر کی شکنیں دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ دل ہی دل میں تمہید باندھ رہی تھی کہ کس طرح مالکن کو رضامند کر لے کہ وہ بیٹے کی ماں بن کر اسے ستاروں والا ریشمی سوٹ ضرور دے گی۔ چھوٹی عمر تھی اور چھوٹی چھوٹی ہی خوشیاں تھیں۔

”چھی بات ہے۔ چلو اب جاؤ جلدی سے پھول لے کر آؤ پھر میں نے کپڑے بھی آرن کروانے ہیں۔“ وہ وارڈ

روپ میں منہ دیے ڈریس منتخب کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

”جی باجی جاتی ہوں۔“ اس نے میلے بیڈ کور کا گولہ سا ہنا کر ہاتھ میں پکڑا پھر مڑی تو نظر وارڈروب پر پڑی۔ ایک سے ایک بڑھیا سلا ہوا ریڈی میڈ سوٹ ہینگ کیا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسے بڑا اچھا لگا۔ یہ کسی بھی بڑے گھر میں کام کرنے کا اس کا پہلا تجربہ تھا۔ اسے بہت سی چیزیں نئی نئی سی لگتی تھیں۔ کچن کینٹنس میں پڑی گروسی، فریق میں موجود تازہ پھل، ڈائمنگ ہال میں سجے چمکتے نئی نئی طرز کے برتن۔ ہاتھ روم کے ٹائلز، شلف پر بڑے بڑے سب سے پو لوشن جو اس نے صرف لی وی میں دیکھ رکھے تھے۔ اب وہ تا صرف انہیں ہاتھ میں پکڑ سکتی تھی بلکہ نظر بچا کر استعمال بھی کر سکتی تھی۔ دل بھانے کی کیا کیا چیزیں تھیں جو اسے ہمہ وقت اس کے حواسوں پر سوار رہتی تھیں۔ وہ چند لمحے اسی طرح ان کپڑوں کی جانب دیکھتی رہی۔

”باجی۔ جب آپ مولیٰ ہو جائیں گی تو یہ کپڑے کس کو دیں گی۔“ اس نے بے ساختہ ہی پوچھ لیا۔ شہرین نے مڑ کر حیرانی سے اسے دیکھا۔

”نہیں بھئی۔ میرا موٹے موٹے ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ وہ ناک چڑھا کر بولی تھی۔

”پر باجی جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو سب عورتیں مولیٰ ہو جاتی ہے۔ پھر تو کپڑے تنگ ہو جاتے ہیں نا۔“ رانی معصومیت بھرے لہجے میں بولی تھی۔ شہرین کے چہرے پر اب کی بار تا صرف حیرانی بلکہ ناپسندیدگی بھی تھی۔

”کہاں ہے بچہ۔ کیا الٹی سیدھی باتیں کرتی رہتی ہو۔“ شہرین چڑ کر بولی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ رانی نے اس کی اور اماں رضیہ کی باتیں سنی ہوں گی۔ رانی سہم سی گئی۔

”جاؤ جا کر پھول لے کر آؤ۔“ وہ اسے ڈپٹ کر بولی۔ اسے رانی کا یہ سوال اچھا نہیں لگا تھا اور رانی ہاتھ میں بیڈ کور پکڑے کمرے سے باہر جاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”فلموں میں تو ایسی باتیں سن کر ہیروئینیں تو خوش ہوتی ہیں۔ یہ ہماری ماں لکن اس بات پر بھی غصے میں آگئی ہے۔“



اس روز سر شام ہی آسمان کو بادلوں نے گھیر لیا تھا۔ برسات کے دن تھے اس لیے بادلوں کا آنا جانا اور آنے جانے کے اس سفر کے درمیان میں دل کھول کر یا ترس کر برسا آج کل معمول کی بات لگتی تھی۔ کاشف نے کچھ عرصہ پہلے ہی اپنی دکان کو ایک بڑے شوروم میں تبدیل کر لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اب اپنا ایک کشاہ الگ آفس بھی بنالیا ہوا تھا مجید بھائی کے مرنے سے اس کی مستقبل کی منصوبہ بندی کو بڑی ٹھیس پہنچی تھی کیونکہ وہ ان پر کافی انحصار کرنے لگا تھا۔ وہی تو وہ صرف مارکیٹ کی جانچ پڑتال کے لیے جانا چاہ رہے تھے۔ ان کا اصل مقصد بعد میں چین جانا تھا جہاں سے ہوم اپلائنسز امپورٹ کر کے خطیر منافع کمانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ابی الوقت یہ سب معاملات التوا کا شکار تھے لیکن پھر بھی اس کا کاروبار کافی سے زیادہ وسیع ہو چکا تھا اسی وجہ سے اس کے معمولات زندگی بھی تبدیل ہوتے جاتے تھے۔

اس روز وہ شوروم سے ذرا جلدی اٹھ گیا تھا۔ آج کل اس کی روٹین یہی تھی۔ اپنے گھر جانے سے پہلے وہ جیبہ کی طرف جاتا تھا۔ بادل دیکھ کر اس نے سوچا کہ ارادہ ملتوی کر دے لیکن پھر جیبہ کی ناراضی کے متعلق سوچ کر اس نے گاڑی اس کے گھر کی سمت موڑ دی تھی۔ وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ جیبہ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر اور اس کو دیکھ کر جیبہ کے چہرے پر مسکراہٹ خود بخود چمکنے لگتی تھی۔

”کیا ہو رہا تھا سیٹھ صاحب۔“ ایک دوسرے کے قریب صوفے پر بیٹھ چکنے کے بعد اس نے سوال کیا تھا۔

”جناب کا انتظار ہو رہا تھا کہ آپ آئیں تو ہمارے آئے۔“ وہ اٹھلا کر بولی تھی۔ کاشف کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ صوفیہ کو ایسی دل بھانے والی باتیں کرنی نہیں آتی تھیں اور جیبہ ایسی باتیں کرنے سے چوکتی نہیں تھی۔ وہ صوفیہ کی پشت کا سہارا لے کر زرارہ لیکس ہوا تھا۔

”میں آج جلدی چلا جاؤں گا۔ بادل کافی گہرے ہیں۔ ہلکی بارش ہو رہی ہے لیکن مجھے لگتا ہے آج بادل جی بھر کر برسنے والے ہیں پھر ڈرائیو کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے آج ”ہمارا“ اپنے گھر جا رہی ہے۔“ وہ بات مکمل کر کے خود ہی ہنسا تھا۔

”یہ غلط ہے۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ کاشف کے چہرے پر ذمہ داری سے مسکراہٹ بکھری۔

”کیوں سیٹھ صاحب۔ میرا اپنے گھر جانا غلط کیسے ہو گیا؟۔ کیا میں اپنے گھر جانا چاہوں؟“ وہ اسی انداز میں سوال کر رہا تھا۔

”میں گھر جانے کی بات کو غلط نہیں کہہ رہی ہوں بلکہ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ ٹھیک کنکلی تمہارا جملہ غلط ہے کہ ہمارا اپنے گھر جا رہی ہے۔ یوں کہو کہ ”ہمارا“ اپنے گھر جا رہا ہے۔“ وہ تصحیح کر رہی تھی۔ کاشف نے سر ہلایا۔

”اوکے۔ ہمارا آج اپنے گھر جا رہا ہے۔ اب خوش ہو؟“

”کاشف نار جس کے احباب میں شامل ہو گا۔ وہ خوش کیوں نا ہو گا جناب۔“

”اس عزت افزائی پر میں شکر گزار ہوں سیٹھ صاحب۔“

”عزت افزائی کا شکریہ ہی ادا کرنا ہے تو کھانا کھا کر جاؤ نا۔ یہ تو کوئی طریقہ نا ہوا۔“ وہ پھر اسی ناز و ادا کو لہجے میں سمو کر بولی جو اس کا خاصہ تھا۔ کاشف نے کچھ دیر سوچا۔ جیبہ کو انکار کرنا آسان نہیں تھا۔

”آج نہیں۔ صوفیہ انتظار کر رہی ہوگی۔“ اس نے پھر ہمانہ بنانا چاہا۔ اس کے انکار کرنے پر جب جیبہ اصرار کرتی تھی تو اس کو بڑا اچھا لگتا تھا۔

”میں صرف انتظار ہی نہیں کر رہی۔ صبر بھی کر رہی ہوں۔“ اس کے جملے میں ایک اسرار تھا اور یہ اسرار صرف کاشف ہی سمجھ سکتا تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”میں اسی لیے تو آپ کی دل سے قدر کرتا ہوں سیٹھ صاحب کہ آپ بہت صبر والی خاتون ہیں۔“ وہ اس کے ملائم ہاتھ کو نرمی سے سہلا رہا تھا۔ جیبہ کے گھر میں ملازم تو تھے لیکن کاشف کی موجودگی میں کسی کو ڈسٹرب کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ سب کو پھیلی جانب بنے کو ارنڈز میں بھیج دیا کرتی تھی حتیٰ کہ چوکیدار کو بھی گیٹ سے ہٹ کر اپنے کیمپ میں بیٹھے رہنے کا حکم صادر کر دیا کرتی تھی۔

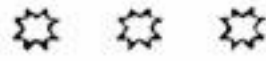
”تم صوفیہ کو میرے بارے میں کب بتاؤ گے؟“ اس نے کاشف کے لہجے کو نظر انداز کر کے سوال کیا تھا۔ اس کی عدت ختم ہوئی تھی یا ابھی کچھ ایام باقی تھے اسے کچھ خبر نا تھی لیکن یہ بات حتمی تھی کہ اس کی شرم کب کی ختم ہو چکی تھی۔ اس کے اور کاشف کے درمیان تعلقات بہت پہلے سے استوار ہو چکے تھے۔

”وہ پہلے سے ہی تمہارے بارے میں جانتی ہے۔“ کاشف جو آج جلدی اٹھنے کے ارادے سے آیا تھا اب جیبہ کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا تھا۔

”کیا...؟ کیا جانتی ہے وہ میرے بارے میں؟“ جیبہ اس کی پیش قدمی کو خاطر میں نالائے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”یہی کہ کاشف جیبہ پر مرتا ہے۔“ ہاتھ اب چہرے کی جانب آچکے تھے۔

”تو پھر آج اسے یہ بھی بتاؤ نا کہ صرف کاشف ہی نہیں مرتا جیبہ پر۔ جیبہ بھی مرتی ہے کاشف پر۔ اور کاشف کی خاطر کسی کو بھی مار سکتی ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ذمہ داری سے انداز میں بولی تھی۔ کاشف نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ بارش تیز ہونے لگی تھی اور خون کی روانی بھی۔



”تم نے حبیبہ کو ٹیلی فون تو کر دیا تھا نا؟“ بی بی جان نے سفید دوپٹے کا آپٹل سر بردر دست کرتے ہوئے اس سے سوال کیا تھا۔ وہ زمین کو گود میں لیے گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ کاشف نے گھر کے لیے ڈرائیور رکھ دیا تھا۔ وہ دونوں ساس بہو اب کہیں آنے جانے کے لیے اس کی محتاج نہیں رہی تھیں۔ وہ دونوں ساس بہو حبیبہ سے ملنے اور اسے گھر کھانے کی دعوت پر مدعو کرنے جا رہی تھیں۔ صوفیہ نے ان کی بات کا جواب دینے کی بجائے آسمان کی جانب دیکھا۔ بادل کافی گہرے ہو رہے تھے۔ بارش کے کافی امکانات نظر آرہے تھے۔ اس نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد زمین کو کیری کاٹ میں لٹا دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں دعائیں پڑھ کر اب اس پر پھونک رہی تھی۔ عام ماؤں کی طرح اسے بھی بہت خدشہ رہتا تھا کہ زمین کو نظر نا لگ جائے سو وہ کسی سے بھی ملتے وقت یا کہیں آتے جاتے وقت زمین پر دعائیں پڑھ کر پھونکتی رہتی تھی۔ بی بی جان بھی اس کو اس ایکٹوٹی میں مصروف دیکھ کر چپ ہو گئیں۔

”ٹیلی فون کرتی رہی لیکن اس نے اٹھایا ہی نہیں۔ ہمارا نمبر دیکھ کر وہ فون اٹھاتی کب ہے۔“ صوفیہ نے اپنا کام مکمل کر کے طنزیہ انداز میں کہا تھا۔ بی بی جان نے گہری سانس بھری لیکن بد مزگی کے خیال سے ملاحت بھرے لہجے میں بولیں۔

”ارے نہیں بیٹی۔ اس کی عدت ختم ہوئی ہے نا۔ شاید کہیں ملنے ملانے چلی گئی ہوں گی۔ اتنے دنوں سے گھر میں محصور تھیں۔ ہوا خوری کے لیے نکل گئی ہوں گی۔ ہمارے خاندان میں تو عدت کے بعد بھائی بھانج اپنے یہاں لے جاتے ہیں اور پھر کچھ دن بہت اہتمام سے مسمان بنا کر رکھتے ہیں۔ کیا پتا ان کے یہاں بھی ایسا ہی رواج ہو۔“

صوفیہ چپ رہی ڈرائیور اور دوسرے ملازمین کے سامنے وہ عموماً ”بی بی جان سے بحث سے احتراز برتی تھی۔ گاڑی فرمائے بھرتی ڈیفنس کی جانب رواں دواں تھیں۔ اس دوران بارش بھی برسنے لگی تھی۔ زمین کاٹ میں لیٹی سو گئی تھی۔ صوفیہ بھی خاموشی سے گاڑی کے شیشے سے برستی بارش کو دیکھنے لگی۔ بارش کی رفتار زیادہ نہیں تھی اس لیے شیشے ابھی دھندلائے نہیں تھے۔ صوفیہ کو باہر دیکھتے ہوئے یکدم احساس ہوا جیسے کاشف کی سیاہ سوک پاس سے گزری ہے۔ وہ دوریہ سڑک تھی۔ ایک سیاہ رنگ کی گاڑی فرمائے بھرتی ان کے قریب سے گزر کر متضاد سمت میں چلی گئی تھی۔

بی بی جان دل کی مریضہ تھیں اس لیے ڈرائیور کو دست رفتاری کی خاص تاکید کی جاتی تھی۔ صوفیہ نے ذرا سا آگے ہو کر گردن موڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے اس سیاہ گاڑی کو کھونچنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ اس گاڑی کی رفتار کافی زیادہ تھی وہ منٹوں میں غائب ہو گئی تھی۔ صوفیہ کو یقین سا ہوا کہ وہ گاڑی کاشف ہی کی تھی۔ اس نے کچھ عرصہ پہلے ہی نئی گاڑی نکلوائی تھی۔ اسے ایسے بہت شوق تھے اچھی گاڑی اچھا لباس، اچھی گھڑی۔ وہ دنیا کے سامنے اپنا اسٹیٹس بڑھا چڑھا کر ظاہر کرنے کا شوقین تھا۔

”ارے بی بی جان! یہ کاشف تھے نا؟“ اس نے ان سے پوچھا۔

”ہیں۔ وہ اس وقت اس سڑک پر کہاں ہوں گے بیٹی۔“ بی بی جان نے آنکھوں پر لگا چشمہ درست کرتے ہوئے کہا۔ انہوں نے مڑ کر عقب میں دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ صوفیہ کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ صوفیہ بھی خاموش ہو گئی۔ گاڑی حبیبہ کے گھر کی جانب بڑھ رہی تھی۔



”کیا ہوا ہے؟“ وہ وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے آگے ہوا تھا جب کسی نے پوچھا۔ باجی عذرا کاؤنٹر پر کھڑی اسے دیکھتے ہوئے سوال کر رہی تھیں۔

”یہ ساتھ والی گلی میں جو حسین صاحب رہتے ہیں ان کے بیٹے کا عقیقہ ہوا ہے۔“ اس نے بنا مسکرائے لیکن اپنے مخصوص بذلہ سنیچ انداز میں کہا تھا۔ وہ آج بہت اداس تھا۔ کسی بھی گاہک کے ساتھ کام کے علاوہ اس نے کوئی بات ہی نہیں کی تھی۔ عذرا باجی مسکرائیں۔

”ساتھ والی گلی کی باتیں مت کرو۔ وہاں تو پرسوں پولیس بھی آئی ہوئی تھی۔ سنا ہے کسی کے گھر سے ہیروئن پکڑی گئی ہے۔“ وہ اپنی طرف سے بہت بڑی خبر دے رہی تھیں۔

”ہیروئن پکڑی گئی ہے۔؟“ سلیم نے مصنوعی تحیر سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے دہرایا پھر رازداری سے استفہامیہ انداز میں بولا۔

”کون سی ہیروئن۔؟ رہنمایا میرا۔ ریشم یا صائمہ۔؟“ صائمہ باجی نے قہقہہ لگایا۔

”میں ان کی نہیں۔ اس ہیروئن کی بات کر رہی ہوں جو سفید سفید ہوتی ہے۔“ انہوں نے وضاحت کی۔

”ارے تو یہ سب کون سا کالی ہیں۔ سب کی سب سفید سفید ہی ہیں۔“ وہ اسی انداز میں بولا۔

”جو مت۔ میں تمہارا پوچھ رہی تھی کہ تمہیں کیا ہوا ہے؟“ وہ سنجیدہ ہوئی تھیں۔

”مجھے؟“ اس نے استفہامیہ انداز میں پھر دہرایا پھر آنکھیں میٹکا کر انہیں گھور کر بولا۔

”آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔؟“ عذرا باجی کے ساتھ اس کی کافی بے تکلفی تھی۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا بھی تھا۔

”میں بس ایسی ہی۔“ انہوں نے کندھے اچکائے پھر مزید بولیں۔

”دراصل سارے محلے کو صبح سے بے چینی ہے کہ آج سلیم بھائی پریشان ہیں۔“ واصل انڈے ڈبل روٹی لے کر

گیا تو وہ کہہ رہا تھا کہ سلیم بھائی اداس لگتے ہیں آج۔ ابھی دوکان پر آتے ہوئے نسیم صاحبہ جی مل گئیں۔ وہ بھی یہی کہہ

رہی تھیں کہ سلیم کسی بات پر پریشان لگتا ہے۔“ ان کی بات پر سلیم دل میں حیران ہوا۔ کیا سارا محلہ اس کے

چہرے سے اس کے دل کا حال جان سکتا تھا۔ وہ پریشان تو نہیں تھا لیکن دل کو بے چینی سے لاحق تھی اور اداسی بھی

تھی جو مایوسی کے دھندلے پردے میں لپٹی تھی۔ دس بج چکے تھے اور فیضان ابھی تک اپنی بل گم لینے نہیں آئی تھی۔

وہ یونیورسٹی سے چھٹی نہیں گرتی تھی اور پھر اب تو وہ ٹیوشن کے لیے بھی جاتی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ گھر سے

نکلے تاہم وہ اگر گھر سے نکلی تھی تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اس نے سلیم سے بغیر ملے جانا گوارا کر لیا تھا۔

”کیا وہ ناراض ہو گئی تھی؟“ یہ وہ سوال تھا جو سلیم کے حواسوں پر بوری طرح سوار تھا۔ ساری رات وہ ٹھیک

سے سو نہیں پایا تھا۔ اپنی کمپانی کی احساس پہلے بھی اس پر حاوی رہتا تھا لیکن فیضان کے دو ٹوک جواب نے اسے اندر

سے توڑ ہی ڈالا تھا۔ امید اس کی کوئی ہلکی سی کرن بھی اس نے اس کی زندگی میں رہنے نہیں دی تھی۔ وہ واقعی صبح

سے بچھا بچھا سا تھا۔ اس کی دوکان پر آنے والے گاہکوں نے یقیناً اس کی پرمردگی کو واضح طور پر محسوس کیا تھا جس کا

اظہار باجی عذرا بھی کر رہی تھیں۔

”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میں صحیح ہوں۔“ وہ مسکرایا تھا۔ یہ احساس اچھا بھی لگا تھا کہ اس محلے میں اتنی

محبت کرنے والے لوگ موجود تھے۔

”میں نے بھی یہ نہیں کہا جناب کہ آپ غلط ہیں۔ لیکن یہ چہرے پر جو بارہ بجا رکھے ہیں تاہم یقیناً غلط ہیں۔“

ہمیں نہیں پسند ایسا سلیم۔ اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ کیا ہوا ہے۔“ وہ لہجے میں شفقت سمو کر بولیں۔ وہ ان کے

بڑے بیٹے سے چند سال ہی چھوٹا تھا اور شروع سے ہی ان کا رویہ اس کے ساتھ محبت بھرا ہی رہا تھا۔ وہ مسکرایا۔

”آج طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بخار سا ہے۔ سر میں درد محسوس ہو رہا ہے۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکا۔

”ارے تو آج کلیم یا علیم کو کہہ دیتے وہ بیٹھ جاتے دکان پر۔ تم آرام کر لیتے۔“ انہوں نے پریشانی بھرے لہجے میں کہا تھا۔ سلیم نے نسی میں سر ہلایا۔

”وہ دونوں کالج گئے ہوئے ہیں نا۔“ اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ باجی عذرا بولیں۔
”میں تمہارے بھائی سے کہوں۔ ان کی شام کی شفٹ ہے وہ سو کر دیتے ہیں تمہاری۔“
”ارے نہیں عذرا باجی میں ٹھیک ہوں۔ ٹیبلیٹ لی ہے۔ آپ فکر نا کریں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے انہیں تسلی دی تھی۔

”اچھی بات ہے۔ جلدی جلدی ٹھیک ہو جاؤ۔ بالکل اچھے نہیں لگ رہے ایسے سنجیدہ سے مجھے بالکل نہیں قبول یہ والا سلیم۔ سارا محلہ مر جھایا ہوا لگ رہا ہے۔“ وہ منہ بنا کر بولیں۔
”آج تو بڑی روانٹک باتیں کر رہی ہیں آپ۔ مجھے تو سارا محلہ کھلا کھلا سا لگنے لگا ہے۔“ وہ آنکھیں منکاتے ہوئے کاؤنٹر پر ذرا آگے کی جانب ہو کر چڑانے والے انداز میں بولا تھا۔
”شرم کرو بہن سے فکرٹ کرتے ہو۔“ وہ ہنس رہی تھیں۔

”اچھا آپ کریں تو حلال۔ ہم کریں تو حرام۔ ظالم لوگو۔“ وہ بساط بھر کو شش کر رہا تھا کہ وہ اپنی افسردہ کیفیت سے نکل سکے۔

”پلو مجھے وال مونگ دو۔ دھلی ہوئی۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے اپنی مطلوبہ شے بتائی تھی۔
”میں میلی کھیلی چیزیں پختا بھی نہیں ہوں۔ یہاں ہر چیز دھلی دھلائی۔ صاف ستھری۔ چکا چک لاتی ہے۔“ وہ اپنی جون میں پلٹ رہا تھا۔

”اے ہی رہا کرو۔ ہنستے کھیلتے۔ اللہ تمہیں بہت سی خوشیاں دے۔“ وہ ہنستے ہوئے دعا دے کر اور ادائیگی کر کے وال لے کر چلی گئی تھیں۔

”خوشیاں۔۔۔؟“ اس نے گہری سانس بھرتے ہوئے سامنے کی سٹو دیکھا جہاں اس کی خالہ کا گھر تھا۔
”نہینا ناراض ہو گئی ہو کیا؟“ وہی سوال پھر ذہن میں چکرانے لگا تھا۔ وہ افسردگی پھر جو پر چھانے لگی تھی۔ اس نے کاؤنٹر پر صبح سے رکھی بیل گم پر انگلی رکھی تھی۔



”رانی! ایمن کو میرے پاس لے آؤ۔“ شہرین نے ہاتھوں پر روشن ملتے ہوئے با آواز بلند ملازمہ کو پکارتے ہوئے حکم صادر کیا تھا۔ اس کی طبیعت سارا دن ٹھیک رہی تھی۔ سردی کی شکایت ہوئی تھی نا اب کائی آئی تھی۔ اماں رضیہ نے تازہ انار کا جوس نکلا کر اسے پلایا تھا۔ وہ کافی فریش محسوس کر رہی تھی۔ ہلکے سبز رنگ کے لباس میں تکسک سے تیار مناسب جیولری کے ساتھ اب وہ بی بی لاؤنج میں آئی تھی مگر اسے سمجھ آئے تو دروازے پر اس کا استقبال کر سکے اور اپنی ساری کارکردگی اس کے گوش گزار کر سکے۔ وہ کافی خوش اور پر جوش نظر آتی تھی۔ ایمن رانی کے پاس تھی اور گب سے شہرین کو رانی کی آوازیں آرہی تھی۔ وہ ایمن کے ساتھ مسلسل باتیں کرنے میں مصروف تھی۔

شہرین کو اپنے بیڈروم سے باہر دیکھ کر ملازم کافی مستعد ہو رہے تھے۔ شہرین اماں رضیہ سے بہت خوش تھی اور رانی سے بھی بظاہر اسے شکایت نہیں تھی لیکن ایمن کے ساتھ اس کی باتیں سن کر اسے احساس ہو رہا تھا کہ جس

طرح کا انداز گفتگورانی کا ہے اس سے ایمن کی زبان بھی خراب ہوئی اور پھر اس کے دوپہروالے سوال نے بھی شہرین کو ذرا الرٹ کر دیا تھا۔ ایمن کو سنبھالنے کے لیے کوئی سمجھدار لڑکی ہونی چاہیے تھی جبکہ رانی کے ساتھ کافی المجد ہو چکی تھی۔ شہرین کو تو یہ خدشہ بھی تھا کہ ایمن اٹنے سیدھے الفاظ بولنا سیکھ لے گی۔ بولنے لگی تھی اور اس کا کریڈٹ بھی رانی کو جاتا تھا۔ وہی چھوٹے چھوٹے جملے بولتی رہتی تھی جس کی وجہ سے ایمن باتیں کرنا سیکھ رہی تھی۔

شہرین کو آج ایمن کے متعلق نا صرف اپنی ذمہ داریوں کا بلکہ اپنی لاپرواہی کا بھی بہت احساس ہو رہا تھا۔ اس کی بیٹی اس کی طبیعت کی بنا پر بہت اگنور ہوتی رہی تھی۔ اس نے ڈاکٹر بشری کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق اپنے معمولات کو تبدیل کرنے کا سوچا تھا۔ اماں رضیہ بھی تاکید کرتی تھیں اور اسے بھی احساس ہو رہا تھا کہ اس کی طبیعت کی خرابی کا سب سے زیادہ نقصان ایمن کو ہو رہا تھا۔ وہ اس کے کسی کام میں دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ اس کے کھانے پینے سے لے کر صفائی ستھرائی اور کھانے پینے تک کے لیے وہ اماں رضیہ کی محتاج تھی۔

”او ایمن گڑیا آپ کی پاپا جانی بلارہی ہیں۔“ رانی نے فوراً ہی بے بی واکر لاکر اس کے پاس رکھ دی تھی جس میں ایمن مزے سے بیٹھی تھی۔ اس کے کپڑے اور ہاتھ پاؤں صاف شہرے تھے۔ اماں رضیہ بلاشبہ بچی کا خیال ٹھیک سے رکھ رہی تھیں۔

”ایمن۔ بے بی۔ کیسی ہو میری جان۔“ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے گود میں لے لیا تھا۔ ایمن لمحہ بھر کے لیے کسمپاسی پھر اطمینان سے اس کی گود میں کھلنے لگی۔ رانی بغور ما لکن کے اطوار دیکھ رہی تھی۔ شہرین نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور خود ایمن کو گود میں ہی کیے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں ایمن کے وجود کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ بہت دن کے بعد اسے اس طرح گود میں لے کر بیٹھی تھی۔ وہ اپنی ہی بیٹی سے بہت کتراتے تھی اور اس کی وجہ کیا تھی یہ اس نے کبھی سمجھ کو بھی نہیں بتایا تھا۔

ایمن بنی بنائی شہرین تھی۔ بالخصوص اس کی آنکھیں بالکل شہرین جیسی تھیں۔ بہت روشن اور غلانی آنکھیں۔ جو پہلی نظر میں دل موہتی تھیں اور این پر بہت گہری پلکوں کی باڑھ تھی۔ ذرا سانم ہونے پر ہی اس کی آنکھیں پلکوں کی وجہ سے بہت زیادہ بھیگ جاتی تھیں اور ہی شہرین کے ساتھ بھی ہوتا تھا۔ وہ چہرہ دھو کر خشک بھی کر لیتی تھی تو آنکھیں پھر بھی نم ہی رہتی تھیں۔ پانی کی ننھی ننھی بوندیں اسی پلکوں میں پھنس سی جاتی تھیں جس سے وہ بھیگنے کے بعد مزید خوب صورت لگنے لگتی تھیں۔ اس کی کزنز اور مسہلہ ماں اکثر اس کی آنکھوں کے لیے بہت خوب صورت اشعار پڑھا کرتی تھیں اور سمجھ بھی اس کی آنکھوں کے لیے بہت اچھے کھمپلینٹ پاس کرنے کا عادی تھا۔

شہرین نے ایمن کے بھورے بالوں میں انگلیاں نرمی سے چلاتے ہوئے اس کی آنکھوں کے بعد تیکھی مغرور ناک اور پھر ہونٹوں کو بغور دیکھا۔ وہ بالکل شہرین کا عکس تھی۔ اس کا رنگ روپ نقش ہر چیز شہرین سے مشابہ تھی۔ حتیٰ کہ دونوں کے بالوں کا رنگ بھی ایک جیسا بھورا تھا۔ ایمن کے جو دانت نکل آئے تھے اس سے اس کے چہرے کی شہباز مزید شہرین جیسی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی لمبی گردن میں شہرین کی گردن کی مشابہت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ مسکراتی تھی تو دونوں گالوں میں ڈمپل پڑتا تھا۔ اس کی مخروطی ننھی ننھی انگلیاں اور ہتھیلیاں بالکل اپنی ماں کے جیسی لگتی تھیں۔

شہرین نے غیر ارادی طور پر اس کے بال کانوں کے پیچھے اڑتے ہوئے اس کے کانوں کو چھوا تھا۔ اس کے اپنے کان بہت چھوٹے اور نرم سے تھے اور کان کی لو بالکل پتلی سی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ ایمن کے کان بھی اس جیسے ہیں یا نہیں۔ ایمن کے کان بھی اس کے جیسے ہی تھے وہی نرمی وہی ملائمت۔ وہ کچھ دیر بلا وجہ اس کے کان کی

لوپرانگلی پھیرتی رہی۔

”اللہ تمہیں بیٹی دے گا اور وہ بالکل تمہارے جیسی ہوگی۔ دیکھنا بالکل تمہارے جیسی۔ ہو ہو تمہارا عکس۔ یاد رکھنا میری بات۔“ کسی کا کہا ہوا جملہ اس کی یادداشت میں جیسے چنگاری بن کر پھوٹا تھا اور پھر جیسے دھیرے سے ہوا میں دھواں بن کر زائل ہو گیا تھا۔ اذیت اس کے اندر راکھ بن کر اڑی تھی۔ اس کے سر میں درد کا احساس جاگا اور پھر ایسے ہی غائب ہو گیا جیسے پانی کا بلبلہ ہوا میں پھٹ کر غائب ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں نمی چمکنے لگی۔

”رائی! ایمن کو لے جاؤ۔“ اس نے بو جھل دل کے ساتھ رائی کو آواز دی تھی۔ ایمن ماں کے تاثرات سے بے خبر اس کی گود میں کسی شہزادی کی طرح بیٹھی تھی۔



”نینا کتنے بچے آئے گی۔“ زری نے چائے کا پانی چولھے پر رکھنے سے پہلے احتیاطاً ”امی سے پوچھا تھا۔ امی نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ چارج چکے تھے۔

”آئی ہوگی دس منٹ میں۔“ انہوں نے مصروف سے انداز میں جواب دیا۔ وہ اون کے لچھے لیے بیٹھی تھیں جو انہوں نے دروازے پر آنے والی پٹھانی سے خریدے تھے۔ ان پٹھوں کو اب وہ گولے کی شکل میں لپیٹ رہی تھیں۔ انہوں نے آلتی پالتی کی پوزیشن میں بیٹھ کر اس موٹے لچھے کو گھٹنوں میں پھنسا رکھا اور گولہ ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا جس پر وہ تار تار کر کے ساری اون لپیٹتی جاتی تھیں۔

”اس کا موڈ کیسا تھا۔ ناراض تھی؟“ وہ سوچ سوچ کر سوال کر رہی تھی۔ امی نے عینک کے شیشوں سے سوالیہ انداز میں اس کے سوال کو سنا تھا پھر افسوس کرنے والے انداز میں بولیں۔

”کس وقت ناراض نہیں ہوتی وہ اور تم بار بار ایک ہی بات کیوں پوچھتی جا رہی ہو۔ ناشتے کے وقت بھی یہی سوال کیا تھا اب بھی پوچھ رہی ہو۔ تمہارا کیا جھگڑا ہوا ہے اس سے۔“ امی کو ایک بار پھر نینا کا رویا انداز زیاد آیا۔

”میں کب جھگڑے وگڑے کرتی ہوں اس سے۔ اسے ہی عادت ہے یہ سب کرنے کی۔ میں تو اس لیے پوچھ رہی تھی کہ آپ نے ڈانٹا تھا نا اسے۔“ وہ چائے کا پانی چولھے پر رکھ کر دوبارہ ان کے پاس آ بیٹھی تھی۔ نینا اور سلیم کی باتیں سن لینے کے بعد اس نے نینا کے نصلے کو ہی درست قرار دیا تھا۔ سلیم نینا کے لیے قطعاً ”مناسب جوڑ نہیں تھا لیکن اس کا دل چاہ رہا تھا کہ امی کی ٹوہ بھی تولے۔ آخر امی یکدم نینا اور سلیم کی دوستی سے کیوں چڑنے لگی تھیں۔ کیا وہ اس سارے معاملے سے باخبر تھیں۔

”اسے ڈانٹتے کتے ہیں؟ میں تو اسے صرف سمجھانا چاہ رہی تھی کہ یہ روش ترک کر دے۔ اب وہ بچی تھوڑی ہے کہ جب دل چاہے جہاں دل چاہے چلی جائے۔ لڑکیوں کو بہت محتاط ہونا چاہیے۔“ امی گولہ باندھتے ہوئے چڑ کر بولی تھیں۔ بلاوجہ کے سوالات انہیں جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیتے تھے۔ زری نے سر ہلایا اور پھر امی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

”لیکن امی وہ بچپن سے خالہ اور ان کے بیٹوں سے الگ رہی ہے۔ وہ ان کے ساتھ ان کے گھر میں رہی ہے۔ سلیم سلیم کے ساتھ کھیلتی رہی ہے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتی رہی ہے۔“ وہ رک رک کر بولی تھی۔ امی نے اسے گھور کر دیکھا۔

”میں اس بات سے انکار کر رہی ہوں کیا۔ آپا اور ان کے خاندان نے بہت پار دیا ہے نینا کو۔ سلیم ہی نہیں باقی تینوں بھی بہن سمجھتے ہیں نینا کو۔ بہت پیار کرتے ہیں اس سے لیکن یہ بات لوگوں کو نہیں سمجھائی جاسکتی۔ وہ اپنے

حساب سے 'اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔' وہ ہاتھ روک کر ساری توجہ زری کی طرف مبذول کر کے اس کی بات کا جواب دے رہی تھیں کہ جب زری کی بات ہونہنا سے تو وہ ان کے موقف کو اس تک پہنچا سکے۔ زری نے لفظ "ہسن" پر بمشکل اپنے تاثرات کو قابو میں رکھا۔

"لوگوں کی باتیں رہنے دیں۔ لوگ ہمیں کھانے کو نہیں دیتے۔" زری منہ بنا کر بولی۔ امی کو اس کے انداز پر بڑا غصہ آیا۔ ان کی دونوں بیٹیاں بحث مباحثے کی بڑی شوقین تھیں۔

"تمہارا باپ تو دوتا ہے نا۔ ان کی باتیں کر لوں۔" وہ چڑھ کر بولی تھیں۔

"کیا مطلب؟" زری نے حیران ہونے کی بھرپور اداکاری کی کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ شاید ابانے ہی امی کو کہا ہو گا کہ وہ ہنہنا کو ٹوکیں۔

"تمہارے ابا کو نہیں پسند ہنہنا کا سلیم سے زیادہ ملنا جلتا۔ اور اب سوال پر سوال کرتی جاؤ گی یا اس چائے کی خبر بھی لوگی جو چولھے پر انتظار میں سکھانے کو چڑھائی تھی۔" انہوں نے اپنی جانب سے بات ختم کر دی تھی۔ زری کو بھی یاد آیا کہ چولھے پر رکھی تھی۔ وہ کچن تک گئی پھر آنچ دیکھی کر کے وہیں سے بولی۔

"امی یہ بھی تو ہو سکتا ہے نا کہ سلیم اور ہنہنا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہوں۔ میرا مطلب ہے۔" اس نے

جان بوجھ کر بات اور پوری چھوڑ دی۔ اسے ڈر تھا اب امی اس پر برس برس کرے گی لیکن وہ چند لمحے کچھ نہیں بولی

تھیں۔ زری نے کچن سے جھانک کر دیکھا کہ وہ کس گہری سوچ میں گم ہو گئیں لیکن وہ اطمینان سے اون کا گولا

بنانے میں مگن تھیں۔ اس کے دیکھنے پر جیسے ہی انہیں احساس ہوا کہ وہ جواب کی منتظر ہے تو بولیں۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔" زری چپ کی چپ رہ گئی۔ یہی تو ہنہنا نے بھی سلیم سے کہا تھا۔ یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ امی اور ہنہنا کا موقف ایک تھا۔



وہ پانی پینے کے لیے اٹھا تھا۔ رات کو اکثر اسے پاس لگ جا یا کرتی تھی اس لیے وہ گلاس سائیڈ پر رکھ کر سونے کا

عادی تھا۔ اس نے مندی مندی آنکھوں سے گلاس کا کور اٹھایا تھا اور پھر کھونٹ کھونٹ پانی پینے لگا۔ پانی پی کر اس

نے کروٹ لی تھی اور تب ہی اسے احساس ہوا تھا کہ شہرین اپنی جگہ پر نہیں تھی۔ اس نے فوراً "واش روم کی سمت

دیکھا جس کے دروازے کے جھری سے کوئی روشنی آرہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا تھا۔

"شہرین۔ شہرین۔" اس نے بہت آہستگی سے آواز دی تھی لیکن کوئی رد عمل سنائی نہیں دیا تھا۔ وہ بستر سے

اترا اور تب ہی اسے احساس ہوا تھا کہ بالکونی کا دروازہ کھلا تھا اور ساتھ ہی کچھ غیر معمولی ٹپ ٹپ کی آوازیں آرہی

تھیں۔ بارش ہو رہی تھی۔ وہ آہستگی سے چلتا ہوا بالکونی میں آگیا۔ بارش کے ہوتے ہی گرمی کا زور ٹوٹ گیا تھا۔

سمجھ کا استقبال لہلہاتی بل کھاتی ہوئے کہا تھا۔ اسے ہوا کی ملاحت بڑی بھلی لگی۔ مینڈ سے بھری آنکھیں پوری

طرح کھل گئی تھیں۔ وہ شہرین کے ساتھ آکھڑا ہوا۔ اس کے بھورے بال جن میں ہلکا سا کرل تھا، کھلے ہوئے تھے

اور اس کی پشت پر بھرے تھے۔ اس نے بہت زری سے شہادت کی انگلی سے اس کے بالوں کو چھوا جیسے کوئی

موسیقار اپنے طنبورے کو چھوتا ہے۔ شہرین نے چونکے بنا مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔

"سمجھ دیکھو۔ کتنی خوب صورت بارش ہو رہی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

"میرے پاس دیکھنے کے لیے اور خوب صورت چیزیں نہیں ہیں کیا۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ

رہا تھا۔ شہرین اس کا اشارہ سمجھ کر مسکرائی۔

"میری تعریف کر رہے ہو۔ اشاروں اشاروں میں۔ گھما پھرا کر۔" وہ دیکھ سامنے ہی رہی تھی جہاں بارش کا پانی

سڑک کو پوری طرح بھگوچکا تھا اور اب بارش کی مخصوص مہک چاروں طرف پھیلی تھی۔
 ”کوئی اعتراض؟“ سمیع نے سابقہ انداز میں کہا تھا۔ وہ ابھی بھی اس کی لٹوں پر انگلی پھیر رہا تھا۔
 ”نہیں۔ لیکن اتنی تعریف بھی مت کیا کرو۔ کچھ معاملات میں فراخ دلی اچھی نہیں ہوتی۔“ وہ چڑانے والے
 انداز میں بولی۔ سمیع نے مصنوعی خیر چہرے پھیلاتے ہوئے استقبالیہ انداز میں اسے دیکھا۔
 ”شادی کے پہلے سال تم کھل کر میری تعریف کیا کرتے تھے۔ شادی کے چوتھے سال تم اشاروں میں تعریف
 کرنے لگے ہو۔ شادی کے دس سال بعد تم تعریف کرنا چھوڑ دو گے۔ اس لیے اپنے الفاظ بچا بچا کر رکھو۔ مختصر
 تعریف کیا کرو اور کبھی کبھی یہ تاکہ دس سال بعد بھی کام آسکیں۔ میں نہیں چاہتی کہ تم مجھ سے اکتا جاؤ۔“ وہ اپنی
 جانب سے دلیل دے رہی تھی۔ سمیع نے اس کا رخ اپنی جانب موڑا پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے کمرے
 کی جانب لے جاتے ہوئے بولا۔

”ایک بات یاد رکھیں شہین بی بی۔ بلکہ کہیں لکھ کر محفوظ کر لیں۔ سمیع دنیا کے ہر کام سے اکتا سکتا ہے لیکن
 آپ سے نہیں۔“
 ”کیوں۔“ وہ اٹھلا کر بولی۔

”کیوں کہ سمیع کو آپ سے محبت ہے۔“ وہ بھی اسی کے انداز میں بولا تھا۔

”کیوں؟“ اس نے ایک اور سوال کیا۔

”کیوں کہ آپ بہت خوب صورت ہیں۔“ سمیع نے ترنت جواب دیا جیسے کوئی مقابلہ ہو رہا ہو اور وہ اس میں
 ہارنا چاہتا ہو۔

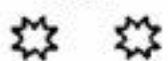
”سمیع! کیا محبت کے لیے خوب صورتی سب سے اہم شرط ہے۔ کیا خوب صورتی ہی محبت کے لیے ضروری
 ہے۔“ شہین کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیں تھیں۔ سمیع نے گہری سانس بھرتے ہوئے برا سامنہ بنایا۔
 ”یعنی تم نے حتمی فیصلہ کر لیا ہے کہ رات کے اس پہر جب اتنی رومانٹک بارش ہو رہی ہے۔ ہوا میں میٹھی سی
 خوشبو بکھری ہے اور تم اتنی خوب صورت لگ رہی ہو۔ لیکن تم اپنے شوہر کو جی بھر کر بور کر دو گی۔ تو کرو گی۔“ وہ
 مصنوعی ناراضی لہجے میں سمو کر بولا تھا۔

شہین مسکرائی تک نہیں۔ سمیع نے اس کے کندھوں پر ہاتھ پر رکھا تھا۔

”محبت میں حساب کتاب جانچ پڑتال کی باتیں بے معنی ہوتی ہیں۔ یہ فلسفہ تھوڑی ہے کہ اس کے وجود اور عدم
 وجود پر مناظرے کیے جائیں۔ اس کو ثابت کرنے کے لیے بنڈال سجائے جائیں۔ محبت طبیعات نہیں ہے۔ یہ
 مابعد الطبیعات ہے۔ انسانی ذہن سے اور کی چیز۔ عقل و دانش سے ماورا۔ علم محبت کے اپنے مکتب اپنی کتابیں
 ہوتی ہیں۔ اس میں کوئی منطق کوئی دلیل کام نہیں آتی۔ یہ اگر ہے تو ہے اور اگر یہ ہے تو اسے ثابت کرنے کے
 لیے دنیا کے کسی قانون، کسی فارمولے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیوں، کیسے، کس لیے، کس طرح حوالی باتیں اس میں
 نہیں ہوتیں۔“

اس میں نا کوئی شق ہوتی ہے نا شرط۔ یہ ایک خود کارا خطراری جذبہ ہے۔ اس لیے اس کے ہونے اور نہ ہونے
 کی بنیادی شرائط پر بحث کرنا صرف وقت کا ضیاع ہیں۔ ”وہ ایک ایک جملے کو بولتے ہوئے اس کی آنکھوں میں بھی
 دیکھ رہا تھا۔ آخری جملے پر اس نے اپنا سر نرمی سے اس کے سر کے ساتھ ٹکرایا تھا۔ شہین کچھ نہیں بولی۔ سمیع
 بعض اوقات اتنی اچھی باتیں کرتا تھا کہ اسے اپنے الفاظ اس کے الفاظ کے سامنے کمتر لگنے لگتے تھے۔“

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)



کے سر پر سید

ہاں بس ایک جو آدمیوں اور دوسرے ہماری والدہ ہی تھیں جنہوں نے کبھی ہمیں ان فضول تک نیم سے نہ پکارا بلکہ ہمیشہ ہمارے پورے نام ہی لیے گئے کیوں کہ بقول ان کے بچوں کے بے معنی اور آدھے ادھورے ناموں سے ان کی شخصیت پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔

خیر جانے دیجئے میں بھی کیا قصہ لے کر بیٹھ گیا۔ ایک جو ٹیلی میں کوئی باقاعدہ قصہ گو تو ہوں نہیں کہ مجھے علم ہوتا کہانی کیسے شروع کرتے ہیں اور کیسے لفظوں کے طومار باندھ کر پڑھنے والوں کو ان کا اسیر کرتے ہیں۔ مجھ پر تو بس اس گود کا اثر ہے جس میں نے پرورش پائی اس لیے تو چند حرف جوڑنے آگئے اور اسی بنا پر آج جی چاہا کہ اپنی داستان حیات دنیا کے سامنے لے کر آؤں۔ جی ہاں۔ اپنا قصہ غم جو میری شادی کے ساتویں روز سے شروع ہوا۔

کیا کہا؟ پہلے چھ دن کی باتیں؟ ارے واہ آپ کو کیا میں اتنا ہی چغد نظر آتا ہوں کہ آپ سے ہر بات شیر کر لوں جتنا بتا رہا ہوں اتنا ہی جیب کر کے جانیں اور خبردار کسی نے مجھے ٹوکنے کی کوشش کی۔ اور ڈیڑھ ٹریڈیٹر یہ جو میں نے چند ایک جملے سیدھے کرنے کی سعی ناکام کی ہے نا اس کی تو آپ نے بالکل تراش خراش نہیں کرنی کیوں کہ مجھے پتا ہے کہ آپ کسی ماہر ٹیلر سے بھی زیادہ مہارت رکھتی ہیں۔ قینچی پھیرنے میں۔ ہاں نہیں تو۔



افس۔ میرا پیارا کمرہ جو میری شریک حیات کے

میں ہوں صمصام عبید موسوی۔
”ارے کیا ہوا؟ چونک گئے۔ ارے نہیں بھئی اب اتنا بھی مشکل نام نہیں کیا نام ہے ان کا وہ اپنے چاچا جی۔ مس۔ تن۔ اوہ ویاد نہیں آ رہا۔ ہاں ان سے تو کم ہی مشکل ہے میرا نام۔“

دراصل بات کچھ یوں ہے کہ بقول راوی ہماری عزیز ازجان والدہ محترمہ اپنے دور جوانی میں خاصی ”ناولز نورز“ میں سے رہی ہیں جس کا اثر یہ ہوا کہ انہوں نے باقاعدہ پورے خاندان کے ساتھ ہنگمے لے لے کے اپنے بچوں کے نام چن چن کر ایسے افسانوی رکھے صرف اس خیال سے کہ دنیا دنگ رہ جائے۔ اب دنیا دنگ رہی یا نہ رہی یہ الگ ایشو ہے ہاں تنک ضرور رہے وہ بھی بے چارے ہم۔ کیوں کہ جو بھی پہلی بار ہمارا نام سنتا وہ ضرور منہ کھول آنکھیں پھیلا کر ہماری طرف دیکھتا۔

”یہ کیا نام ہے بھلا؟ کس نے رکھا تھا؟ مطلب کیا ہوا؟“ اس سے زیادہ اوکھا نام نہیں تھا ملا؟ حد ہو گئی بھی۔

اتنے سوال ہوئے کہ کیا امتحانی پرچے میں ہوتے ہوں گے اور ہم جواب دے دے کہ عاجز پھریوں ہوا کہ زبان کو ممکنہ بل پڑنے سے بچانے کے لیے دنیا نے ہمارے لمبے ترنگے ناموں کو ہی اچھا خاصا کانٹ چھانٹ دیا۔ جیسے میں صمصام عبید سے ”صمی“ ہو گیا۔ ضعیف رضا صاحب صرف ”عمی“ رہ گئے شاندا نہ ”شمی“ اور شازمہ ”شمی“ رہ گئیں دھت تیرے کی یہ دنیا والے بھی

تا۔

اور ر سکون ہو جائیں، مگر ہائے کاش)
 مجھے تو علم ہی نہیں تھا کہ شادی کرنا کوئی آسان کام
 نہیں۔ افس۔ ایسی ایسی بے ہودہ رسمیں ہیں ہمارے
 ہاں کہ بعض اوقات تو مجھے لگا کہ میں کوئی تماشہ کرنے
 والا بندر ہوں مجھ پر ٹکٹ لگی ہوئی ہے اور سارا مجمع
 مجھے دیکھنے کے لیے اکٹھا ہوا ہے (کیا آپ کو بھی اپنی

آنے کے بعد اور زیادہ حسین ہو گیا تھا، مگر آج میں
 پورے دو دن بعد یہاں آیا تھا ایک تو شادی کے دنوں
 کی تھکان اس کے علاوہ چوتھی پانچویں کی فضول
 رسمیں جو ہم لوگوں نے جانے کیوں خود پر لاگو کر رکھی
 ہیں۔ مجھے ان رسموں کی کوئی ضروری وجہ سمجھ نہیں
 آتی، مگر میں حیران ہوں کہ ہم لوگ انہیں اتنی عقیدت
 و محبت کے ساتھ ادا کرتے ہیں جیسے یہ کوئی قومی فریضہ
 ہو (اگر ہم اسی طرح پر خلوص ہو کر نہایت ضروری
 فرائض بھی ادا کرنے لگیں تو ہماری زندگیاں کتنی سہل



کی ناک پر دمک رہی تھی اور اس لمحے مجھے کہیں زیادہ خوب صورت لگی۔

ویسے آپس کی بات ہے یہ صنف نازک میں اتنا کسٹیکس کیوں پایا جاتا ہے اپنی خوب صورتی کے متعلق۔ اللہ تعالیٰ نے مکمل حسن دے رکھا ہوتا ہے، مگر پھر بھی انہیں کمی سی کیوں لگتی ہے۔ اتنے پیارے چہرے پر مختلف ہونق سے رنگ پھیر کر وہ سمجھتی ہیں کہ بہت خوب صورت لگ رہی ہیں؟ شکر ہے اللہ کا اس معاملے میں ہم مرد بہت بے فکر ہیں۔ نہ کلو و کلو میک اپ نہ چارپانچ کلو کی جیولری نہ آٹھ دس کلو کے کپڑے، صرف منہ دھویا، شیو کی یا نہ کی، ہلکے ہلکے صاف ستھرے کپڑے پہنے اور لوجی تیار اور تیار بھی ایسے کہ نظر لگ جانے کی حد تک حسین و خوبو لگنے لگتے ہیں۔ (ماشاء اللہ)

ہمیں اپنی خوبوئی کو اجاگر کرنے کے لیے کسی بھی مصنوعی سہارے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کیوں کہ بھئی ہمیں کوئی احساس کمتری نہیں ہے۔ ہمیں پتا ہے ہم خوب صورت ہیں اور ہم بغیر کسی محنت و کوشش کے دل فریب نظر آتے ہیں (آہم۔ آہم۔)

اوہو! مگر یہ خواتین کو کون سمجھائے؟ اور چلو چھوڑو بھئی ساری خواتین سے مجھے کیا لینا دینا۔ میرا واسطہ صرف اپنی پیاری بیگم سے ہے اور میں اسے تو سمجھا سکتا ہوں اور میں نے یہی تو کیا، میں نے زرنش سے کہا۔

”تمہیں میک اپ کرنے کی ضرورت نہیں ہے تم ایسے ہی بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔“ اور وہ میرے لفظوں پر یک لخت یوں شرمائی کہ اس کا کچی اسٹرابیری سا چہرہ سرخ انار میں بدل گیا۔

”اور دیکھو پلیز آئندہ یہ اٹنے ملنے رنگ اپنے چہرے پر ایلانی مت کرنا، سچ میں خواتین، بہت عجیب لگتی ہیں مجھے اس حلیے میں۔“ اور میرے اگلے لفظوں کا الٹا اثر ہوا اس کا چمکتا چہرہ ایسے ہو گیا جیسے دن میں دسیدوں بار ہمارے کمروں کے انرجی سیور ہو جاتے ہیں۔ یک لخت اس کے نقوش تن سے گئے۔

شادی کے وقت ایسا ہی لگا تھا سچ بتائیے گا۔ لگا تھا نا۔) زرنش کی سہیلیوں اور کزنز نے تو مجھے اچھا خاصا زچ کیا ایسی چلبلی اور شوخ لڑکیاں، کئی ایک کی فضول باتوں پر تو مجھے اتنا غصہ آیا کہ حد نہیں، کئی بار تو بے اختیار جی میں آئی کہ ایک ایک لگا ہی دوں، مگر آہ! یہ مروت یہ رواداری۔ یہ تو اگر میں کوئی شائے، بیبا سا بچہ ہوتا تو ان کے ہاتھوں مزید پٹ جاتا، مگر میں بھی صمصام عبید موسوی ہوں، میں نے بھی ایسے ایسے کرارے جواب دیے کہ دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیے پھر کئی ایک کو میں نے زرنش سے کہتے سنا۔

”ہائے ہائے تمہارا میاں تو بہت ہی گھنا ہے، بے حد چالاک۔ سچ کر رہنا۔ زرنش تمہاری زندگی تو لگتا ہے سختی میں گزرے گی۔ اب مرد اگر حاضر دماغ اور حاضر جواب ہوتا تو عورت بے چاری کو سوال کرنا بھی بھول جاتے ہیں۔ سچ سچ۔ زری اچھا نہیں ہوا تمہارے ساتھ۔“ اور میں دل ہی دل میں مسکراتا رہا۔ یہ سب باتیں میرے حق میں جا رہی تھیں اور یقیناً زرنش پر اثر انداز بھی ہو رہی ہوں گی اور جو میرے لیے ہی فائدہ مند رہیں گی۔ اچھا ہے نا شروع کے دنوں میں اگر شوہر بیوی پر رعب شوب ڈال کر اسے اپنے قابو میں کر لے تو پھر سکون میں رہتا ہے، لیکن اگر وہ اوائل دنوں میں ہی بیوی کے نخروں کے جال میں پھنس جائے تو پھر بے چارا تمام عمر ماہی بے آب کی طرح پھر پھرتا رہتا ہے۔ (کیوں بھائیوں اتفاق کرتے ہونا میرے ساتھ) ویسے بھائی لوگ تو کم ہی پڑھیں گے میری پتا۔ ہاں بہنوں سے معذرت کے ساتھ۔

”کیا بات ہے؟ کیا سوچ رہے ہیں؟“ تو ویسے سے چہرہ تھپتھپاتی زرنش بیڈ کے دوسرے کنارے پر آ بیٹھی، میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے بے شمار میک اپ کر رکھا تھا۔ جھلملاتے کپڑے خوب ساری جیولری اور تب وہ اچھی لگ رہی تھی اور اب دھلا دھلا یا بے داغ خوب صورت چہرہ، صاف شفاف رنگت زیور کے نام پر صرف ایک لونگ جو اس

”کیا مطلب ہے آپ کا! کیا میں سارا میک اپ اٹھا کر باہر پھینک دوں۔ آپ کو پتا ہے کتنا اعلا معیاری برانڈڈ امپورٹڈ میک اپ پر چیز کیا تھا میں نے، میری تو صرف آئی شیڈ اور بلش آن کٹ ہی سات ہزار کی آئی تھی۔“

”کیا؟ سات ہزار۔“ میں لیٹے سے اٹھ بیٹھا اک بجلی کا جھٹکا تھا جو مجھے لگا۔

”جی ہاں پورے سات ہزار اور باقی کی چیزوں کا تو پوچھیے ہی مت، چیدہ چیدہ چیزیں لیتے بھی پچیس تیس ہزار لگ گئے تھے میرا تو بیونی بکس ہی لگ بھگ چالیس ہزار کا بن گیا تھا۔ آپ کی طرف کا بیونی بکس تو اس لیول کا ہی نہیں وہ تو میں نے دیکھتے ہی سوچ لیا تھا کہ یوز نہیں کرنا وہ ادھر ادھر کسی نہ کسی موقعے پر آپ کی بہنوں کو ہی گفٹس دینے کے کام آجائے گا، لیکن دیکھ لیں میں نے آپ سے اس بارے میں کوئی بات کی، کوئی گلہ کیا۔ لڑکی کے بھی سواربان ہوتے ہیں میری بھی خواہش تھی کہ مجھے سسرال کی طرف سے اچھا میک اپ ملے گا۔ اتنا شوق ہے مجھے تو اس کا۔“ وہ تڑتڑ بولے جا رہی تھی اور میں نے اس کا خوب صورت منہ دیکھتے اپنا خشک ہوتا حلق ترکیا اس کی ساری باتوں میں سے صرف ایک بات ہی تسلی بخش لگی تھی۔

”آہ۔ اچھا۔ اب یہ جو تمہارا چالیس ہزار کا برانڈڈ امپورٹڈ میک اپ ہے یہ کم از کم دس سال کے لیے تو کافی ہو گا تمہیں۔“

”کیا۔“ اس نے گویا چیخ ماری۔

”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کیسی عجیب بات کر رہے ہیں، آپ کو تو واقعی کچھ نہیں پتا میک اپ صرف ایک سال تک یوز ابل ہو سکتا ہے اس کے بعد استعمال کرنے کا مطلب اپنی جلد خراب کرنا ہے۔ آپ کیا چاہتے ہیں میں گندہ میک اپ یوز کر کے بیمار پڑ جاؤں ایک طرف کہہ رہے ہیں میک اپ یوز نہ کرنا اور اب چاہ رہے ہیں دس سال تک وہی استعمال کروں۔ افوہ! آپ مرو لوگ بھی نا۔“

اسے یقیناً ”میری بات نے صدمہ پہنچایا تھا اور جو صدمہ مجھے ملا تھا اس کا کیا۔“

”چالیس ہزار کا میک اپ اور صرف ایک سال کے لیے۔ اوہ گاڈ! چلو ایک سال تک تو خیریت رہے گی گزارہ ہو جائے گا، مگر باقی کے سالوں میں کیا بننے والا تھا میرا۔ میں ایک پرائیویٹ ادارے میں محنت کرنے والا ایک عام مزدور نما کیشور۔ جس کی قلیل تنخواہ کا ایک کثیر حصہ یہ بد نما میک اپ ٹیکس کی صورت ہڑپ جایا کرے گا۔ ہر سال چالیس ہزار۔ ارے نہیں بھئی قیمتیں اور منگانی تو روز بھوسے کے ڈھیر کو لگی آگ کی طرح بڑھتے جا رہے ہیں ہمارے بڑھائے تک تو یہ فالٹو خرچہ لاکھوں تک پہنچ جائے گا۔ کس پاگل کے پترنے بنایا تھا یہ میک اپ۔ وہ ضرور دنیا کا بد صورت ترین انسان ہو گا کم بخت خود تو مر گیا مصیبت ہمارے لیے گر گیا۔ ضرور کیڑے پڑے ہوں گے اس کی قبر میں۔“

اوسے میری تو آنکھوں کے آگے تر مرے سے ناچ رہے تھے۔ بنتے بگڑتے خاکوں سے خاک سمجھ نہیں آرہی تھی۔ کیا سوچ رہا ہوں میں نے سر پکڑ لیا اور سن ہوتی سماعتوں سے میں نے سنا زوجہ محترمہ فرما رہی تھیں۔

”اچھا بات سنیں۔ میری سب سہیلیاں مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ ہنی مون پہ کب اور کہاں جا رہے ہو؟“

”کیا۔“ اب چیخنے کی باری میری تھی۔ میں نے جھٹکے سے سر اٹھایا وہ اک پل کو سہم سی گئی پھر منہ پھلایے بولی۔

”توبہ ہے آہستہ تو بات کریں، میں نے ایسا بھی کیا پوچھ لیا۔ شادی کے بعد ساری دنیا ہنی مون پر جاتی ہے اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے آپ نے تو ایسے ری ایکٹ کیا جیسے کوئی انوکھی بات کر دی ہو میں نے، سچ ہی تو پوچھ رہی تھیں میری فرینڈز کتنے دن ہو گئے ہماری شادی کو اور ہم نے اس موضوع پر کوئی ڈسکشن ہی نہیں کی۔ ہمیں تو یہ معاملہ بہت پہلے طے کر لینا چاہیے تھا، میں تو اتنی امپریس ہوئی تھی فرینڈز

کے سامنے کہ کیا بتاؤں، اچھا بتائیں تاکہ ماں جائیں گے ہم لوگ؟ آپ نے کچھ تو سوچا ہوگا۔“ وہ بے حد پر استیاق لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”ہک ہاں اگر سوچنے کا پوچھا جائے تو انسان کیا کیا نہیں سوچتا کیا کیا ارادے نہیں باندھتا، مگر کبھی اپنا سوچا اور ارادہ بھی پورا ہوا ہے یا رے بے بسی کے میری آنکھوں میں غضب بھرنے لگا۔ ارے بھئی زرنش کے لیے نہیں اس کی ان بد تمیز سہیلیوں کے لیے جنہوں نے میرے لیے اک نئی مصیبت جگادی تھی۔ کاش وہ چھچھوری لڑکیاں میرے سامنے ہوتیں تو میں ان کے گھونسلہ نما بالوں کو ایک ایک جھٹکا ضرور دیتا۔ آہ مگر کاش۔“

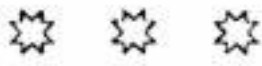
”بات سنو۔ ہنی کچن میں رکھا ہو گا لے آؤ۔ اور کھڑکی کھول لو مون یہیں سے نظر آجائے گا جب ہم ایک ہی چچے سے ہنی کھائیں گے اور مل کر مون دیکھیں گے تو ہمارا ہنی مون یہیں ہو جائے گا۔“ باجوو غصے کے میں نے بے حد ٹھنڈے لہجے میں اس سے کہا اس کا منہ کچھ اور کیا ہوا۔

”بہت پرانا لطیفہ ہے۔ آپ مجھے باتوں سے نہیں بہلا سکتے۔ آخر میری بھی اپنی چار دوستوں میں کوئی عزت ہے، میں نے بھی انہیں ملنا ہے۔ صبح مجھے ضرور بتا دیجیے گا، ہم کہاں جائیں گے۔“ اس نے چادر کھول کر سر تک تان لی تھی۔

”اوہ! دراصل بات یہ ہے تمہیں دوستوں کو منہ دکھانے کی فکر ہے۔ کچھ تو خوف خدا کرو بیوی۔ منہ دکھانے کی فکر صرف اللہ کے لیے کرو۔ بھاڑ میں جھونکو دنیا کو حد ہو گئی آخر یہ آج کل کے لوگوں کی عزت کا معیار ظاہری بھونڈی شوشاہی کیوں بن کر رہ گیا ہے۔ دنیا والوں کو دکھانے جلانے کی تک و دو میں لیے رہتے ہیں دن رات۔ ارے یہ جو دو کاندھوں پر دائیں کاندھے والا اس کے لیے بھی کوئی کام کر لیا کرو ظالمو۔ اور ابھی شادی پر اتنا خرچہ ہو چکا ہے میرا کہ کسی فالتو خرچے کے لیے تو میری جیب بالکل اجازت نہیں دے گی۔ اور اتنی چھٹیاں کر چکا ہوں آفس سے اب بھی

میرا کھڑوس باس کبھی نہ دے گا مجھے چھٹی۔ اور ویسے بھی یہ ہنی مون۔ سنی مون سب پیٹ بھروں کے مشغلے ہیں ہم جیسے لوگوں کا ان مشغلے بازیوں سے کیا واسطہ۔ اس لیے یہ ٹاپک یہیں کہ یہیں کلوز کرو۔ اور آئندہ کے لیے اپنی سہیلیوں کو خبردار کرونا ہماری ذاتیات میں دخل اندازی مت کرس ورنہ میں تمہارا ان سے میل ملاپ بالکل برداشت نہیں کروں گا۔ بند کروں گا تمہارا ان سے ملنا تم اب میری بیوی ہو صرف۔ باقی سب فالتو کے رشتے بھول جاؤ۔ سمجھیں تم۔“ اور آپ کیا سمجھ رہے ہیں یہ ساری باتیں کیا میں زرنش کے ساتھ کر رہا ہوں ارے نہیں بھئی اب اپنی اتنی پیاری من موہنی سی دلہن کا نازک سارل میں یوں بے دردی سے نہیں توڑ سکتا۔ یہ سب باتیں تو میں آپ سے کر رہا ہوں۔ ویسے ایسے لیکچر بھی ضرور پلانے چاہئیں بیوی کو اس سے گرائی نہیں ہوتی۔ مجھے بھی میرے دوستوں نے بتایا تھا مگر کم بخت یہ بتانا بھول گئے کہ جاگتی بیوی کے سامنے یہ سب کیسے کہتے ہیں۔ اب میری بیوی تو سو رہی ہے ناں اور مجھے اس کی پیاری نیند میں خلل ڈالنا گوارا نہیں۔ آخر اتنی اتنی فضول رسموں نے اسے بھی تھکایا ہے ناں۔ اور ہاں یارو تھک تو میں بھی گیا ہوں۔ اچھا اب میں بھی سونے لگا

”گڈ نائٹ“



اور یہ تذکرہ ہے۔ شادی کی آٹھویں صبح کا۔ آفس کا پہلا دن زرنش نے تیاری میں میری بھرپور مدد کی تھی۔ پریس کیے کپڑے، پالش شدہ جوتے، ضرورت کی ہر چیز سامنے موجود، بغیر کسی پریشانی کے یعنی وہ جو ہر صبح ایک ہڑونگ میرے کمرے میں مچتی تھی اب یکسر غائب ”میں تو ہر شے بکھیر کر رکھ دیتا تھا اب ہاتھ کے ہاتھ سب کچھ سمٹتا بھی گیا۔ جو کہ مجھے بے حد اچھا بھی لگا۔ انتہائی پرسکون طریقے سے ڈریس اپ ہو کر میں ناشتے کی ٹیبل پر آیا۔“

”صبح بخیر امی، بابا جان۔“ میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

”جیتے رہو جگ جگ جیو۔ ماشاء اللہ بڑا پار الگ رہا ہے آج تو میرا بیٹا۔“ امی نے پیار بھری نظر میرے چہرے پر ڈالی۔ ان کے پیار کا انداز اب بھی وہی تھا جیسے میں کوئی چھوٹا سا بچہ ہوں۔ میں مسکرا دیا۔ بابا جان نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا۔

”ہاں۔ ٹھیک کہہ رہی ہو۔ آج تو ثانی کی میچنگ بھی بالکل ریفریکٹ ہے ورنہ اس گھونچو نے تو مجھے درست ثانی تک نہیں لگائی تھی۔ اس سے لگ رہا ہے کہ ہماری بہو سلیقہ مند ہے۔“ وہ سر ہلاتے تعریف بھی کر رہے تھے تو میرے بجائے اپنی بہو کی۔ مگر مجھے ان کے الفاظ نے عجیب سی خوشی دی۔ اب میں اور زرنش الگ الگ تو نہیں تھے ناں بھئی۔ اب میرے سارے کریڈٹس اس کے تھے اور اس کی ساری خوبیاں میری۔ ”لو جی۔ آپ نے ایک ثانی کی میچنگ سے ہی فیصلہ کر لیا بہو کی سلیقہ مندی کا۔ بہو کے اصل ہنر تو تب کھلیں گے جب وہ گھر سنبھالے گی۔ ثانی کا کیا ہے تو یہ تو کوئی عقل کا اندھا پکڑ کر باندھ لے۔“ بابا جان کے برعکس امی جس لہجے میں بولی تھیں۔ اس بدلاؤ نے میرے مسکراتے چہرے پر یکدم پریشان کن سنجیدگی کا پوچھا پھیر دیا۔ اس قدر ادنیٰ ذوق رکھنے والی میری پیاری ماں بھی کیا بہو گھر لاتے ہی بدل گئی ہیں۔ کیا وہ بھی وہی روایتی ساس ثابت ہوں گی جن کی وجہ سے گھروں کے گھر بے سکونی کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ یا اللہ! کیا اب مجھے بھی ایسے دن دیکھنا پڑیں گے جو آئے دن آس پاس دوستوں اور کولیگز سے سنتا رہتا ہوں۔

اف! کیا اب میں بھی وہی گیند بن جاؤں گا جسے کبھی ماں اپنے کورٹ میں ڈالنے کی کوشش میں ہلکان ہوتی ہے اور مجھے بیوی۔ اوہ۔ میرے تو بس سر پکڑنے کی کسر رہ گئی تھی کہ تب ہی تروتازہ چہرہ لیے زرنش کمرے سے نکلی۔ ہلکے پھلکے میک اپ میں انتہائی خوب صورت ڈریس پہنے۔ اور اس ڈریس کو کیا کہتے ہیں۔ ٹیل فرائڈ؟ لانگ فرائڈ، آڑی فرائڈ اوہو۔ اللہ جانے کیا اور اس کے کپڑوں کا رنگ۔ ارے بھئی اس وقت تو میرے اپنے چوتھے کارنگ اڑ گیا تھا۔ میں اس

کے کپڑوں کا رنگ کیا پہچانتا۔ ویسے بھی میں کون سا عمیرہ احمد، راحت جبین، سمیرا حمید یا صدف رحمان گیلانی ہوں جو سامنے والے کاسر سے پاؤں تک خاکہ کھینچ دیں۔ سارے لوازمات اور سارے رنگوں سمیت۔

ہائیں۔ کیا کہا۔ صدف رحمان گیلانی کو نہیں جانتے۔ چلیں چھوڑیں ان کو۔ باقیوں کو تو جانتی ہیں ناں۔ ہاں تو میں شکر منار ہا تھا کہ زرنش نے امی کی بات نہیں سنی ورنہ ضرور اسے دکھ ہوتا۔ اور اب یعنی سی بات ہے اسے کوئی وجہ دکھ دے گی تو کیا میں دکھی نہ ہوں گا۔ اب ہمارے سکھ دکھ سا بچے ہیں بھئی۔ وہ سیدھی کچن میں گئی تھی شازمہ ناشتا بنا رہی تھی جو وہ لا کر ہمیں سرو کرنے لگی۔

”ماشاء اللہ! بہت پیاری ہے ہماری بیٹی۔ میرے تو گھر کی رونق دو بالا ہو گئی ہے سچ میں، مجھے تو بیٹھے بیٹھے تیسری بیٹی مل گئی اور وہ بھی اتنی اچھی۔“ بابا بنتے مسکراتے اسے سراہ رہے تھے اس کے چہرے پر بھی مسکان تھی میرے اندر طمانیت سی اتری۔ کنکھیوں سے امی کو جانچا۔ جن کے چہرے پر ایک لا تعلق سا رنگ غالب تھا۔ زرنش پلٹ کر پھر کچن کی جانب چلی گئی تو بابا امی سے کہنے لگے۔

”تم بھی اگر یونہی مسکرا کر دو بول تعریف کے بچی سے کہہ دو گی تو کوئی خرچہ نہیں آئے گا تمہارا۔ وہ اب ہماری ہے ہمارے گھر کا حصہ ہے اور اس نے یہاں کیسے رہنا ہے یہ ہم نے اسے اپنے طریقے سے سیکھانا ہے۔ تم مسکراؤ گی وہ بھی مسکرائے گی۔ اور اگر ہم ہی اسے گھورنے لگے تو کوئی شک نہیں کہ وہ ہماری جانب دیکھے بھی نا۔ دیکھو بیوی مجھے گھر میں صرف سکون چاہیے، بے سکونی برداشت نہیں کروں گا میں۔ ہم ایک بیٹی لے کر آئے ہیں تو گھر سے ایک بیٹی وداغ بھی کی ہے۔ اور یہ سوچ لینا جو عمل آج بہو سے کرو گی کل کو وہی تمہاری بیٹی کے ساتھ بھی دوہرایا جاسکتا ہے اب یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے کہ تم اچھا عمل کرو یا برا۔“ اوہو۔ یہ بابا جان کے الفاظ تھے یا کوئی امرت

دھارا جو میرے دل پر برسا تھا یعنی صرف میں نے ہی نہیں انہوں نے بھی امی کے بدلے رویے کو محسوس کیا تھا۔ بے اختیار میرا جی چاہا اٹھ کر ان کے ماتھے پر بوسہ دوں جبکہ امی نے انہیں اک سرد نگاہ سے دیکھ کر میری جانب رخ پھیرا۔

”اچھا مصمصام بیٹا شادی کی ساری رسمیں تو مکمل ہو چکی ہیں خیر سے۔ اس کے علاوہ شاندا نہ اور اس کے سرالیوں کی دعوت بھی بہت اچھی رہی۔ ماشاء اللہ! وہ سب ہی بے حد خوش تھے اس روز اور اس کی ساس تو بہت متاثر ہوئیں ہمارے گھر کے طور طریقوں سے۔ اور آج انہوں نے ہم سب کو اپنے ہاں ڈنر پر مدعو کیا ہے۔ تم ذرا جلدی آجانا آفس سے۔“

”جی کوشش کروں گا۔“ میں نے سر ہلایا۔
”لیکن یہ دعوت ضروری تھی کیا؟ آپ انہیں منع کر دیتیں۔“

”ارے کیسے منع کر دیتی، بیٹی کی سسرال کا معاملہ ہے۔ پھر اب کس کس کو منع کروں گی۔ تمہارے چاچا، پھوپھی، خالہ، ماموں، جس کو منع کروں گی وہی ناراض ہو گا اور پھر جب تمہارے تایا نے تین بچے بیاہے پھوپھی نے دو تو ہم نے بھی تو سب کی دعوت کی تھی اب ریت رواج کے مطابق وہ بھی ہماری کر رہے ہیں اس میں نیا کیا ہے۔ اور بھئی میں نے تو سب کو حامی بھردی ہے۔ ہاں تمہاری وجہ سے سب کو رات کے کھانے کا ہی کہا ہے۔ اس پارے میں فکر نہیں کرو تم۔“ یہ امی کیا کہہ رہی تھیں میں نے بوکھلا کر انہیں دیکھا۔

”یعنی ہر روز کہیں نہ کہیں جانا ہو گا؟“
”ہاں بالکل۔ اور ہاں یاد رکھنا خالی ہاتھ تو کسی کے گھر نہیں جاتے دو کلو مٹھائی تو لازمی ہوگی۔“

”کک۔ کیا۔“ میرے حلق میں نوالا اٹک گیا میں نے بے چارگی سے ابو کو دیکھا جو ہماری گفتگو سے بے نیاز نرم خستہ پراٹھے اور مزے دار پھولے پھولے آلیٹ میں الجھے ہوئے تھے۔ اور میری تو بھوک ہی اڑ گئی بالکل اس طرح کہ جیسے ناگہانی آفات کے دنوں

میں امداد کے ٹرک اڑ جاتے ہیں۔ یا خدا! یہ میں نے شادی کی تھی یا کوئی پھندا گلے میں ڈال لیا تھا۔ یعنی کہ ایک اور اضافی خرچہ۔ افس۔ میں تو اپنے ہی بال نوچنے کے درپے ہو چلا تھا۔ اب میرے اس ری ایکشن سے آپ مجھے کتنوس بالکل مت سمجھ لیجئے گا۔ میرا پریشان ہونا قطعاً فطری تھا۔ میں کیا کرتا۔ میری شادی کے ساتھ ہی شاندا نہ کی شادی بھی ہوئی تھی۔ اب آپ خود اندازہ کر لیں دو دو شادیوں کے کتنے خرچے ہوئے ہوں گے۔ آپ کی شادی ہو گئی ہے تو آپ کو ضرور علم ہو گا اگر نہیں ہوئی تو کسی سے پوچھ لو ناں بھئی۔

میرے ساتھ تو وہ ہوا جو کسی دشمن کے ساتھ بھی نہ ہو۔ ابھی فقط ڈیڑھ برس ہی تو ہوا تھا کمائیاں کرتے کہ امی جان کو میرے سرے کے پھول دیکھنے کا شوق چرا گیا۔ اب آپ ہی بتائیں ایسے ہو شریا منگالی کے دور میں۔ معمولی سی سخاوت رکھنے والے آدمی نے کتنی سیونگ کر لی ہوگی۔ مگر کس کو کیا لگے، امی جان اور بہنوں کے ہزاروں ارمان تھے جو انہوں نے راج راج کر نکالے پھر شاندا نہ کو بھی ٹھیک ٹھاک جینز دیا گیا۔ بھئی امی کا وہی مشہور زمانہ شوق کہ بس دنیا دیکھے اور دنگ رہ جائے۔ پھر چاہے خود جتنا چاہے تنگ ہو جاؤ وہ پروا نہیں پاپا جان کی تو جمع پونجی لگی ہی۔ میری شامت الگ بلائی گئی۔ ہم تو بہتیرا چہ بختے کہ فالتو، فضول قسم کی رسموں سے اجتناب برتا جائے اور جو بھی ضروری کام کیا جائے اس میں ہاتھ ہولا رکھا جائے مگر نہ جی۔ سنتا کون۔ اور میری تو رہی سہی کسر شادی کے بعد ڈھیر ساری خزانٹ قسم کی سالیوں نے مختلف موقعوں پر نیگ لے لے کر پوری کر دی۔

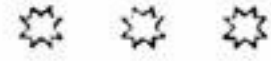
اب میرا تو یہ حال تھا کہ دن گن رہا تھا کہ کب سیلری ملے جبکہ امی جان میری جان نکالنے کے درپے ہو چلی تھیں۔ روز کتنا خرچہ ہو گا۔ دو کلو مٹھائی۔ آنے جانے کا پیٹرول۔ پھر اس کے علاوہ۔۔۔ میں حساب کتاب میں جت گیا۔

”ارے ہاں بھئی یہ دعوتیں تو چلتی رہیں گی مجھے یاد

آگیا تھوڑے دن ہی تو رہ گئے ہیں بڑی عید کے آنے میں۔ قربانی بھی تو ضرور کرنا ہوگی ورنہ لوگ کیا کہیں گے اتنا خرچہ کر کے بچوں کی شادیاں کر لیں۔ فرض ادا نہ کیا گیا ان سے۔ ارے بھئی سچی بات ہے لوگوں کے سوالوں کے جواب نہیں دیے جاتے۔ آپ دونوں اس بارے میں بھی صلاح مشورہ کر کے ابھی سے سوچ لیں۔ ”امی کا نیا فرمان۔ جانے بابا جان کیا کہہ رہے تھے میں ٹکر ٹکر دونوں کے منہ دیکھ رہا تھا۔ بند منہ میں زبان مچل مچل جا رہی تھی کہ چیخ کر کہہ دوں۔“

”آپ ساری قربانیاں چھوڑیں بس مجھے ہی قربان کریں“

اف۔ دل کر رہا تھا نمیل پر سر رکھوں اور بھیس بھیس کر کے رو دوں۔



اور یہ احوال ہے پانچویں دعوت کا۔ اور گزشتہ دعوتوں میں چاچا جی، خالہ، تایا جی، پھوپھو، نجمہ اور ذکیہ کے ہاں ہم جن حالوں سے ہو کر آئے اس کا اب کیا تذکرہ کروں بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ کل گئے تھے جن کے ہاں وہ تو رہتے بھی اللہ میاں کے پچھواڑے ہیں۔ آفس میں ایک بھر پور تھکا دینے والا دن گزار کر واپسی پر پھر نئے سرے سے تیاری اس کے بعد بھاگ بھاگ پورے دو گھنٹے کی ڈرائیو پھر ایک برنگام گید رنگ اس کے بعد پھر دو گھنٹے کی ڈرائیو۔ سبھی گھر آتے آتے رات کا ڈیڑھ بج گیا سوتے سوتے تین۔ صبح سات بجے پھر نیند میں اٹھ کر لشتم پشتم آفس کی تیاری۔ اور اس ساری حالت کے بعد آج اپنے پورے جا ب ٹائم میں۔ میں نے اپنی سیٹ پر جتنی جھپکیاں لیں اس سے کہیں زیادہ مجھے باس سے جھٹکیاں کھانے کو ملیں سارے کو لیگز میری حالت زار پر منہ چھپا چھپا کر ہنس رہے تھے اور مجھے کوئی کونا نظر نہیں آ رہا تھا۔ جہاں میں منہ چھپا لیتا۔ اوئے۔ ہوئے۔ روز روز کی اس خواری نے تو تھکا ڈالا تھا مجھے، جتنا خرچہ کہیں آنے جانے میں ہو رہا تھا۔ اس سے کہیں کم بجٹ میں ہم اگر گھر پر بہت

اچھا سا کھانا کھا لیتے تو کیا برا تھا ہمیں۔ مگر مار بڑے ان رسموں رواجوں پر جو اچھے خاصے لوگوں کی چولیس تک ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ میں تو گھن چکر بن کر رہ گیا تھا قسم سے۔

جو ادا ماموں، ماشاء اللہ کثیر العیال ہیں ہمارے پورے خاندان میں۔ ان کے بڑے سارے گھر میں ان کے بچوں، پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں کے علاوہ ہماری فیملی کے ہونے سے خوب رونق بنی ہوئی تھی۔ وہاں کھانے میں کیا کیا تھا؟ سب کس ٹاپک پر بات کر رہے تھے۔ کس لطفی پر ہنس رہے تھے؟ میں اپنے بکھرے حواسوں کے باعث کچھ زیادہ نہیں جان پارہا تھا کھانے کے بعد کشمیری چائے سرو کی گئی میں اپنا کپ لیے ڈانگن ہال سے نکل آیا۔ تھی تو یہ بد تہذیبی مگر میں کیا کرتا وہاں سب کے درمیان بار بار بھاڑ جیسا منہ کھولنا بھی تو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ باہر اک اور ہلچل مچی تھی۔ لان میں بڑا سائیل بندھا تھا اور سب بچے اس کے ارد گرد اسے چھو کر، چارہ کھلا کر خوش ہو رہے تھے۔

”یہ نیل دیکھا کتنا خوب صورت ہے ماشاء اللہ،“ قربانی کا جانور ہے ناں علیحدہ ہی روپ ہے اس کے وجود پر۔“ زرنش میرے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔

”کتنے خوش ہیں ناں سب اور سماں کی رونق دیکھ کر تو میرا بھی دل کر رہا ہے ہمارے بھی صحن میں ایک بڑا حسین سائیل بندھا ہو۔ جسے میں اپنے ہاتھ سے چارا کھلاؤں، اس کے ماتھے پر ہندی سے چاند تارا بناؤں، گلے میں رنگ برنگے پھولوں والا ہار ڈالوں، ہائے ان بچوں کو دیکھ کر تو مجھے بھی اپنا بچپن یاد آ گیا۔ کتنا مزا آتا تھا ناں۔ کیا دن تھے وہ بھی، اور اب تھوڑے دن تو رہ گئے ہیں عید میں اور پھر قربانی کے جانور کی خدمت کرنے کا تو بڑا ہی اجر و ثواب ہے۔ آج امی کا بھی فون آیا تھا بابا جان نے بھی جانا تھا منڈی اور میری فرزند ہے ناں گل زارا اس کے میاں تولے بھی آئے بکرا۔ وہ بتا رہی تھی کہ اتنا تخیم تخیم اور۔“

اوہ گاڈ! ایک تو یہ زرنش بولتی بہت ہے اور نہایت

دیکھتے۔ ماموں بولے تھے زرنش نے جتنا ہی نظروں سے اسے دیکھا۔

”بالکل ماموں جی۔ میں بھی ابھی ان سے یہی بات کہہ رہی تھی اب کتنی کے دن تو رہ گئے ہیں عید میں اب ہمیں بھی قربانی کے لیے جانور لے لینا چاہیے۔ بہت ثواب ہے ان کی خدمت کا تو۔“

”بے شک۔ اللہ توفیق دے۔ اور ہم سب کی نیتوں اور اعمال کو قبول کرے۔“ ماموں کا انداز دعائیہ تھا۔ مجھے زرنش پر غصہ آیا تھا بھلا ان کے ساتھ یہ بات کرنے کی کیا ضرورت تھی قبل اس کے کہ وہ کچھ اور کہے میں نے اسے وہاں سے دوڑانے کی سوچی۔

”زرنش جاؤ۔ ماموں کے لیے چائے لے کر آؤ۔“

”اوہ ہاں! ماموں جی نے تو چائے پی نہیں تھی میں ابھی لے کر آئی۔“ صد شکر وہ فوراً تابعداری سے چل دی۔ میں یوں ریلیکس ہوا گویا انکی سانس بحال ہوئی۔ ماموں نے بچوں سے کہہ کر دو کرسیاں منگوالی تھیں ایک پہ خود فروکش ہو گئے ایک مجھے مرحمت فرمائی۔

”کیا بات ہے میاں صمصام عبید موسوی بہت تھکے ہوئے اور کچھ پریشان لگ رہے ہو۔“ انہوں نے تو مجھ سے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا مگر میرے تو جیسے کسی نے زخم چھیر دیئے تھے۔ ویسے بھی میں ماموں کو بچپن سے ہی اڈا کرتا ہوں ان کی شخصیت میں بے شمار خوبیاں ہیں جنہیں اس وقت احاطہ تحریر میں لانا میرے لیے ممکن نہیں (بھئی اپنے حواس جو یکجا نہیں) ماموں کے تو بولنے بات کرنے کا انداز اتنا اچھا اتنا پیارا ہوتا ہے کہ بے اختیار سب کچھ کہہ دینے کو دل کرتا ہے اس پل میری ساتھ بھی یہی ہوا ہے تو جیسے کس سالی (سامع) کی ضرورت تھی (جی ہاں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کیا یارم صرف آپ نے ہی پڑھ رکھا ہے) میں جو بولنا شروع ہوا تو اپنے اندر غبار بن کر اودھم مچاتے تمام کے تمام الفاظ ان کے سامنے دھکیل پاہر کیے ماموں مہرہ لب سب سنتے گئے جب میں نے تھک کر منہ بند کیا تو انہوں نے میرا کاندھا تھپکا۔

ہی بے تکا بولتی ہے میری اچھی بھلی کشمیری چائے پکدم ہی بد مزہ ہو گئی جی میں تو آئی کپ زور سے فرش پر تیخ دوں اور خود ایک چھوٹے بچے کی طرح فرش پر لیٹ کر اڑیاں رگڑ رگڑ کر روؤں اور روتے روتے سو جاؤں۔ کتنا کہا تھا سب نے بڑی عید کے بعد شادی کی تاریخ رکھوالو۔ آٹھ ماہ رہی تھی زرنش کے ساتھ میری منگنی اور یہ میرا ہی شوق تھا۔ بہت محبت ہو گئی تھی مجھے اس سے، میری ہی شدید خواہش تھی کہ چھوٹی عید تو جیسے تیسے گزر گئی اب کم از کم بڑی عید تو میں اس کے ساتھ گزاروں۔ اور اب گزارو بیٹا۔ رنج رنج کر گزارو، بلکہ بھگتو آج جانور کی فرمائش آئی ہے کل شاپنگ کی ہوگی پھر اس کے بعد۔

اب یہ سلسلہ رکنے والا نہیں ہے دل بڑا کر لو، کمر کس لو، اتر آؤ میدان میں، بھول جاؤ وہ دن ہمارے، جب سب ہری ہری سو جھتی ہے اب تو بال کی بھی کھال اترے گی۔ بچو۔ وہ بھی صحیح معنوں میں۔

اب بس بھی کریں کوئی آگیا تو کیا کہے گا۔ زرنش خواہ مخواہ شرمائی مسکائی میں جو اپنے آپ میں گم خود کو کوستا بے دھیانی میں اسے ہی دیکھے جا رہا تھا اس کی ادا پر جھنجلا کر رخ ہی پھیر گیا۔ اب۔ یہ بیوی بھی نال کتنے بڑے امتحان کا چھوٹا سا نام ہوتا ہے۔ کاش پہلے کوئی مجھے یہ بات سمجھاتا۔

”ماموں آپ کا تیل بے حد خوب صورت ہے۔“

سامنے سے ہی جو ادا ماموں چلے آ رہے تھے کھانے کے فوراً بعد وہ نماز عشاء کی ادائیگی کے لیے مسجد چلے گئے تھے سفید بے داغ کپڑوں میں چنی سفید ٹوپی سر پر لیے بارعب اور پر نور چہرے والے ماموں جنہیں دیکھتے ہی زرنش بہت جوش و خروش سے بولی تھی جس پر وہ ہلکا سا مسکرا دیے۔

”یہ میرا کہاں ہے بیٹا یہ تو میرے اللہ کا ہے۔ میرے پاس تو مہمان آیا ہے۔ چند دن کے لیے۔ میں کچھ دن اس کی مہمان نوازی کر لوں تو بڑی سعادت ہے۔ میرا مالک اسی کے صدقے میرے گھر میں بھی برکت اتار دے۔“ تیل کو پیار بھری نظروں سے

”بس بیٹا بات ہے سمجھنے کی۔ مسئلہ یہ ہے کہ آج کہ انسان نے سمجھنا چھوڑ دیا ہے اور اسی لیے وہ اتنے مسائل کا شکار ہے اور خاص طور پر ہم لوگ جن کے لیے باری تعالیٰ نے بے شمار آسانیاں رکھیں۔ زندگی یہ سب اصول ہمیں سکھلائے۔ اور اسے اتنا خوب صورت بنایا گویا پھولوں کی نرم سج۔ مگر افسوس ہم نے خود اپنی ناقصیت اندیشی سے اس پر جھاڑ کے کانٹے اگلے ہمیں تو یہ بتایا گیا کہ دیانت کو اپنا شعار بناؤ۔ قناعت پسند بنو۔ اسراف مت کرو، ایثار کرو، نمود و نمائش سے بچو۔ اسی میں تمہاری فلاح ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اپنی نیت صاف اور دل کشادہ رکھو۔ ایک کام جسے آپ دنیا دکھاوے کے لیے بہت سی دنیاوی دولت خرچ کر کے بڑھا چڑھا کر کرتے ہیں تو اللہ بے نیاز ہے۔ اسے آپ کے ایسے کسی عمل کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر وہی آپ ایک جھوٹا سا عمل مکمل دلی اخلاص کے ساتھ کرتے ہیں تو کوئی شک نہیں کہ وہ در قبولیت تک رسائی پا جائے۔“

س میرے بچے ہمیشہ سے دھیان رکھو کہ نیت میں کھوٹ نہ ہو۔ جتنا ہم اپنے سماجی معاملات کی فکر کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ ہمیں اپنے دینی فرائض کی پروا کرنا چاہیے۔ وہ کتنا اچھا ہوتا جو شادی کے لیے ڈھیر ساری شاپنگ کرنے سے قبل آپ قریانی جیسے اہم فریضے کے لیے بھی ایک مخصوص رقم محفوظ کر لیتے۔ اور آپ کو میرے طریقے کار کا بھی پتا ہے صمصام بیٹا ہر ماہ اپنی آمدن میں سے کچھ حصہ ایک طرف بچانا مارتا ہوں اور اس لیے اللہ کے کرم سے ایسے کسی بھی موقعہ پر پریشانی نہیں ہوتی۔ ماموں بتا رہے تھے اور میرا سر جھکا ہوا تھا۔ اور مجھے پتا تھا ان کے طریقہ کار کا اور ہم بہت سے لوگوں سے متاثر ہوتے ہیں ان کے اصولوں کو پسند بھی کرتے ہیں اور یہ بھی علم رکھتے ہیں کہ اگر ہم بھی عمل کریں گے تو بہتر نتائج پائیں گے مگر جانے کیوں ہماری عادت سی بن گئی ہے ہمیشہ اس بات کو اپنائیں گے جہاں ہمیں امید ہو کہ اس پر واہ واہ کے خوب ڈونگر برسیں گے۔

ہم اس دنیا میں رہتے ہیں۔ ہمیں اس دنیا کا سامنا کرنا ہوتا ہے ہمیں ہر وقت میں دنیا کی ہی فکر ہے۔ تو کیا ہمارے لیے یہی دنیا ہے؟ ہمیں یہاں کے ہر کام اور اس کی مکمل تیاری کی ٹینشن رہتی ہے مگر اگلی دنیا اگلے سفر کے لیے کیا زور اور ضروری ہے؟ اسے کیوں بھلائے بیٹھے ہیں ہم۔ میرے اللہ نے تو ہمارے لیے بہت سی آسانیاں رکھیں۔ ہمارے ہر نیک عمل کو ہمارے لیے نجات کا ذریعہ قرار دیا تو کیا ہمیں یقین ہے کہ ہمارا ہر عمل نیک ہوتا ہے اوہ۔ میرے خدا! میرا سر اوپر نہیں اٹھ رہا تھا۔ ماموں کا ہاتھ ایک بار پھر میرے شانے پر آٹھرا۔

”صمصام بیٹا ہمارے دین میں کوئی سختی نہیں۔ میرے مولانا نے بہت کرم کیا ہے اپنے بندوں پر۔ وہ ان کے سب دکھ سکھ جانتا ہے۔ تم یوں پریشان مت ہو۔ وہ بڑا غفور رحیم ہے۔ معاف کرنے والا ہے۔ اگر اس بار تمہارے پاس گنجائش نہیں ہے تو اگلی بار یہ فریضہ ادا کر لیتا اور رہی بات زرنش بی بی کی خواہش کی تو بیٹا وہ اب تمہاری شریک حیات ہے تمہاری زندگی کا حصہ اس کی ہر امید اب تم سے ہے۔ اس کی سب خوشیاں تمہارے ذمہ ہیں اور اسی طرح وہ بھی تمہاری ہر آسانی اور پریشانی میں سا تجھے دار ہے۔ تم نے اسے اپنے موجودہ حالات نہیں بتائے جو تمہارا اس پر کم اعتمادی کا اظہار ہے۔ جبکہ میں یہ کہوں گا اپنی ہر اہمیت سے آگاہ کرو۔ اسے بتاؤ تاکہ وہ کسی بھی متوقع بے گمانی کا شکار نہ ہو اللہ نے اسے تمہارا عمر گسار بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن جب تم ہی اسے بے خبر رکھو گے تو وہ کیسے سمجھے گی ہر بات ہر مسئلے کو بے شک ”ایک چپ سو سکھ۔“ والا مقولہ جھوٹا نہیں لیکن بیٹا زندگی میں بہت سے مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں بولے بنا درستی نہیں آتی۔ تم سمجھ رہے ہونا میری بات۔ میں بالکل ہی گونگے کا گڑ کھانے بیٹھا تھا انہوں نے بغور میرا چہرہ دیکھا میں نے بمشکل ایک مسکان کھینچ کر ہونٹوں پر سجائی۔

”شباباش میرے بچے۔ دیکھو دن اور رات تو زندگی کا لازمی جز ہیں۔ بات یہ ہے کہ اجالا دیکھ کر کبھی آپے

سے باہر نہ ہونا اور اندھیرے میں کبھی گھبرانا نہیں۔ پھر دیکھنا کیسے سب کلفتیں دور ہوتی ہیں۔ ”یہ ماموں کی حوصلہ دیتی مسکراہٹ ہی تھی جس نے میری تھکان دور کر دی۔ پھر امی باباجان اور باقی سب بھی باہر آگئے تو بہت دیر تک محفل جمی رہی۔



اور اگلے ہی دن ناشتے کی ٹیبل پر امی جان نے پھر سے ”مسئلہ قریانی“ چھیڑ دیا۔

”بھئی مجھ پوچھو تو میرے سر پر تمہاری ہی وجہ سے قرض چڑھ گیا تھا۔“

”میری وجہ سے؟ ہائے ہائے مجھے کون سے سونے

کی دس بیس سیٹ بنا کر دے دیئے آپ نے۔“ بابا

جان چڑ کر بولے تھے تو جو بابا امی کا سنا ہونا بھی بنتا تھا۔

”بس تمہاری ہی کسر رہ گئی تھی۔ باقی جو تمہارے

مشوروں پر اتنا خرچہ ہوا وہ سمجھاتا بھی رہا کہ اللہ کی

بندی بے دریغ خرچ مت کرو۔ مگر تم نے جینے دیا ہے۔

آخری دنوں میں مجبور ہو کر کچھ قرض لینا پڑا۔ اب مجھے

بتاؤ میں گھر کے خرچے ضرورتیں پوری کروں یا پھر

تمہاری نیت کے مطابق دنیا دکھاوے کو قریانی جیسا

متبرک فریضہ ادا کروں۔ بتاؤ کہاں سے کروں سب۔

اب تم اتنا بھی جانتی ہوگی قریانی نہ ادھار سے ہوتی ہے

نہ قرض دار پر فرض۔ یہ تو خلوص نیت سے ہوتی ہے

فقط رضائے الہی پانے کے لیے اگر وہی تم پہلے میری

بات مان کر بہت سے غیر ضروری خرچوں اور اپنی

فضول شاپنگ کی قریانی دے دیتیں تو اب ہم بھی اس

قابل ہوتے مگر اب میں بہت مجبور ہوں اس روز بھی

معذرت کی تھی آج پھر کر رہا ہوں ایک ہی بات بار بار

دہرا کر مجھے شرمندہ نہ کیا جائے پلیز۔“ بابا سچ پریشان

تھے اور ان کے کندھوں پر قرضے کے بوجھ کا تو بھی

اس وقت ہی پتا چلا جس نے مجھے بھی سوچ میں ڈال

دیا۔ وگرنہ تو میری رات ہی ماموں سے بات ہو گئی تھی

ان کے تیل میں ایک حصہ دار کم تھا اور میرا ارادہ تھا کہ

سیلری ملتے ہی انہیں رقم ادا کروں گا۔ اب الگ سے

جانور خریدنے کی تو استطاعت پچی نہیں تھی۔ پھر جب میرے اللہ نے ہم جیسوں کے لیے ”مسکون پیکیج“ جو رکھے ہوئے ہیں تو ان سے فائدہ لیا جائے یہی سوچ رکھا تھا مگر اب تو یہ بھی ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ ناشتا جوں کا توں ہمارے آگے دھرا تھا۔ امی دونوں ہاتھوں پر سر رکھے بیٹھی تھیں۔ بابا جان کا موڈ آف، زرنش بھی سر نیہوڑائے کسی سوچ میں گم تھی میں نے گلا کھنکارا۔

”بے شک قریانی بے حد اہم اور بابرکت فریضہ

ہے۔ خواہش تو میری بھی تھی کہ ہم ادا کرتے مگر

میرے خیال میں بابا جان پہلے قرض کا ادا کرنا ضروری

ہے۔“

”بالکل ضروری ہے۔ کیونکہ قرض دار شرعی حکم

کے مطابق قریانی ادا نہیں کر سکتا۔ ہے ناں بابا جان!“

ہماری طرف آتے ہی غم نے میری بات سن لی تھی اور

وہ بولا تھا۔ بابا نے اسے صرف نگاہ اٹھا کر دیکھا اور سر

جھکا لیا۔

”ڈونٹ وری بابا جانی۔ آپ قرض کی اماؤنٹ

بتائیں۔ ہم سب مل کر ادا کریں گے۔ یہ ہم سب کا

مشترکہ مسئلہ ہے۔“ غم نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا

تھا۔

”بالکل۔ بلکہ یہ ہماری وجہ سے ہی تو مسئلہ ہے۔“

مجھے شرمندگی ہونے لگی۔ ان کی پریشانی کا پورا پورا

احساس تھا مجھے۔ بابا جان نفی میں سر ہلاتے رہے تھے۔

”کوئی اتنا زیادہ بھی نہیں ہے تم لوگ پریشان مت

ہو۔“

”ارے کیسے پریشان نہ ہوں۔ اب یہ قرض ہمارے

سر سے اترے گا تو ہی ہم کوئی انگلا قدم اٹھا سکیں گے۔

گھر کی خوشیوں کا سوال ہے پلیز بابا۔“ میں نے منت

کی۔

”تو اور کیا۔ اور یہ میں آپ کو گارنٹی دیتا ہوں کہ

میری شادی کے سبب انتظامات آپ کریں گے جیسے

آپ کو مناسب لگے۔ چاہیں تو سیدھا مسجد میں لے

جا کر نکاح پڑھا لیجئے گا۔ نوٹیشن۔“ غم نے بھی لقمہ

میں اس کے پیچھے ہی کمرے میں آیا تھا۔
 ”تھینکس۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
 ”کس بات پر۔“ اس نے بھنویں اچکائیں۔
 ”تم بہت اچھی ہو۔“ میں نے پیار سے اس کا
 حیران چہرہ دیکھا۔

”آہم۔ وہ تو میں ہوں۔ پتا ہے مجھے۔ لیکن دکھ ہے
 کہ آپ اتنے بھی اچھے نہیں ہیں جتنے نظر آتے ہیں۔
 یہ کل خبر ہوئی ہے۔“
 ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میں تو دل میں آئی ہر بات کر لیتی
 ہوں آپ سے مگر آپ اتنے کئے ہیں جو دل میں ہوتا
 ہے وہ بتاتے نہیں۔“ وہ ہاتھ پھڑا کر پرے جا کھڑی
 ہوئی۔

”میرے دل میں تو بس تم ہی تم ہو۔ میں مسکراتا
 آگے بڑھا۔

”بس جانیں دیں بنائیں مت مجھے۔“ وہ روٹھی
 روٹھی اور پیاری لگ رہی تھی۔ میں جانتا تھا وہ کن
 باتوں کی طرف اشارہ کر رہی تھی مگر اسے ستانے کو
 بولا۔

”کیا یو قوف۔ ارے بھئی وہ تو تم بنی بنائی ہو۔ میری
 کیا مجال کہ میں بنا سکوں۔“ اور اس نے مجھے گھور کر
 دیکھا تھا میں زور سے ہنس دیا۔

دیا تھا۔ سب کے بچھے چروں پر مسکراہٹ رنگ گئی۔
 پھر بابا کے بتانے پر میری اور ان کی سیلری، ضمیمہ کی
 سیونگ امی کا خفیہ کھانا سب مل ملا کر اتنے ہو گئے کہ
 تمام قرض ادا ہو سکتا تھا اور اس کے علاوہ بفضل تعالیٰ
 سنت ابراہیمی بھی۔

ہم حساب کتاب میں الجھے تھے کہ میں نے زرنش
 کو اٹھ کر جاتے دیکھا۔ اور کچھ دیر میں اس کی واپسی
 ہوئی تھی مگر خالی ہاتھ نہیں ایک پھولا ہوا سا ہینڈ بیگ
 لا کر اس نے بابا کے سامنے رکھ دیا تھا۔ انہوں نے سر
 اٹھا کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”اس میں وہ رقم ہے جو سلامی میں اکٹھی ہوئی
 تھی۔ اب جب آپ سب کی سیونگ قرض کی مد میں
 چلی جائے گی تو گھر کا خرچ کیسے چلے گا۔ پھر اور بہت سی
 ضرورتیں۔ اس لیے بابا جان یہ آپ رکھ لیں۔“ وہ
 جھکے سر سے کہہ رہی تھی۔ میں نے بابا کی آنکھوں میں
 ایک چمک اترتی دیکھی اور میرا اپنا دل عجب خوشی سے
 بھر گیا۔ وہ مجھے اتنی پیاری اس لمحے سے پہلے کبھی نہ لگی
 تھی۔

”دیکھا بیگم میں نہ کہتا تھا میری بیٹی بہت اچھی
 ہے۔ نہایت حساس اور سمجھ دار۔ جیتی رہو بیٹا۔ خوش
 رہو۔“ بابا نے امی سے کہا پھر اسے دیکھا۔

”لیکن بیٹا یہ آپ رکھو اپنے پاس۔ یہ سب آپ
 کے ہیں۔ ان پر صرف آپ کا حق ہے آپ انہیں جیسے
 چاہو خرچ کرو۔“ انہوں نے بیگ اس کے آگے کھسکا
 دیا تھا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

”مگر بابا۔“ زرنش نے کچھ کہنا چاہا کہ انہوں نے
 ہاتھ اٹھا کر اسے وہیں روک دیا پھر اس کا سر تھپتھا کر
 چلے گئے۔ اس نے میری جانب دیکھا۔ میں نے مسکرا
 کر سر ہلا دیا۔

”زرنش بچے اٹھا لو بیگ۔ اگر گھر میں ضرورت
 پڑے گی تو پھر تم ہم سے الگ تو نہیں ہونا بیٹانی الحال
 رکھو انہیں اپنے پاس۔“ امی بھی اس سے کہہ رہی
 تھیں۔ ان کے چہرے پر بھی میں نے طمانیت بھری
 مسکان دیکھی۔ چار ونا چار زرنش نے بیگ اٹھا لیا۔

تمہاری اپنی لکھی کہانی



فرحت اشتیاق

قیمت - 300 روپے

”جہاں تمہارے اندر بہت سی خوبیاں ہیں وہاں مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا ہے کہ تم دور سے 007 کی بھانجی بھی لگتی ہو۔ کل جب میں اور ماموں باتیں کر رہے تھے تو پھلو کے پیچھے لہراتا تمہارا بوپٹا میں نے دیکھ لیا تھا۔“ میں نے مزے سے بتایا زرنش کا ذرا سا منہ کھلا پھر وہ خفگی سے بولی۔

”وہ تو میں ویسے ہی وہاں سے گزری تو آپ کے کچھ لفظ میرے کانوں میں پڑ گئے اور یقین کریں مجھے بہت دکھ ہوا۔ جب میں نے پہلی بار آپ کے سامنے قربانی کے حوالے سے بات کی تھی آپ اس وقت مجھے کھل کر بتا دیتے تو کیا میں دوبارہ آپ سے کوئی ذکر کرتی۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ آپ نے مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھا۔“

”غلط بات یہ نہیں ہے دراصل میں تمہاری امید توڑنا نہیں چاہتا تھا مجھے اللہ پر بھروسہ تھا کہ ضرور وہ میری مدد کرے گا۔ مگر تمہارے سامنے ہی سارے حالات ہیں۔ میں خود بہت تھک چکا تھا فالٹو کی آئینوں روایتیں نبھانے کا بوس اللہ ہم لوگوں کو بدایت دے، ہم دنیاوی رسومات کی ادائیگی سے زیادہ اپنے مذہبی ذائقے کی جانب دینِ خلوص سے متوجہ ہو جائیں۔ اور سچ مانو تو ان گزرے دنوں میں خوب نصیحت ملی ہے کہ پہلے وہ کام کرو جو ہماری اس دنیا کو ہی نہیں بلکہ آخروی سفر کو بھی سہل بنا دیں۔ اور تم نے سنا ہو گا ماموں کیا بتا رہے تھے۔ میں اپنی ساری آمدن تمہارے حوالے کر دیا کروں گا۔ بس اسے سنبھال کر خرچ کرنا تمہاری ذمہ داری۔“

”کیا۔۔ یعنی سب سے مشکل کام مجھے سونپ رہے ہیں۔ مجھے تو حساب کتاب نہیں آتا۔“ وہ گھبرا کر گویا ہوئی۔

”آجائے گا۔ جب اپنا گھر سنبھالو گی تو سب آجائے گا۔ یہ گھر تمہارا میں تمہارا سب کچھ تمہارا تو اب سیکھنا تو پڑے گا نا۔“ میں نے اس کے شانے پر بازو پھیلا کر ساتھ لگا لیا وہ پرسوج انداز سے سر ہل رہی تھی۔ ”پریشان مت ہو۔ میں ہر قدم پر تمہارے ساتھ

ہوں۔ جہاں تم لڑکھڑاؤ گی میں سنبھال لوں گا۔ جہاں میں ڈنگ لگایا تم میرا سہارا بن جانا۔ اس طرح مل جل کر ہر راستے پر سفر پر چلیں گے تو ہر منزل آسان تر ہو جائے گی اور میں چاہوں گا کہ ہماری زندگی میں پہلی ترجیح ہمیشہ اس عمل کو دیں جو ہمیں اس دنیا میں نہیں بلکہ ہمیں اس دنیا میں سرخروئی دلو اسکے جو ابدی ہے اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔“

”ان شاء اللہ۔ ایسا ہی ہو گا۔“ اس کے چہرے پر مدہم سی مسکان پھیل گئی۔ مجھے لگا کمرہ کچھ اور روشن ہو گیا ہے کھلی کھڑکی سے اندر آتی سورج کی کرنیں بتا رہی تھیں کہ سفر عروج کی جانب گامزن ہے اور ایک لخت مجھے یاد آیا میں تو ناشتا کر رہا تھا اور مجھے آفس جانا ہے۔

”اوہ یار تم نے مجھے یاد ہی نہیں کرایا۔ اف پھر۔“

”اس کی جھڑکیاں۔“ میں جلدی سے اٹھا لپک جھپک چیریں کیمیں۔

”اف! آپ کتنا ڈرتے ہیں اپنے پاس سے۔“ زرنش ہنس رہی تھی میں ایک لخت نہہر گیا۔

”کیا واقعی میں ڈرتا ہوں؟“ میں نے سوچا۔ پھر میں مسکرا دیا۔

”ناں واقعی میں ڈرتا ہوں۔ مرنے سے بے خوف ہونا۔“

میں نے اس بے عزتی سے جو وہ چار بندوں کے سامنے بے دھڑک کر دیتا ہے۔ اور میرے خیال میں ہم سب کو ڈرنا چاہیے اس ذلت سے جو ہمیں اس روز اٹھانا پڑے گی جب کوئی بھی مددگار نہیں ہو گا۔ اسی لیے ڈرنا ہی اچھا۔ کیا خیال ہے؟“

”بالکل۔“ زرنش نے پوری شد و مد سے سر ہلایا۔ اور میں مطمئن ہو کر باہر کو چل دیا۔ آج بہت سی ذہنی الجھنوں سے نجات مل گئی تھی۔ اور دل کو یقین تھا ہماری اس بار کی عید ضرور انوکھی اور خوب صورت عید ہوگی۔ کیونکہ جب جذبوں کو خالص کرنے کی کوشش شروع کر دی جائے تو پھر کوئی شک نہیں کہ زندگی گھرنگ نہ ہو۔



شادی

رسم ہے۔ وہ تو آپ کی خوشی کی خاطر اس نے اعتراض نہیں کیا ورنہ وہ تو سرے سے ان مہندی مایوں کی تقریبات کے ہی خلاف ہے۔ سادگی سے کرنا چاہتا تھا شادی۔“

ام ہانی کو ذرا سا حوصلہ ہوا۔۔۔ بھلا شادی کے دن نہ آنے کا کیا جواز پیش کرے گا۔۔۔ آہی جائے گا۔۔۔ بس ایسے ہی ڈرا رہا ہے۔

”چلیں۔۔۔ جیسے اس کی خوشی۔۔۔“ نائلہ نے معاملہ رفع دفع کرنا چاہا۔

”کوئی بات نہیں۔۔۔ خیال اس کا بھی درست ہے۔ آپ آئیں بیٹھیں تو سہی۔۔۔ مہ پارہ انہیں ہانی کے قریب لے جاؤ۔“

ام ہانی پیلے روٹے سے سر ڈھانے خود کو ڈھارس دے رہی تھی کہ یہ شخص خالی خولی دھمکی ہے۔ سالار اعظم جیسا سمجھ دار انسان ایسا نہیں کرے گا اور۔۔۔ اور پھر رات کو ان سب ہنگاموں سے فارغ ہونے کے بعد بالا خروہ اسے منالے گی۔۔۔ منت سماجت کر کے محبت سے کسی بھی طرح بس تھوڑی دیر تک۔

اور یہ تھوڑی دیر سالار کے لیے بہت طویل مدت کے برابر تھی۔

اپنے کمرے کی نیم تاریکی میں بیٹھا ہاتھ میں پکڑے فون کو بے تاثر نگاہوں سے تلکسا سالار خوش رنگ زہر کے گھونٹ بھر رہا تھا۔

نشہ جیسے جیسے اس کے اندر سرایت کرتا جا رہا تھا۔ ام ہانی کی جانب سے کسی مہسج یا کال نہ آنے کی جھنجلاہٹ اور کوفت رفتہ رفتہ طیش میں بدلتی جا رہی

ام ہانی اس نئی فرمائش۔۔۔ شرط مطالبہ۔۔۔ یا ضد جو بھی یہ تھا۔۔۔ اس پر حق دق سی رہ گئی۔۔۔ جواب میں ایک لفظ تک نہ تھا کہنے کو۔

نہ معذرت کا نہ اپنی مجبوریاں بیان کرنے کے لیے نہ اس سے رحم کی اپیل کر سکی۔

نہ نظر ثانی کی درخواست۔۔۔ بس مردہ ہاتھوں سے فون ایک طرف رکھ کے سالار کے الفاظ اور لیجے کو یاد کرنے لگی۔ بہت غور کرنے پہ بھی ان پہ کسی قسم کے مذاق کا شائبہ نہ ہو رہا تھا۔

کاروائی

”انٹھو بھئی۔۔۔ نیچے چلو۔۔۔ رسم ہونی ہے۔“ مہ پارہ ایک دو لڑکیوں کے ہمراہ شور مچاتی اندر آئیں۔

”لہنگائیں پکڑوں گی آبی کا۔“ بلی بڑے شوق سے آگے بڑھی، کسی معمول کی طرح ان کی سنگت میں کمرے سے نکلتے نکلتے ام ہانی نے بڑی بے بسی اور رحم طلب نظروں سے بیڈپہ پڑے فون کو دیکھا۔۔۔ جہاں سے حکم صادر ہو چکا تھا۔

اور اس نے خالی خولی دھمکی نہیں دی تھی۔۔۔ وہ واقعی نہیں آیا تھا۔ نیچے اماں نائلہ اور مہ پارہ سے معذرت کر رہی تھیں۔

”دراصل سالار کو یہ مہندی وغیرہ کی رسمیں پسند نہیں ہیں اسی لیے نہیں آیا۔“

”مگر آنا تو چاہیے تھا۔ لوگ کیا کہیں گے۔“ مہ پارہ کو اللہ موقعہ دے اعتراض اور نکتہ چینی کا۔

”بس۔۔۔ وہ اس کا کہنا ہے کہ یہ خالصتاً خواتین کی

تھی۔



ناچتے گاتے۔ مست خوش حال سب کے سب
زہر لگ رہے تھے مجھے ان سب کی محبتوں سے میرا
ایمان ہی اٹھ گیا۔ حتیٰ کہ امی کی مامتا سے بھی۔ بڑے
دادا جی کے لاڈ سے بھی۔

اگر ان سب کو واقعی مجھ سے محبت ہوتی تو کیا
میرے چہرے سے میرے دل کا درد نہیں جان سکتے
تھے

اور اگر جان رہے تھے۔ ہلکا سا شائبہ بھی ہوا تھا تو
نظر انداز کیسے کر رہے ہیں۔ خوشیاں کیسے منا رہے
ہیں مجھے اس آگ میں جلتا دیکھ کے بھی۔

رسم ہو رہی تھی مہندی کی۔ اور میں ایک کونے
میں کھڑا شعلے برساتی نظموں سے یہ سارا ڈرامہ دیکھ رہا
تھا۔

سب سے پہلے خالہ بتول کو آگے لایا گیا۔ رسم کی
ادائیگی کے لیے۔ اور وہ اپنا بھاری بھر کم وجود سنبھالتی



ام ہانی کے پاس بیٹھ کے اس کے ہاتھ پہ شگن کی ہندی لگانے لگیں۔ کسی چھچھورے نے گانا لگا دیا۔

ہندی ناں سجدی

جے نچے کڑی دی داوی

اور شور سا چ گیا۔ ام ہانی کے منہ میں ذرا سی مٹھائی ٹھوستی ہوئی خالہ بتول نے پہلے تو لجا کے شور کرتی لڑکیوں بالیوں اور ہو بیٹیوں کو وا جی سا گھورا۔ پھر ٹھنوں پہ ہاتھوں کا دباؤ ڈال کے انھیں اور تین چار ٹھمکے ہلا دیے۔

پھر تو جیسے سب کی باری آگئی۔

ہندی ناں سجدی۔۔

جے نچے کڑی دی ناں۔

اور امی جی رسم کی ادائیگی کے بعد شو پیر سے انگلی لگی ہندی صاف کرتے ہوئے بس ذرا سا ہاتھ ہلا کے رہ گئیں۔ شاید یہی تھا ان کا ڈانس۔۔۔ سب پھر بھی یوں تالیاں بجا کے داد دینے لگے۔۔۔ اب مہ پارہ پھوپھو کی باری تھی۔۔۔ میں خود پر جبر کرتے ہوئے یہ سب تماشا دیکھنے پہ مجبور تھا۔

”ہندی ناں سجدی۔“

جے نچے کڑی دی پھوپھی۔

اور کڑی دی پھوپھی تو پھر ایسا جھوم کے ناچی کہ خالہ بتول کو پکڑ پکڑ کے انہیں ہٹھانا پڑا۔

نجانے مجھے کیا ہوا۔۔۔ میرے قدم خود بخود آگے بڑھنے لگے اور راستے میں بھنگڑا ڈالتے نیاز ماموں نے مجھے پکڑ کے اس واہیاتی میں شامل کرنا چاہا۔ مگر میں ان کا بازو جھنک کے آگے بڑھتا گیا۔ ایک پل کے لیے بھی نظر ام ہانی سے ہٹا نہیں پارا تھا۔

اور عین اس وقت جب امی کی کوئی قریبی سہیلی ام ہانی کو ہندی لگانے کی نیت سے انھیں۔۔۔ میں ام ہانی کے بالکل نزدیک بنجوں کے بل بیٹھ چکا تھا۔ اور وہاں رکھے بڑے سے سجے سجائے تھال میں موجود تیل، اینٹن اور ہندی کی پیالیوں میں سے ہندی میں اپنی انگلی بھگو چکا تھا۔

”اوائے۔۔۔ منڈے نہیں کرتے یہ رسم۔۔۔“

خالہ بتول نے لکارا۔۔۔ مگر امی نے ٹوک دیا۔
”رہنے دیں ناں خالہ جی کرنے دیں اسے اپنا شوق پورا۔“

ہندی ناں سجدی

جے نچے منڈے دا ماما۔۔

نیاز ماموں کے ناچنے پہ سب تالیاں بجا بجا کے داد دے رہے تھے اور میں ہندی میں بھیگی انگلی لیے گھونگھٹ سے ذرا ذرا سا جھلکا ام ہانی کا کھبرا ہوا چہرہ دیکھ رہا تھا۔۔۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔۔۔ جسے اس نے فوراً ہی آچل کے اندر کر لیا۔ پھر بھی میں نے مضبوط گرفت کے ساتھ اس کا ہاتھ کھینچ کر اپنے سامنے کیا کہ اس پہ ہندی لگا سکوں۔۔۔ مگر اب وہ سختی سے مٹھی بھینچ چکی تھی۔۔۔ میں نے اس کا گھونگھٹ ہلکا سا ہٹایا۔ زرد رنگ میں اس کی رنگت بھی زرد تھی۔۔۔ چہرے پہ ایک خوف و ہراس۔ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے میں نے اس کی مٹھی کھولنا چاہی تو اس بار وہ مزاحمت نہ کر سکی۔

ہندی ناں سجدی

جے نچے کڑی دی بہن۔۔

اب بہلی اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی اس لیے میری جانب کوئی متوجہ نہ تھا سب اس کی قلابازیاں دیکھ رہے تھے۔ میں نے ہندی سے اس کی ہتھیلی پہ اپنے نام کا پہلا حرف ایس لکھ دیا۔

وہ جو نظر حرم کا چکی تھی۔ ایک بار پھر مجھے دیکھ کے رہ گئی۔ اس کی نگاہوں میں گلہ تھا، شکوہ تھا، ناراضی تھی۔

مگر اتنی نہیں جتنی میری نگاہوں میں تھی۔ شاید اسی لیے وہ تاب نہ لا سکی۔۔۔ نظر بھی چرائی اور گھونگھٹ بھی کھینچ کر خود کو ایک بار پھر مجھ سے چھپا لیا۔ میں بو جھل قدموں کے ساتھ اٹھ کے وہاں سے جانے لگا۔

ہندی ناں سجدی۔۔

جے نچے کڑی داویر۔۔

کسی نے گانے کے بول اچانک ہی تبدیل کر دیے

[[بندہ کرن (72) اکتوبر 2015]]

تھے اور ٹھک ٹھک کے ناچتا علی مجھے کھینچ کر اپنا ساتھ دینے یہ زبردستی مجبور کر رہا تھا۔ میں نے بے زاری سے خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے واجبی سے ایک دودھکے بھی دیے۔ مگر اب وہ خود اپنے بھونپو جیسے حلق سے آوازیں نکالتا گانے لگا۔ ساتھ ساتھ میرا بازو اٹھا کے مجھے ناچنے پہ اکسارہا تھا۔

اوہندی تال سجدی۔

جے نچے کڑی واوری۔

یہاں میری برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔ میں آپے سے باہر ہو گیا۔ اور بھنا کے اسے زور کا پھٹر دے مارا۔

تالیاں بجاتے سب نفوس کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

سن نے جادو کی چھڑی گھما کے سارے ماحول کو سوبا ہوا محل میں تبدیل کر دیا تھا۔ میوزک بھی بند ہو گیا تھا اور میں عیش میں آ کے اب علی کو بے تحاشا لیت رہا تھا۔

۔۔۔ سے جو اس لیے جا رہا ہے۔ تیری تو میں۔۔۔

۔۔۔ سے جو اس لیے جا رہا ہے۔ تیری تو میں۔۔۔

۔۔۔ سے جو اس لیے جا رہا ہے۔ تیری تو میں۔۔۔

میں ایک ہاتھ سے اس کی گردن دوپچے اور سرے ہاتھ کے گھونٹے اس کی کمر میں مارے جا رہا تھا اب ابو کے ساتھ ساتھ نیاز ماموں بھی مجھے اس سے الگ ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔

”یہ کیا کر رہے ہو؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟“ ادھر خالہ بتول کی وہائیاں۔

”ہائے ہائے۔۔۔ میرے پوترے کو ماروے گا یہ منڈا۔“

”سعد سن نہیں رہے تم؟“

امی بھی وہیں کھڑی کھڑی غصے سے چلائی تھیں اور میں مارتے مارتے اب اسے نیچے گرا چکا تھا۔

”اب بولے گا اب کرے گا بوا اس؟“

قریب تھا کہ میں نیچے گرے علی پہ پیٹھ کے اس کا گلا دبا دتا کہ آخر ابو اور ماموں اور شاید دو تین اور بھی کوئی

لوگ تھے مجھے کھینچ کر، تھینے میں کامیاب ہو گئے۔
”چھوڑوں گا نہیں میں اسے۔“

میں ابھی تک کسی بے قابو پھرے ہوئے سائڈ کی طرح خود کو چھڑا کے ایک بار پھر علی پہ پل پڑنے کی تک دود میں تھا کہ ابو کے زوردار طمانچے نے میرے ہوش ٹھکانے لگا دیے۔

جھاگ کی طرح بیٹھ کے اب میں گل پہ ہاتھ رکھے ڈری ڈری نظروں سے سب کے چروں کے سوال بڑھ رہا تھا۔ ایک نظریے نیچے گرے علی پہ ڈالی جو لیروں لیر کرتے کے ساتھ کراہ رہا تھا۔

”سعد۔۔۔ دلغ خراب ہو گیا ہے کیا تمہارا؟ یہ کیا حرکت تھی۔“ ابو نے گرج کے پوچھا۔

”وہ۔۔۔ علی۔۔۔ علی نے۔۔۔“

مجھے اب سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا جواز پیش کروں۔
”ابو علی اس کو چھیڑ رہا تھا۔“ اچانک مجھے سامنے بلی نظر آئی تو میں نے اس کی جانب انگلی کا اشارہ کر دیا۔
”وہ اس کے بارے میں بری بری باتیں کر رہا تھا۔“

تو مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔

۔۔۔ سے جو اس لیے جا رہا ہے۔ تیری تو میں۔۔۔

۔۔۔ سے جو اس لیے جا رہا ہے۔ تیری تو میں۔۔۔

۔۔۔ سے جو اس لیے جا رہا ہے۔ تیری تو میں۔۔۔

۔۔۔ سے جو اس لیے جا رہا ہے۔ تیری تو میں۔۔۔

۔۔۔ سے جو اس لیے جا رہا ہے۔ تیری تو میں۔۔۔

۔۔۔ سے جو اس لیے جا رہا ہے۔ تیری تو میں۔۔۔

۔۔۔ سے جو اس لیے جا رہا ہے۔ تیری تو میں۔۔۔

۔۔۔ سے جو اس لیے جا رہا ہے۔ تیری تو میں۔۔۔

۔۔۔ سے جو اس لیے جا رہا ہے۔ تیری تو میں۔۔۔

۔۔۔ سے جو اس لیے جا رہا ہے۔ تیری تو میں۔۔۔

۔۔۔ سے جو اس لیے جا رہا ہے۔ تیری تو میں۔۔۔

۔۔۔ سے جو اس لیے جا رہا ہے۔ تیری تو میں۔۔۔

۔۔۔ سے جو اس لیے جا رہا ہے۔ تیری تو میں۔۔۔

۔۔۔ سے جو اس لیے جا رہا ہے۔ تیری تو میں۔۔۔

۔۔۔ سے جو اس لیے جا رہا ہے۔ تیری تو میں۔۔۔

”مجھ سے شادی کرو گے؟ عمر دیکھی ہے اپنی انیس سال کے ہو ابھی اور تمہاری اسٹڈیز بھی مکمل نہیں ہوئی باتیں اور شوق دیکھو اپنے۔“ وہ باقاعدہ لعنت ملامت کرنے لگی۔

”تو تم کچھ سال انتظار کر لو۔“

”کیوں کروں میں انتظار میں سالار کو پسند کرتی ہوں۔ کل میری شادی ہے اس سے سمجھے؟“

”کیا نظر آ رہا ہے تمہیں سالار میں؟“ بے بسی کے احساس سے کچلا میں رو ہی پڑا۔

”اتنا بڑا ہے وہ تم سے عمر میں۔۔۔ وہ تمہیں مجھ سے زیادہ پیار بھی نہیں دے سکتا۔“

”ہاں ہو سکتا ہے وہ مجھے تم سے زیادہ پیار نہ دے سکیں مگر وہ مجھے وہ تحفظ دیں گے جو تم کبھی نہیں دے سکتے۔ ابھی تو تم خود کو سنبھالنے کے قابل نہیں ہو بات بے بات تمہارے آنسو نکل آتے ہیں۔ گڑ گڑانے لگتے ہو۔۔۔ میں سالوں سے تمہارے آنسو صاف کرتی آرہی ہوں اور سالار۔۔۔ وہ میری آنکھ میں ایک آنسو نہیں دیکھ سکتے۔“

وہ ایسے گن گن کے میری کیمیاں اور سالار کی خوبیاں حتمی تھی کہ میں اور شدت سے رونے لگا۔

”دیکھو۔۔۔ دیکھو تم پھر سے رو رہے ہو۔“

اس کے استہزائیہ انداز میں بازو موڑ کے اپنی آستین کے کف سے آنسو پونچھنے لگا۔

”تم تو اتنے چھوٹے اور ناتجربہ ہو سعد۔۔۔ کہ ابھی تک محبت کا مطلب تک نہیں جانتے۔ تمہیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ پیار کوئی من پسند کھلونا نہیں ہے جو بچوں کی طرح اڑیاں رگڑ کے ضد کر کے یا پھر رو دھو کے پالیا جائے۔“ اس کے طعنوں تشنوں نے مجھے غصہ دلادیا۔

”تم کون ہوتی ہو یہ فیصلہ سنانے والی کہ مجھے پیار کا مطلب آتا ہے یا نہیں۔۔۔ بچہ ہوں میں ٹھیک ہے۔ اب یہ بچہ ہی تمہیں بتائے گا کہ وہ کیا کر سکتا ہے۔“

”اچھا کیا کر لو گے تم؟“

میں اس کے سوال پہ ایک لمحے کے لیے چپ ہوا۔

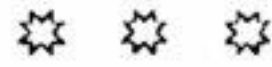
اچھائی نہیں جاتیں۔“

اور مجھے کمرے میں دھکیل کے آخری دھمکی دی۔

”خبردار جواب تم کل تک اس کمرے سے نکلے۔“

دروازہ بند ہونے کے بعد میں ڈھے سا گیا اور بیڈ پہ جا گرا۔ آج کی رات بس ایک آخری رات۔

یہ ایک واحد موقع ہے میرے پاس جو کرتا ہے آج کی رات کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پرانی ہو جائے گی۔ کچھ دیر میں وہیں پڑا نیچے سے آنے والے ہنگاموں پہ کان دھرے رہا جب سارا شور دم بڑا۔۔۔ حتیٰ کہ گاڑیوں کے اشارٹ ہونے اور گیٹ سے نکلنے کی آوازیں بند ہوئے بھی گھنٹہ گزر گیا۔ تو میں چپکے سے اپنے کمرے سے نکلا۔



سالار کا فون مسلسل بزنڈل رہا تھا۔ اور ام ہانی اس گھنٹے میں یہ چوتھا سب سے کمر رہی تھی۔

”سالار۔۔۔ پلیزیات کو سمجھیں۔۔۔ میں کیسے آؤں۔۔۔ گھر میں اتنے مہمان ہیں۔ شادی والے دن کتنا مشکل ہو گا نکلنا۔۔۔ میں آپ کو منالوں گی۔ جو کہیں گے ویسا کروں گی۔ وعدہ آپ پلیزی مجھے ایسے نہ ستائیں۔۔۔ اتنی کڑی شرط نہ۔۔۔“

دروازہ کھلنے کی آواز پہ وہ بری طرح ہڑبڑا کے پلٹی اور مجھے دیکھ کے فون ایک جانب رکھ دیا۔

”سعد۔۔۔ کیا کرنے آئے ہو تم؟ ابھی اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے میری برداشت کی حد ویسے ہی ختم ہو چکی ہے۔“

”مجھ سے بھی اب اور برداشت نہیں ہو رہا۔“ اس کے غصے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے میں آگے بڑھتا رہا۔

”میرا دل پھٹ رہا ہے ہنی۔۔۔ میں تمہیں کسی اور کا ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ خدا کے لیے یہ مت کرو۔۔۔ نہ کرو یہ شادی میں ہوں ناں۔ میں تم سے شادی۔۔۔“

”یا گل تو نہیں ہو گئے تم۔۔۔“ وہ زور سے چلائی تھی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

کوئی جواب نہ تھا۔ میرے پاس واقعی میں کیا کر سکتا تھا لیکن اس وقت اس کی سچی باتوں نے مجھے اتنا کم تر محسوس کروا دیا تھا کہ مجھے کچھ تو کہنا تھا، کوئی دعوا تو کرنا تھا چاہے کھوکھلا ہی سہی۔

”تمہارے اس سالار کو تو میں دیکھ لوں گا۔ کیسے لاتا ہے بارات اور کیسے لے کر جاتا ہے تمہیں مجھ سے دور۔“

”سعد۔“

میرے اس کھوکھلے دعوے اور بے جان سی دھمکی بھی وہ اتنی حراساں ہوئی کہ اس کا زرد چہرہ اور پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھ کے میری کلی انا کو تسکین سی ملی بڑا بچہ سمجھ رہی تھی ناں مجھے، کیسے اوسان خطا کر دیے میں نے، مجھے مزا آنے لگا اسے ڈرانے میں۔

”بڑا اترا رہی ہونا اس پہ۔۔۔ میں بتا رہا ہوں ہنی۔۔۔ تیرے ہوتے ہوئے تم کسی اور کی نہیں ہو سکتیں، میں پتہ چھو کر سکتا ہوں۔ جان دے بھی سکتا ہوں جان۔۔۔“

”تو۔۔۔ جاؤ یہاں سے۔۔۔ دفعہ ہو جاؤ۔“ وہ

نہت سے چلائی تھی۔
دنی اور یہ بات کرتا تو مجھے غصہ آتا۔ مگر تم سے سن کے شرم آ رہی ہے کہ کبھی تمہیں دوست جانا تھا میں نے۔۔۔ نکل جاؤ میرے مرے سے۔ اور میری زندگی سے بھی۔“

اس کا وہ ڈر جو مجھے لطف دے رہا تھا۔ بس چند لمحوں کا مہمان تھا اور بس اب پھر وہی نفرت بے پناہ نفرت میں پھر سے رو پڑا تھا شکست کے بھرپور احساس نے مجھے گھٹنوں کے بل کر دیا تھا۔

”ہنی۔۔۔؟“

میرے سسک کے کہنے پہ وہ پھر سے چلائی۔ اسی شدید نفرت کے ساتھ۔

”کبھی بھی مجھے ہنی کہہ کر مخاطب نہ کرنا۔ تم یہ حق کھو چکے ہو۔۔۔ بلکہ مجھے میرا اصل نام لے کر بھی مخاطب نہ کرنا اور۔۔۔ اور سعد رضوان شاہ ہو سکے تو کبھی مجھے بنا نام کے بھی مخاطب مت کرنا کبھی ملنا تو ایسے

جیسے دو اجنبی ملتے ہیں۔“
زہر کے چھینٹے مجھ پہ اچھال کے وہ رخ موڑ کے کھڑی ہو گئی۔ میں ہارے ہوئے انداز میں اسے حسرت سے دیکھتا رہا۔

کل تک جو ہلکی سی امید میرے اندر سانس لے رہی تھی کہ وہ میری محبت پہ ایمان لے آئے گی۔ آج اس امید نے آخری سسکی لے کر دم توڑ دیا۔
میں اسے کھونے نہیں والا تھا۔

میں اسے کھو چکا تھا۔
اٹنے قدموں میں اسے حسرت بھری نظروں سے دیکھتا وہاں سے نکل آیا اور باقی کے آنسو اپنے کمرے میں آکے بہائے۔

روتے روتے تھک گیا تو بیگ نکال کے اس میں کپڑے ٹھونسے لگا۔ میں اسے کسی اور کا ہونے سے روک نہیں سکتا تھا۔ مگر کسی اور کا ہوتے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔

بس یہ ایک تھا جو فی الحال میرے بس میں تھا کہ میں یہاں سے دور چلا جاؤں۔۔۔ کم از کم اس ایک دن کے لیے۔۔۔ جب وہ میری آنکھوں کے سامنے سالار کے ساتھ چلی جاتی۔

اتنا حوصلہ کہاں سے لاتا، بچا ہی کہاں میرے پاس جو تھوڑی بہت ہمت تھی وہ مجتمع کر کے یہاں سے نکلنے لگا۔ گیٹ سے نکلتے ہوئے میں نے مڑ کے دیکھا تھا۔ ہنی کے کمرے کی کھڑکی کے پردے گرے ہوئے تھے اور ان کے اس پار گھپ اندھیرا تھا۔

”کہاں جا رہا ہے سعد۔۔۔ سن تو۔“ لنگڑاتا لڑکھڑاتا علی مجھے پکارتا پیچھے آ رہا تھا۔
”کہیں بھی۔۔۔ تجھے کیا؟“

”میں نے مڑ کے دیکھا تو اس کے چہرے پہ نظر آتے مار پیٹ کے نشان مجھے ندامت میں بھگو گئے۔“
”مگر کیوں؟ شادی ہے کل۔“

”اسی لیے تو۔“ میں بدستور چلتا رہا۔ اور وہ میرے پیچھے پیچھے۔
”مجھ سے ناراض ہو کے؟“

وہ لپک کے سامنے آگیا اور میرا راستہ روک لیا۔
مجھے ہنسی آئی چاہیے تھی اس کی اس درجہ خوش گمانی
پہ۔ مگر اس کی سادگی بہ رونا آگیا۔

”دیکھ تو اور مار لے۔ نکال لے غصہ مگر قسم سے
میں نے بلی کو نہیں چھیڑا تھا تجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔“
”علی۔ ہٹ جا سامنے سے۔“

”نہیں میں تجھے ایسے ناراض ہو کے نہیں جانے
دوں گا۔“

”نہیں علی۔ میں تجھ سے ناراض نہیں ہوں۔“
میں نرم سا پڑ گیا اس کے سامنے۔

”اور سوری یار۔۔۔ رات تمہیں خواہ مخواہ ہی۔۔۔ پتا
نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے بہنی سے بھی میں نے ابھی اتنی
فضول بکو اس کر دی۔ جو نہیں کرنی چاہیے تھی لگتا ہے
میں پاگل ہو رہا ہوں۔۔۔ اسی لیے جانا چاہتا ہوں تاکہ
شادی کے موقع پہ مجھ سے پھر کچھ الٹی سیدھی حرکت
نہ ہو جائے۔“

”مگر تو جائے گا کہاں؟“

”ہاسٹل یا کسی دوست کے پاس اور ہمیشہ کے لیے
نہیں جا رہا واپس آ جاؤں گا خود ہی ایک دو روز میں مگر
وعدہ کرتا کسی کو نہیں بتائے گا کہ میں کہاں ہوں۔ ابو کو
تو ہرگز نہیں۔“

”مگر تو جا کیوں رہا ہے اور تیرے بغیر یہ شادی کیسے ہو
گی آخر؟“ اس کی بے تکلی بات نے مجھے پھر سے تاؤ دلا
دیا۔

”کیوں میرے بغیر کیوں نہیں ہو سکتی؟ میرے
ساتھ ہو رہی ہے کیا؟“

ہاتھ سے اسے بری طرح اپنے سامنے سے ہٹاتا
میں وہاں سے نکلا تو پو پھنسنے والی تھی۔



”ام ہانی بیٹا۔“

تاکہ اس کا عروسی لباس اور زیورات کے ڈبے
اٹھائے اندر داخل ہو میں تو اسے خلاف توقع اور
خلاف معمول سوٹایا۔

”ام ہانی۔۔۔ بیٹا آج اتنی دیر تک سووگی، اٹھو بیٹا۔“
وقت کم ہے اور کام زیادہ۔۔۔ بلی کے ساتھ پارلر بھی جانا
ہے تمہیں۔“

اور پاس آنے پہ اسے جگانے کی نیت سے جیسے ہی
چھو اتو چونک اٹھیں وہ بری طرح تپ رہی تھی۔

”یا اللہ اتنا تیز بخار۔۔۔ اٹھو ام ہانی تمہیں تو سخت
بخار ہے پھٹک رہی ہو۔ اٹھو ناشتا کرو تو میں تمہیں
دواؤں ذرا طبیعت سکھلے تو پھر ہی بھیج سکوں گی پارلر۔“

ام ہانی کراہ کے اٹھی اور سب سے پہلے جلتی بلتی
آنکھوں کے ساتھ تکیے کے نیچے سے زن نکال کے
دیکھا۔۔۔ سالار کو بھیجے کسی مہیج کا کوئی جواب نہیں
تھا۔



اماں پریشان نظروں سے سالار کے کمرے کی حالت
دیکھ رہی تھیں۔۔۔ خالی بوتلیں لڑھکتے گلاس۔

اور خود وہ بے سدھ پڑا تھا۔

”سالار یہ کیا حرکت ہے۔ آج تمہاری زندگی کا اتنا
اہم دن ہے کچھ تو خیال کرتے۔۔۔ ساری رات پیٹے
رہے کیا؟“

”وہ اسے بری طرح جھنجھوڑ رہی تھیں مگر اس کی
مدھوشی ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔“

”سالار۔“

بہت پکارنے۔۔۔ بہت جھنجھوڑنے پہ اس نے
بمشکل آنکھیں کھولیں۔ وہ اس کی سرخ انگارہ

آنکھیں دیکھ کے ڈر کے تھوڑا سا پیچھے ہٹیں۔ عام
حالات میں ہی وہ خاصا بد لحاظ ہوتا تھا تو لڑنے میں تو۔۔۔

”میں تو تمہیں بتانے آئی تھی کہ ام ہانی کی مائی کا
فون آیا تھا۔“

وہ کرنٹ کھا کے اٹھ بیٹھا۔ سب سے پہلا خیال
یہی آیا کہ کہیں ام ہانی نے خود کشی نہ کرنی ہو اب یاد آیا

کہ کل سے اسے کیسے کیسے خوفناک اور دھمکی آمیز
پیغام بھیجے تھے۔

”بتا رہی تھیں کہ ام ہانی کو تیز بخار ہے۔“

”اوہ۔“

وہ پرسکون ماہو کے دوبارہ لیٹ گیا اور اماں بیماری کی خبر پہ اس کا اطمینان بھرا سانس لینے پہ حیران رہ گئیں۔ پھر وہ ڈگمگاتا ہوا اٹھا اور الماری سے کپڑے نکالنے لگا تو اسے قدرے معمول پہ آنا دیکھ کے اماں کی جان میں بھی جان آئی۔

”تیار ہونے لگے ہو؟ ماشاء اللہ مجھے تو کبھی کبھی لگتا تھا تمہیں دلہا بنے دیکھے بنا ہی میں اس دنیا سے چلی جاؤں گی۔ مگر خدا کا کرم ہے۔ اس نے یہ دن دکھایا۔“ وہ بے تاثر چہرے اور سرد انداز کے ساتھ کوٹ سے ٹائی میچ کرتا امن کو سن رہا تھا۔

”آج تمہارے ابو زندہ ہوتے تو تمہیں دلہا بنے دیکھ کے وہ بھی بہت خوش ہوتے۔“

سالار نے ہاتھ میں پکڑا سوٹ غصے سے دور فرس پہ اچھال دیا اور دھاڑا۔

”آپ نے قسم کھا رکھی ہے ہر موقع پہ میرے سکون کو برباد کرنے کی؟ جان بوجھ کے آپ مجھے تکلیف دیتی ہیں۔“

”سالار میں تو۔۔۔“

وہ گڑبڑا کے وضاحت دینے لگیں۔

”کتنی بار کہا ہے آپ سے۔۔۔ مت کیا کریں اس شخص کا ذکر میرے سامنے اگر آپ کو اتنی ہی یاد آتی ہے ان کی تو اپنے کمرے کی تنہائیوں میں ان کو یاد کر کے رو لیا کریں۔“

وہ خاموشی سے آنسو پتی وہاں سے جانے لگیں اور سالار نے اندر کی تپش پہ چھینٹے مارنے کے لیے ایک اور بوتل کھول لی۔

”کسی کو بتا کے بھی آیا ہے یا نہیں؟“ شعیب تشویش سے پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔“

بہت دقت کے بعد میں یہ مختصر جواب دینے کے قابل ہو سکا۔۔۔ دل ہی نہیں چاہ رہا تھا اس کے کسی

سوال کا جواب دینے کو۔

”غلط کیا سعد۔۔۔ وہ سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

”کسی کو میرا خیال بھی نہیں آئے گا۔ ابو نے خود مجھے کمرے سے نہ نکلنے کی تاکید تھی اور آج سارا دن سب بہت مصروف رہیں گے۔“

پھر میں نے جیب سے فون نکال کے اسے آف کرتے ہوئے سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا۔

”اور جب تک خیال آئے گا۔ تب تک بہت وقت ہو چکا ہو گا۔ شادی کے عین وقت کوئی مجھے ڈھونڈنے یا واپس لانے کے لیے نہیں نکلے گا۔“

شعیب میرے برابر بیٹھ گیا اور میرے کاندھے پہ ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے خلوص سے کہنے لگا۔

”مرد بن کے حالات کا سامنا کرتے ہیں۔ ان سے فرار نہیں ہوتے سعد۔“

مگر میں اس کے مخلصانہ مشورے پہ بھی تڑپ اٹھا۔

”ہاں تو بھی دے لے مجھے مردانگی کا طعنہ۔ کیا مردوں کے سینے میں دل نہیں ہوتا؟ اس دل میں درد نہیں ہوتا؟ اور کیا یہ درد ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں لا سکتا اور۔۔۔ اور جو روتے ہیں۔ کیا وہ محبت نہیں کر سکتے۔“

سالار نشے میں دھت لڑکھڑاتا ہوا کار تک آ رہا تھا جہاں اماں پہلے سے تیار اس کی منتظر تھیں۔ اسے اس حال میں دیکھ کے وہ دلکھی سے زیادہ پریشان ہو گئیں کہہ بھی نہیں سکتیں تھی کچھ نہ ٹوک سکتی تھیں کہ وہ برامان کے جانے سے انکار ہی کر دیتا تو کیا کر لیتیں بھلا مگر یہ سوچ سوچ کے ان کی روح ضرور فنا ہو رہی تھی کہ وہاں جانے تک بھی اس کا نشہ نہ اترتا تو اس حال میں دیکھ کے سب لوگ کیا کیا باتیں بنا میں گے۔

”آپ میرے ساتھ نہیں جائیں گی۔ دوسری گاڑی میں جائیں۔“

[[کون 78 اکتوبر 2015]]

”ماشاء اللہ کتنا نکھار آیا ہے۔“ نائلہ نے اس کا ماتھا چوما۔

”اوہو بخار ابھی بھی ہے۔۔۔ مہ پارہ اسے ایک اور خوراک دے دینا دو اکی مگر دودھ کے ساتھ۔“

”یہ سعد کہاں سے بھا بھی صبح سے نظر نہیں آیا۔“ مہ پارہ کے پوچھنے پر وہ لہجہ فکرمندی ہو گئیں۔

”پتا نہیں میں سمجھ رہی تھی رضوان نے ڈانٹ کر کمرے میں بند کیا ہے تو احتجاجاً نہیں نکل رہا اب جا کے دیکھا تو وہ ہے ہی نہیں۔۔۔ نہ کمرے میں نہ حویلی

۔۔۔ نہ جانے کب نکلا کسی کو نہیں پتا۔“ ام ہانی بلا وجہ ہی سر جھٹکا کے اپنی مہندی رچی ہتھیلیاں دیکھنے لگی۔

”کمال ہے فون کرنا تھا بھا بھی۔“

”تو کیا نہیں کیا ہوگا؟ مگر فون آف مل رہا ہے۔“

”یا اللہ۔۔۔ یہ لڑکا۔“

ام ہانی کو اس ذکر سے وحشت ہونے لگی۔ دل چاہا ہاتھ جوڑ کے خاموش کرادے ان دونوں کو۔

”اللہ گجرے آئے یا نہیں۔“

بیلی افراتفری میں اندر داخل ہوئی ہمراہ خالہ بتول بھی تھیں۔

”کڑیو۔۔۔ نیاز تیار رہا ہے بارات گھنٹہ پہلے نکل چکی ہے۔ آنے والے ہوں گے وہ لوگ۔۔۔ جا کے نیچے تیار کر دو۔“

”دیکھو تو کیسی لگ رہی ہیں ہانی آپ۔“ بیلی نے اشتیاق سے گھونگھٹ میں جھانکا۔

”میں ذرا جا کے رضوان سے کہوں۔ ایک بار پھر سعد کی خبر لیں۔“ نائلہ مہ پارہ کو لیے کمرے سے نکلیں۔

”اف۔۔۔ قیامت آفت۔“

ادھر بیلی اسے دیکھ دیکھ کے جھوم رہی تھی۔ خالہ بتول نے اس کے سر پر ایک چپت لگا کے خاموش کرایا۔

”ماشاء اللہ کہتے ہیں۔۔۔ بے عقل۔۔۔ بے ہدایتی۔۔۔ دلہن ہو یا دلہا۔ نظر فوراً لگ جاتی ہے اس دن ہر

اس کی آواز تک میں نشہ ڈول رہا تھا۔“

”مگر سالار۔۔۔ پہلے ہی تمہارے کہنے پر میں نے سب مہمان کو براہ راست ہی ہانی کی حویلی پہنچنے کا کہہ دیا ہے حالانکہ بارات کو قرینے سے جانا چاہیے تھا پھر بھی

۔۔۔ اب کم از کم تم مجھے تو۔۔۔“

مگر وہ ان کی بات نظر انداز کرتا اب ڈرائیور پر برس رہا تھا۔

”منہ کیا دیکھ رہے ہو میرا۔ نکالو گاڑی۔“

”تم خود ڈرائیور کرو گے؟“

وہ اس کا ارادہ بھانپ گئیں جبکہ وہ ان کا سوال ان سنی کرتا جیب میں کچھ ٹٹول رہا تھا۔

”سالار ضد مت کرو۔ تمہاری حالت نہیں ہے خود کار ڈرائیو کرنے کی۔ تم نہیں چاہتے کہ میں تمہارے ساتھ جاؤں۔ ٹھیک ہے میں دوسری گاڑی میں چلی آتی ہوں لیکن تم ڈرائیور کو ساتھ لے لو بیٹا۔“

سالار نے جیب سے ایک لفافہ نکال کے ان کی جانب بڑھا دیا۔ سرد مہری امنڈ امنڈ کے چھٹک رہی تھی۔

”میری شادی کا تحفہ آپ کے لیے۔“

”یہ کیا ہے؟“ وہ حیران تھیں۔

”آپ کا ٹکٹ امریکہ کے لیے کل صبح کی سیٹ ہے۔“

”سالار؟ اتنی جلدی آج رات دلہن گھر آرہی ہے اور میں صبح ہی امریکہ چلی جاؤں۔“

”میری دلہن آرہی ہے۔ میرے لیے آرہی ہے آپ کے رکنے کا کوئی مطلب نہیں ہے۔“

اتنا کہہ کر وہ لا تعلقی سے مڑا اور دوسری گاڑی میں بیٹھ گیا۔ یہ دیکھے بنا کہ ماں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ ہی اسے آنسوؤں میں بھیگی دعائیں دے رہی تھی۔

کچھ پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھی۔

ام ہانی کے چہرے کی سوگواری اور بڑھڑکی دلہناپے کے سنگھار میں بھی چھپ نہیں پارہی تھی۔

میں روئی ڈالے صم بکم بیٹھا تھا۔
 ”فون سننا نہیں ہے تو آف ہی رہنے دیتے پہلے کی
 طرح کان پکادے تو نے۔“ وہ ٹرے میرے سامنے
 رکھتے بڑبڑایا۔

”بند تھا۔ مگر تب عجیب بے چینی تھی۔ اب بار بار
 آنے والی فون کالز اور میسجز سے اتنا تو ہتا چل رہا ہے
 کہ وہاں میری کمی محسوس ہو رہی ہے۔ کوئی اتنے
 ہنگامے پہنچل اور مصروفیت میں بھی مجھے یاد کر رہا ہے۔
 پتا نہیں وہ یاد کر رہی ہے یا نہیں۔ پتا نہیں اسے اپنے
 کٹھورین کا احساس ہوا کہ نہیں۔ پتا نہیں وہ مجھے فون
 کرے گی یا نہیں۔“

”سعد۔ تم تم ازیت پسند ہو۔“
 ”نہیں۔۔۔ ہوتا تو یہاں نہ آتا۔۔۔ وہاں رہ کے خود کو
 شوق سے ازیت دیتا اسے کسی اور کی دلہن بنا دیکھ
 کے۔“

”بے حس انسان۔ خود کو نہیں۔ تم خود سے وابستہ
 لوگوں کو ازیت دے رہے ہو سوچو ان سب کا کیا حال ہو
 رہا ہو گا۔“ تبھی دوبارہ فون بج اٹھا۔
 ”تم نے نہیں کرنی تو نہ سہی۔۔۔ میں کرتا ہوں بات
 ۔“ میں تڑپ کے اٹھ بیٹھا اور فون کی جانب بڑھتے
 شعیب کو روکا۔

”خبردار جو تم نے انہیں میرے بارے میں کچھ بھی
 بتایا تو۔“

”بتاؤں گا۔“ وہ میری دوہمکی کو خاطر میں نہ لایا۔
 ”ویسے بھی اب کونسا وہ شادی کے وقت سب چھوڑ
 کے اتنی دور تمہارے خڑے اٹھانے آئیں گے۔ کم از
 کم میں انہیں اتنی تسلی تو دے دوں۔۔۔ کہ تم خیریت
 سے ہو۔“

اب کے میں نے نہ روکا۔۔۔ دل میں خیال سا آیا۔
 امی کا ابو کا واقعی شادی کی خوشی بھی نہ ڈھنگ سے منا
 رہے ہوں گے وہ۔ چلو ان کو یہ سکون تو ملے۔

”ہیلو۔۔۔ جی السلام علیکم جی میں سعد کا دوست
 ہوں۔ شعیب جی وہ سو رہا ہے اس کی طبیعت ٹھیک
 نہیں ہے۔ جی جی کہہیے کیا؟ اوہ کب؟ کون سے

پل بھاری ہوتا ہے۔“
 پھر ان کی نظر کھلی کھڑکی پہ جا پڑی رات کی سیاہی
 میں سرخی سی کھل رہی تھی۔

”یا اللہ خیر کیسی لال آندھی اٹھی ہے۔ یہ تو شر ہے
 نرالال آسمان سے تو ہنا مانگنی چاہیے۔“
 باہر نالکہ بھی رضوان سے فکر مندی جتلا رہی
 تھیں۔

”اتنا خراب موسم۔ پتا نہیں کہاں منہ پھلا کے
 بیٹھا ہو گا آپ بھی حد کرتے ہیں اتنا ڈانٹنے کی کیا
 ضرورت تھی۔“

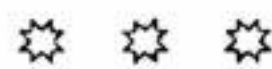
”تو ڈانٹ کھا کے وہ کونسا سدھر گیا۔ اب دیکھ لو نئی
 حرکت یہ کوئی موقع ہے ایسی اموشنل بلیک میلنگ کا
 ۔ ان سب کاموں کو دیکھیں ہم یا اسے ڈھونڈ کے اس
 کے آگے ہاتھ پیر جوڑ کے منا کے لائیں۔ ذرا فارغ ہو
 نوں پھر اس کی طبیعت صاف کرتا ہوں۔ آئندہ مجال
 نہیں ہوگی اس کی کہ یہ ڈرامے کر سکے۔“

”اچھا۔۔۔ کرتے رہے گا۔ ابھی تو ایک بار پھر کال
 ملائیے۔ سب لوگ بار بار اس کا پوچھ رہے ہیں۔ امہالی
 کچھ کہہ نہیں رہی مگر اسے بھی کمی محسوس ہو رہی ہو
 گی سعد کی۔۔۔ اس کی خاطر ہی اس گدھے کو واپس
 بلا لیں۔“

”اچھا بھی تمہارے کہنے پہ کرتا ہوں ایک بار۔۔۔
 مگر یہ تم اسے شہہ دے رہی ہو۔ اس بار اچھا ہوتا کہ
 اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیا جاتا ذرا سا بھی احساس
 ہوتا۔“

انہوں نے ابھی فون جیب سے نکالا ہی تھا کہ بج
 اٹھا۔

”اوہ۔ ایک منٹ۔۔۔ سالار کی والدہ کی کال سے ہیلو
 جی۔“ اور کچھ ایسا سنا انہوں نے کہ رنگت فق ہو گئی۔
 ”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔“



شعیب میس سے کھانا لے کر اندر داخل ہوا تو
 سرہانے رکھا فون مسلسل بج رہا تھا اور میں جیسے کانوں

ہسپتال۔“

ہسپتال کا سنتے ہی میں اٹھ گیا اور اس کے پاس چلا آیا۔

”جی ٹھیک ہے وہ آتا ہے ابھی۔“

چہرے پر پریشانی کا واضح تاثر لیتے وہ فون بند کرتا میری جانب پلٹا۔

کون سے ہسپتال؟ بڑے دادا گزر گئے؟“

شعیب نے ایک ملامتی نگاہ مجھ پر ڈالی اور بتایا۔

”بارت لاتے ہوئے سالار کا ایک سیڈنٹ ہو گیا

ہے۔ وہ شدید زخمی حالت میں ہسپتال ہے۔“



اور ایسا پہلی بار نہیں تھا کہ میں نے ہاسٹل سے اپنے قصبے تک کا دو گھنٹے کا سفر کتنے بھر میں کیا ہو، کتنی بار میں کسی افراتفری میں اڑتا ہوا اپنی سے منے گیا تھا۔ اور آج تو جیسے مجھے صرف پر نہیں گئے تھے۔ ان میں سے آگ بھی لگی ہوئی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا وہاں پیسے پہنچا۔

ستے پیسے نہا۔ تنا وقت لگا۔

میں نے وہ سڑک تیز رفتاری سے آتے ٹرکوں اور دیمینوں میں سے پیسے پار کی۔ ہسپتال میں داخل ہونے کے بعد کس سے تفصیل لی تھی اور اس نے کیا روم نمبر بتایا تھا بس میں بھاگتا چلا گیا۔ بھاگتا ہی رہا۔

اس وقت تک۔۔۔ جب تک میری نظر سامنے ان جانے پہچانے چہروں پہ نہ گئی جن پہ ایک انجانی سی دہشت اور خوف اس وقت نظر آ رہا تھا۔

پریشانی سے شہلتے ابو۔۔۔

تسبیح کے دانوں پہ زیر لب کچھ ورد کرتیں امی۔ جائے نماز پہ بیٹھی خالہ بتول اور۔۔۔ اور ام ہانی۔۔۔ دلہن بنی ام ہانی وہ سر جھکائے ہچکیاں لیے رو رہی تھی۔

میں جب اس سے پہلی بار ملا۔ تو وہ یونہی رو رہی تھی اور میں دور کھڑا سیاہ لباس میں ملبوس اس روٹی ہوئی لڑکی کے آنسوؤں کے ساتھ بہتا چلا گیا تھا۔

آج وہ سیاہ لباس کی بجائے سرخ لباس میں تھی۔

مگر میں، میں آج بھی بہہ رہا تھا ڈوبنے سے بچنے کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ آج ہی اس کے آنسو مجھے اندر تک گیلا کر سکتے ہیں۔ میں آج بھی اس کے رونے سے اسی طرح ٹوٹ کر بکھر سکتا ہوں۔۔۔ جیسے پہلی بار بکھر گیا تھا۔

مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ بھلے یہ آنسو وہ سالار کے لیے بہا رہی ہے پھر بھی۔۔۔ پھر بھی میں اس کی آنکھوں میں یہ آنسو نہیں دیکھ سکتا، مجھے سالار کی حالت جاننے کے خوشی ہونی چاہیے تھی۔ جس شادی کو روکنے کے لیے میں نے ہر حربہ آزمایا اور ناکام رہا وہ شادی اب رک گئی تھی اور ہو سکتا ہے کبھی نہ ہو پائے اگر سالار۔۔۔ مگر میں خوش نہیں ہو پا رہا تھا کیسے ہوتا۔۔۔ اسے رلا کے کیسے خوش ہوتا؟

نہیں ام ہانی تمہیں رونا نہیں چاہیے نہ میری وجہ سے نہ ہی سالار کی وجہ سے اگر سالار کے دور جانے سے تم دھبی ہوتی ہو۔ تو ٹھیک ہے۔ سالار کو تم سے دور نہیں ہونا چاہیے۔ بس تم دھبی مت ہونا تم روتے مت روتے روتے۔

میں بس سے چھ قدموں کے فاصلے پہ کھڑا غم آنکھوں سے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ امی مجھے پکارتے ہوئے آنکھیں۔

”سعد آگئے تم۔“

میرا نام سن کے اس کا ہچکیاں لیتا وجود تھا اس نے نظر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ اٹھی اور پھر برق رفتاری سے میری جانب دوڑتی آئی۔ میرے بازو خود بخود پھیل گئے اور دل میں ایک یقین سا اتر آیا۔ کہ تمام تر ناراضیوں۔۔۔ گلے شکلوں کے باوجود آج بھی۔ میری ہنی کو آنسو بہانے کے لیے میرا ہی کاںدھا چاہیے ہمیشہ کی طرح اب بھی وہ میرے ہی گلے لگ کے اپنا غم ہکا کرتی ہے۔

میں اس کے آنسو اپنے اندر اتارنے اور اس کا درد خود میں سمونے کے لیے بازو پھیلائے اس کا انتظار کر رہا تھا جب وہ وہ بھاگتی ہوئی آئی اور ایک زنانے دار تھپتر میرے چہرے پہ دے مارا۔۔۔

”کیوں کیا تم نے ایسا؟ کیوں؟“

میرے بازو بے جان ہو کے میرے پہلو میں آن گئے اور میں بت بنا سے چلا تے دیکھ رہا تھا۔

پھر ایک کے بعد دوسرا۔ دوسرے کے بعد تیسرا تھپڑ وہ مجھے مارتی چلی گئی۔ میرے ساتھ باقی سب بھی حیرت کے اتنے شدید اثر میں تھے کہ اپنی جگہ سے ہل تک نہ سکے۔ وہیں جے ششدر انداز میں اس کی ہڈیانی کیفیت کو دیکھ رہے اور شاید سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے اور تم اس کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہو؟ یہ کیسی محبت ہے سعد؟ محبت تو دکھ نہیں دیتی۔ محبت اعتبار نہیں توڑتی محبت کرنے سے پہلے محبت کرنا تو سیکھ لیتے۔“

میں اس سے تھپڑ کھاتا جا رہا تھا۔ بنا کسی مزاحمت کے اور اب وہ میرا کالر دیوچ کے میرے گریبان کو جھٹکے دے رہی تھی۔

”تمہیں پتا بھی ہے محبت ہوتی کیا ہے؟ محبت صرف پانے کا نام نہیں ہے کہ کچھ بھی کر کے کسی بھی طرح بس پالیا جائے۔ حاصل کر لیا جائے محبت دینے کا نام ہے۔ تاؤ کچھ دینے کا حوصلہ ہے تم میں؟“
روتے روتے وہ ادھ موٹی سی ہو گئی۔ بے جان اور بھر بھری رت کی طرح ڈھے کر نیچے گرتی جا رہی تھی۔ میرا کالر اب بھی اس کی مٹھیوں میں قید تھا تو میں بھی آہستہ آہستہ نیچے ہوتا گیا اور گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گیا جیسا بیٹھی وہ بلک بلک کے دم توڑتی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”بہت غصہ آتا ہے نا۔۔۔ جب میں تمہیں چھوٹا کہتی ہوں لیکن اب تم خود اپنی نظروں میں کتنے چھوٹے ہو گئے ہو اس کا احساس ہے تمہیں۔۔۔ کیوں کیا تم نے ایسا بولو تم سے ناراض ہونے کے باوجود تمہاری سب فضول حرکتوں کے بعد بھی میں تمہارے لیے دعا میں کرتی رہی اور تم۔۔۔ تم نے میری زندگی کی واحد خوشی مجھ سے چھیننا چاہی۔ مار دیا اسے۔ مار

ریا۔“

میرے پیروں تلے زمین نکل گئی اور اگر ابو آ کے اسے سنبھالتے ہوئے یہ بات نہ کہتے تو شاید میں کھڑے کھڑے وہیں خود کو بھی مار ڈالتا۔

”ہانی بیٹا ایسے مت کہو۔ کچھ نہیں ہو اسلار کو۔“
وہ اسے کاندھوں سے تھام کے اٹھانے لگے۔

”معمولی ایک سیڈنٹ تھا۔ ڈاکٹرز تسلی دے چکے ہیں۔ ابھی کچھ دیر میں تم خود اسے صحیح سلامت دیکھ لیتا۔“

یہ سنتے ہی وہ ابو کے سینے لگ کے پھر سے رو دی۔۔۔ ابو نے بہت دھیرے سے میرا گریبان اس کی مٹھیوں سے آزاد کر لیا پھر ایک گہری خاموش نظر میرے چہرے پر نظر آئے اس کے تھپڑوں کے نشان پہ ڈالی۔ مگر امی خاموش نہ رہ سکیں ابھی تک وہ شاید حیرت کے شدید دھچکے کے زیر اثر تھیں مگر جب ام ہانی کی باتوں کا مطلب سمجھ آیا تو پاس آتے ہوئے بلی ہوئی آواز میں مگر شدید غصے میں کہنے لگیں۔

”رضوان۔۔۔ کیا بکو اس کر رہی ہے۔ یہ۔۔۔ یہ صلہ دے رہی ہے یہ ہمارے اتنے سالوں کے احسان کا؟“
یہ سن کے میرے ساتھ ساتھ ہانی نے بھی ابو کے سینے سے سر اٹھا کے بے یقینی سے انہیں دیکھا کیونکہ ان کا یہ انداز۔۔۔ یہ روپ یہ لہجہ سب نیا تھا۔

”کیوں تماشنا بنا رہی ہو اپنا بھی اور ہمارا بھی۔ یاد رکھو کہ تمہارا ہونے والا شوہر اور اس کی ماں بھی یہیں موجود ہیں۔ انہیں بھنگ بھی پڑی تو سعد کا تو کچھ نہیں بگڑے گا تمہیں۔“
”امی پلیز۔۔۔“

میں نے ٹوکا اور پھر انہیں کاندھوں سے تھام کے وہاں سے لے جانے لگا۔ اور اب اب ہانی کو تسلی دے رہے تھے۔

”پریشان ہے نائلہ بھی۔ تم دل پہ مت لیتا اور فکر مت کرو ڈاکٹرز نے اطمینان دلایا ہے کہ سالار کو کوئی خطرناک چوٹ نہیں آئی۔ شاید ایک نہیں تو دو دن میں اس کو ڈسچارج بھی کر دیں گے۔ اور بیٹا سعد کا اس

میں ہی تھی جو جان بوجھ کے ٹالتی تھی۔ یہاں ہوں کیا سعد کے دل کے حال سے انجان رہ سکتی تھی، مگر انجان بنی رہی کہ بات دلی ہے تو دلی رہے۔“
رضوان نائلہ کے اس انکشاف یا اعتراف پہ دنگ رہ گئے۔

”نائلہ۔۔۔ تم جانتی تھی سعد کی چاہت؟“
”ہاں۔۔۔“ انہوں نے تسلیم کیا۔
”مگر یہ چاہت نہیں۔۔۔ اس کا بچپنا تھا۔ ابھی اس کی عمر ہی کتنی ہے اور پھر ہانی۔۔۔ وہ اس سے بڑی ہے کافی، خیر جو ہوا سو ہوا۔ مگر ہانی کو بھی سعد کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا پہلے میرے معصوم بچے کو شہہ دی پھر شادی کے لیے کسی اور پسند کیا۔ اور تو اور اس۔۔۔ اتنا بڑا الزام تک دگاریا۔ کیا میرا معصوم بچہ قابل ہو سکتا ہے۔“

”نہیں نہیں ایسی کوئی تشویش والی بات نہیں ہے۔“ ڈاکٹر سالار کی اماں کو سلی دے رہا تھا۔
”معمولی چوٹیں ہیں ایک دو دن میں ڈسچارج ہو جائیں گے۔“
”دراصل مجھے آج ہی امریکہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ مگر دل نہیں مانتا۔ ملتی تو کر دیا ہے ارادہ۔ بس یہ جانتا چاہتی تھی کہ ابھی اسے میری ضرورت ہے تو میں کب تک رکوں یہاں؟“
”آپ ماں ہیں۔۔۔ آپ کی ضرورت تو انہیں تا عمر رہے گی۔“ ڈاکٹر مسکرایا تھا۔ مگر وہ جواب میں مسکرا تک نہ سکیں۔
”ایکسیڈنٹ تو بہت خطرناک تھا۔۔۔ یہ تو معجزہ ہے کہ ان کو کوئی بہت سیریس انجری نہیں ہوئی۔ لیکن اس طرح ڈرنک ہو کر ڈرائیونگ کرنا ضرور خطرناک ہے۔ انہیں احتیاط کرنی چاہیے۔“
ڈاکٹر کی بات سن کے تو وہ شرمندہ ہوئیں ہی۔ مگر تبھی دروازے پہ اندر آتے آتے ٹھٹک کے رکتی نائلہ کو دیکھ کے تو مارے شرمندگی کے سر ہی جھکا لیا۔

سارے قصے میں کوئی قصور نہیں۔۔۔ سالار نے ابھی خود پولیس کو بیان دیا ہے کہ اس کی تیز رفتاری کی وجہ سے کار ایک ٹرالر سے ٹکرائی تھی اور سعد۔۔۔ وہ تو سیدھا ہاسٹل سے آ رہا ہے۔“

امی کو وہاں سے لے جاتے ہوئے میں نے یہ سب سنا تو۔۔۔ مگر مڑ کے ہانی کے تاثرات دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔۔۔ پتا نہیں اس نے اس سب پہ یقین بھی کیا یا نہیں۔



خالہ بتول کی زبانی سارا واقعہ حویلی کے ایک ایک فرد تک پہنچ چکا تھا۔
”حیرت ہے۔۔۔ یہ سب ہوتا رہا حویلی میں۔۔۔ اور کسی کو پتا ہی نہیں تھا۔“ مہ پارہ کو موقع ملا تھا کھولن نکالنے کا۔

”اور دیں بچوں کو آزادی۔۔۔ میں کچھ کہتی تھی تو آپ میری زبان پکڑ لیتی تھیں۔۔۔ بچے ہیں۔۔۔ بچپن کا ساتھ ہے۔“
”ایک ساتھ بلے بڑھے بچوں میں لگاؤ تو ہو ہی جاتا ہے۔ بلا وجہ بات کا بگڑنا نہ بناؤ۔“ رضوان نے ٹوکا تو وہ بگڑ گئیں۔
”میری تو ہر بات بری لگتی ہے۔ میں ہمیشہ بھابھی کو خبردار کرتی رہی کہ سعد کو دور رکھیں ہانی سے وہ اس پہ چھاتی جا رہی ہے۔ سعد کو کچھ سوچتا ہی نہیں ہانی کے علاوہ اور یہ ٹھیک نہیں ہے مگر۔۔۔“
”مہ پارہ۔“

اس بار رضوان نے ذرا زیادہ سختی سے ٹوکا۔
”گھر مہمانوں سے بھرا ہے کیوں معاملے کو اچھال رہی ہو۔“
”ہونہ۔۔۔“

وہ سر جھٹک کے احتجاجاً وہاں سے چلی گئی۔ اور اب تک خاموش بیٹھی نائلہ نے اس کے جانے کے بعد اس کی تائید کی۔
”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے اور ہمیشہ صحیح ہی کہتی تھی

”اس ایکسیڈنٹ میں تو انہیں کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچا۔ مگر الکو حل انہیں کوئی دوسرا نقصان ضرور پہنچا سکتی ہے کب سے کر رہے ہیں یہ شراب نوشی؟“
نانکہ بچھے دل کے ساتھ پلٹ گئیں مگر پھر وہیں رک کر ان کا انتظار کرنے لگیں دل میں عجیب سے دوسو سے بھی جاگ رہے تھے اور عجیب سی کشمکش اور تذبذب بھی۔

کچھ دیر بعد اماں اسی شرمندگی کے تاثر کو چہرے پہ سجانے لگیں تو نانکہ نے فوراً ”ان کا راستہ روکتے ہوئے پوچھا۔

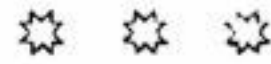
”سالار ایکسیڈنٹ کے وقت نشے میں تھا؟“ وہ خاموش رہیں تو دوسرا سوال۔

”صرف اس وقت؟ یا اکثر رہتا ہے؟“

”شادی کے بعد چھوڑ دے گا آہستہ آہستہ۔“ اماں کا لہجہ پست تھا۔

”ام ہانی بہت اچھی بچی ہے۔ بڑی نیک بخت۔ اس کی سب بری عادتیں پھڑو ادے گی۔“

نانکہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔ اور پھر ایک سرد آہ بھر کے رہ گئیں۔ آنے والے وقت میں نظر آتا موہوم سا خدشہ انہیں اس تلخ سچائی کو پی جانے پہ مجبور کر رہا تھا۔ انہوں نے سالار کی ذات کے حوالے سے سامنے آنے والی اس بد صورت اور کرمہ سچائی کو مصلحت کے پردے سے ڈھانپ دیا۔



آج دو سزاؤں تھا مجھے یہاں۔ جب سے آیا تھا۔ ہاسپٹل میں ہی تھا علی ابو امی سب بار بار مجھے جانے کا کہہ رہے تھے۔ مگر میں میں اتنا بد صورت داغ لے کر یہاں سے کیسے چلا جاتا۔ بتا اسے دھوئے۔

سالار کو خون کی فوری ضرورت تھی۔ وہ میں نے دیا۔ اگر میری جان کی ضرورت پڑتی۔ میں وہ بھی دے دیتا۔

اگرچہ سالار کی نظموں میں میرے لیے ایک سرد مہر بے زاری تھی۔ لیکن میں کسی بھی بات کی پروا کیے

بغیر دن رات اس کی تیمارداری میں مصروف تھا۔ پروا تھی تو اس بات کی کہ ہنی کو لیٹین دلا سکوں کہ مجھے اس کی خوشیاں عزیز ہیں۔ اس کی خوشی کی خاطر میں اسے سالار کا ہوتے دیکھنے کا بھی حوصلہ کر سکتا ہوں۔

وہ سب دیکھ رہی تھی۔ میرا رات بھر جاگنا۔ دن بھر سالار کے روم کے باہر ایک ٹانگہ پہ کھڑے رہنا۔

سب دیکھ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ۔

اور میں بھی سب دیکھ رہا تھا چپ چاپ۔ اس کا سالار کے سرہانے بیٹھ کے آنسو بہاتے دعائیں مانگنا۔ سالار کے ہوش پہ اس کا بھاگ کر اس کے روم میں جانا۔ مگر اب کسک نہیں ہوتی تھی نہ جلن۔

صرف ایک خلش باقی تھی۔ کہ کاش اس رات

میں نے یونہی وہ بے تکیے دعوے نہ کیے ہوتے۔ وہ

کھوکھلی دھمکیاں نہ دی ہوتیں تو ام ہانی کے دل میں پل بھر کے لیے یہ وہم نہ آتا کہ میں ایسا کچھ کر سکتا ہوں۔



وہ سالار کے ہوش میں آنے کے بعد سے اب تک مسلسل اس کے سامنے بیٹھے روئے جا رہی تھی۔ اور وہ مسلسل اسے دیکھے جا رہا تھا۔

”آپ کو کچھ ہو جاتا تو۔“

”تو تم اور زیادہ رو تمیں۔“

”نہیں۔ میں بھی زندہ نہ رہتی۔“

”زندہ نہ رہنے کی خواہش کرنا بہت آسان ہے مگر اس خواہش کو پورا کرنا مشکل۔“ وہ طنز سے مسکرایا تھا۔

”زندہ رہنا پڑتا ہے ہانی۔ جانتی ہو میں نے تم سے

کہا تھا کہ جب تک تم خود چل کے نہیں آؤ گی مجھے

منانے۔ میں کبھی اپنے کے الفاظ سے پیچھے نہیں ہٹا

۔ جو کہہ دیا وہ پتھر پہ لکیر لیکن اس بار میں نے خود سے

کیا عہد توڑنا چاہا۔ میں آ رہا تھا ام ہانی۔ اپنی زبان

سے پھر کے مگر قدرت کو منظور نہیں تھا۔ اس نے

میرے عہد کا بھرم رکھ لیا۔“ ام ہانی نے بے تابی سے

مشکل سے مانی تھیں اب ملک سے باہر بھیجنا چاہتی ہو۔“

”اس کی اور ہانی دونوں کی بہتری کے لیے کر رہی ہوں۔۔۔ ہانی کا گھر کبھی نہیں بس سکے گا اگر سعد یونہی۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ سالار کی اماں اگلے ہفتے جا رہی ہیں امریکہ اس سے زیادہ نہیں رک سکتیں آپ دو تین دن کے اندر سالار کا نکاح پڑھوائیں ہانی سے اور رخصت کریں۔“

”نانکھ تم یکے بعد دیگرے اوٹ پٹانگ باتیں کرتی جا رہی ہو کل صبح سالار ہسپتال سے ڈسچارج ہو رہا ہے اور میں پرسوں اسے بیٹی رخصت کرانے کا کہوں۔“

”پرسوں نہ سہی دو دن بعد۔۔۔ سادگ سے کروادیں۔۔۔ مگر خدا کے لیے اب تاخیر نہ کریں۔ تبھی میری گھبراہٹ اور خوف ختم ہوں گے اور سعد کا پاگل پن بھی ٹھکانے لگے گا۔“

وہ روپڑیوں تو رضوان کچھ مزید نہ کہہ سکے۔



اندر عجیب سی گھٹن ہو رہی تھی تو میں باہر نکل آیا۔ حالانکہ باہر رات کے اس وقت خنکی بڑھ جاتی ہے۔ میں بازو سینے سے بھنچے باقاعدہ ٹھٹھرا رہا تھا جب علی آ گیا۔

”مجھے انکل نے بھیجا ہے یہاں رات رکنے کو۔ تو واپس چلا جا سعد۔“

”نہیں۔۔۔ تمہیں رکنا ہے تو رکو۔۔۔ میں نہیں جاؤں گا۔ جب تک خود سے یہ الزام نہیں دھولیتا۔“

میں ستون سے ٹیک لگا کے کھڑا ہو گیا۔ اور علی سنجیدہ سا ہو کے میرے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کے کہنے لگا۔

”مجھے تو انداز ہی نہیں ہوا سعد۔ اور جب پتا چلا تو۔۔۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔“

”جاننے ہو علی۔۔۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ جب سے اسے دیکھا ہے اس سے محبت کی ہے۔ مگر میں تالائق۔۔۔ بدھو محبت سیکھنا بھول گیا۔

اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”میں اب آپ کو منار ہی ہوں ناں۔۔۔ سوری بھی کہہ رہی ہوں میں نے جان بوجھ کے آپ کو نظر انداز نہیں کیا تھا نہ کبھی کر سکتی ہوں۔ آپ سے اہم میرے لیے کچھ بھی نہیں اور میں نے واقعی آنے کی بہت کوشش بھی کی تھی۔ مگر۔“

وہ پھر سے روپڑی اور سالار اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے مندی دیکھنے لگا جو ابھی بھی مدھم نہیں پڑی تھی۔

”تم نے اپنے ہاتھ پہ مندی سے میرا نام لکھا؟“

ہانی چونک کر اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگی۔ جہاں ہتھیلی کے ابھار پہ ایس لکھا تھا۔ وہ روٹا ہی بھول گئی۔ کم

”کیا تم نہیں جانتی کہ مندی کا رنگ کتنی جلدی پھیکا پڑ جاتا ہے۔ مٹ جائے گا میرا نام۔“

”مگر وہ لکھے نام کو کون مٹائے گا سالار۔“

اس نے سالار کی نظروں سے چھپانے کے لیے مٹھی ہی نور سے بھیج لی۔ جیسے ڈر ہو وہ جان ہی نہ جائے یہ حرف اس کے نہیں کسی اور کے نام کا حصہ ہے جسے اس نے خود لکھا تھا۔



”سعد آج بھی نہیں آیا؟“

نانکھ نے رضوان کو پھر سے اکیلے ہی واپس آتے دیکھا تو تشویش سے پوچھا۔

”نہیں بہت کہا۔ مگر نہیں مانا۔“

”کمال ہے۔ وہاں اتنے لوگ ہیں اس کا خیال رکھنے کو۔ سعد کا کوئی ضروری نہیں ہے ہسپتال رکنا۔ آپ بس کسی طرح اسے واپس بلائیں۔ اس کا اور ام ہانی کا بار بار سامنا ہونا ٹھیک نہیں ہے بلکہ۔۔۔ بلکہ اسے کل ہی دوبارہ ہاسٹل بھیجیں نہیں۔ بیرون ملک بھیج دیں۔“ نانکھ کے گہرائے انداز پہ رضوان حیران ہوئے۔

”نانکھ تم تو دوسرے شہر سے بھیجنے کے لیے اتنی

ہلے سیکھنی چاہیے تھی ناں یا۔۔۔ اب کم از کم اب تو
مجھے سیکھنے دے۔۔۔ کچی کچی سی ہانڈی اتار کے اس کے
سامنے رکھ دی بھول گیا کہ بہت وقت لگتا ہے پھر کو
پارس بننے میں۔۔۔

علی کی نظروں کے تعاقب میں میڑ کے دیکھا تو ہانی
کبل لیے میرے بالکل پیچھے کھڑی تھی۔ نجانے کب
۔۔۔

”نہ لے لو۔۔۔ سردی ہے۔“

”مجھے نہیں لگتی۔“ میں نے دوبارہ رخ پھیر لیا۔

”آتم سوری سعد۔۔۔ مجھے حقیقت جاننے سے پہلے

تمہیں الزام نہیں دینا چاہیے تھا۔“

”کیس نہ کہیں تو میں ہوں ذمے دار۔۔۔ اور قصور

وار بھی میری بددعا میں تمہاری دعاؤں سے اور میری

نفرت تمہاری محبت سے ٹکرا رہی تھی۔ جس خدا

سے تم نے سالار کو پانے کی منت مانی تھی۔ اس خدا

سے میں نے بھی سالار کو تم سے دور کرنے کی منت مانی

تھی۔ شاید اسی لیے۔“ وہ خاموشی سے کبل علی کو

تھما کے چلی گئی۔ وہ رات بھی کٹ گئی۔

صبح سالار ڈسپانچ ہو کے اپنے گھر چلا گیا اور میں دو

راتوں کی تھکن چہرے پہ لیے حویلی لوٹ آیا۔

”سالار چلا گیا کھر؟“

جو گرز اتار رہا تھا جب امی نے اندر آتے ہی بلا

مقصد سوال کیا۔۔۔ جبکہ جواب یہ یقیناً ”جانتی ہیں۔“

”جی۔۔۔“

”چلو اچھا ہوا اب تم کم از کم اس کے پیچھے گھرنہ

چلے جانا ویسے تو ہسپتال بھی اتار کئے کی ضرورت نہیں

تھی۔ خیر اب ذرا احتیاط کرو۔ گھر میں کلنی مہمان ہیں

۔۔۔ مہ پارہ کی زبان کے آگے تو ویسے بھی خندق ہے اور

اوپر سے خالہ بتول کہیں بات پھیل نہ جائے۔“

”کیوں رکے ہیں سب ابھی تک واپس کیوں نہیں

جاتے۔“ میں نے بے زاری سے جاگرز ایک جانب

پھینکے۔

”چلے جائیں گے جس کام کے لیے آئے تھے اب

وہ کام کر کے ہی جائیں گے۔ پرسوں نکاح کے بعد ہم

ہانی کو سادگی سے رخصت کر رہے ہیں۔“

اپنے تئیں یہ انکشاف کرنے کے بعد انہوں نے

بڑی ٹوٹتی اور کریدتی سی نگاہ مجھ پہ ڈالی تھی۔ مگر میں

کمال ہو سیاری سے اپنے اندر کے طوفان کو چھپائے

اب الماری سے کپڑے نکال رہا تھا۔

”اچھا۔“ بڑے سکون سے میں نے فقط اتنا کہا۔

”اور اس سے اگلے دن کی تمہاری سیٹ کنفرم

ہے۔“

ایک جانب سے مطمئن ہوتے ہی انہوں نے اگلا

دھماکا کیا جو کہ یقیناً ”زیادہ بڑا اور چونکانے والا نہیں تھا

کہ ابو مجھے بتا چکے تھے۔ مگر پھر بھی میں زچ ہوا تھا۔

”آپ کیوں چاہتی ہیں ایسا؟ کیوں مجھے گھر سے اور

خود سے دور کر رہی ہیں؟ سزا کے طور پر۔“

”ماں ہوں سعد۔۔۔ اولاد کا ہر رنگ، ہر ڈھنگ

پہنچاتی ہوں۔ تمہیں کیا لگتا ہے میں تمہارے

اشارے کنائے نہیں سمجھتی تھی سب سمجھتی تھی

۔۔۔ سعد۔ مگر ہنس کے ٹالتی تھی تمہاری بے قراریاں

نظر آتی تھیں مجھے اور حماقتیں بھی۔۔۔ مگر چشم پوشی کرنا

لازمی تھا۔“

یہ تھا اصل دھماکا۔۔۔ میں ہل کے رہ گیا۔

”ٹالتی رہی۔۔۔ نظر انداز کرتی رہی۔۔۔ جان کے

انجوان بنی رہی کہ تم کھل کے مجھ سے وہ نہ مانگ لو جو

میں نہ دے سکتی تھی نہ دینا چاہتی تھی۔ اسی لیے تو ہانی

کے رشتے کے لیے اتنی بے چین تھی میں کہ وہ حویلی

سے تمہاری زندگی سے دور ہو جائے تاکہ تم اس کے

اثر سے آزاد ہو جاؤ۔“

”امی۔۔۔“

میں بے یقینی سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔

ایک ایک کر کے بہت سے ماں اور بہت سے بھرم

ٹوٹ گئے۔

”آپ۔ آپ جانتی تھیں۔ تو پھر۔ کیوں؟ مائیں تو

اولاد کی ہر خواہش پوری کرتی ہیں۔“

”یہ خواہش نہیں بچپنا تھا وہ پانچ چھ سال بڑی سے تم

سے۔ تم میرے اکلوتے بیٹے۔ بلکہ اس حویلی کے

اکھوتے وارث۔ تمہیں لڑکیوں کی کیا کمی۔ جب تک تم تعلیم مکمل کر کے اس قابل ہو گے۔ وہ تیس سال کی بچی عمر کی عورت ہوگی۔ میں نے بھی کچھ خواب دیکھ رکھے ہیں تمہارے بارے میں۔ کیا میرے بیٹے کی دلہن بن کے ایک پختہ عمر کی عیتم لڑکی آتی۔“

میں کتنی دیر انہیں افسوس اور ملامت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ اب سارے گلے شکوے فضول تھے۔ جو جھل دل کے ساتھ میں کھنڈر کی جانب اٹلا۔

وہی دیواریں۔ وہی جا بجا لکھے اس کا اور میرا نام۔ کاش جتنا آسان دیوار اور پیڑھے ان دونوں کو ایک ساتھ لکھتا تھا۔ اتنا ہی آسان زندگی میں ان کو ایک ساتھ دیکھنا بھی ہوتا۔

”آئی لو یو۔ آئی لو یو۔“ اپنے ہی کہے الفاظ کی بازگشت مجھے چاروں جانب گونجتی سنائی دی۔ میں نے گھوم کے دیکھا۔

کھائی میں کچھ گرتا نظر آ رہا تھا۔

پھر دھڑام سے کچھ گرنے کی آواز آئی۔

”تمہارے یہ تین الفاظ ان دیواروں سے ٹکرا کے اس کھائی میں جا گرے ہیں۔ ان کی یہی اوقات تھی۔“ میرے کانوں میں ہنسی کی سرگوشی پھنکار بن کر ابھری۔ میں نے جیب سے وہ آخری پتھر نکالا۔ جو بھی اس نے اپنے ہونٹوں سے چھو کے پھینکا تھا۔ اس پتھر کو۔ اس لمس کو اس کھائی میں ان تین لفظوں کے برابر گرا کے میں نے خود کو قدرے ہلکا پھلکا محسوس کیا میں اب دل و دماغ دونوں طرح سے بھرپور تیار تھا پورے حوصلے، کمال ضبط اور وقار کے ساتھ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہارنے کو۔



آج پورے چالیس گھنٹے بعد میں اس کا سامنا کرنے جا رہا تھا۔ یہ چالیس گھنٹے ہم نے ایک ہی چھت کے نیچے گزارے تھے مگر میں دانستہ اس سے کترا رہا تھا۔ لیکن کب تک۔ وہ اس حویلی میں چند گھنٹوں کی مہمان تھی۔

دردانہ کھولنے پہ ہنسی نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ وہ پھر سے دلہن کے روپ میں تھی۔ میں تاب نہ لاسکا اور نظر جھکا کے کہا۔

”میں۔ میں سوری کہنے آیا ہوں ہنسی۔“

”سوری تو مجھے کہنا چاہیے تھا سعد۔“ اس دن بنا سوچے سمجھے سب کے سامنے میں نے۔ ورنہ سالار کو تو زندگی اور صحت شاید ملی ہی تمہاری دعاؤں اور خدمت سے ہے جو تم نے اتنی محبت سے کی۔

”تم ٹھیک کہتی تھی ہنسی۔ یہ شاید محبت نہیں تھی۔ محبت تو اتنی جلدی ہار نہیں مانتی۔ اور میں نے۔ میں نے ہار یاں لی ہے۔ شاید نہیں۔ یقیناً۔“ یقیناً یہ محبت نہیں تھی۔ مگر محبت جیسی کوئی چیز ضرور تھی۔ اور اس چیز نے میرا بڑا نقصان کیا۔ میری سب سے اچھی دوست مجھ سے چھین لی۔“

”ایسا نہیں ہے سعد۔“

”ایسا ہی ہے اور میں اس کے لیے تمہیں الزام نہیں دوں گا۔ قصور وار میں ہوں۔ غلطی میری تھی۔ سزا بھی مجھے ملنی چاہیے۔ اور مل بھی رہی ہے۔ میں جا رہا ہوں ہنسی۔“

”جا تو میں رہی ہوں بدھو۔“ وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔

اور کتنے دنوں بعد اس نے مجھے ”بدھو“ کہہ کر پکارا تھا۔ میں آگے بڑھا اور پیروں کے بل اس کے سامنے بیٹھ کے اس کی گود میں رکھے مہندی لگے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ کتنی بار میں نے ان ہاتھوں کو تھاما تھا۔ سہلایا تھا۔ اور آج چھوتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ وہ شاید میری جھجک کو بھانپ گئی۔ دھیرے سے اس نے خود اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پہ رکھ دیا۔

ایک ممنونیت بھری نگاہ اس پر ڈال کے میں مسکرایا۔

”اچھی لگ رہی ہو۔ امید تو نہیں تھی۔ مگر لگ رہی ہو۔“ اس نے پھر مسکرایا چاہا۔ مگر آنکھیں ساتھ نہ دے پائیں۔ چند آنسو چھلک کے گال پہ بہہ نکلے جن کو انگلی کی پور پہ میں نے چن لیا۔

”نہیں ہنی۔ آج کے بعد رونا مت۔ جب جب تم روو گی۔ مجھے لگے گا تم نے میری غلطی کو معاف نہیں کیا۔ تمہارے آنسو مجھے بد دعا کی طرح لگیں گے۔ کبھی مت رونا ہنی۔ کبھی بھی نہیں۔“

وہ مسکراتے ہوئے انکار میں سر ہلانے لگی اور سارے آنسو جو پلکوں کی منڈیر پر جھانک رہے تھے اپنے اندر اتار لیے۔

”نہیں روؤں گی۔ وعدہ۔“

”دیکھو ہنی۔ میں بھی نہیں رو رہا۔ دل چاہ رہا ہے پھر بھی نہیں۔ تم نے کہا تھا ناں کہ میری آنکھوں میں بروقت آنسو ہوتے ہیں۔ دیکھو۔ اب نہیں ہیں۔ میں نہیں رو رہا۔ نہ کبھی روؤں گا۔ میں بھی وعدہ کرتا ہوں۔“

”بہ سو۔ مجھے یاد بھی نہ کرتا۔ سمجھے؟“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ میں ہنسنے کی کوشش کرتا آہستگی اس کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”تمہاری شادی کے لیے کوئی تحفہ نہیں لے سکا اور تو کچھ ہے نہیں تمہیں دینے کے لیے۔ دعا دے دوں؟“

اس نے ہاں میں سر ہلایا۔ گردن اٹھائے وہ مسلسل مجھے دیکھتی جا رہی تھی۔ میں ذرا سا جھکا اور بہت عقیدت کے ساتھ اس کی پیشانی پہ ایک بوسہ دیا۔

”ہمیشہ خوش رہو۔“

ام ہانی کی آنکھیں بند تھیں اور جب تک کھلیں میں کمرے سے جا چکا تھا اور کھلے دروازے سے سلٹی کی کڑک دار آواز ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ اندر آ رہی تھی۔

تیرے محلوں دے رنگے بو ہے۔

تسوچوں میری ڈولی لنگنی۔

میں بھاگتا ہوا سیڑھیاں اترتا اور ایسے ہی بھاگتے ہوئے لان تک گیا۔ جہاں بارات کی آمد آئی تھی۔ میرے قدموں میں بجلی بھری تھی جیسے ڈر تھا رکاتو پتھر کا ہو جاؤں گا۔ سب حیرانی سے مجھے بارات کے ساتھ

بلکہ آگے آگے ڈھول کی تھاپ پہ بھنگڑا ڈالتا دیکھ رہے تھے کئی ایک نے تو دبے لفظوں میں کہا بھی۔

”ارے۔ سعد۔ تم لڑکی والے ہو بارات کے ساتھ کیوں ناچ رہے ہو۔“

مگر مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میں بس خود کو بے حد خوش بہت سرشار دکھانا چاہتا تھا یا شاید۔ شاید میں اپنے اندر کی تڑپ کو اس بہانے نکالنا چاہ رہا تھا۔ ہنستے مسکراتے میں نے سلار کا سواگت بھی کیا۔ نکاح کے بعد چھوہارے بانٹنے اور مٹھائی سے سب کا منہ میٹھا کروانے میں بھی میں ہی پیش پیش تھا۔ ہر ایک کے ساتھ چپک چپک کے اور سارے دانت ہونٹوں کے شوکیس پہ سجا کے تصویریں بھی بنوائیں۔

اور پتھر رخصتی کے وقت قرآن پاک ہاتھ میں لیے بھی میں ہی سب کے درمیان راستہ بنانا آگے آیا اور ابو کے گلے لگی ام ہانی کے سر پہ اس کا سایہ کر کے دلہیز پار کرائی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے ذرا سا مڑ کے مجھے دیکھا میرے چہرے پہ صبح سے وہی بھرپور مسکراہٹ سجی تھی۔ حتیٰ کہ اس کی کار کے نظروں سے اوچھل ہونے کے بعد بھی یہ مسکراہٹ نہ گئی۔ سب ایک ایک کر کے چلے گئے۔

کچھ حوصلی کے اندر کچھ واپس اپنے گھروں کو مگر میں وہیں گیٹ کے پاس کھڑا مسکراتا ہوا اس موڑ کو دیکھ رہا تھا۔ جو اسے کسی اور راستے کا مسافر بنانے کے لیے گیا تھا پھر کسی کے سسک کے رونے کی آواز پہ پلٹ کے دیکھا لان میں جھولنے پہ بیٹھی وہ بلی تھی۔

”تم کیوں رو رہی ہو؟“ میں اس کے پاس چلا آیا۔ وہ دوپٹے سے ناک صاف کرتی بسوری۔

”رخصتی پہ تو سب کو رونا آتا ہے آپ کو نہیں آ رہا؟“

”آ رہا ہے، مگر میرے رونے پہ پابندی ہے تاحیات۔“

”ہاں آپ کیوں روئیں گے آپ تو ایسے ناچ رہے تھے بارات کے ساتھ جیسے لڑکے کے شہ بلا ہوں۔“ وہ ناک چڑھاتی اٹھ کے جانے لگی۔

”سنو بلی۔“

”اب کیا ہے؟“

”تمہیں پتا ہے کہ اس دن میں نے علی کو کیوں

مارا؟“

”ہاں میری وجہ سے۔ تھینک یو۔“

”نہیں وہ نہیں میں۔ تمہیں چھیڑنے والا تھا چنگلی

کاٹنے جا رہا تھا تمہیں اس نے تو روکنے کی کوشش کی

اور میں نے اسے پیٹ ڈالا۔“

”کیا؟“

”ہاں۔۔۔ سچ۔۔۔ اچھا سنو یہاں اس وقت کوئی نہیں

ہے اب چھیڑ لوں تمہیں؟“

”لفٹنگ۔۔۔ بد معاش۔۔۔ میں عزت دے رہی ہوں

اندر سے کیا نکلے لو فر۔ ابھی بتاتی ہوں پھوپھو نائلہ

کو۔“

وہ غصے سے دھمکاتی۔ نفرت سے گھورتی پیرنچ کے

اندر جانے لگی اور میرے بے ساختہ قہقہے ابلنے لگے۔

اندر کچھ تھا۔

کچھ عجیب سا۔

جو بات کے ساتھ پاگلوں کی طرح تاج کے بھی نہ

نکل رہا تھا اور نہ ایسی الٹی سیدھی حرکتیں کرنے کے

بعد بھی کم ہو رہا تھا۔ پتا نہیں کیا تھا کوئی آنسوؤں کا ریلا

نہ ہو جو بند توڑ کے نکلنا چاہتا ہو۔

میں قہقہوں کا ایک اور بند باندھنے لگا۔ اور بلا وجہ

بنتے بنتے اندر کی طرف بڑھا تو برآمدے کے ستون سے

لٹنی سلکی کو بھی چمکوں پہنکوں روٹے پایا۔

”لو۔ تم بھی۔ تمہیں بھی ہانی کے جانے پہ رونا

آ رہا ہے کیا؟“ تب ہی بانسری کی وہی درد بھری صدا

ابھری۔

”مجھے تو اپنے نصیبوں پہ رونا آ رہا ہے جی۔“ وہ

ہچکیاں لے رہی تھی اور میں جو ہمیشہ بانسری کی اس

آواز پہ کھوسا جاتا تھا۔ مسور ہو جاتا تھا۔ اس بار جھنجلا

اٹھا۔

”ارے ہے کون یہ بے سرا۔ وقت بے وقت

شروع ہو جاتا ہے۔“

”خدا بخش ہے جی۔ کمہاروں کا لڑکا۔ وہ جس کے

ساتھ میں۔۔۔ وہ کہتے کہتے رکی۔

”بھاگی تھی؟“ میں نے اس کا فقرہ مکمل کیا۔

”ہاں جی۔۔۔ روز بانسری بجا کے مجھے بلاتا ہے اب

میں اسے کیسے بتاؤں کتنی مجبور ہوں کل مجھے بھی نکاح

کر کے خدا بخش سے الگ کرنے والے ہیں یہ

لوگ۔“ میری ہنسی چھوٹ گئی۔ مجھے بے تحاشہ قہقہے

لگتا دیکھ کے وہ رونا بھول کے اب حیرت سے میرا منہ

تک رہی تھی۔

”یہ تمہیں بلاتا تھا؟ تمہارے لیے بجاتا تھا بانسری؟

دھت تیرے کی اور میں سمجھتا تھا اور والے نے میرے

لیے کسی اسپیشل بیک گراؤنڈ میوزک کا انتظام کیا ہوا

ہے رومانٹک فلموں کی طرح۔“ پھر اچانک میں نے

اس کا ہاتھ پکڑا اور کھینچ کے برآمدے کی چار سیڑھیاں

اتارنے لگا وہ گھبرا اٹھی۔

”سعد صاحب۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہیں۔“

”بھگا رہا ہوں تمہیں جلدی کرو۔ بھاگ جاؤ اس

یا گل کے بچے کے ساتھ ورنہ یہ ایسے ہی بانسری بجا بجا

کے داغ پکاتا رہے گا۔“

”مگر۔۔۔“ وہ بے چاری ہکا بکا تھی۔

”کہاں تا۔ نکل جاؤ میں سب سنبھال لوں گا۔ آج

ویسے بھی کسی کو ہوش نہیں ہے۔“ میں نے کوٹ کی

جیب سے والٹ نکال کے پورا کا پورا اسے تھما دیا۔

”نو۔ جلدی۔ ایک دو تین چار۔“ اور پانچ کہنے

سے پہلے پہلے وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔

ام ہانی سالار کے ہمراہ اس گھر میں داخل ہوئی جہاں

اب اسے زندگی کا نیا سفر شروع کرنا تھا۔ بڑے سے گھر

کے ماحول میں اسے وہی رعب و دبدبہ محسوس ہو رہا تھا

جو سالار کی شخصیت کا خاصہ تھا اور پھر دیواروں پہ جا بجا

مگنی سالار اعظم کی قد آدم تصاویر۔

سالار ام ہانی کے پہلو میں بہت سنجیدہ اور سرد مہر

تاثرات کے ساتھ کھڑا تھا جس والہانہ گرم جوشی اور

خوشی و سرشاری کی توقع اسے سالار سے تھی اس کا مظاہرہ اماں کی جانب سے ہو رہا تھا وہ صدقے کی نیت سے اس پر نوسوار رہی تھیں۔

”ماشاء اللہ۔ نظر نہ لگے آج سے یہ گھر تمہارا ہے اور میرا بیٹا بھی۔“

ام ہانی مسکرائی، مگر سالار کی رکھائی سے کسی بات نے اس کی مسکراہٹ شدید ہم کر ڈالی۔

”آپ اسے مس گائیڈ مت کریں۔ میں اس کا نہیں یہ آج سے میری ہے۔“

ہانی نے پلٹ کے بہت حیرت سے اسے دیکھا تھا، مگر وہ اپنی کہنے کے بعد لمبے لمبے ڈگ بھرتا کرے کی جانب جا رہا تھا۔ اماں نے اس کی خشک بات کا ازالہ کرتے ہوئے ہانی کا ہاتھ چوما۔

”اس کے ذائق ایسے ہی ہوتے ہیں۔ آؤ میں تمہیں تمہارے کمرے تک لے چلوں۔“ کمرے میں آنے کے بعد بھی وہ دیر تک سالار کی عجیب و غریب باتوں کو اماں کے کہنے کے عین مطابق مذاق سمجھ کے ہی خود کو بہلاتی رہی۔

”تم اتنی خوش ہو؟“

”کیا نہیں ہونا چاہیے؟ آج سے میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے جس میں آپ میرے ساتھ ہوں گے۔“ وہ لگا سا مسکرائی تھی، مگر دل میں گلہ بھی جاگا کہ چہرے پر بھلھلائی خوشی کا سبب تو اس نے دیکھ لیا، مگر جس نکھار کے قصیدے سب نے پڑھے اس پر سالار کی جانب سے ایک تعریفی جملہ تک نہ آیا۔

”مگر میں نے سنا ہے اپنوں کو چھوڑنے کا دکھ لڑکیوں کو کافی عرصے تک رلاتا ہے۔ تمہیں ان سے الگ ہونے کا کوئی غم ہے ایسا بظاہر لگتا تو نہیں رہا۔“

”میں ان سے الگ کب ہوئی ہوں اور نہ ہی چھوڑا ہے یہ تو ہر لڑکی کے ساتھ ہوتا ہے۔ ویسے بھی آپ کے ساتھ نے جو خوشی دی ہے وہ ہر دکھ پر حاوی ہے۔“

”پھر بھی۔“ سالار کے کنبے میں اس کے چہرے پر اس کی نظروں میں ایک شدت سے محسوس کی جانے

والی مایوسی تھی۔ اذان کی آواز پر ام ہانی چونکی۔

”اے صبح ہو گئی۔ اتنی جلدی۔ میں نماز پڑھ لوں؟“ سالار نے خاموشی سے ہاں میں سر ہلاتے ہوئے سگار سلگایا۔ اور وہ کچھ جھجک کر پوچھنے لگی۔

”آپ نماز نہیں پڑھتے؟“ اس بار سالار کا سر انکار میں ہلا۔

”کبھی بھی نہیں پڑھی؟“ وہ تاسف سے کہنے لگی۔

”ایک بار پڑھی تھی۔ اپنے باپ کے مرنے پر۔“

”اے نماز جنازہ۔“

”نہیں۔ شکرانے کے نفل۔“ سالار نے سگار کا دھواں اگلتے ہوئے سفاکی سے کہا تو وہ جو اپنا بھاری لہنگا سنبھال کے وضو کے لیے اٹھ رہی تھی وہیں جم کے رہ گئی۔



صبح ہوتے ہوتے سلمیٰ کے فرار کی خبر حویلی میں عام ہو گئی اور میں نے بہت سہولت سے سب کو مطلع کر دیا کہ یہ عظیم کارنامہ چونکہ میں نے کیا ہے اور میرے کارنامے کسی بھی قسم کی کمی بیشی سے پاک، مکمل محفوظ ہوتے ہیں اس لیے اسے تلاش کرنے کی کوشش بے سود رہے گی احتیاط کی جائے۔ اور اب بڑے دادا کے کمرے میں میری نکلاں لگی تھی۔

”بے غیرت۔ کتنے آرام سے کہہ رہا ہے کہ ہاں۔ میں نے بھنگایا ہے اسے۔ ڈھیٹ کا بچہ۔“

”میں کب ڈھیٹ رہا ہوں دادا جی؟“ ابو بلبلا اٹھے۔

”آپ اسے ڈائریکٹ برا بھلا کہیں مجھے کیوں

درمیان میں لے آتے ہیں ہر بار۔ اس کے کرتوتوں پر

میں کیوں کچھ سنوں؟“ انہوں نے خشمگین نظروں سے مجھے گھورا بھی ہو گا۔ یقیناً ”مگر میں چپ چاپ

نظریں جھکائے کھڑا تھا۔

”سعد۔ یہ کیا کیا تم نے؟“ اب امی کی باری تھی

یعنی طعن کی۔

”بے شک وہ ملازمہ تھی، مگر ہماری ذمے داری بھی

تو تھی۔ اب ہم اس کے گھر والوں کو کیا جواب دیں گے

جو آج گاؤں تھے اس کی شادی کاسن کر آرہے ہیں۔“
 ”اور میں اپنے ملازم کے سامنے کتنا شرمندہ ہوں گا
 جس سے آج اس کا نکاح پڑھانا تھا۔ کیا بے تکاپن ہے
 یہ۔“

ابو کا تو بس نہ چل رہا تھا چہل اتار کے میری تواضع
 ہی شروع کر دیتے۔ شاید کل میری بیرون ملک روانگی کا
 خیال انہیں لحاظ کرنے پہ مجبور کر رہا تھا کہ اب جاتے
 جاتے کیا خاطر کروں؟

”ہن بول۔۔۔ منہ سی کے کھلو تا اے۔“ بڑے دادا
 نے بیڈ کے ساتھ رکھی چھڑی اٹھا کے تان لی۔

”بڑے دادا۔۔۔ بچپن سے دیکھتا آرہا ہوں جب بھی
 ہم میں سے کوئی لمبے سفر کے لیے نکلتا ہے۔ گھر والے
 صدقے کی نیت سے پرندے آزاد کرتے ہیں۔ سفر پہ
 نکلنے والے کی سلامتی کے لیے ہانی بھی ایک نئے سفر
 پہ نکلی ہے اور میں نے سہمی کو آزاد کر کے ام ہانی کی
 آنے والی خوشیوں کا صدقہ دیا ہے۔“

میری اس بات پہ کوئی کچھ نہ کہہ سکا۔ سب ایک
 دوسرے کی جانب دیکھ کے رہ گئے بس۔ اور میں اپنی
 ادھوری پیننگ مکمل کرنے چلا آیا۔

علی الاصبح میری فلائٹ تھی۔ جانے سے پہلے میں
 نے فجر کی نماز وہیں برآمدے میں اس جگہ ادا کی جہاں وہ
 سالوں سے کرتی آئی تھی اس کے بعد چھت پہ جا کے
 ایک ایک کر کے سب پرندے بھی آزاد کر دیے۔
 جاتے ہوئے امی کے گلے لگا تو ان کی آنکھوں میں آنسو
 دیکھ کے پہلی بار میرے دل کو کچھ نہ ہوا کچھ بھی
 نہیں۔۔۔ یہ آنسو اب کیوں؟ خود ہی تو فیصلہ کیا تھا مجھے
 بھیجنے کا۔ میں نے ان کے آنسو تک نہ پونچھے اور نکل
 آیا۔

اس حویلی سے۔۔۔ جس کے درو دیوار میں میری
 محبت نے پہلی بار آنکھ کھولی تھی۔ پہلا سانس لیا تھا۔

مگر نہیں۔۔۔ وہ تو محبت تھی ہی نہیں شاید۔
 شاید۔۔۔

ام ہانی کے دل میں ایک خلش سی تھی۔ وہ جارہا

تھا۔
 بہت دور۔۔۔ اور ایک نامعلوم مدت کے لیے۔ پتا
 نہیں دو بارہ کب ملنا ہو، مگر وہ چاہتے ہوئے بھی سعد کی
 روانگی کے وقت حویلی نہ جاسکی تھی کہ عین اسی وقت
 اماں کی بھی امریکا کے لیے فلائٹ تھی۔

”زمانے کے بعد میرے گھر میں اجالا ہوا ہے اور
 مجھے جانا پڑ رہا ہے۔“ وہ اسے گلے لگا کے بہت سا پیار
 اور ڈھیروں دعا میں دے رہی تھیں۔

”آپ جلدی واپس آئیے گا اماں۔“
 ”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ضرور۔۔۔ اور تم اپنا اور سالار کا
 خیال رکھنا۔“

”جی۔۔۔“

”بلکی۔۔۔ اپنا زیادہ۔۔۔“ ان کے لہجے میں ایسی دہلی دہلی
 تہنید تھی کہ وہ الجھ سی گئی۔

”سالار تمہیں چاہتا ہے۔ اس لیے تمہیں اپنی
 زندگی میں شامل کیا ہے ورنہ۔۔۔ مگر تمہیں اسے اور
 اس کی چاہت کو سمجھنے میں بہت وقت لگے گا۔ بہت
 وقت۔“

ان کے چہرے پہ خوف دیکھ کے وہ بھی خوف زدہ
 ہو گئی، مگر اس سے پہلے کہ ان سے کچھ سوال کرتی اپنی
 الجھن دور کرنے کے لیے۔ گھڑی پہ وقت دیکھا سالار
 عجلت میں وہاں آیا۔

”آپ کی فلائٹ کا ٹائم ہو گیا ہے چلیں باہر ڈرائیور
 انتظار کر رہا ہے۔“

”سالار ہم بھی چلتے ہیں اماں کو ایرپورٹ تک
 چھوڑنے۔“ اس نے بڑے چاؤ سے کہا، مگر سالار خشک
 لہجے میں فقط اتنا کہہ کر رہ گیا اور وہ چپ ہو گئی۔
 ”کیوں۔۔۔؟“



”اب کیوں رو رہی ہو؟“ رضوان نے نائلہ کو آنسو
 بہاتے دیکھ کے کہا۔

”یاد تو آئے گا۔“
 ”یاد کرنے کا فائدہ۔۔۔ بھیجنے سے پہلے سوچنا تھا۔“

گلاس سمیت اس کی جانب آنے لگا۔
”تمہیں نہیں ہوا؟“ وہ جواب میں خاموشی سے سر
جھکا کے رہ گئی۔

”یا پھر انہیں دکھ ہوگا۔ اس بات کا زیادہ ملال ہے
تمہیں؟“

”ظاہر ہے ملال تو ہوگا۔ میں نہیں چاہتی انہیں
نہیں پہنچے۔“ سالار کے ہونٹوں پہ ایک مدہم سی
مسکراہٹ آئی۔

”گھر آئے مہمان سے نہ ملنا بدتمذہبی ہے۔“ وہ
گلاس ایک جانب رکھتا ڈولتے قدموں سے باہر نکلنے
لگا۔

”مگر سالار۔۔۔ پلیز۔۔۔ یوں نہ جائیے ان کے
سامنے۔ سالار۔“ اس نے روکنے کی کوشش کی،
لیکن بے سود۔ رضوان نے اسے دیکھا تو چائے کا
کپ رکھ کے بڑے تپاک سے اٹھے۔

”او سالار کیسے ہو بیٹا۔ میں ہانی سے تمہارا
ہی۔“

اور پھر سالار کے بے ترتیب قدم ڈگمگاتا ڈولتا وجود
اور سرخ ہوئی آنکھیں دیکھ کے ٹھٹک کے خاموش
سے ہو گئے بڑی تعجب بھری نظروں سے غور کرنے
لگے۔

”کیسے ہیں آپ؟“ اور جب وہ بولا تو اس کی زبان
میں بھی لگنت واضح تھی۔ اب شک کی گنجائش ہی نہ
تھی۔ رضوان نے شریذ حیران سوالیہ نظروں سے
سالار کے عقب میں آئی ہانی کے شرمینہ چہرے کو
دیکھا جو سر اٹھانے کے قابل نہ سمجھ رہی تھی خود کو۔

”تشریف رکھیے۔“ انہیں بیٹھنے کا کہتے ہوئے
سالار خود تقریباً ”صوفے پر گر سا گیا۔ رضوان ایک
تاسف بھری نظر ڈال کے خود بھی بیٹھ گئے اور ایک سرد
آہ بھری۔ جو سیدھی ام ہانی کے کلیجے میں جا لگی۔ اس کا
بس نہ چل رہا تھا کس طرح یا تو سالار کو یہاں سے لے
جائے یا رضوان کو واپس بھیج دے، لیکن اب کیا ہو سکتا
تھا وہ بات جو لن کے سامنے ظاہر نہیں ہونی چاہیے
تھی۔ عیاں تو ہو چکی تھی۔

”وہ گھر سے دور گیا ہے۔ اس کا دکھ نہیں۔ مجھ
سے ناراض گیا ہے اس کا دکھ ہے۔“

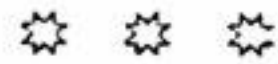
”وہ ڈھائی سال کی بات ہے۔ آجائے گا اور ناراضی
تو شاید دو تین دن میں ہی ختم ہو جائے گی۔“ انہوں نے
تسلی دی اور پھر دانستہ موضوع تبدیل کیا۔

”میں تم سے یہ پوچھنے والا تھا کہ ام ہانی اور اس کے
شوہر کو انوائٹ کیا جائے کھانے؟“

”ہاں۔ ضرور۔ میں فون کرتی ہوں اسے۔“
”نہیں زیادہ مناسب یہ رہے گا اگر میں خود جا کے
دعوت دوں۔ تم چلو گی ساتھ؟“

”میرا جی ابھی بھاری سا ہو رہا ہے سعد کے جانے
سے۔ آپ ہی ہو آئیں۔“

”چلو جیسے تمہاری مرضی۔ کل شام کا کہہ دوں؟“



”سالار۔۔۔ وہ دیکھیں۔ تیا جان اچانک ہی۔“ وہ
بہت خوشی خوشی رضوان کی اچانک آمد کی۔ خبر دینے
کمرے میں داخل ہوئی تھی مگر جب سالار کو اس کے
شغل میں مصروف دیکھا تو دھک سے رہ گئی۔

پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ سالار کے سامنے رکھی
بوٹل اور اس کے ہاتھ کے گلاس کو دیکھ رہی تھی۔

”دستک دے کر آیا کرو۔“ وہ شاید کلنی دیر سے
نوشی کر رہا تھا آواز بھی بھاری ہو رہی تھی۔

”جی۔“ مرے مرے لہجے میں وہ فقط اتنا کہہ سکی۔
دانستہ نظریں اس زہر سے ہٹائیں۔ دل کٹ سا رہا تھا
سالار کی ذات کا یہ رخ سامنے آنے پہ۔

”اب بتاؤ۔ کیا بات ہے؟“
”تیا جان آئے ہیں۔“ جتنے اشتیاق اور مسرت
کے عالم میں وہ یہ بتانے آئی تھی اب وہ ناپید تھا جیسے
لہجے میں کہہ کر جانے کے لیے پلٹی۔

”میں انہیں کہہ دیتی ہوں کہ آپ سو رہے ہیں۔“
”کیوں؟“

”میں نہیں چاہتی آپ کو اس حالت میں دیکھ کے
انہیں دکھ ہو۔“ وہ یہ کہنے کے لیے رکی تو سالار اٹھ کے

تا عمر۔ اسی طرح۔ دکھی۔ یا سکھی۔ یہ تمہاری چوائس ہے میرا مسئلہ نہیں ہے۔ ”ام ہانی دکھ سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر ایک گہرا سانس لے کر الماری کی جانب پلٹی۔

”آپ پہلے بتا دیتے تو میں رات سے ہی پیکنگ شروع کر دیتی۔ اب پتا نہیں اتنے کم وقت میں یہ سب کیسے ہو گا۔“ اس کے اتنی جلدی خود کو معمول پہ لے آنے پر سالار جھنجلا سا اٹھا۔ مایوسی اس کے چہرے سے جھلکنے لگی۔

”اندرون سندھ کے ایک چھوٹے سے قصبے میں ہوئی ہے میری پوسٹنگ۔ میں آئے روز تمہیں میکے والوں سے ملوانے نہیں لاسکوں گا۔“

یہ کہہ کر وہ بغور اس کا رد عمل جانچنے لگا، مگر وہ سکون سے الماری سے کپڑے نکال رہی تھی۔

”ظاہر ہے۔ مشکل ہو گا۔“

”اور وہاں وہ سہولیات بھی نہیں ہوں گی جو یہاں ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔“

اس کے اطمینان نے سالار کو اس حد تک جھنجلا دیا کہ وہ ہاتھ میں پکڑا گلاس زور سے اس کی جانب اچھالنے پر مجبور ہو گیا۔ کانچ کا گلاس ام ہانی کے پیر سے ٹکرا کے فرش پر گر اور چکنا چور ہو گیا۔ تو وہ کانپ کے رد عملی۔ اور دہشت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ جواب مسکرا رہا تھا۔



”وہ نشے میں دھت تھانا نکلے۔“ رضوان کی نظروں میں دکھ کے ساتھ ساتھ خفگی اور گلہ تھا۔

”وہ بھی اپنے گھر کی چار دیواری میں۔ دن کے وقت اور ام ہانی کے چہرے پر اتنا دکھ افسوس اور شرمندگی تھی کہ میں اس سے نظر تک نہ ملا سکا۔“

”بات تو افسوس کی ہے، مگر شرمندگی سالار کو ہونی چاہئے آپ کو نہیں اور آپ کیوں نظر نہیں ملا پارہے تھے ام ہانی سے؟ اس میں آپ کا کیا قصور؟ سالار ام ہانی

”آپ دونوں کو کل شام کے کھانے پہ بلانے آیا تھا۔“ اب بات تو کرنی ہی تھی جس مقصد کے لیے وہ آئے تھے سو کہہ دی۔ یہ الگ بات کہ اب نہ انداز میں وہ تپاک تھا نہ لہجے میں وہ گرجوٹی۔

”کل ہم ضرور آتے، مگر کل صبح ہی ہمیں روانہ ہونا ہے۔ میں آپ کو بتانا بھول گیا غالباً کہ میری پوسٹنگ سندھ میں ہو گئی ہے۔“ اس پر ام ہانی نے چونک کے حیرت سے اسے دیکھا تھا اس کے لیے بھی یہ انکشاف تھا۔

رضوان کے جانے کے بعد سالار نے دوسرا دور شروع کر دیا۔ وہ جام پہ جام انڈیل رہا تھا اور ام ہانی اپنے سوالوں کے جواب کے لیے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔

”آپ نے مجھے بتایا نہیں کہ ہم دوسری جگہ جارہے ہیں۔“

”بتایا تو ہے ابھی۔“ اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

”مگر اتنی اچانک کیسے ہو گئی ٹرانسفر؟“

”ہوئی نہیں۔ میں نے خود کر دالی ہے۔“

”مگر کیوں؟“

”میں نہیں چاہتا کہ تمہارے تایا اور دوسرے رشتے داروں کو مجھے ہر بار اس حال میں دیکھ کے دکھ ہو اور انہیں دکھی دیکھ کے تمہیں دکھ ہو گا تو بہتر ہے ہم ان سے دور رہیں۔“

”مگر آپ کو اس حال میں دیکھ کے بھی تو مجھے دکھ ہو گا۔“ وہ آنسو پی گئی۔

”اس کی اجازت ہے تمہیں۔“ سالار نے کمال فراخ دل کا مظاہرہ کیا۔

”میرے لیے دکھی ہونا تمہارا حق بنتا ہے اور فرض بھی۔ مگر تم کسی اور کے لیے دکھی ہو یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔“

”مگر سالار۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا کہ وہ دھاڑا تھا۔ ”تو کیا چاہتی ہو تم؟ میں بھی تم سے دور ہو جاؤں؟ نہیں ام ہانی۔ نہ میں خود کو بدل سکتا ہوں نہ تمہیں خود سے دور کر سکتا ہوں۔ تمہیں میرے ساتھ ہی رہنا ہو گا

کی ہی پسند تھا۔“

”یہ واحد دھچکا نہیں تھا نا نلمس۔ دوسرا دھچکا مجھے تب ملا جب سالار کے گھر سے نکلتے ہی میں نے اس کی والدہ کو فون کیا۔ یہ گلہ کرنے کے لیے کہ انہوں نے سالار کے کردار کا یہ رخ ہم سے کیوں پوشیدہ رکھا۔ تو جانتی ہو انہوں نے کیا انکشاف کیا۔ یہ۔۔۔ کہ تم اس بارے میں پہلے سے جانتی تھیں۔“

اب نالکھ کو ان کی خفگی کی وجہ سمجھ آئی وہ گھبرا کے ٹالنے لگیں۔

”میں۔۔۔ میں تو۔۔۔ دراصل رضوان وہ تو بات ہی۔۔۔“

”بس نالکھ۔۔۔ کچھ نہ کہنا۔ اتنا دکھ مجھے سالار کو نشے میں دیکھ کے نہیں ہوا جتنا یہ جان کے ہوا۔ سب جانتی تھیں تم تو مجھے پہلے کیوں نہ بتایا یا ہانی کو ہی بتا دیتیں۔“

”بتا دیتی تو کیا کر لیتے آپ؟“

”میں کبھی اپنی بچی کی شادی اس سے نہ کرتا بلکہ مجھے یقین ہے کہ سالار کی اس عادت بلکہ عیب کے بارے میں جاننے کے بعد ام ہانی ہی اپنی پسند سے دستبردار ہو جاتی۔“

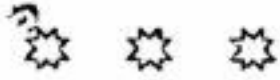
”اسی لیے نہیں بتایا میں نے۔“ وہ پھٹ پڑیں۔

”یہ رشتہ طے ہوتے وقت یہ حقیقت سامنے آتی تو اور بات تھی۔ شادی کے عین وقت آپ فیصلہ بدل کے کیا مہ پارہ کی طرح اسے بھی ساری عمر کے لیے میرے سر پہ بٹھا دیئے؟“ رضوان کو اور بھی دکھ ہوا۔

”کتنی خود غرض ہو تم نالکھ۔ میں سوچتا تھا تم نے میری بھالی کی یتیم بچی کی ذمے داری نبھا کے مجھ پہ بڑا احسان کیا ہے۔ تم نے میرا یہ گمان تو ڈر دیا۔“

”ہاں۔۔۔ ہوں میں خود غرض۔۔۔ ممتا خود غرض ہی ہوتی ہے۔ اسے سالار کے ساتھ رخصت نہ کرنی تو سعد۔۔۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ سعد کا باپ بن کے سوچیں اس کی بہتری کے لیے۔“

”کاش تم نے بھی ایک بار۔۔۔ صرف ایک بار ام ہانی کی ماں بن کے سوچا ہوتا۔ اس کی بہتری کے لیے۔“



سالار کی جیب قبضے سے نکل کے مین روڈ کی جانب گامزن تھی اور جب سالار نے وہاں میں جانب کا موڑ کاٹا تو ام ہانی نے حیرت سے ٹوکا۔

”ہمیں بتایا جان سے ملتے ہوئے جانا تھا۔ بتایا تو تھا آپ کو۔“

”دیر ہو رہی ہے۔“

”آپ پہلے بتا دیتے میں تو انہیں اطلاع کر دیتی کہ ہم نہیں آرہے۔ وہ انتظار کر رہے ہوں گے۔ ٹھیک ہے۔ میں انہیں فون کر کے بتا دیتی ہوں کہ ہمیں دیکھ۔“

اس نے ابھی فون پہ نمبر بلایا بھی نہیں تھا کہ ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالتے سالار نے دوسرے ہاتھ سے بڑی سرعت کے ساتھ اس سے موبائل فون جھپٹ لیا اور گھلے شیشے سے باہر پھینک دیا۔

”سالار۔۔۔؟“

مارے حیرت کے وہ اس سے زیادہ کچھ کہنے کے قابل نہیں تھی اور سالار کا دھیان اب اس پر نہیں۔ سامنے خالی سڑک پر تھا۔ وہ گاڑی کی رفتار بڑھا چکا تھا۔

ہانی نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔

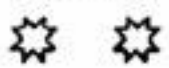
دور خالی سڑک پہ ایک نقطے کی طرح اس کا فون گرا نظر آ رہا تھا۔ اور پھر بے تحاشا اڑتی دھول اور گرد نے اس نقطے کو بھی معدوم کر دیا۔

اور یہ گرد۔۔۔ یہ دھول اگلے دو سال اس کی زندگی کے ہر گوشے پہ پڑی رہی۔

اگلے دو سال۔۔۔

دو طویل سال۔۔۔

(باقی آئندہ شمارے ملاحظہ فرمائیں)



مشہدات صدیقی



عانیہ پر ان ہی کا تھا، مگر ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے حق و یمن کی صورت جتنا نہیں چاہتے تھے کیوں کہ وہاں موجود دوسرے افراد کی طرح وہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ حق تسلیم کرنے کی صورت ایک بہت بڑی ذمہ داری ان پر آڑتی اور جسے نبھانا ان کے لیے بہت مشکل اور دشوار تھا، بلکہ وہاں موجود کوئی بھی دل سے راضی نہ تھا، سب ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے، ایسے میں سائرہ بیگم کی بات نے حیرت و مسرت کے ساتھ ساتھ ان سب کے کندھوں سے ایک بہت بڑے بوجھ کو سرکا دیا۔ سب نے ہی بے اختیار اطمینان بھرا پرسکون سانس ہوا میں خارج کیا تھا۔

”کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے میرے اس فیصلے سے؟“ انہوں نے ایک بار پھر سے سب کی طرف دیکھا جن کی گردنیں نفی میں ہلنے میں لگا تھا۔

دلینز پر کھڑی عانیہ سعید کے دل پر گہری چوٹ پڑی تھی۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنے چچا اور تایا کو دیکھا، ایسا نہیں تھا کہ اس کے پاس رشتے نہ تھے، رشتے تو تھے، مگر ان میں احساس اور اپنائیت شاید ختم ہو چکی تھی جب تک اس کے ممالیہا زندہ تھے، انہوں نے کسی طرح چہروں پر اپنے پن اور محبت و فکر کا نقاب چڑھائے رکھا اور آج جب اسے سب سے زیادہ ان کی ضرورت تھی تو انہوں نے کسی طرح بیگانے پن کا مظاہرہ کرتے منہ پھیر لیا تھا۔

”ممالیہا...“ نڈھال سے انداز میں اپنے کمرے میں

سائرہ بیگم کی بات پر سب نے ہی کافی حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا تھا کسی کو بھی اپنی سماعت پر یقین نہیں ہوا تھا۔ انہیں لگا جیسے ان سب کو سننے میں غلطی ہوئی ہو یا پھر سائرہ بیگم نے ہی بغیر سوچے سمجھے یہ فیصلہ لیا ہو، کچھ دیر کے بعد جب سوچ کے درواہوں کے تو وہ اپنے کئے سے مکر نے میں لمبے کی بھی تاخیر نہیں کریں گی، مگر درحقیقت ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ ایک تو صورت حال بہت نازک تھی، دوسرا ان جیسی یا دیر فل شخصیت

مشکل اڈان

سے ایسی توقع کسی صورت نہ کی جاسکتی تھی۔

وہاں موجود سب لوگ انہیں بہت اچھی طرح جانتے تھے اور بے یقین ہونے کی اصل وجہ بھی شاید یہ ہی تھی، ان کی بات سے انکار یا اختلاف تو کسی ایک کو بھی نہ تھا، مگر اتنا وقت گزرنے کے باوجود بھی سب ابھی تک چپ تھے اور یہ ہی بات سائرہ بیگم کو کھٹک رہی تھی۔

”کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہے جو آپ سب اتنے خاموش اور حیران ہو کر مجھے دیکھ رہے ہیں؟“ انہوں نے باری باری سب کی طرف دیکھا۔

”نہیں“ آپ نے کچھ غلط نہیں کہا۔ ہم آپ کے فیصلے کی قدر کرتے ہیں اور آپ کی بات سے متفق ہیں۔“ ان سب میں سے ایک نے جواب دیا جو رشتے میں عانیہ سعید کے سکے تایا تھے اور سب سے پہلا حق



آتے ہی وہ بیڈ پر گر کے تڑپ تڑپ کر رودی ایک ہفتہ پہلے تک تو سب کچھ ٹھیک تھا، مگر یہ ہی ایک ہفتہ تو ان کے بستے بستے گھر کو اجاڑ کر رکھ گیا تھا۔ وہ جتنا روتی کم تھا جتنا تڑپتی کم تھا۔ اس کا نقصان بہت بڑا تھا، جہاں ماں باپ کی دائمی جدائی نے اسے اندر باہر سے توڑ کر رکھ دیا تھا وہیں سگے رشتے داروں کے بدلتے رویوں نے بھی اس کی رہی سہی توانائی کو نچوڑ دیا تھا۔ وہ لاڈوں پٹی محبت کی آغوش میں پروان چڑھنے والی اب یکلخت ہی تقدیر کی ستم ظریفی اور سنگدلی کی لپیٹ میں آچکی تھی۔

”چلو عانیہ اپنا سامان پیک کر لو تمہیں ساڑھے بیگم کے ساتھ جانا ہے۔“ تایا جان اسی وقت اس کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔

”مگر تایا جان۔۔۔“ وہ آنسو پونچھتے ان کے قریب آکھڑی ہوئی۔

”میں ان کے ساتھ کیسے جا سکتی ہوں، میں تو انہیں جانتی تک نہیں۔“ اک موہوم سی امید کے تحت اس نے اپنے تایا کی طرف دیکھا، ہو سکتا تھا کہ وہ اسے روک لیتے فیصلہ بدل لیتے، مگر ہائے ری خوش فہمی۔

”وہ تمہاری ماما کی فرسٹ کزن ہے اس لحاظ سے تمہاری خالہ ہوئی اور وہ تمہاری ذمہ داری لینے کو باخوشی تیار بھی ہے۔“

”اور آپ۔۔۔؟“ اس نے شاکی نظریں اٹھائیں، وہ نظریں چراگئے۔ عانیہ کے دل میں بیس سی اٹھی اندر کی توڑ پھوڑ بڑھنے لگی۔

”دیکھو عانیہ۔۔۔“ انہوں نے جیسے تمہید باندھنی چاہی، عانیہ کا دل چاہ کہ وہ ان سے چیخ چیخ کر کہے کہ اسے ان کی کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

”ہم سب کے حالات تو تمہارے سامنے ہی ہیں میری پہلے ہی چار بیٹیاں ہیں اور ساجد (پچا) کی تین حالات بھی دونوں کے اجازت نہیں دیتے کہ ایک اور بیٹی کا بوجھ اٹھا سکیں۔“ وہ بیٹی کو بوجھ کہہ رہے تھے جبکہ اس کے بیانے تو اس کی پرورش کسی شہزادی کی طرح کی تھی۔ گتافرق تھا پاپا میں اور ان میں عانیہ نے دکھ اور تاسف سے سوچا۔

”تنگ دستی ایسی ہے سر تک اٹھانے نہیں دیتی معاشی و مالی دباؤ بھی کچھ کم نہیں، بس یوں سمجھ لو کہ فاتوں کی نوبت نہیں آئی، ورنہ حالات تو بہت ہی تنگ گزر رہے ہیں اور رہی ساڑھے بیگم کی بات تو وہ معاشی طور پر کافی مستحکم ہے۔ ابر کلاس سے تعلق رکھتی ہے۔ تھوڑی موڈی ہے، مگر اس نے خود تمہیں ساتھ لے جانے کی بات کی ہے۔ ہم سب اسے اچھی طرح جانتے ہیں، اس لیے ہم میں سے کسی کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ تمہاں زیادہ خوش رہو گی۔ جب بنا کے تمہاری ہر ضرورت پوری ہوگی تو ہمیں دعا میں دیتی نہ تھکو گی، اس لیے اپنے دماغ سے ہر طرح کی فضول سوچوں کو جھٹک کر جانے کی تیاری کر لو۔“

اس نے امید و بیم کی کیفیت میں آخری بار ان کی طرف دیکھا، وہ کسی صورت ساڑھے بیگم کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تھی، مگر وہ اس کی نظروں کے ہر تاثر کو یکسر نظر انداز کیے باہر چلے گئے۔



ناچاہنے کے باوجود بھی اسے ان کے ساتھ آنا پڑا۔ نارمل تاثرات لیے لیے ان کے چہرے پر ایک نظر ڈال کر اس نے سیٹ کی بیک سے کمر نکادی۔ وہ ان کے ساتھ ہی بیٹھی تھی، مگر ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ گاڑی میں تنہا ہو۔ اسے گاڑی کے اندر کا ماحول کچھ سرد سا لگا۔ لمبا سانس ہوا میں خارج کرتے وہ آنکھیں موند گئی۔

اتنے دنوں کی بے خوابی اور ذہنی ٹینشن نے اسے ادھ موا کر چھوڑا تھا۔ بند پلکوں کے پار ممالیہا کے چہرے لہراتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا بلکہ زندگی کو جینے کے لیے نئے راستے تلاش کیے جاتے ہیں۔“ اپنے قریب سے ابھرتی آواز پر اس نے جھٹ سے آنکھیں کھولی تھیں۔ اس کی نظریں بے اختیار ہی ساڑھے بیگم کے چہرے کی طرف اٹھیں، جو کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھیں۔ عانیہ کو اپنی ساعتوں پر شبہ سا گزرا کیا

”اے۔۔۔“ اس نے سیٹی کے انداز میں ہونٹوں کو گول کیا۔ تصدیق کے باوجود بھی اسے یقین کرنے میں دشواری ہوئی کہ وہ ملازمہ ہے۔ ”پڑھی لکھی لگتی ہو۔“

”جی میں نے گریجویشن کیا ہے۔“

”واش۔۔۔؟“ وہ از حد حیران ہوئی۔

”پھر یہاں۔۔۔؟“

”بس جی مجبوری انسان سے کیا کچھ کروالے اسے کچھ پتا نہیں چلتا اور ویسے بھی پرکشش تنخواہ کے ساتھ ساتھ اور بھی کافی سہولتیں دستیاب تھیں تو۔“

”ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجبوری انسان کو نجانے کہاں سے کہاں لے جائے۔“ اس کی بات سے اتفاق کرتے عانیہ کے دل میں دکھ کی لہری اٹھی، دو سرے ہی لمحے خود کو سنبھالتے وہ پوچھنے لگی۔

”کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ اس گھر میں کون کون رہتا ہے؟“

”جی ضرور۔ میڈم سائرف۔ جن کے ساتھ آپ آئی ہیں۔ مظہر صاحب، ان کے ہنرمند اور اشنا میم، ان کی صاحب زادی۔“

”بس۔۔۔ اتنے بڑے گھر میں صرف تین لوگ ہی رہتے ہیں۔“ وہ ابھی تک حیران تھی۔

”جی۔ بالکل۔۔۔“ زینبی اس کی سلوکی پر مسکرا دی۔



دھکڑو محبت

قیمت - 300 روپے

صائبہ کوٹلی پوہی

مکھانے کا چم

کچہ، عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

واقعی انہوں نے اس سے کچھ کہا تھا وہ کافی دیر ان کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرتی رہی، مگر پھر مایوس ہوتے پھر سے آنکھیں موند گئی۔ اسے یقیناً ”سننے میں غلطی ہوگی۔ آج کل تو ویسے بھی دلغ نے کام کرنا چھوڑا ہوا تھا۔“

تایا جان کے روپے کے بارے میں ہی سوچتے نجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی پھر کسی کے مدد ہم انداز میں پکارنے پر ہی اس کی آنکھ کھلی تھی، آنکھیں کھولتے اس نے اپنی دائیں طرف دیکھا ساتھ بیگم وہاں موجود نہ تھیں۔

”میڈم اندر ہیں اور میں آپ کو لینے آئی ہوں۔“

”اف کیا میں اتنی دیر سوتی رہی۔“ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی اور پھر جیسے دم بخود رہ گئی۔ وہ کوئی گھر نہیں بلکہ کوئی محل تھا۔ لڑکی کے ساتھ اندر کی طرف بڑھتے وہ مبہوت سی ارد گرد بھی دیکھ رہی تھی۔

”میم یہ آپ کا کمرہ ہے، کسی چیز کی بھی ضرورت ہو تو آپ مجھے انٹرکام پر بلا سکتی ہیں۔“ لڑکی کا لہجہ انتہائی نفیس اور پرکشش تھا۔ شکل سے وہ اسے ملازمہ ٹائپ ہرگز نہیں لگتی تھی۔

”آپ اس وقت کیا لینا پسند کریں گی؟ چائے یا کافی۔۔۔؟“

”نہیں کچھ نہیں۔“ وہ نفی میں سر ہلا گئی۔

”جی بہتر۔۔۔“

”سنو۔“ وہ جانے لگی تو اس نے آواز دے کر روک لیا۔

”نام کیا ہے تمہارا؟“

”زینبی۔“ وہ مسکرائی تھی۔ عانیہ کو اس کی مسکراہٹ بہت بھلی سی لگی۔

”میرا نام عانیہ ہے، عانیہ سعید۔“

”بہت خوب صورت نام ہے آپ کا۔“ عانیہ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی، اسے وہ لڑکی کافی دلچسپ لگتی تھی۔ اس لیے اپنائیت سے پوچھا ”اور تم یہاں۔۔۔؟“

”کام کرتی ہوں۔۔۔“

”کیا اب میں جاؤں۔؟“
 ”ہاں جاؤ۔؟“ اس کے جانے کے بعد اس نے
 طائرانہ نظریوں سے کمرے پر ڈالی۔
 کمرے کا کافی کشادہ اور ویل ڈیکوریٹ تھا۔ وہ اپنے بیگ
 سے کپڑے نکالتے فریش ہونے کے لیے واٹس روم
 میں گھس گئی۔



انگل منظر سے اس کی ملاقات ڈنر پر ہوئی تھی۔ اس
 کے سلام کرنے پر انہوں نے آہستہ سے سر اٹھاتے ہوئے
 ہلاتے جواب دیا تھا۔ عانیہ کی نظروں نے بے ساختہ ہی
 اس وسیع و عریض ڈائننگ ہال کو سراہا تھا۔ ہر چیز
 اموریٹڈ اور نیو برانڈ تھی۔ اسی پل اشٹاڈائننگ ہال میں
 داخل ہوئی۔

”ہیلو ماما۔“ بے نیازی سے کہتے وہ سائبر بیگم کے
 ساتھ والی کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ عانیہ کی آنکھیں اسے
 دیکھتے حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ بہت خوبصورت اور
 ماڈرن لڑکی تھی عانیہ کو خود سے اقرار کرنا پڑا کہ لیکن
 اس کے حیران ہونے کی وجہ اس کی خوب صورتی ہرگز
 نہ تھی بلکہ وہ لباس تھا جو اس نے زیب تن کر رکھا تھا۔
 انتہائی چست ریڈ ٹراؤزر کے اوپر بلیک سیلویس اسکن
 ٹائٹ پہنے وہ اپنے پاپا کے سامنے بالکل نارمل انداز میں
 بیٹھی تھی۔

عانیہ کو اپنے گھر کا ماحول یاد آ گیا کس طرح وہ سر پر
 دوپٹا اوڑھ کر پاپا کے سامنے جاتی تھی۔ اس نے آنکھوں
 سے منظر صاحب کی طرف دیکھا کہ شاید وہ اسے کچھ
 کہیں مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا جیسا وہ سوچ رہی تھی۔
 انہوں نے نارمل انداز میں کھانا کھایا اور پھر نہ کنی سے
 ہاتھ صاف کرتے ہال سے باہر چلے گئے۔

”اشناہ تمہاری کزن عانیہ ہے اور عانیہ یہ اشناہ ہے
 میری اکلوتی بیٹی۔“
 ”سلام علیکم!“ اس نے مسکراتے ہوئے اسے
 سلام کیا تھا۔

”ہیلو۔“ جبکہ وہ ایک سرسری سی نظر اس پر ڈال کر

دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔
 ”عانیہ کیا کوالیفیکیشن ہے تمہاری؟“ وہ اشناہ کے
 بارے میں ہی سوچ رہی تھی جب سائبر بیگم کے
 مخاطب کرنے پر ہڑبڑاتے ہوئے ان کی طرف متوجہ
 ہوئی۔

”جی۔۔۔ خالہ جی۔“ وہ ان کی بات ٹھیک سے سن
 نہیں پائی تھی مگر وہ سری طرف سائبر بیگم کے خوب
 صورت چہرے پر لمحوں میں ناگواری تھی۔
 ”واٹ خالہ۔“ ان کے ماتھے پر سلوٹیں ابھرنے
 لگیں۔

”لکسن۔ ڈونٹ کال می، آگین خالہ۔“ وہ تو اچھی
 خاصی برہم دکھائی دے رہی تھیں۔ عانیہ کو بوکھلا کر رہ
 گئی۔
 ”تم مجھے آئی کہہ سکتی ہو۔ بٹ خالہ۔ نو۔ نیور
 آگین۔“

”جی۔“ ان کی جڑبڑ صورت دیکھتے عانیہ تو اس طرح
 شرمندہ ہونے لگی جیسے اس سے کوئی بہت بڑا گناہ ہو گیا
 ہو۔

”میں نے تمہاری تعلیم پوچھی ہے۔“
 ”جی۔ وہ گریجویٹیشن“ اس کے گلے سے پھنسی
 پھنسی سی آواز نکلی تھی۔
 ”کرچکی ہو یا۔۔۔“

”جی۔ جی۔ کرچکی ہوں۔“ ان کے ابرو اچکا کر
 پوچھنے پر اس نے جواب دیا۔ ان کے یا کا مطلب وہ
 اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔
 ”اوکے۔ کیا آگے پڑھنا چاہتی ہو؟“ ان کے مزید
 استفسار پر وہ چپ سی رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ
 وہ کیا جواب دے۔

”عانیہ۔ واٹس پر ایلم وریو۔ بار بار یوں مراقبے میں
 کیوں چلی جاتی ہو۔“ اس کی مسلسل خاموشی نے سائبر
 بیگم کو بھی تپا دیا۔ وہ برہم سی گویا ہوئیں۔

”وہ ایسے چوکیلی آ۔۔۔ نئی جی۔ میں پڑھنا تو چاہتی
 ہوں مگر آپ کا پہلے ہی بہت بڑا احسان ہے مجھ پر۔۔۔“
 ”زینی۔۔۔ زینی ہاتھ اٹھا کر اس کی بات درمیان میں ہی

پیارے بچوں کے لئے پیاری پیاری کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیوں
پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے
آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ ایک مفت

قیمت - 300/- روپے
ڈاک خرچ - 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

کاتے ہوئے وہ زینہ کو آوازیں دینے لگیں۔
”یس میڈم“ وہ لمحوں میں حاضر تھی۔ ”کنفرم
کرو اگر ایم اے کے ایڈمیشن اوپن ہیں تو اسے لے جاؤ
اور اس کا یونیورسٹی میں ایڈمیشن کروادو۔“ نہکن سے
ہاتھ صاف کرتے اٹھتے ہوئے انہوں نے حکم صادر
کیا۔

”جی میڈم ہو جائے گا۔“

”اس سے پوچھ لیتا یہ کونسا سبجیکٹ لیتا چاہے
گی۔“

”جی۔ آپ فکر نہ کریں میں دیکھ لوں گی۔“

”او۔ کے یو کین گوناؤ۔“ اس کے جاتے ہی انہوں
نے اشنا کی طرف دیکھا جو تقریباً ”کھانا کھا چکی تھی۔“

”اشنا آج کہیں جانے کا تمہارا پروگرام ہے؟“

”نومام۔ آج میں فری ہوں اور اس وقت اپنے
روم میں جا کر ریسٹ کروں گی۔“

”او۔ کے سویٹ ہارٹ ایز یوش۔“ انہوں نے
محبت سے اس کے گل کو چھوا اور پھر ساڑھی کا پلو
سنجھالتی باہر نکل گئیں۔

”میں اس وقت اپنے روم میں جانا چاہتی ہوں اس
لیے تم سے زیادہ بات نہ کر پاؤں گی پلیز ڈونٹ مائنڈ۔“
وہ اٹھتے ہوئے آہستہ سے بولی تھی جب کہ عانیہ نے سر
اثبات میں ہلاتے ”اٹس اوکے“ کہا۔ اس کے جانے
کے بعد وہ کتنی دیر وہاں اکیلے بیٹھی رہی پھر اپنے روم
میں آگئی۔ نجانے کیوں۔ مگر ماما یا ایک دم یاد آنے
لگے تھے۔ ماں بیٹی کا پیار دیکھتے دل بھر سا آیا تھا۔ وہ بھی
تو اپنے ممالیا کی اٹھوتی بیٹی تھی۔

یابا بینک میں ایک اچھی پوسٹ پر فائز تھے۔ انہوں
نے کبھی بھی کسی بھی چیز کی اسے کمی محسوس نہ ہونے
دی تھی بن کے ہی اس کی ہر ضرورت پوری ہو جایا
کرتی تھی۔ ان کا گھر چھوٹا ضرور تھا مگر ماما کے سلیقہ مند
ہاتھوں نے اسے بہت سنوار کر رکھا تھا۔ کتنی آسودگی
تھی اس گھر میں اور وہ کتنی مطمئن اور خوش رہا کرتی
تھی مگر پھر ایک دم قسمت نے ایسا پلٹا کھایا کہ سب ختم
ہو گیا۔ اس کی کھلتی ہوئی ہنسی اس کی خود اعتمادی جیسے

یابا بینک میں ایک اچھی پوسٹ پر فائز تھے۔ انہوں
نے کبھی بھی کسی بھی چیز کی اسے کمی محسوس نہ ہونے
دی تھی بن کے ہی اس کی ہر ضرورت پوری ہو جایا
کرتی تھی۔ ان کا گھر چھوٹا ضرور تھا مگر ماما کے سلیقہ مند
ہاتھوں نے اسے بہت سنوار کر رکھا تھا۔ کتنی آسودگی
تھی اس گھر میں اور وہ کتنی مطمئن اور خوش رہا کرتی
تھی مگر پھر ایک دم قسمت نے ایسا پلٹا کھایا کہ سب ختم
ہو گیا۔ اس کی کھلتی ہوئی ہنسی اس کی خود اعتمادی جیسے

یابا بینک میں ایک اچھی پوسٹ پر فائز تھے۔ انہوں
نے کبھی بھی کسی بھی چیز کی اسے کمی محسوس نہ ہونے
دی تھی بن کے ہی اس کی ہر ضرورت پوری ہو جایا
کرتی تھی۔ ان کا گھر چھوٹا ضرور تھا مگر ماما کے سلیقہ مند
ہاتھوں نے اسے بہت سنوار کر رکھا تھا۔ کتنی آسودگی
تھی اس گھر میں اور وہ کتنی مطمئن اور خوش رہا کرتی
تھی مگر پھر ایک دم قسمت نے ایسا پلٹا کھایا کہ سب ختم
ہو گیا۔ اس کی کھلتی ہوئی ہنسی اس کی خود اعتمادی جیسے

یابا بینک میں ایک اچھی پوسٹ پر فائز تھے۔ انہوں
نے کبھی بھی کسی بھی چیز کی اسے کمی محسوس نہ ہونے
دی تھی بن کے ہی اس کی ہر ضرورت پوری ہو جایا
کرتی تھی۔ ان کا گھر چھوٹا ضرور تھا مگر ماما کے سلیقہ مند
ہاتھوں نے اسے بہت سنوار کر رکھا تھا۔ کتنی آسودگی
تھی اس گھر میں اور وہ کتنی مطمئن اور خوش رہا کرتی
تھی مگر پھر ایک دم قسمت نے ایسا پلٹا کھایا کہ سب ختم
ہو گیا۔ اس کی کھلتی ہوئی ہنسی اس کی خود اعتمادی جیسے

یابا بینک میں ایک اچھی پوسٹ پر فائز تھے۔ انہوں
نے کبھی بھی کسی بھی چیز کی اسے کمی محسوس نہ ہونے
دی تھی بن کے ہی اس کی ہر ضرورت پوری ہو جایا
کرتی تھی۔ ان کا گھر چھوٹا ضرور تھا مگر ماما کے سلیقہ مند
ہاتھوں نے اسے بہت سنوار کر رکھا تھا۔ کتنی آسودگی
تھی اس گھر میں اور وہ کتنی مطمئن اور خوش رہا کرتی
تھی مگر پھر ایک دم قسمت نے ایسا پلٹا کھایا کہ سب ختم
ہو گیا۔ اس کی کھلتی ہوئی ہنسی اس کی خود اعتمادی جیسے

یابا بینک میں ایک اچھی پوسٹ پر فائز تھے۔ انہوں
نے کبھی بھی کسی بھی چیز کی اسے کمی محسوس نہ ہونے
دی تھی بن کے ہی اس کی ہر ضرورت پوری ہو جایا
کرتی تھی۔ ان کا گھر چھوٹا ضرور تھا مگر ماما کے سلیقہ مند
ہاتھوں نے اسے بہت سنوار کر رکھا تھا۔ کتنی آسودگی
تھی اس گھر میں اور وہ کتنی مطمئن اور خوش رہا کرتی
تھی مگر پھر ایک دم قسمت نے ایسا پلٹا کھایا کہ سب ختم
ہو گیا۔ اس کی کھلتی ہوئی ہنسی اس کی خود اعتمادی جیسے

یابا بینک میں ایک اچھی پوسٹ پر فائز تھے۔ انہوں
نے کبھی بھی کسی بھی چیز کی اسے کمی محسوس نہ ہونے
دی تھی بن کے ہی اس کی ہر ضرورت پوری ہو جایا
کرتی تھی۔ ان کا گھر چھوٹا ضرور تھا مگر ماما کے سلیقہ مند
ہاتھوں نے اسے بہت سنوار کر رکھا تھا۔ کتنی آسودگی
تھی اس گھر میں اور وہ کتنی مطمئن اور خوش رہا کرتی
تھی مگر پھر ایک دم قسمت نے ایسا پلٹا کھایا کہ سب ختم
ہو گیا۔ اس کی کھلتی ہوئی ہنسی اس کی خود اعتمادی جیسے

یابا بینک میں ایک اچھی پوسٹ پر فائز تھے۔ انہوں
نے کبھی بھی کسی بھی چیز کی اسے کمی محسوس نہ ہونے
دی تھی بن کے ہی اس کی ہر ضرورت پوری ہو جایا
کرتی تھی۔ ان کا گھر چھوٹا ضرور تھا مگر ماما کے سلیقہ مند
ہاتھوں نے اسے بہت سنوار کر رکھا تھا۔ کتنی آسودگی
تھی اس گھر میں اور وہ کتنی مطمئن اور خوش رہا کرتی
تھی مگر پھر ایک دم قسمت نے ایسا پلٹا کھایا کہ سب ختم
ہو گیا۔ اس کی کھلتی ہوئی ہنسی اس کی خود اعتمادی جیسے

101 کون 101 اکتوبر 2015

پڑے گی۔“
”مگر آئی میں یہ کیسے لے سکتی ہوں۔“ وہ پیسے لینے
میں جھجک رہی تھی۔ ان کے ہاتھ پر سلوٹس ابھرنے
لگیں۔

”کیوں۔ تم کیوں نہیں لے سکتی۔ اتنے سارے
لوگوں کے سامنے میں نے تمہاری ذمہ داری لی ہے اور
اپنی ذمہ داری کو پورا کرنا میں بہت اچھی طرح جانتی
ہوں۔ جب تک تمہاری شادی نہیں ہو جاتی تمہاری
ساری ضرورتیں میری ذمہ داری میں شامل ہیں۔“
اس بار ان کا لہجہ کچھ نرم سا ہو گیا۔

”مگر آئی یہ بہت زیادہ ہیں اور مجھے اتنے سارے
پیسوں کی ضرورت نہیں۔“

”ضرورت پڑتے دیر نہیں لگتی۔“ انہوں نے وہ
پیسے اس کی گود میں ڈال دیئے۔

”زینہ کے ساتھ جا کر اپنے لیے کچھ نوڈرہسز بھی
لے آنا اور اب جاؤ اپنے کمرے میں۔“ ان کے حتمی
انداز میں کہنے پر وہ کچھ جھجکی گئی بغیر کمرے سے نکل
آئی۔



وہ آج ساری دوپہر سو تی رہی تھی مگر اس کے باوجود
بھی کسٹمنڈی اور سستی محسوس کر رہی تھی۔ زینہ کو
چائے کا کہہ کر وہ لان میں چلی آئی۔
شام کے سائے پھیلنے ہی والے تھے۔ بچپن سے ہی
اسے اس وقت میں عجیب سی اٹریکشن فیل ہوتی تھی۔
غروب آفتاب سے ذرا پہلے جو ارد گرد لالی چھائی تھی
اسے پسند تھی جو اسے یہ احساس دلاتی تھی کہ ہر گرم
دن کا اختتام ٹھنڈی شام پر ہوتا ہے اور اس ٹھنڈی شام
کی لپیٹ میں آنے والی رات کا اختتام اک نرم اجلی
صبح پر ہوتا ہے اور یہ گردش لیل و نہار ہی تو احساس
دلاتی ہے زندگی کی حقیقت کا اس کی سچائی کا جس میں
لگن انسان وقت کی ڈور سے جڑا زندگی جی لیتا ہے
اچھی یا بری یہ تو بعد کی بات ہوتی ہے۔
”عانیہ میم آپ کی چائے۔“ اسی وقت زینہ کی آمد

مما پاپا کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی۔ اس نے آج تک
اپنا ہاتھ کسی کے سامنے نہ پھیلا یا تھا۔
پاپا نے تو اس کا ہاتھ کبھی اپنے اور ماما کے سامنے
پھیلانے کی بھی نوبت نہ آنے دی تھی۔ مہینے بعد تنخواہ
ملتے ہی وہ اک مخصوص رقم اس کے کمرے میں اس
کے سرہانے رکھ دیتے جس سے اس کی مہینے بھر کی تمام
ضرورتیں با آسانی پوری ہو جایا کرتیں۔ اسے کتابوں
سے عشق تھا وہ اپنی پاکٹ منی کا زیادہ تر حصہ اچھی
اچھی کتابیں خریدنے میں سرور کر دیا کرتی تھی۔ اس
کے گھر کی چھوٹی سی لائبریری مختلف قسم کی کتابوں سے
بھری پڑی تھی۔ وہ قدرے کم گو اور شرمیلی سی لڑکی تھی
اسے بحث کرنی نہیں آتی تھی بلکہ زیادہ بولنا بھی اسے
کبھی کبھی بہت دشوار لگتا۔ بھگی بھگی پلکوں کو جھپکتے وہ
معصوم سی لڑکی اپنے آنسو اپنے اندر ہی اتارنے لگی۔



اس کا ایڈمیشن ہو گیا تھا۔ آج یونیورسٹی جاتے اسے
تیسرا دن تھا جب ساہ بیگم نے اسے اپنے روم میں
بلایا۔ تاک کرتے وہ اندر داخل ہو گئی۔

”السلام علیکم آئی جی۔ آپ نے بلایا۔“
”ہاں آؤ بیٹھو۔ میں تمہارا ہی ویٹ کر رہی تھی۔“
خود پر ریفریوم اسپرے کرتے انہوں نے صوفے کی طرف
اشارہ کیا۔ وہ بر کلف سے انداز میں ٹک گئی۔
”کوئی پرابلم تو نہیں ہوئی ایڈمیشن میں؟“ وہ اب
پالوں میں برش کر رہی تھیں۔
”نہیں۔“ اس نے مختصر کہا۔
”ایڈجسٹ کر گئی ہو۔“ برش رکھتے وہ دراز کی
طرف جھکیں۔

”جی۔“ جواب اب بھی مختصر سا تھا۔
”یہ لے لو۔“ اس کے قریب آتے انہوں نے کچھ
رقم اس کی طرف بڑھائی۔
”جی۔ یہ۔۔۔ میں۔“ وہ پیسے دیکھ کر پہلے حیران ہوئی
پھر ہچکچا سی گئی۔
”ہاں تم یونیورسٹی جاتی ہو ظاہر ہے ضرورت تو

سے اس کا تسلسل ٹوٹا۔

”او بیٹھو زینی۔“ اس نے اپنی طرف بڑھائی جانے والی چائے کا کپ لیتے ہوئے کہا۔

”جی۔“ زینی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”اگر تم مجھے عالی کہو گی تو مجھے زیادہ اچھا لگے گا یہ میم ویم مجھے کوئی خاص پسند نہیں ہے۔“ چائے کا سب لیتے اس نے ہلکی سی ناک چڑھائی، انداز میں بلا گئی معصومیت تھی۔ سر اٹھاتے میں ہلاتے زینی مسکرا دی۔

”ویسے تم چائے کافی اچھی بناتی ہو۔“

”تھینکس۔ آپ سے ایک بات کہوں عانیہ؟“

”ہاں کہو نا۔“

”آپ بہت اچھی ہیں، دوسروں سے بہت مختلف،

بہت پیاری بہت معصوم اور بہت سادہ۔“

”ارے بس بس۔۔۔ تم نے تو مجھے پتا نہیں کیا سے

کیا بنا دیا میں ایک بہت عام سی لڑکی ہوں اس گھر کے دوسرے افراد کی طرح ماڈرن اسٹائلش اور غیر معمولی خوب صورت نہیں ہوں۔“

”آپ اسٹائلش اور ماڈرن نہیں ہیں۔ آپ خوب صورت نہیں ہیں یہ بات میں نہیں مان سکتی۔ آپ کے چہرے کا پہلا تاثر بہت بھلا، نرم، معصوم اور انوکھا ہوتا ہے۔“

اسی وقت چوکیدار نے مین گیٹ کھولا اور بلیک کٹر کی پراڈو اندر داخل ہوئی اس کے پیچھے ہی ایک جیپ بھی تھی۔ جس میں سے دو بادر دی پاڈی گارڈز ہاتھوں میں اسلحہ تھامے مستعدی سے باہر نکلے پھر ان میں سے ایک نے پھرتی مگر مکمل موڈب انداز سے پراڈو کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور پھر باہر نکلنے والی ہسٹی کو دیکھ کر تو عانیہ سعید جیسے پلک تک جھپکنا بھول گئی۔ بلیک ڈنر سوٹ میں نکھر اٹھا خوشبو میں بکھیرتا وہ جو کوئی بھی تھا ۴ انتہا کا پرجشش اور ڈھنگ تھا۔ لان اور پورچ کا فاصلہ کچھ اتنا زیادہ بھی نہ تھا مگر اس کے باوجود اس نے اک سرسری سی نظر بھی لان کی طرف نہ ڈالی۔ پرنیوم اور کلون کی ملی جلی مہک عانیہ سعید کے نتھنوں میں بلا اجازت آھسی۔ وہ بے نیاز سا شخص اسے کسی ریاست

کا شہزادہ ہی لگا تھا۔ اک شان تمکنت سے وہ راہداری سے گزر کر اندر کی طرف بڑھ گیا، اور پاڈی گارڈز وہیں چوکیدار کے پاس ہی کھڑے رہے۔

عانیہ کو وہ سارا ماحول ایک دم خالی خالی سا لگنے لگا۔ کیا کسی انسان کی شخصیت اتنی زور آور بھی ہو سکتی ہے کہ آئے اور چھا جائے، پلٹے اور تسخیر کرے۔ وہ فقط سوچ کر رہ گئی۔

”زینی پیسہ؟“

”یہ عرشمان صاحب ہیں۔ داؤد صاحب کے بیٹے؟“

اور داؤد صاحب مظہر صاحب کے بڑے بھائی ہیں۔“

”او۔ اچھا۔ مگر یہ۔۔۔“ اس کی نظر پاڈی گارڈز کی

طرف اٹھی، زینی اس کی نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے بولی۔

”بڑے لوگ ہیں جی، سو طرح کی دشمنیاں ہوتی ہیں

اور ویسے بھی داؤد صاحب کا سیاست سے تعلق ہے تو۔۔۔“

”او۔ اچھا۔“

”میں اندر جا رہی ہوں، ساڑھ میڈم کو میری ضرورت ہوگی کیا آپ چلیں گی؟“

”نہیں، تم جاؤ میرا ابھی موڈ نہیں ہے۔“

”جی بہتر۔“ اس کے اندر جاتے ہی عانیہ نے اپنا سر

کرسی کی پشت سے نکا دیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا، وہ کافی دیر وہاں بیٹھی رہی۔ خوشبو کا جھونکا ایک بار پھر سے اس کی ناک سے ٹکرایا اس نے بے ارادہ ہی پورچ کی طرف دیکھا تھا۔ پاڈی گارڈز دروازہ کھول رہا تھا اور وہ شہزادوں کی آن بان نشان رکھنے والا بھرپور مردانہ وجاہت کا شاہکار اپنی لشکارے مارتی نئی نکور گاڑی میں سوار ہو رہا تھا۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے ہی گیٹ سے باہر نکلی تھیں وہ لمبا سانس ہوا میں چھوڑتی اندر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔



داؤد صاحب نے ان سب کو ڈنر پر مدعو کیا تھا۔ اشنا نے تو طبیعت خرابی کی وجہ سے جانے سے انکار کر دیا۔

سائہ بیگم نے زینی کے ہاتھ اسے پیغام بھیج دیا۔ وہ جانا نہیں چاہتی تھی مگر آئی سائہ کو بھی ناراض ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی اس لیے بے دلی سے اپنے کپڑے لے کر دوش روم میں گھس گئی۔

”یہ تم تیار ہوئی ہو؟“ وہ جیسے ہی لاؤنج میں آئی انہوں نے سر سے پیر تک اسے تنقیدی نظروں سے گھورا۔ بلک گھر کے پکین سوٹ میں جس پر شاکنگ پنک پٹیاں لگی تھیں، پسنے وہ انہیں عام دنوں کی طرح ہی لگی۔ میک اپ کے نام پر اس نے اپنی بڑی بڑی براؤن آنکھوں میں کاجل تک نہ ڈالا تھا۔

”مم میں ٹھیک تو ہوں آئی۔“ ان کے دیکھنے کے انداز سے اسے عجیب سی سبکی کا احساس ہوا تھا۔

”وہ جو میں نے تمہیں پیسے دیے تھے اس کی تمہنے ابھی تک شاپنگ کیوں نہیں کی؟“

”یہ۔۔۔ ابھی مجھے اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔“

”ابھی بھی تمہیں ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔“ طنزیہ حیرت بھری نظروں سے انہوں نے ایک بار پھر سے اسے سر تپا گھورا۔

”اب اگر یہاں آئی ہو تو ہمارے اسٹیشن کے مطابق خود کو تبدیل بھی کرو۔ تم سے زیادہ اچھے کپڑے تو اس گھر کے ملازم پہنتے ہیں۔ آئندہ اس بات کا خیال رکھنا اور چلو اب۔“ ہتک و خجالت کے شدید ترین احساس سے اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہوا تھا۔ اپنی ایسی تزییل پر اس کا معصوم دل کافی دکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے کونے گیلے ہونے لگے۔ اپنی بیگی بھیگی پلکیں جھپکتے سر جھکائے ان کے تعاقب میں چل پڑی۔ زینی نے تاسف بھری نظروں سے اس کو جاتے دیکھا تھا۔ اور یہاں آکر تو حقیقتاً اس کے چوہ طبع روشن ہو گئے۔

”کیا واقعی وہ کوئی گھر ہی تھا۔ آئی سائہ کا گھر تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا۔ اک غرور لیے سائے کھڑی یہ شاندار عمارت کسی صورت بھی کسی محل سے کم نہ تھی۔ عائیہ سعید نے اسے دل ہی دل میں

خوب سراہا تھا۔

ان کی گاڑی جیسے ہی وسیع و عریض پورچ میں آکر رکی ایک ملازم نے مودب انداز میں دروازہ کھولا تھا۔ رایداری کے شروع میں ہی ایک بے انتہا پرکشش لڑکی گرین کلر کی ساڑھی پہنے ہاتھوں میں بکے پکڑے ان کے انتظار میں کھڑی مسکراتی تھی۔

”گڈ ایوننگ میم۔“ اس نے بکے سائہ بیگم کی طرف برہمایا۔

”صاحب کہاں ہیں تمہارے؟“ سائہ بیگم کے بکے تھامتے ہی مظہر صاحب نے پوچھا تھا۔

”جی۔۔۔ وہ اندر آپ کا ہی ویرٹ کر رہے ہیں آئیے پلیز۔“ تھوڑا سا سر خم کرتے اس نے ہاتھ سے اندر کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

”تو کیا یہ بھی ملازم ہے، اف، اتنی حسین۔“ عائیہ کا حیرت کے باعث منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ادائے نزاکت سے اپنے ساتھ چلتی اس لڑکی کو اس نے کتکیوں سے کئی بار دیکھا تھا۔ انجانے میں وہ جس دنیا کا حصہ بن چکی تھی وہ واقعی اس کی دنیا سے یکسر مختلف تھی۔ کچھ دیر پہلے جو آئی کی بات سے اسے اپنی شدید انسٹیل ہوتی تھی، یہاں آکر اسے احساس ہوا کہ انہوں نے ایسا کچھ غلط بھی نہ کہا تھا۔ اس نے خود پر ایک نظر ڈالی اور پھر احساس کمتری میں مبتلا ہونے لگی۔ کیا وہ کبھی ان لوگوں میں ایڈجسٹڈ کپائے گی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ ان جیسا نہیں بن سکتی تھی۔ اندر کی بے چینی کو زائل کرنے کے لیے وہ اپنے نیچے والے ہونٹ کو بلاوجہ کھینچنے لگی۔

”ویل کم ٹومائے سوٹ پلیس مظہر۔“ اسی دوران داؤد صاحب بڑے پر جوش انداز میں ان کی طرف بڑھے اور پھر مظہر صاحب کو گلے لگا لیا۔

”یونویار آج ہم تین ماہ بعد مل رہے ہیں۔“ وہ خوش دلی سے بولے تھے جب مظہر صاحب مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلا گئے۔

”زندگی کی مصروفیات نے کچھ زیادہ ہی بڑی کر ڈالا

ہے ہمیں ابھی بھی آپ اگر ڈنر پر نہ بلا تے تو آنا مشکل تھا۔“

”جانتا ہوں اسی لیے یہ اہتمام کیا ہے۔“
 ”بی بی جی کہاں ہیں؟“ مظہر صاحب نے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

”ملازمہ لینے گئی ہیں انہیں وہ آتی ہی ہوں گی تم بیٹھو تو سہی۔“ اس دوران سائرہ بیگم اور عانیہ بالکل خاموش کھڑی رہیں۔

”اور تم کیسی ہو سائرہ؟“ داؤد صاحب کے لہجے میں بڑے بھائیوں والا لاڈ تھا۔ وہ آہستہ سے سر اٹھاتے میں ہلا گئیں۔ ”میں ٹھیک ہوں بھائی جان۔“

”اشنا بیٹی نظر نہیں آرہی؟ کیا وہ نہیں آئی؟“
 ”جی۔ اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے نہیں آئی۔“

”کیوں کیا ہوا اُسے؟“ وہ ایک دم پریشان ہو گئے۔
 ”کچھ خاص نہیں بھائی جان بس سر میں درد تھا میڈسن لے کر سوئی ہوئی تھی۔“

”او۔ اچھا!“ پھر ان کی نظر اچانک اس پر پڑی۔
 ”اور اس پیاری سی بیٹی کا تعارف تو آپ نے کروایا ہی نہیں۔“

”یہ بھانجی ہے میری۔ والدین کی روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈھتھ کے بعد اسے میں اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔“

”اوویری سیڈ۔“ انہیں حقیقتاً دکھ ہوا تھا۔
 ”السلام علیکم انکل۔“ اس کے سلام پر انہوں نے مسکراتے ہوئے آہستہ سے سر اٹھاتے میں ہلایا۔ اسی

دوران ملازمہ بی بی جی کی چیئر گھسیٹی ہوئی لے آئی تو سب کی توجہ ان کی جانب ہو گئی۔ سب سے پہلے ان کی طرف بڑھنے والا مظہر صاحب ہی تھے۔

”کیسی ہیں بی بی جی؟“
 ”میں تو ٹھیک ہوں، مگر تم نے اس بار بڑی دیر کے بعد چکر لگایا ہے۔“ ان کا ماتھا چومتے انہوں نے جیسے ہلکا سا شکوہ کیا۔

”بس بی بی جی مصروفیت ہی بہت رہی ہے۔“ پھر سائرہ

بیگم کے سلام کرنے کے بعد بی بی جی کی نظر کچھ نروس سی انگلیاں چٹکتاتی عانیہ پر پڑی۔

”یہ بھانجی ہے میری بی بی جی۔“ ان کی نظروں کا مطلب سمجھتے سائرہ بیگم نے تعارف کروایا وہ اک جھجک لیے آگے بڑھی اور پھر انہیں سلام کرتے اپنا سر

ان کے سامنے جھکا دیا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ان کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے چمکیں۔ آج کے دور میں بڑوں کا ایسا احترام۔ عانیہ سعید کا پہلا ہی تاثر بہت

اچھا رہا تھا۔
 ”عرشمان کہاں ہے بی بی جی نظر نہیں آرہا۔“
 ”اس کا فون آیا تھا، تھوڑی ہی دیر میں گھر پہنچنے ہی

والا ہے۔“ سائرہ بیگم کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا۔ پھر وہ سب تو باتوں میں مصروف ہو گئے اور عانیہ سعید وہاں بےوجہ ہی پور ہوئی رہی۔

”عانیہ اگر تم پور ہو رہی ہو تو ملازمہ کے ساتھ جا کر گھر دیکھ لو۔“ سائرہ بیگم کو ہی آخر اس کی بورت کا احساس ہوا تو انہوں نے کہہ دیا۔ عانیہ نے بے ساختہ

تشکر بھرا سانس لیا اور پھر ملازم کی رہنمائی میں لان کی طرف آگئی۔ شام کے سائے ڈھل رہے تھے اس کا پسندیدہ وقت شروع ہو چکا تھا۔ دھیمے سے مسکراتے وہ

پھولوں کی باڑ کے پاس آکھڑی ہوئی۔ سبز گھاس پر چنبیلی کے سفید پھول گرے بہت خوب صورت لگ رہے تھے وہ آہستہ سے جھکی اور پھر انہیں دوپٹے کے پلو میں اکھٹا کرنے لگی۔

”ہیلو کون ہیں آپ؟“ پارعب گبھیر پر کشش مردانہ آواز پر وہ بوکھلاتے ہوئے بیٹھی۔

”کون ہو تم۔ اور یہاں کیا کر رہی ہو؟“ عرشمان داؤد نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

عانیہ سعید اسے لمحوں میں پہچان گئی تھی۔ وہ عرشمان داؤد تھا، داؤد انکل کا بیٹا، مظہر انکل کا بھتیجا، اور اس گھر کا اکلوتا چشم و چراغ۔ لمحوں میں دلوں کو نسیخہ

کرنے والا جاوید گر جبکہ اس کے برعکس عرشمان داؤد اسے بھرپور اجنبی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے نہیں جانتا تھا۔ اس نے اسے پہلی بار دیکھا تھا مگر اس

کے باوجود بھی وہ اس چہرے کے پہلے تاثر کو دیکھتے ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا ضرور تھا۔
 ”کیا پاپا نے کوئی نئی ملازمہ رکھی ہے؟“ اس سوچ کے دماغ میں آتے ہی اس نے ایک بار پھر سے اسے سر تاپیر گھورا۔

”کیا تم نئی ملازمہ ہو؟“

”جی! عانیہ کی تو جیسے پوری آنکھیں کھل گئیں۔ بے عزتی کے احساس سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ کیا واقعی وہ ملازمہ لگ رہی تھی۔“

”کب اپوائنٹ کیا ہے پاپا نے تمہیں؟“ وہ اس کے جی کو اپنے ہی معنی میں لیتے دوبارہ بولا شدید ہتک محسوس کرتے اس کی آنکھیں پانی سے بھرنے لگیں۔
 ”عمرشان داؤد کی آنکھیں ان جھیل کٹوروں پر ٹھہری گئیں۔ لباب پانی سے بھرے کٹورے چھلکنے کو بے تاب، عمرشان داؤد کو عجیب سی کشمکش میں مبتلا کرنے لگے۔“

”عانیہ میم کھانا لگ گیا ہے سب لوگ آپ کا اندر وٹ کر رہے ہیں۔“ اس سے پہلے کہ وہ ضبط کھودتی ملازمہ کے پکارنے پر اندر کی طرف بھاگ گئی۔
 ”میم؟۔ انتظار؟“ وہ حیران حیران سا اس کے پیچھے اندر کی طرف بڑھا تھا۔

”السلام علیکم!“ ڈانٹنگ ہال میں داخل ہوتے اس نے سب کو مشترکہ سلام کہا تھا اور پھر عانیہ پر اس کی نظر جیسے ٹھہری گئی جو سر جھکائے آئی سارہ کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ یعنی وہ ملازمہ نہیں تھی۔ تو پھر کون تھی؟

”بچھج کر کے آجاؤ ہم تمہارا ہی ویٹ کر رہے تھے۔“

”جی آپ شروع کیجیے میں بس پانچ منٹ میں آیا۔“ پاپا کے کہنے پر وہ عانیہ کے جھکے سر پر سر سوچ نظر ڈالتا الجھتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ کھانے کے ساتھ ساتھ پاپا اور چچا جان سے باتوں میں بھی مصروف تھا۔ نظریں گلابے بگا بے عانیہ کی طرف بھی اٹھ جاتیں جو اسے مکمل طور پر نظر انداز کیے ہوئے تھی۔ اس نے

ایک بار بھی نظر اٹھا کر اس کی طرف نہ دیکھا تھا۔
 ”عمرشان داؤد کو ندامت سے ہونے لگی۔ اپنے مہمانوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرنے کی تو اسے تربیت نہ دی گئی تھی، انجانے میں ہی سہی مگر وہ غلطی کر چکا تھا اور اب جبکہ اسے پتا چل چکا تھا کہ وہ آئی سارہ کی بھانجی ہے تو گلٹ اور برہہ گیا تھا۔“

”اے کسکو زنی مس عانیہ۔“ واپسی پر وہ سر جھکائے سب سے پیچھے چلی آ رہی تھی جب اس کے پکارنے پر ناچاہتے ہوئے بھی رک گئی۔ ”سوری“ اگر آپ میری وجہ سے ہرٹ ہوئی ہیں میں نے وہ سب جان بوجھ کر نہیں کہا تھا۔“ عانیہ اس سے کوئی بھی بات کیے بغیر آگے بڑھ گئی۔ اسے روہ رو پاتے ہی وہ عجیب سی کیفیت کا شکار ہونے لگتی اور یہ ہی چیز اسے الجھن میں مبتلا کر رہی تھی۔



لی جی آج مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔
 ”کیوں کیا ہوا؟“ رات وہ لی جی کی گود میں سر رکھے کہہ رہا تھا جب انہوں نے پوچھا۔
 ”وہ جو آئی سارہ کی بھانجی آئی تھی نا ان کے ساتھ۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“
 ماشاء اللہ کافی سلجھی ہوئی اور بیماری بچی تھی۔ اس کے انداز و اطوار دیکھتے صاف پتا چلتا ہے کہ بہت اچھے طریقے سے اس کی پرورش کی گئی ہے۔ سلام کرنے کے بعد اس نے بڑے احترام سے سر جھکایا تھا اور نہ آج کل کے بچوں میں تو ایسی اخلاقیات سرے سے ہی نہیں پائی جاتیں۔“

”میری بھی تو سنیے نا۔“ لی جی کی تعریفیں اس کے اندر کے گلٹ کو اور بڑھاتی جا رہی تھیں اس لیے زچ ہوتے ہوئے بولا۔

”ہاں، ہاں، کو پتر جی میں سن رہی ہوں۔“
 ”وہ اے کسکو زنی۔ میں اسے ملازمہ سمجھ بیٹھا تھا۔“
 ”کیا۔۔۔؟“ لی جی کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

”عرشمان یہ کیا حرکت کی بیٹا آپ نے کیا وہ آپ کو ملازمہ لگی تھی اتنی موہنی اور پیاری صورت تھی اس کی میری تو ابھی تک نظروں میں گھوم رہی ہے۔“
انہیں حقیقتاً دکھ ہوا تھا۔

”اوہو۔ لی جی کہا تو ہے کہ غلطی ہو گئی۔“ وہ جھنجلا سا گیا، یہ اس کی طبیعت کا خاصا تونہ تھا مگر دل کی بے چینی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔

”تو بیٹا آپ نے اس سے اہکسکیوز کر لینی تھی۔“ وہ اس کے ماتھے کے بل سمیٹتے ہوئے جھٹ سے بولیں۔

”کی تو تھی۔“

”پھر۔“

”پھر کیا۔ نور پلائی لگتا ہے کہ وہ کچھ زیادہ ہی مائنڈ کر گئی تھی۔“

”تو بیٹا اسے کرنا بھی چاہیے اب اگر کوئی آپ کو ملازم کہے تو آپ کو کیسا لگے گا۔“

”کیوں۔ کوئی مجھے ملازم کہے گا، میری شکل ملازموں جیسی ہے کیا۔“ وہ برہم سا گویا، بی بی جی مسکرائیں، واقعی اس کی شکل تو شہزادوں جیسی تھی۔ تو کیا اس لڑکی کی صورت ملازموں جیسی تھی۔

”آپ اس سے دوبارہ اہکسکیوز کر لیں مائے سن۔“

”جی کر لوں گا۔“ سر اثبات میں ہلاتے وہ تابعداری سے بولا تھا، لی جی تو اس کی اس ادا پر شمار ہی تو ہو گئیں۔

”انہیں اپنا یہ پوتا حد سے زیادہ عزیز تھا اگر یوں کہا جائے کہ اس کے اندر ان کی جان بستی تھی تو کچھ غلط نہ ہوگا، عمارہ کے جانے کے بعد انہوں نے ہی اس کی پرورش کی تھی، اس کی شخصیت کو نکھارنے میں اپنی طرف سے تو انہوں نے کوئی کثر نہ چھوڑی تھی۔ کچھ وہ خود بھی بہت سلجھی ہوئی طبیعت کا مالک تھا، ایک دفعہ

بی جی نے جس بات سے منع کر دیا تو دوبارہ پلٹ کر وہ بات نہ کی، عورت ذات کے حوالے سے اس کی سوچیں کچھ منتشر اور مبہم سی تھیں۔ عورت کے لیے وہ اک خاموش سمندر کی مانند تھا جس میں آج تک پہلا پتھر

نی جی نے جس بات سے منع کر دیا تو دوبارہ پلٹ کر وہ بات نہ کی، عورت ذات کے حوالے سے اس کی سوچیں کچھ منتشر اور مبہم سی تھیں۔ عورت کے لیے وہ اک خاموش سمندر کی مانند تھا جس میں آج تک پہلا پتھر

نی جی نے جس بات سے منع کر دیا تو دوبارہ پلٹ کر وہ بات نہ کی، عورت ذات کے حوالے سے اس کی سوچیں کچھ منتشر اور مبہم سی تھیں۔ عورت کے لیے وہ اک خاموش سمندر کی مانند تھا جس میں آج تک پہلا پتھر

نی جی نے جس بات سے منع کر دیا تو دوبارہ پلٹ کر وہ بات نہ کی، عورت ذات کے حوالے سے اس کی سوچیں کچھ منتشر اور مبہم سی تھیں۔ عورت کے لیے وہ اک خاموش سمندر کی مانند تھا جس میں آج تک پہلا پتھر

پھینکنے کی کسی میں ہمت نہ ہوئی تھی۔
مما جب اسے چھوڑ کر گئی تھیں تو اس کی عمر فقط سات سال کی تھی ذہن کچا تھا اور دل معصوم، اگر بی جی کا سہارا نہ ہوتا تو عورت ذات کے لیے اس کے دل میں اب تک شدید نفرت پیدا ہو چکی ہوتی، مما کا کردار اک آئینے کی طرح اس کے سامنے تھا۔ مما کے دل سے پاپا ٹوٹ گئے تھے بکھر گئے تھے، عورت ذات سے نفرت کرنے لگے تھے، مگر وہ ایسا نہیں کہ پایا تھا وہ اگر عورت سے نفرت نہیں کرتا تھا تو محبت بھی نہیں کہ پایا تھا۔ وہ بی جی کو ٹوٹ کر چاہتا تھا اور شاید یہ ہی وجہ تھی کہ وہ عورت سے نفرت کرنے میں خود کو کمزور پاتا تھا، مگر اس بار محبت اسے جن چکی تھی اور محبت کا تو کام ہی انسان کو اپنی اسیری میں لے کر بے بس کرنا ہوتا ہے۔



وہ آج خاص طور پر اس سے اہکسکیوز کرنے کے ارادے سے وہاں آیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی اس نے زینی سے عانیہ کو بلانے کے لیے کہا تو زینی نے خاصی حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے عرشمان داؤد کا اس طرح سے عانیہ کو بلانا قابل حیرت ہی تو تھا جب زینی نے پیغام عانیہ تک پہنچایا تو وہ بھی کافی حیران ہوئی تھی۔

”وہ تجھ سے کیوں بلنا چاہتا ہے؟“

”یہ تو مجھے بھی پتا نہیں مگر وہ ڈرائنگ روم میں آپ کا ویٹ کر رہے ہیں۔ آپ چائے میں چائے لے کر آتی ہوں۔“ زینی کے جانے کے بعد وہ آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی، گھریلو ساہ سا پرپل اور وائٹ سوٹ، دھلا دھلا یا صاف شفاف چہرہ۔

”ہاتھ سے کپڑوں کی سلوٹیں دور کرتے سر پر دوپٹا اوڑھ کر وہ ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔“

”السلام علیکم!“ اندر داخل ہوتے ہی اس نے سلام کیا۔

”السلام علیکم السلام۔“ یہ کلمت وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”پلیز بی سیٹل۔“

ڈریس کیسا ہے؟“ انہوں نے وہی فرائگ اس کے سامنے کیا۔ فرائگ کے گھیراؤ اور چمک دھمک نے حقیقتاً اس کی آنکھیں خیرہ کر دی۔

”بہت بہت زبردست ہے آئی؟“ اس نے کھلے دل سے تعریف کی تھی۔

”یہ میں تمہارے لیے لائی ہوں، آج رات کے فنکشن کے لیے۔“

”جی“ حیرت سے اس کی زبان گنگ سی رہ گئی۔ اسے کسی صورت یقین نہ آیا تھا۔

”ناٹ آگین عانیہ، کتنی بار میں تمہیں کہہ چکی ہوں کہ کوئی بھی بات کرنے سے پہلے ہمارے اسٹیشن کو مد نظر رکھ لیا کرو۔ تم مشرقی لباس پسند کرتی ہو اس لیے میں نے تمہارے لیے یہ خریدی ہے جبکہ آشنا مغربی لباس پسند کرتی ہے تو اس نے اپنے لیے میکسی خریدی ہے۔“

آج پہلی بار تم ہمارے سرکل میں متعارف کروائی جاؤ گی اور سب تمہیں ساٹھ بیگم کی بھانجی کی حیثیت سے ہی ملیں گے اور یہ میں کسی صورت برداشت نہیں کر پاؤں گی کہ تم کسی سے بھی کم نظر آؤ، یہ لو اور اب جاؤ، مہمان آنے ہی والے ہوں گے۔ تیار ہو جاؤ جا کر۔“

اس نے ان کے ہاتھ سے فرائگ لی اور پھر اپنے کمرے میں آگئی۔ ڈریس کی ٹینشن تو ختم ہو گئی تھی مگر یہ بھی سچ تھا کہ حیرت کسی صورت ختم نہ ہو رہی تھی۔ وہ شاید آئی ساٹھ کو ٹھیک سے سمجھ نہیں پائی تھی۔ وہ اوپر سے سخت، کرخت، گھمنڈی نظر آنے والی اندر سے بالکل برعکس تھیں۔ وہ ہر چیز پر فیکٹ چاہتی تھیں۔ معمولی سی چیز ان سے جڑ کر خاص ہو جاتی تھی۔ وہ خود کو نمایاں رکھنے کی عادی تھیں پھر وہ کس طرح گوارا کر لیتیں کہ ان کی بھانجی اس فنکشن میں معمولی کپڑوں میں نظر آئے۔ وہ ظاہر نہیں کرتی تھیں مگر انہیں عانیہ کی پروا تھی مگر ان کا پروا کرنے کا انداز ذرا مختلف تھا، اور عانیہ سعید کو یہ بات اب بڑی تفصیل سے سمجھ آ چکی تھی۔ وہ ایک اخروٹ کی طرح کی تھیں

”تھینکس۔“

”زینی بتا رہی تھی کہ آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ خیریت؟“ اس کے سامنے والے صوفے پر براجمان ہوتے اس نے نارمل سے انداز میں پوچھا، ورنہ اسے رو رو پاتے دل کی حالت غیر ہونے لگتی تھی۔

”اچھا، جو سبکی اس دن کے حوالے سے میں آپ سے معذرت کرنے آیا ہوں۔“ عانیہ نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، وہ واقعی تادم نظر آ رہا تھا۔

”اٹس اوکے۔“ اسی وقت زینی چائے کے ساتھ دیگر لوازمات سے بھی ٹرائی کھینٹتے اندر داخل ہوئی۔

”ایم سوری میں عانیہ، میں اس وقت کچھ بھی نہیں لے پاؤں گا۔ آئی ہیو شارٹ ٹائم، بہت اہم میٹنگ اینڈ کرنی ہے۔ آئی ہوپ آپ مائنڈ نہیں کریں گی۔ میں تو بس آپ سے اہکسکیوز کرنے آیا تھا۔“

وہ دھیرے سے مسکراتے اٹھ کھڑا ہوا۔ عانیہ سعید کی نظریں اس کی مسکراہٹ پر جم سی گئیں۔ کیا کسی مرد کی مسکراہٹ اتنی خوب صورت بھی ہو سکتی ہے۔ وہ سوچ کر رہ گئی۔



اشنا کی برتھ ڈے پارٹی کو کافی بڑے پیمانے پر ارنج کیا گیا تھا۔ وہ تولان کی سجاوٹ دیکھ کر ہی دنگ رہ گئی۔ ایسے لگتا تھا جیسے کسی کی شادی کے فنکشن کی تیاری ہو رہی ہو۔ ساری ڈیکوریشن کو سراہتی ہوئی نظروں سے دیکھتے وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ وہ یہ ہی سوچ رہی تھی کہ فنکشن میں کونسا سوٹ پہنے کہ اسی وقت ٹاک کرتے زینی اندر داخل ہوئی۔

”عانیہ آپ کو میڈم ساٹھ اپنے روم میں بلا رہی ہیں۔“ وہ سر ہلاتے ساٹھ بیگم کے کمرے کی طرف برہہ گئی۔

جو اپنے سامنے بیڈ پر وائیٹ کلر کا نہایت خوب صورت فرائگ پھیلائے سوچوں میں گم تھیں۔

”میں آ جاؤں آئی؟“

”ہاں، ہاں آ جاؤ، میں تمہارا ہی ویٹ کر رہی تھی، یہ

سی عانی کتنی دیر خود کو آئینے میں دیکھتی رہی۔
 ”یہ سب اس ڈریس اور میک اپ کا کمال ہے ورنہ
 میں تو وہی پرانی سی عانیہ سعید ہوں۔“ اس کے ساؤگی
 اور معصومیت سے کہنے پر زینی مسکرا دی۔



اشنا کا لباس آج کے دن بھی عانی کو کافی نامناسب
 لگا۔ عانیہ سعید نے سوچا اگر وہ اس وقت مغربی کے
 بجائے مشرقی لباس میں ہوتی تو انتہا کی حسین لگ رہی
 ہوتی مگر ساری بات ہی اپنی اپنی پسند کی ہے۔ تمام
 مہمان آچکے تھے۔ آئی سب سے اس کا بڑھ چڑھ کے
 تعارف کرا رہی تھیں۔ ان کی اس قدر محبت و اہمیت
 پر عانیہ خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔
 اس کے چہرے پر اتنی خوشی تھی کہ وہاں موجود کئی
 لوگوں کی نظر ٹھنکی تھی۔

اس پل عرشمان داؤد اندر داخل ہوا تھا۔ عانیہ کی نظر
 جیسے اس پر ٹھہری گئی۔ نیوی بلو سوٹ میں وہ حسب
 معمول اس وقت بھی مروانہ وجاہت کا دلکش شاہکار
 نظر آ رہا تھا بے ساختہ ہی عانیہ کی ہارٹ بیٹ مس
 ہوئی وہ دشمن جاں اسی کی طرف ہی آ رہا تھا عانیہ سعید
 کے پورے وجود میں پھریری سی گھومی چہرے پر پسینے کی
 چھوٹی چھوٹی بوندیں نمودار ہونے لگیں۔ یہ کیسا
 احساس اس ایک لمحے میں اس پر آشکار ہوا تھا یہ کیسا
 ادراک تھا یہ کیسی آگہی تھی اس کی آنکھوں کے
 کونے نمکین پانی کی لپیٹ میں آنے لگے۔ وہ قریب
 آچکا تھا عانیہ نے آہستہ سے اپنا سر جھکا لیا۔

”السلام علیکم عانیہ، کیسی ہیں؟“ عانیہ نے ہولے
 سے سر اٹھایا۔ عرشمان داؤد بے اختیار ٹھنکا عانیہ کی
 آنکھوں کا بھیگا بھیگا تاثر اسے وہیں منجمد کر گیا۔ عرشمان
 داؤد نے بغور اس چہرے کو دیکھا تھا، سرسری اٹھی نظر
 کب گہری ہوتی گئی اسے خود بھی احساس نہ ہوا۔ وہ
 دونوں ہی ارد گرد سے غافل عجب خود فراموشی میں کتنی
 دیر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ کالی دیر کے
 بعد ہی وہ خود میں لوٹے تھے، عرشمان داؤد کی آنکھوں

جو بظاہر سخت نظر آتا ہے مگر اندر سے انتہائی نرم ہوتا
 ہے۔ وہ اک رشتے کی ڈور سے بندھی اس گھر میں
 موجود تھی اور آج اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ رشتہ اتنا کچا
 ہرگز نہ تھا۔ عانیہ کے ہونٹوں کو دھیمی سے مسکراہٹ
 نے چھو لیا۔

وہ ڈریس لے کر واش روم میں گھس گئی اور پھر
 جب چینیج کر کے قد آدم آئینے کے سامنے آکر کھڑی
 ہوئی تو خود کو دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ فرائڈ کی فننگ
 پرفیکٹ تھی وہ اس میں باربی ڈول ہی لگ رہی تھی۔
 کتنی دیر تو پلک جھپکے بغیر وہ خود کو دیکھتی رہی۔ کیا واقعی
 وہ اتنی خوب صورت تھی۔ اس نے تھیر سے سوچا
 اسی وقت ناک کرتے آئی کمرے کے اندر داخل
 ہوئیں اور یہ ان دو ماہ میں پہلا موقع تھا کہ وہ خود سے
 چل کر اس کے روم میں آئی تھیں۔ اسے دیکھتے ان کی
 آنکھوں میں جو پہلا تاثر ابھرا تھا وہ ستائش و پسندیدگی کا
 تھا۔ عانیہ جھینپ سی گئی۔

”ڈریس لیتے وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ تم پر
 اتنا سوٹ کرے گا۔“ تعریف تھوڑے مختلف انداز
 میں کی گئی تھی مگر عانیہ مسکرا دی۔

”میک اپ کیوں نہیں کیا تم نے؟“
 ”وہ۔ آئی میں نے زندگی میں کبھی میک اپ
 نہیں کیا۔“ انہوں نے انٹرکام پر زینی کو آنے کے لیے
 کہا۔

”زینی اس کا میک اپ کرو چونکہ اس نے زندگی
 میں کبھی میک اپ نہیں کیا تو بہت سوٹ اور لائٹ لیج
 دینا۔“ زینی کو کہتیں وہ ساڑھی کا پلو سنبھالتی باہر چلی
 گئیں، انہیں خود بھی جا کر تیار ہونا تھا، اشنا تو کب سے
 پار لڑ گئی ہوئی تھی۔

زینی نے ساڑھ بیگم کی ہدایت پر پورا پورا عمل کیا تھا،
 اور پھر جیسے زینی کی نظر اس کے خوبصورت چہرے پر
 ٹھہری گئی۔

”ماشاء اللہ! آپ بہت خوب صورت لگ رہی ہیں
 عانیہ، اللہ نظرید سے بچائے۔“ اس کے کانوں میں
 لائٹ سے ٹاپس پہناتے زینی نے کہا جبکہ حیران حیران

میں حیرت جبکہ عانیہ سعید کی آنکھوں میں نمی تھی فقط اک لمحہ لگا تھا اور وہ عام چہرہ عثمان داؤد کے لیے خاص بنا گیا خوب صورتی تو کبھی بھی عثمان داؤد کی طلب نہ تھی تو پھر آخر کیا تھا اس چہرے میں۔

”عانیہ کیسی ہیں آپ؟“ تھوڑی دیر کے بعد عثمان داؤد نے دوبارہ پوچھا۔ وہ جواب دینے کی پوزیشن میں ہرگز نہ تھی اس لیے تقریباً ”ووڑتے ہوئے وہاں سے پلٹی تھی۔ اشنا کے قریب آکر کھڑے ہوتے وہ کتنی دیر اپنے تیز تیز دھڑکتے دل کی دھڑکنیں سنبھالتی رہی۔

”آریو او کے عانیہ!“ اشنا کے پوچھنے پر وہ آہستہ سے سر اثبات میں ہلا گئی اور پھر وہ پورے فنکشن کے دوران عثمان داؤد کی نظریں خود پر محسوس کرتی رہی۔

”اف کتنی گہری نظریں ہیں اس بندے کی۔“ اس کے گالوں سے اچھی خاصی پیش نکلنے لگی۔ اپنے دونوں گالوں کو تھکتے وہ قدرے کم رش والی جگہ پر ایک

کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔ اس وقت وہ آئی سائز اور اشنا کے ساتھ کھڑا باتوں میں مصروف تھا، مگر اس کے باوجود بھی اس کی نظریں کی گرفت میں وہ بار بار آرہی تھی۔

وہ کسی بات پر ہنسا تھا عانیہ کا دل اندر سے دھڑکا تھا، نظر ٹھہری گئی اس کی نظریں کے ارتکاز کو محسوس کرتے عثمان داؤد کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور پھر تھوڑی دیر

کے بعد ہی اس نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ اٹھنے لگی۔ مگر یہ کیا، کمر کے پیچھے سے اس کی فرائ کی چیز میں بری طرح پھنستے ہوئے الجھ کر رہ گئی۔ وہ

ایک دم پریشان ہو گئی۔ اس نے اپنی طرف کھینچتے تھوڑا ہی زور لگایا تھا جس کے نتیجے میں فرائ پھنسنے کی آواز صاف سنائی دی گھبراتے ہوئے اس نے بے اختیار ہی

ارد گرد دیکھا، کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ تھا، مگر عثمان داؤد اس کے قریب آچکا تھا۔ اس نے اپنی کمر کو

کرسی کی بیک سے چپکا لیا، وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی فرائ کمر کے کس حصے سے اور کس حد تک پھٹی

تھی۔ ”اف اللہ جی یہ کیا ہو گیا۔“ اس کا سر جھک گیا آنکھیں لب لباب پانی سے بھرنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ

اپنی بے بسی پر وہ رو دیتی اسی وقت اس کی آنکھوں کے سامنے کوٹ ٹھامے ایک ہاتھ ابھرا اس نے بھیگی پلکیں اٹھائیں، سامنے عثمان داؤد اپنی زور آور شخصیت لیے کوٹ اس کی طرف برصائے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ اس وقت از حد سنجیدہ تھا۔ اسے کیسے بتا چلا کہ اسے مدد کی ضرورت ہے۔ کیا وہ اسے نوٹ کر رہا تھا۔ نیٹ کا باریک دوپٹا تو کسی صورت اس قابل نہ تھا کہ اس سے وہ اپنی پشت ڈھانپ سکتی کچھ بھی کہے بغیر اس نے آہستہ سے عثمان داؤد کے ہاتھ سے کوٹ تھام لیا اور پھر چیئر پر بیٹھے ہی اسے پہن بھی لیا، کھڑے ہوتے اس نے سرعت سے چیئر کی طرف دیکھا وہاں نوک دار باریک کیل نظریوں کی گرفت میں آتے ہی اس کی آنکھیں بے اختیار ہی عثمان داؤد کی نظریں سے ٹکرانی تھیں اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا، مگر عثمان نے ایک نظر کے بعد دوبارہ اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

”لگتا ہے کہ آپ کو میری نظر لگ گئی ہے، اس ڈریس میں آپ ساری بھی تو بہت لگ رہی تھیں۔“ عانیہ نے بخیر سے پلکیں اٹھائیں، مگر وہ پلٹ چکا تھا۔



وہ لاؤنج میں بیٹھی نیوی دیکھ رہی تھی جب ٹیلی فون کی بیل بجی۔

”ہیلو۔“ ولیم کم کرتے اس نے ریسیور کان سے لگایا۔

”کسی کی چیز لے کر واپس کرنے کا رواج نہیں ہے کیا آپ کے ہاں۔“

”جی۔ کیا مطلب؟ اور کون بات کر رہے ہیں آپ؟“ ایر پیس سے ابھرنے والی مردانہ گھبیر آواز نے گھوں میں اسے حیران کیا تھا۔

”میں عثمان داؤد بول رہا ہوں۔“

”آ۔۔۔ سپ! میں نے کون سی چیز لی ہے آپ کی؟“

”کیوں اتنی جلدی بھول گئیں، اشنا کی برتھ ڈے کو ابھی اتنا عرصہ تو نہیں گزرا۔“ ادھر سے وہ مسکراتے

ہوئے کہہ رہا تھا اس کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔
 ”اوہ۔ تو آپ کوٹ کی بات کر رہے ہیں مگر وہ تو میں
 نے ڈرائیور کے ہاتھ دوسرے دن ہی بھینچ دیا تھا۔“
 ”اچھا۔ مگر مجھے تو نہیں ملا۔“ وہ انجان بنا ورنہ
 کوٹ تو اس وقت اس کی وارڈروب میں موجود تھا۔
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے میں ابھی ڈرائیور سے پوچھتی
 ہوں۔“

”ارے رہنے دیں اس بے چارے ڈرائیور کو کچھ
 مت کہنے گا فون تو میں نے آپ کو یہ کہنے کے لیے کیا
 ہے کہ بی جی آپ کو بہت یاد کر رہی تھیں۔“
 ”مجھے۔۔۔؟“ وہ خاصی حیران ہوئی۔

”بی جی آپ۔۔۔ کو۔“
 ”اچھا۔ کیسی ہیں وہ؟“
 ”اب طبیعت تو ٹھیک ہے، مگر کمزوری بہت
 محسوس کر رہی ہیں۔“

”کیوں کیا ہوا تھا انہیں!“ وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔
 ”عرشان داؤد کو اس کا بی جی کے لیے یوں پریشان ہونا بہت
 اچھا لگا تھا۔“

”پچھلے کچھ دنوں سے انہیں بخار تھا اسی وجہ سے تو
 اشنا کی برتھ ڈے پارٹی پر بھی نہیں آسکیں۔ مگر اب اللہ
 کا شکر ہے کہ ٹھیک ہیں۔“
 ”کب آرہی ہیں آپ؟“

”کہاں؟“
 ”ہمارے غریب خانے پر بی جی کی عیادت کو۔“
 ”مہمہ میں؟“
 ”بی جی آپ۔۔۔“

”ویکھتی ہوں۔“ وہ ٹال گئی۔
 ”کیا دیکھتی ہیں ایک بیمار کی عیادت کے لیے بھی
 آپ کو کچھ دیکھنا پڑتا ہے جبکہ بیمار خود آپ سے ملنے کی
 خواہش کا اظہار کرے۔“ وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی
 تھا۔ کئی دنوں سے وہ عجیب سی بے کلی محسوس کر رہا تھا
 اور اب اس کی آواز سن کر دل کسی معصوم بچے کی طرح
 ایک دم بہل سا گیا تھا جب سے وہ اشنا کی برتھ ڈے
 سے لوٹ آیا تھا اپنے ساتھ اک بے چینی اور بے

سکونی بھی لے آیا تھا جب کسی پل قرار نہ ملا تو دل کے
 ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اسے فون کرنے لگا اس سے بات
 کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ تو چاہیے تھا تا پہلے
 کوٹ اور پھر بی جی کے حوالے سے بات کرنے لگا،
 ورنہ بی جی تو اللہ کا شکر تھا پہلے سے بہت بہتر تھیں۔
 کل انہوں نے باتوں باتوں میں عانیہ کا ذکر چھیڑ لیا اور
 اسی ذکر کو حوالہ بنا کر وہ اسے انوائٹ کرنے لگا۔ عانیہ کی
 سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اسے کیا جواب دے۔ اسی وقت
 سائرہ بیگم نے لاؤنج میں قدم رکھا۔

”عانیہ کس کا فون ہے؟“ بو کھلاتے ہوئے اس نے
 ریسیور کریڈل پر رکھ دیا، ”آئی کی آمد سے وہ ایک دم گھبرا
 سی گئی۔“

”وہ۔۔۔ وہ آئی جی بی جی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے،
 میں ان کی عیادت کو جانا چاہ رہی تھی۔“ ”عرشان کا ذکر وہ
 دانستہ گول کر گئی۔“

”اوہ۔۔۔ انہوں نے لہا سانس ہوا میں خارج کیا۔
 ”مگر تم جانا چاہتی ہو تو ضرور جاؤ۔ میں تو اس وقت
 بہت ضروری کام سے جا رہی ہوں، تم ایسا کرنا میری
 طرف سے بھی پوچھ لیتا، میں ڈرائیور کو کہہ دیتی ہوں۔
 وہ تمہیں چھوڑ آئے گا بی جی سے کہنا میں ایک دو دن
 میں ضرور چکر لگاؤں گی۔“

”بی جی۔۔۔ ان کے مصروف سے انداز میں کہنے پر وہ
 فقط اتنا ہی کہہ سکی۔ یہ بھی سچ تھا کہ وہ وہاں جانا چاہتی
 تھی۔ کیوں یہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔“



گاڑی جیسے ہی اس عالیشان محل کے پورچ میں رکی
 وہ آہستہ سے دروازہ کھولتے باہر نکل آئی، چونکہ وہ بنا
 بتائے آئی تھی اس لیے راہداری میں ویلیم کے لیے
 کوئی موجود نہ تھا۔ لاؤنج میں قدم رکھتے وہ بے ساختہ
 جھک سی گئی۔ گھر کے افراد تو ایک طرف کوئی ملازم بھی
 نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ بی جی کا کمر اکون
 سا ہے اور کسی بھی کمرے میں منہ اٹھا کر وہ گھسنا نہیں
 چاہتی تھی۔ اسی لیے متذبذب سی انگلیاں مروڑتے

وہیں کھڑی رہی۔ اسی وقت اسے سیڑھیوں سے قدموں کی چاپ سنائی دی تو اس نے گردن موڑتے سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔

”آپ۔۔۔؟“ سامنے موجود عرشان داؤد کی آنکھوں میں خوش گواری حیرت ابھری تھی۔ اسے جیسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ آیا۔ تک سب سے تیار خوشبو میں بکھیرتا اس کا وجود آج بھی بلا کا دلکش لگ رہا تھا۔ ان لوہتی آنکھوں کی چمک نے تو ایک پل کے لیے عانیہ سعید کی بولتی ہی بند کر دی۔ نظروں کے ساتھ ساتھ اس کی گردن بھی جھکتی چلی گئی۔ کپکپاتی پلکوں کی جنبش، چہرے پر چھائی سرخی عرشان داؤد کے ہونٹوں پر دھیمی مگر خوب صورت مسکراہٹ بکھیر گئی۔ وہ اس کے کلیوں سے بھی نازک سر آپے کو نظروں کی گرفت میں لیتے اس کے رویہ آکھڑا ہوا۔ اک دلفریب مسک عانیہ سعید کے حواسوں پر چھانے لگی۔

”اس ایک پل کے غرض کوئی مجھ سے میری پوری زندگی کی خوشیاں بھی مانگ لے تو میں ہنس کر دے دوں گا۔“ وہ فقط آواز تو نہ تھی وہ تو کوئی سحر تھا جو اس کی سماعتوں پر پھونکا گیا تھا۔ وہ تو کوئی ایسا طلسم تھا جو اس کے چاروں اور جاو بکھیرنے لگا۔ عانیہ سعید کی دھڑکنیں بے قابو ہونے لگیں۔

”کیا واقعی وہ بی جی کی عیادت کو ہی آئی تھی۔“ اس نے خود سے سوال کیا تھا، مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ اندر گہمے خاموشی کا راج تھا جبکہ اس کے برعکس عرشان داؤد کے دل کی گواہی اتنی واضح اور مضبوط تھی کہ اسے کسی اور سے پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی۔

”آپے پلیز۔۔۔“ وہ اسے لیے بی جی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”اگر آپ مجھے بتا کر آئیں تو آپ کے استقبال کے لیے میں خاص اہتمام کرتا۔“ راستے میں وہ کہہ رہا تھا۔ عانیہ نے بے اختیار ہی نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیا، اسی پل عانیہ سعید نے اپنے دل کی ایک ایک دھڑکن اس مسکراہٹ کے نام

کر دی۔ دل واقعی انسان کو بے بس کر چھوڑتا ہے۔ بی جی عانیہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ انہوں نے اسے کھانے پر روک لیا تھا۔ اور وہ رک بھی گئی۔ عرشان داؤد نے ارجنٹ کہیں جانا تھا، مگر اس کے وجود کے سامنے تو جیسے وہ ہر چیز بھول گیا۔ رات کھانے پر اس نے ایک ایک چیز اسے اصرار کر کر کے کھلائی تھی اور بی جی جو کب سے عرشان کے اس نئے روپ کو متعجب سی بغور دیکھ رہی تھیں کچھ سمجھتے ہوئے دھیرے سے مسکرا دیں اس کے چہرے کی چمکتی ہوئی دلکش مسکراہٹ انہیں بہت کچھ سمجھا گئی تھی، انہوں نے عانیہ کے جھنپے جھنپے چہرے کی طرف دیکھا۔ واقعی وہ لڑکی اس قابل تھی کہ اس سے عرشان داؤد محبت کرتا۔ انہوں نے نظروں ہی نظروں میں ان دونوں کی نظراتاری اور پھراک اطمینان بھرا سانس ہوا میں خارج کرتے انہیں ڈھیروں دعاؤں سے نوازا۔ عانیہ سعید کی زندگی ایک دم بدل گئی تھی۔ عرشان داؤد کو سوچنا، اسے چاہنا، اسے دیکھنا اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ ایک خوب صورت دھیمی مسکراہٹ ہر وقت اس کے ہونٹوں پر سچی رہنے لگی۔ ان کے درمیان کوئی عمدہ پیمانہ نہ ہوئے تھے، مگر اس کے باوجود ایک تعلق جڑ چکا تھا۔ عرشان داؤد اکثر اسے فون کرنے لگا، پی پی سی ایل پر بات کرتے اسے کافی دشواری ہوتی اس لیے اس ماہ آئی نے اسے جیسے ہی پاکٹ منی دی تو پہلی فرصت میں ہی اس نے اپنے لیے سیل خرید لیا۔ عرشان داؤد اس کی زندگی کا سب سے خوب صورت خواب بن چکا تھا اور جس کی تعبیر کے لیے وہ بے شمار دفعہ اپنے اللہ کے سامنے گڑ گڑائی تھی۔



”کل کا سارا دن میں تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔“
 ”کیوں کل کے دن میں ایسی کیا خاص بات ہے۔“
 وہ مسکرائی۔
 ”ہے نا خاص بات۔“

”کیا مجھے نہیں بتائیں گے؟“ اس کے اندر تجسس ابھرا تھا۔

”کل کون سا اور ہے پتا چل جائے گا۔“ مسکراتے ہوئے اس نے مسہنسس کری ایٹ کرنا چاہا۔

”اور اگر میں آج جانا چاہوں تو۔۔۔“ وہ بھند ہوئی۔
 ”تو میں بہت پار سے تم سے معذرت کر لوں گا۔“
 ”تو ٹھیک ہے پھر میں بھی معذرت کر لوں گی۔“ وہ
 نروٹھے پن سے بولی۔ عرشان داؤد کی مسکراہٹ گہری
 ہو گئی۔

”ارے نانا ایسا نہ کرنا کیوں کہ یہ تو طے ہے کہ کل
 تم سارا دن میرے ساتھ گزارو گی۔“
 ”گھنٹے دو گھنٹے کی بات اور ہے مگر سارا دن۔۔۔“ وہ
 ہچکچائی۔

”آئی سارہ کو برا لگے گا۔“ اس نے عذر تراشا۔
 ”ان کی تم فکر مت کرو ان سے میں خود بات کر لوں
 گا۔“ اس کے پاس جیسے اس کے ہر جواز کا حل موجود
 تھا۔

”مگر عرشان۔۔۔“
 ”پلیز عانیہ نو اگر مگر اگر تم خود نہیں آنا چاہتی تو
 صاف بات کرو یوں اگر مگر کے چکروں میں مت الجھاؤ
 مجھے۔“ وہ یگانگت سنجیدہ ہوا۔ عانیہ کی جان پر بن آئی۔
 اس کی ناراضی تو وہ کسی صورت انورڈ نہیں کر سکتی تھی
 چاہے اس کے لیے اسے کچھ بھی کرنا پڑتا۔

”او کے ٹھیک ہے۔“ وہ ہار گئی اس کے سامنے تو وہ
 اپنا آپ کب کی ہار چکی تھی وہ ساحر تھا تسخیر کرنا جانتا
 تھا۔ وہ دو سروں کو تسخیر کرنے کے لیے ہی تو پیدا ہوا
 تھا۔

”یہ ہوئی نابالت۔“ وہ کھل سا گیا۔
 پھر بولا۔

”بھی تھوڑی دیر کے بعد تم تک میرا ایک گفٹ
 پہنچے گا اسے ریسیو کر لینا۔“

”ک۔ کیا مطلب؟“ مگر ادھر سے فون آف ہو چکا
 تھا۔ کتنی دیر سیل کو پکڑے وہ گفٹ کے بارے میں ہی
 سوچتی رہی۔ شام کے قریب جا کر اسے وہ گفٹ

موصول ہوا تھا۔ اس نے جیسے اسے کھولا حیرت زدہ رہ
 گئی۔ وہ نہایت خوب صورت اسٹائلشن سا وائٹ کلر
 کا فرائڈ تھا۔ اس نے آشنا کی برتھ ڈے پر جو فرائڈ
 پہننا تھا یہ اس سے کئی گنا زیادہ زیروست اور نفیس
 تھا۔ وہ تو اسے ہاتھ میں لیے کتنی دیر دیکھتی رہی۔ ساتھ
 ہی ایک چھوٹی سی چٹ تھی۔

”اگر تم اسے کل پہنو گی تو بہت خوشی ہوگی
 مجھے۔“ عانیہ ہولے سے مسکرا دی۔

کل جب آئی سارہ سے اس نے اجازت مانگی تو
 انہوں نے بغیر اعتراض کیے اسے اجازت دیے دی
 تھی۔ یقیناً ”عرشان داؤد سے ان کی بات ہو چکی تھی۔
 فرائڈ پہن کر تو وہ آسمان سے اترتی کوئی حور ہی لگ
 رہی تھی۔ زینبی نے اس کا ہلکا سا میک اپ بھی کر دیا۔

”ماشاء اللہ! آج تو آپ آشنا میم کی برتھ ڈے کی
 رات سے بھی زیادہ خوب صورت لگ رہی ہیں۔ اللہ
 پاک ہر طرح کی پری نظر سے بچائے۔“ زینبی کی تعریف
 پر وہ مسکرا دی تھی۔ عرشان داؤد نے بمعہ ڈرائیور
 گاڑی بھیج دی تھی۔ وہ جیسے ہی گاڑی میں آکر بیٹھی
 گاڑی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئی۔ مگر یہ
 کیا یہ عرشان داؤد کا گھر تو تھا سا منے ہی وہ ہیلی کاپٹر کے
 قریب گھڑا تھا۔ گاڑی رکتے دیکھ کر وہ اس کے قریب چلا
 آیا۔ پھر کسی ڈرائیور کی طرح اس کی طرف کا دروازہ
 کھول کر تھوڑا سا جھکا۔

”ویل کم ٹو میم“ عانیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر
 گئی۔

اپنے فرائڈ کو سنبھالتے وہ جھینپی جھینپی سی
 باہر نکلی اور عرشان داؤد اسے دیکھتے تو حقیقتاً ”خود
 سمیت سب بھول گیا۔“

وہ اس وقت انتہا کی خوب صورت لگ رہی تھی۔
 محبت کا کمال تھا یا وہ واقعی اتنی پیاری تھی وہ تو دم بخود
 پاک تک جھپکنا بھول گیا۔ کیا وہ کوئی پری تھی جو پرستان
 کا راستہ بھولتے یہاں آنکلی تھی۔ اس کا دلکش و
 دل فریب وجود اس زمین کا تو نہ لگ رہا تھا۔ وہ تو آسمان
 پر بستے چاند ستاروں سے بھی زیادہ روشنیاں خود میں

سمیٹے ہوئے تھا اور وہ آنکھیں۔ آج تو ان کی سوج و جھج ہی زالی تھی۔ کیا کسی کی آنکھیں اتنی پاگل کر دینے والی بھی ہو سکتی ہیں۔

محبت، چاہت، دیوانگی، والہانہ پن، بے قراری، بے خودی۔ کیا کچھ نہ سمٹ آیا تھا اس وقت عرشمان داؤد کی آنکھوں میں۔

میری اداس راتوں کو حسین کر دے گا وہ اپنے حسن سے سب دل نشین کر دے گا اڑالے جائے گا چاہت کے پرستانوں میں وہ کوہ قاف کا مجھ کو یقین کر دے گا وہ میری خامیاں چن چن کے ختم کر دے گا وہ میری عادتوں کو بہترین کرنے کا کسی کے دل میں تو آخر اسے ٹھہرتا ہے میرے گمان کو پکا یقین کر دے گا از خود وارفتگی کے عالم میں اس نے مدہوش کن بھرپور سرگوشی اس کی سماعتوں میں اندلی تھی۔ عانیہ سعید کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ لرزتی پلکیں انار کی طرح دہکتے عارضوں پر سایہ قلم ہونے میں لمحہ ہی لگا تھا۔ ہر محبوب کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے وجود پر جب اس کے محبوب کی نظر اٹھے تو ٹھہری جائے۔ پھر عانیہ سعید کو عرشمان داؤد کی نظریں کیسے بری لگ سکتی تھیں بلکہ ان نظریں کے دیکھنے کے انداز نے اسے تھوڑا مغرور کر دیا۔ دل نغیر بھرے احساس میں گھرنے لگا۔

”چلیں۔!“ کافی دیر کے بعد عرشمان کے ہونٹوں سے نکلا۔ ورنہ تشنگی ایسی تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

”کہاں۔؟“ لرزتی پلکیں فقط ایک پل کے لیے انھی تھیں۔

”جہاں میں لے چلوں۔“ وہ اس وقت محبت کے سحر میں کھل طور پر آچکا تھا۔ وہ اس وقت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی مٹھی میں بند کر لینا چاہتا تھا امر کر لینا چاہتا تھا۔ عانیہ کی توجہ یکلخت ہیلی کاپر کی طرف ہوئی۔ وہ تھوڑا کنفیوژ سی ہو گئی۔

”کیا مجھ پر بھروسا نہیں ہے۔“ اس کی گھبراہٹ اس کے چہرے سے صاف عیاں ہو رہی تھی۔ کشمکش میں جتلا تاثرات لمحوں میں اس کی گرفت میں آئے تھے۔ اور پھر عرشمان داؤد کی طرف دیکھتے لمحے کے ہزاروں حصے میں عانیہ نے اپنے یقین پر پختگی کی مہر ثبت کی۔

”آپ رہی تو بھروسا ہے عرشمان!“
”تو پھر چلیں۔“ اس کے براعتداد انداز نے عرشمان داؤد کو معتبر سا کر دیا۔ اس نے اس کے سامنے اپنی چوڑی ہتھیلی پھیلانی تو عانیہ نے ہچکچاتے ہوئے اپنا نازک ہاتھ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ وہ اسے لیے کسی شہزادے کی طرح ہیلی کاپر میں سوار ہوا تھا۔

”آف عرشمان۔ کیا آپ ہیلی کاپر چلانا جانتے ہیں۔“ عانیہ نے حیرت سے استفسار کیا، عرشمان داؤد کی ہسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”بھی آپ نے ہمیں جانا ہی کب ہے جناب۔۔۔ اب آہستہ آہستہ ہی ہمارے جو ہر ٹھہرنے کے نا۔“
ٹھیک ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ دونوں ایک نہایت خوب صورت مقام پر موجود تھے۔ عانیہ سعید تو جیسے سحر زدہ سی رہ گئی۔

”یہ میرا فارم ہاؤس ہے جب میں تنہائی محسوس کرتا ہوں تو یہاں چلا آتا ہوں۔“

وہ فارم ہاؤس تو نہ تھا بلکہ وہ کوئی طلسم کدہ تھا۔ ارد گرد چھالی ہریالی، سبزہ، پھول، پودے اور پھر بڑی سی جھیل۔ عانیہ تو اس منظر کو دیکھتے مہسوت سی رہ گئی۔ وہ یہاں بہت انجوائے کرتی اگر عرشمان داؤد کے ساتھ یہاں تنہا ہونے کا احساس نہ ہوتا۔ کس دھڑلے سے اس نے کہا تھا کہ وہ اس پر بھروسا کرتی ہے اور یہ سچ بھی تھا وہ اس پر بھروسا کرتی تھی، مگر اس کے باوجود بھی اس کے ساتھ یہاں تنہا ہونا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ عجیب سی شرمندگی میں جتلا کر رہا تھا۔

وہ اس سے محبت کرتی تھی، اس پر بھروسا کرتی تھی، مگر پھر بھی اندر بے چینی سی تھی اس نے کوئی غلط کام تو نہیں کیا تھا پھر کیوں دل و دماغ اسے مہم سی سوچوں کی

حاکر تم میرے ساتھ ایک پل بھی خوشی کا نہیں
گزار سکتیں، میں نے تم سے محبت ہی نہیں بلکہ تمہارا
احترام بھی کیا ہے۔

جہاں بغیر کسی مضبوط رشتے کے ایک مرد اور عورت
میں تنہائی ہو وہاں شیطان ضرور ہوتا ہے۔ سمجھ دار اور
طاقت ور انسان وہ نہیں جو یہ سوچتا ہے کہ شیطان اس
پر کبھی ہاوی نہیں ہو سکتا۔ سمجھ دار اور طاقت ور انسان
وہ ہے جو ایسے مواقع ہی پیدا نہ ہونے دے، ہم ولی
نہیں ہیں، پھر باتیں کیوں ولیوں جیسی کریں، ہم فرشتے
بھی نہیں ہیں، ہم صرف انسان ہیں اور ہمیں انہیں
حدود و قیود کے زمرے میں رہ کر سوچنا چاہیے کہ یہ
حدیں اللہ کی مقرر کردہ ہیں، میں کوئی بہت مذہبی انسان
نہیں ہوں، مگر یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے
آج تک کبھی بھی کسی بھی عورت کے ساتھ چند پل
بھی تنہا نہیں گزارے۔

محبت ایک بے اختیاری اور مقدس جذبہ ہے اور ہر
مقدس چیز کا احترام تو لازمی ہے نا، پھر میں کیا اور میری
اوقات کیا۔ تم دنیا کی پہلی عورت ہو جس کے سامنے
عرشمان داؤد نے خود کو جھکتے ہوئے پایا ہے۔ تمہارے
چہرے پر چھائی شرم و حیا، آنکھوں میں لچھی جھجک،
تمہیں نایاب کرتی ہے عانیہ اور تمہارا یہ ہی نایاب پن
تمہیں دوسری عورتوں سے منفرد کرتا ہے اور منفرد پن
عام انسانوں میں نہیں بلکہ خاص انسانوں میں ہوتا
ہے۔ "عانیہ کو احساس بھی نہ ہوا اور اس کی آنکھوں
سے آنسو گرنے لگے کیا وہ اس قابل تھی کہ اسے
اتنی اچھی سوچ کا مالک مرد ملتا جبکہ وہ نرمی سے اس کے
آنسو صاف کرتے کہہ رہا تھا۔

"میں اس محبت کو نہیں مانتا جو بغیر کسی رشتے کے
تنہائی کی متلاشی ہو۔ اس فارم ہاؤس میں، میں اور تم
تنہا ہوتے یہ تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ہاں تمہیں
یہاں لانا میرے دل کی بہت بڑی خواہش تھی اور جس
کے آگے میں بے بس ہو گیا تھا۔" عانیہ سعید دھندلائی
آنکھوں سے کتنی دیر اس کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی تو
اس کی آواز بھی بھگی ہوئی تھی۔

طرف دھکیل رہے تھے۔ اس کے اندر ندامت
ابھرنے لگی تھی۔ کیا محبت واقعی اتنی اندھی ہوتی ہے
کہ محبوب کے کہنے پر اتنی دور تنہا چلی آئے بغیر کسی
ڈر بغیر کسی خوف کے۔

"اندر چلیں۔" وہ ایک دم گم صم سی ہو گئی۔ خالی
خالی نظروں سے کتنی دیر عرشمان داؤد کی طرف دیکھتی
رہی۔ ضمیر کی ملامت بڑھنے لگی۔ اس دوران اس کے
چہرے کا ایک ایک اتار چڑھاؤ عرشمان کی نظروں کی
گرفت میں رہا۔ وہ ابھی اسی ادھیڑ بن میں الجھ رہی تھی
کہ اس کے ساتھ اندر جائے یا نہ جائے جب عرشمان
نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے اندر لے آیا، مگر یہ کیا۔؟
اندر کے مین دروازے پر بی جی کو اپنے استقبال میں
دیکھ کر اس نے پر مسرت حیرت سے عرشمان کی طرف
دیکھا۔ اس نے دھیرے سے مسکرا کر سر اثبات میں ہلا
دیا۔ نجانے کیوں، مگر اس کی آنکھوں کے گوشے بھیک
سے گئے۔ ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ
ووڑتے ہوئے بی جی کی کھلی پانسوں میں سمائی تھی۔

"آپ کو یہاں دیکھ کر یقین کریں مجھے بہت خوشی
ہوئی ہے بی جی۔" چمکتی ہوئی آواز میں وہ بولی تھی۔
عرشمان داؤد اس کے خوشی سے چمکتے چہرے کو دیکھتے
مسکراتے ہوئے ٹیرس کی طرف بڑھ گیا۔ آج اسے
مکمل یقین ہو چکا تھا کہ وہ عانیہ سعید کو بہت اچھی طرح
سے جان چکا ہے۔

"تھینک یو سوچ عرشمان۔" تھوڑی دیر کے بعد وہ
بھی اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔ ممنوں نظروں سے اس
کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"جانتی ہو عانیہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کی تمہارے
چہرے کی خوشی نے مجھے ایک غرور آگ تقا خر میں مبتلا
کر دیا تھا۔" مجھے اپنی محبت اپنی پسند پر فخر سا ہوا تھا۔
"تم میرے ساتھ یہاں تنہا آنے پر پا خوشی راضی
ہو تیں میرے لیے یہ باعث خوشی نہ تھا، تمہاری
جھجک، کشمکش، گھبراہٹ میرے لیے وہ انمول تھی۔
اس دوران میں یہ بھی جان چکا ہوں کہ تم مجھے کتنا
چاہتی ہو اور یہ بھی جان چکا ہوں کہ اپنی نیچر کے خلاف

”آپ بہت اچھے ہیں عرشان بہت اچھے“

”نہیں عانیہ میں بہت اچھا نہیں ہوں مجھ میں بھی خامیاں ہیں جس میں سب سے بڑی خامی باقاعدگی سے نماز نہ پڑھنا ہے میں جانتا ہوں کہ تم باقاعدگی سے نماز پڑھتی ہو اور مجھے یقین ہے جب تم میری زندگی میں آؤ گی تو میری تمام خامیاں ایک ایک کر کے ختم کر دو گی۔ کر دو گی نا۔“ اس کے پوچھنے پر عانیہ نے بھیگے چہرے کے ساتھ سر اثبات میں ہلا دیا۔ پھر وہ دور خلاؤں میں گھورتے دکھ بھرے انداز میں بولا۔

”محبت کو محبت ہی رہنا چاہیے عانیہ اسی میں اس کا تقدس اس کی خوب صورتی ہے مگر ہمارے اسٹینٹس میں محبت اور ہوس میں کوئی فرق نہیں رہا۔ میرے اپنے جاننے والے دوست احباب اپنی فیاضی اور گرل فرینڈز کے ساتھ تنہائی میں بہت سا وقت پاس کرتے ہیں۔ میں نے تب ہی سوچ لیا تھا کہ مجھے شیطان کے سامنے نفس نہیں ہارنا یہ سودا بہت مہنگا ہے بہت مہنگا۔“ وہ اک جذب سے کہہ رہا تھا اور عانیہ سعید نخر سے اپنے ہم سفر کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ بتا نہیں کس نیکی کے عوض اللہ پاک نے اتنا اچھا انسان اسے عطا کیا تھا۔ وہ جتنا باہر سے شاندار تھا وہ اس سے بڑھ کر اندر سے شاندار تھا۔ عرشان داؤد دھیرے سے پلٹا۔

”آج عرشان داؤد نے اپنا سب کچھ تم پر قربان کر دیا ہے۔ اس کی اک اک سانس پر صرف تمہارا حق ہے۔ اس کے دل کی دھڑکن پر صرف عانیہ سعید کا اختیار ہے۔ وہ جیسے گا تو عانیہ سعید کے لیے اور مرے گا تو اس کی جدائی میں۔“

”عرشان۔۔۔“ خوف زدہ ہو کر اس نے بے اختیار اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھا۔

”پلیز یوں دل کو دکھانے والی بات تو نہ کریں۔“ سرخ ڈورے لیے قاتل آنکھوں کو دیکھتے اس کے دل نے چاہا کہ وہ ان میں ہمیشہ کے لیے ڈوب جائے۔

”عانیہ کیا محبت سب کو ہی دیوانہ کر دیتی ہے؟“ وہ جب بولا تو اس کی آواز کو جذبوں کی شدت نے بو جھل

سا کر دیا تھا۔ عانیہ کے نمکین ہونٹ مسکرا دیے۔ وہ آہستہ سے سرفنی میں ہلا گئی۔

سب کو نہیں دیکھیں میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔“ معصوم سی شرارت سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کا یوں معصوم سے انداز میں چھیڑنا عرشان کو بہت بھلا لگا۔ آنکھوں میں حدت سی آگئی۔

”مگر میں ٹھیک نہیں ہوں عانیہ تم نے سودائی کر چھوڑا ہے مجھے۔ پاگل، مجنوں، دیوانہ، عاشق کوئی بھی معقول لفظ میرے لیے نہیں بچا۔ مجھے کبھی مت چھوڑنا ورنہ۔“ وہ خاموش ہو گیا مگر اس کے چہرے پر چھائی وحشت و آزر دگی دیکھتے وہ کانپ کر رہ گئی۔ کچھ تو تھا اس چہرے پر، اک ایسی ازیت بھری پر چھائی جسے دیکھتے وہ بری طرح ٹھنکی تھی۔

”میری ممانجھے چھوڑ گئیں کیوں کہ شادی کے آٹھ سال بعد انہیں احساس ہوا کہ انہیں تو پایا سے محبت ہی نہیں تھی۔ وہ کسی اور کو چاہنے لگی تھیں۔ پایا نے انہیں آزاد کر دیا۔ ایک پل کے لیے بھی اس سات سال کے بچے کے بارے میں نہ سوچا جسے ماں کی بہت ضرورت تھی۔ پایا عورت ذات سے نفرت کرنے لگے، ایسے بدزن ہوئے کہ پھر شادی ہی نہ کی، مگر میں پایا کی طرح کی زندگی نہیں گزارنا چاہتا، میں عورت پر یقین کرنا چاہتا ہوں، بھروسہ کرنا چاہتا ہوں، میں اس کے وجود کی دلکشی کو محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ میرے بھروسے کو کبھی مت توڑنا عانیہ ورنہ میں ختم ہو جاؤں گا۔“ وہ اک کرب سے بولا تھا اس کی آنکھیں انتہا کی سرخ ہو چکی تھیں۔ جیسے وہ ضبط و برداشت کی کڑی منزل سے گزر رہا ہو۔ عانیہ نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس شاندار مرد کی طرف دیکھا جو لفظ ہر کتنا مکمل، مگر اندر سے کتنا ادھورا تھا، کتنا ٹوٹا بکھرا تھا۔

”عانیہ سعید خود تو مٹ جائے گی، مگر کبھی بھی آپ کے بھروسے کو ٹوٹنے نہیں دے گی۔“ لہجوں میں عرشان نے خود کو کپڑا کیا تھا اور پھر دھیرے سے مسکرا دیا۔

”مجھے تم پر یقین ہے عانیہ، میں اب بہت جلد

تمہیں اپنے نام کروالینا چاہتا ہوں۔ کیا تمہیں اعتراض ہے؟" یکلمت اس کا موڈ پھینچ ہوا تھا۔ عانیہ تو بولا کر رہ گئی۔ چہرہ ایک دم سرخ ٹماثر ہو گیا۔ نظریں جھک سی گئیں۔ قوس قزح کے سارے رنگ سمیٹے اس پیارے چہرے کو عرشمان داؤد نے کافی دلچسپی سے دیکھا تھا۔

"میں نے ایک ریکورسٹ کی ہے عانیہ، پلیز جواب تو دو۔" اس نے اپنے برحمت ہاتھوں میں اس کے ٹھنڈے کپکپاتے ہاتھ تھام لیے۔

"پلیز آجاؤ میری زندگی میں، دیکھو میرے اندر جھانک کر کتنا تنہا ہوں میں۔ مجھو آج کے دن یہ تمہاری طرف سے میرے لیے تحفہ ہے۔"

"تحفہ۔" عانیہ نے پلکوں کی چلمن اٹھالی۔

"ہاں تحفہ۔ آج میری برتھ ڈے ہے اور میں تم سے اپنی پسند کا تحفہ لینا چاہتا ہوں۔"

"آپ کی برتھ ڈے۔" حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ نظروں کے سامنے اشنا کی برتھ ڈے گھوم گئی۔ کتنے بڑے پیانے پر اینج کی گئی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ عرشمان داؤد کی برتھ ڈے اس سے بھی بڑے پیانے پر سیلبریٹ کی جاتی ہوگی، مگر اس کا یقین غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ ہستیاں اس کی زندگی میں بہت اہم تھیں اور آج کے خاص دن وہ دونوں ہستیاں اس کے ساتھ موجود تھیں۔ عرشمان داؤد کی زندگی میں اپنی اہمیت کا اندازہ اسے اچھی طرح ہو گیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے خالی ہاتھ نہیں لوٹائے گی۔ آج کے اہم دن اس کی پسند کا تحفہ ضرور دے گی اسی لیے آہستہ سے سرابسات میں ہلا گئی۔

"او عانیہ۔" عرشمان داؤد کی خوشی کی تو جیسے کوئی انتہا نہ رہی۔

"تمہیں تم اندازہ بھی نہیں کر سکتی کہ اس وقت تم نے مجھے کتنی بڑی خوشی دی ہے۔" وہ اک جوش سے بولا۔

"آئی ایم سوہیبی، یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے جو مجھے تم سے ملی ہے اور یہ میری زندگی کا

سب سے قیمتی تحفہ ہے جو تم نے مجھے دیا ہے۔ میں جلد ہی بی بی جی اور پیپا کو آٹی سائز کی طرف بھیجتا ہوں۔ اب تو انک پل کی دوری بھی برداشت نہیں ہوگی۔"

جذبات کی شدت سے اس کی آواز بھاری سی ہو گئی۔ اس کی بے قراری و بے تالی دیکھتے تو وہ نازاں ہونے لگی۔ کیا کوئی اتنی شدت سے بھی کسی کو چاہ سکتا ہے وہ فقط سوچ کر رہ گئی۔ پھر وہ سارا دن بی بی جی اور عانیہ نے عرشمان کے ساتھ ہی گزارا۔ عانیہ نے اپنے ہاتھوں سے کوکنگ کی تھی۔ بی بی جی اور عرشمان کو اس کے ہاتھ کا پکا کھانا بہت پسند آیا تھا۔ آنکھوں میں ڈھیروں پیار سموئے سارا وقت عرشمان داؤد اس کے ارد گرد ہی منڈلاتا رہا۔ اس کی دیوانگی دیکھتے عانیہ کا چہرہ پل پل رنگ بدلتا رہا۔

یہ دن ان دونوں بلکہ تینوں کے لیے اک یادگار دن بن گیا۔ واپسی سے کچھ دیر پہلے ہی عرشمان نے میک کاٹا تھا۔ پہلے بی بی جی پھر عانیہ کے منہ میں ڈالا۔ ان دونوں کو اتنا خوش دیکھ کر بی بی جی نے ان کے حوالے سے بہت کچھ سوچ لیا تھا۔



صبح مہیج کی رنگ سے ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ مونری موندی آنکھوں سے اس نے تکیے کے نیچے سے سیل پکڑا تھا۔ نماز پڑھتے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو وہ سوئی تھی۔ عرشمان داؤد کا "گڈ مارننگ" کا بہت ہی خوب صورت مہیج تھا۔ اس کے ہونٹ مسکرا دیے۔ اس نے بھی "گڈ مارننگ" کا مہیج سینڈ کر دیا۔

"صبح ہو گئی؟" دوسری طرف سے فوری دوسرا مہیج موصول ہوا۔

"جی۔ اور آپ کی؟"

"میرا کیا پوچھتی ہو یا ساری رات ایک پل کے لیے بھی نہ سکا۔"

"کیوں۔ خیریت؟" وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔

"ساری رات تمہارے بارے میں ہی سوچتا رہا۔"

”تو پھریوں کہو کہ عرشان مجھ سے اتنی محبت نہ کرو اور مر جاؤ۔“

”عرشان۔“ خوف کی شدت سے اس کی آواز کانپ سی گئی۔

”تنتی بڑی بات کتنی آسانی سے کہہ دی آپ نے۔“ اس کے رونے میں اور شدت آگئی۔

”رہ کیوں رہی ہو، تمہیں تو فخر کرنا چاہیے کہ کسی کو تمہاری چاہ نے اتنا سودائی کر چھوڑا ہے کہ وہ آرد گرد حتیٰ کے خود کو بھی بھول بیٹھا ہے۔“

”مجھے ایسا عرشان نہیں چاہیے۔ مجھے وہی عرشان چاہیے جو زمین پر قدم رکھتا تھا تو زمین خود پر ناز کرنے لگتی۔ جس کی گردن — کے احساس سے کھڑی رہتی جو مغزور تو نہیں تھا، مگر ایک بار عب شخصیت کا حامل تھا۔“ وہ مدھم آواز میں بولی تھی، عرشان داؤد مسکرا دیا۔

”میں ویسا ہی عرشان داؤد ہوں، مگر دوسروں کے لیے تمہارے لیے میں ویسا بالکل نہیں بن پاؤں گا۔ تمہیں تو اسی طرح کے مجنوں سے عرشان سے گزارا کرنا پڑے گا۔“ اور اگر اس وقت عرشان داؤد اسے دیکھ لیتا تو یقیناً ”دیوانہ ہو جاتا۔ وہ اس وقت لگ ہی اتنی حسین رہی تھی جبکہ وہ بے قراری سے پوچھ رہا تھا۔“

”یہیں ہوں، آپ کے پاس۔ مجھے بھلا اب کہاں جانا ہے، میرے تو تمام راستے ہی اب آپ کی طرف آتے ہیں۔“ وہ آنکھیں موندے ہی گویا ہوئی۔

”اور میں تمہیں کہیں جانے بھی نہیں دوں گا۔“

”جانتی ہوں۔“

”کیا جانتی ہو؟“ نجانے وہ کیا سننا چاہتا تھا۔ شرارت سے بولا۔ اور وہ بھی نجانے کس دھن میں تھی کہہ گئی۔

”یہی کہ جیسے ایک جن کی جان کسی توڑتے میں ہوتی ہے اسی طرح عرشان داؤد کی جان غانیہ سعید میں قید ہو چکی ہے۔“ عرشان داؤد کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

اپنے فوجیوں کی پلاننگ کرتا رہا۔“

”کیا تم ٹھیک سے سوتی رہیں۔“

”سچ پوچھیں تو ایک عرصے کے بعد کل رات میں پر سکون اور گہری نیند سوتی تھی۔“ اس نے سچائی سے اعتراف کیا۔

”لو جی۔ وہاں تو معاملہ ہی الٹ ہے۔ ہماری ایک بل کے لیے آنکھ نہیں لگی اور ادھر محترمہ گہری نیند کی آغوش میں گم رہیں۔“

”تو آپ کو کس نے کہا تھا جانے کو، آپ بھی سو جاتے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ٹائپ کیا۔

”وہ رات سونے کے لیے نہیں تھی۔ وہ رات میری زندگی کی سب سے خوب صورت اور خاص رات تھی، میں اسے سو کر ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

”اتنی محبت۔؟“ اس کی آنکھیں بھیگ سی گئیں۔

ادھر سے جواب آنے کی بجائے اس کی کل آگئی۔ اس نے اوکے کرتے سیل کان سے لگایا۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں غانیہ میں خود بھی نہیں جانتا کہ میری محبت کی انتہا کہاں تک ہے بس اتنا جانتا ہوں کہ تمہارے چہرے پر میری پوری دنیا حتم ہو جاتی ہے۔ تمہیں سوچنا ہوں تو اپنا آپ بہت خاص بہت بہت معتبر لگنے لگتا ہے، تمہارا وجود میرے اللہ کی طرف سے میرے لیے ایک گراں بہا تحفہ ہے۔ میں عورت ذات پر بے اعتباری تو نہیں کرتا تھا، مگر سچ یہ بھی تھا کہ اعتبار کبھی نہیں کرتا تھا، مگر پھر تمہیں دیکھا تو دل جھک گیا جیسے کسی ریاست کی شہزادی کے سامنے کسی غلام کا سر جھک جاتا ہے اور تم بھی تو عرشان داؤد کے دل کی سلطنت کی ملکہ ہو۔ میں نے رات لی جی سے بات کر لی ہے۔ ہماری طرح وہ بھی بہت خوش ہوئی تھیں۔ پاپا ایک ماہ کے لیے ملک سے باہر گئے ہیں ان کے واپس آتے ہی سائل اپنا کاہنہ تمہارے در پر حاضر ہو جائے گا۔“

”عرشان پلیز مجھے اتنی محبت نہ دیں، مجھے ڈر لگتا ہے۔“ وہ یکنخت رو پڑی۔

”آئی لو یو عانیہ، زینبی لو یو سوچ۔“ عانیہ نے پٹ سے آنکھیں کھولی تھیں۔ عرشان کے ہونٹوں سے سن کر یہ جملہ ایک دم بہت اہم، بہت خاص اور خوب صورت ہو گیا تھا۔ وہ جیسے محبت کی بارش میں بھیگ سی گئی۔ دھڑکنیں اپنے ہی تال پر محور رقص ہونے لگیں۔



”وہ ایک اہم میٹنگ اینڈ کر کے ابھی اسے کیبن میں آکر بیٹھا ہی تھا جب عانیہ کی کل آگئی۔ مسکراتے ہوئے اس نے کل ریسو کی تھی۔“

”زے نصیب، آج کس طرح یاد کر لیا جناب نے۔“ ریلیکس انداز میں چیر کر بیٹھے اس نے کہا۔

”آپ نے کھانا کھالیا؟“ خالص بیویوں والا جملہ تھا۔ اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”نہیں۔“

”کیوں ٹائم دیکھا ہے آپ نے۔“ اس کے تفکر پر عرشان کو ٹوٹ کر ہار آیا۔

”آج اتنی مہربانی کس لیے دیکھ کر بندہ جان سے ہی نہ ہار جائے۔“ اس کا موڈ یلکھت خوش گوار ہو گیا۔

تھوڑی دیر پہلے کی تھکن بھاگنے میں لمحہ لگا۔

”بہت فضل بولتے ہیں آپ، بی بی نے مجھے بتایا ہے کہ آج صبح آپ نے ناشتا نہیں کیا صرف جوس کا ایک گلاس پیا ہے۔“

”او۔ اچھا۔ میں بھی حیران تھا کہ جناب کو میرے کھانے کی اتنی فکر کیوں ستانے لگی۔“

”یہ تو اچھی بات نہیں ہے عرشان آج آپ نے تقریباً سارا دن بھوکے رہ کر گزار دیا۔“ اس کی فکر ہنوز پر قرار تھی اور جو عرشان داؤد کا سیروں خون بڑھا رہی تھی۔

”کر لیتا ہوں یار۔“

”نہیں۔ بس آپ ایسا کریں گھر آجائیں ساتھ مل کر کھاتے ہیں۔“

”کیا مطلب۔۔۔“ وہ لکھت چوڑکا۔

”میں اس وقت آپ کے گھر میں، آپ کے کچن میں کھڑی، آپ کے لیے بریانی بنا رہی ہوں۔ میں اور بی بی کھانے پر آپ کا ویٹ کر رہے ہیں۔“ اوھر سے سیل بند ہو چکا تھا، وہ سرعت بھرے انداز میں اپنے کیبن سے نکلا تھا اور واقعی اس کے پہنچنے تک میل پر کھانا لگ چکا تھا۔ پنک سوٹ میں گلابی گلابی سی عانیہ سعید کو عرشان داؤد نے نظر بھر کر دل میں اتارا تھا۔ وہ اس کی گہری نظروں کے ارتکاز سے سرخ پڑ گئی۔

”آپ فریش ہو کر آجائیں میں بی بی کو لے کر آتی ہوں۔“

”اگر یہ سربراہ ہے تو میری زندگی کا سب سے خوب صورت سربراہ ہے۔“ اس کا لہجہ آنچ دینے لگا۔ وہ اندر جانے کا راستہ بھول گیا تھا۔



ایک زوردار چیخ کے ساتھ اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس کا پورا جسم ہلکے ہلکے کانپتے سینے سے بھیگ چکا تھا۔ خوف و ہراس کے زیر اثر بے اختیار اس نے ارد گرد دیکھا۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں تھی۔ یعنی ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے خواب دیکھا تھا۔ اتنا دل دہلا دینے والا خواب۔ آخر اس خواب کا مطلب کیا تھا۔؟ ایسا خواب مجھے کیوں آیا؟ مجھے نماز پڑھ کر اللہ سے دعا کرنی چاہیے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اسے جب کسی مل سکون نہ ملا تو وہ وضو کرنے کی نیت سے بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر وہ کتنے ہی دن اس خواب کی وجہ سے ڈسٹرب رہی۔ عرشان داؤد سے اس نے اس خواب کا ذکر نہیں کیا تھا وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی ہاں یہ ہوا تھا کہ عشاء کی نماز اس کی مزید طویل ہو گئی۔ اس وقت بھی عشاء کی نماز بڑھ کر وہ فارغ ہی ہوئی تھی جب زینبی تاک کرتے اندر داخل ہوئی۔

”عانیہ آپ کو میڈم ساتھ اپنے روم میں بلا رہی ہیں۔“

”ٹھیک ہے تم چلو میں آتی ہوں۔“ زینبی کے جانے

کے بعد وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ نجانے کیوں، مگر کچھ دنوں سے اس کے اندر عجیب سی افسردگی چھائی ہوئی تھی اور آج تو دل کافی بو جھل سا ہو رہا تھا۔ آنکھیں بار بار بھر آ رہی تھیں۔ اسی بجھے دل کے ساتھ وہ ان کے روم میں داخل ہوئی تھی۔

”آجاؤ عانیہ۔“ وہ اندر داخل ہوئی۔

”او ادر بیٹھو میرے پاس۔“ انہوں نے اپنے

قریب ہی اسے بٹھالیا۔

”جانتی ہو آج میں بہت خوش ہوں اور میری اس خوشی کا تعلق تم سے جڑا ہے۔ اشنا میری بہت پیاری بیٹی ہے، مگر میں اسے جیسا دیکھنا چاہتی تھی وہ ویسی نہ بن سکی میرے اندر اپنی بیٹی کے حوالے سے اک تشنگی سی رہی۔ اپنی اکلوتی بیٹی کے حوالے سے میرے خواب اس کی ہٹ دھرمی اور ضدی طبیعت دیکھتے جیسے میری آنکھوں میں ہی قید ہو کر گئے۔ پھر تم آئیں میری زندگی میں۔ تم بالکل ویسی تھی جیسی میں اپنی بیٹی کو سوچا کرتی تھی۔ اسے دیکھنے کی متمنی تھی۔ لاشعوری طور پر میں تمہارے قریب آنے لگی۔ میں تم میں اشنا کو دیکھنے لگی اور پھر مجھے خود بھی احساس نہ ہوا اور تم مجھے عزیز ہوتی گئیں۔ میری خواہشوں، میرے خوابوں کا دار و مدار تمہارے ارد گرد گھومنے لگا۔

تم مجھے عزیز ہو چکی ہو۔ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔“ ان کی آواز بھینگ سی گئی۔ انہوں نے بہت آہستہ سے حیران حیران سی عانیہ کو اپنے ساتھ لگالیا۔ پھر انہوں نے پوچھا۔

”کیا ایک ماں کو اپنی بیٹی کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق ہے عانیہ؟“

”ایک ماں کو اپنی اولاد کے لیے ہر طرح کا فیصلہ لینے کا حق ہے آنٹی۔“ عانیہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا کہنے جا رہی ہیں اس لیے سادگی سے بولی۔

”مجھے تم سے یہ ہی امید تھی۔ تمہاری فرما برداری و تابعداری پر مجھے کبھی کوئی شک نہیں رہا۔ اسی لیے جب منصور صاحب نے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے تمہارا ہاتھ مانگا تو میں انکار نہ کر سکی۔“ کوئی بم تھا جو

عانیہ سعید کی سماعت پر پھٹا تھا۔ وہ تیزی سے ان سے الگ ہوئی آنکھیں جیسے پھٹنے کے قریب تر ہو گئیں۔ ہونٹ ادھ کھلے رہ گئے۔ دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی جبکہ سائرہ بیگم خود میں کم کہہ رہی تھیں۔

”خرم کو میں نے ہمیشہ اشنا کے حوالے سے سوچا تھا۔ اسٹیٹس میں وہ کسی صورت بھی ہم سے کم نہیں ہے، مگر پھر جب خرم نے تمہارا نام لیا تو پہلے تو میں حیران ہوئی پھر سوچا ایک بیٹی نہ سہی دو سہی ہی سہی۔ اس نے تمہیں اشنا کی برتھ ڈے پر دیکھا تھا تم اس کو بہت پسند آئی ہو۔ بہت خوش رکھے گا تمہیں۔“ اور عانیہ کو تو ایسے لگ رہا تھا جیسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو کر رہ گئی ہو۔

”مگر آنٹی۔۔۔“ اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرنے کے لیے اسے کافی محنت کرنی پڑی تھی قوت گویائی تو لگتا تھا جیسے جواب دے گئی ہو۔ حلق میں کانٹے سے اگ آئے تھے۔

”یہ۔۔۔ یہ آپ نے۔۔۔“ اس کے تمام آنسو اس کی حلق میں ہی پھنس گئے۔ اسی وقت منظر صاحب نے اندر قدم رکھا تھا۔ عانیہ نے لحوں میں چہرہ دو سہی طرف موڑتے خود کو چھپانے کی کوشش کی ورنہ کچھ ہی دیر میں اس کی حالت کافی ابتر ہو گئی تھی۔

”آپ آج جلدی آگئے۔۔۔؟“ ان کی غیر متوقع آمد پر سائرہ بیگم نے پوچھا۔

”ہاں طبیعت، کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ ٹالی کی تاش ڈھیلی کرتے بولے۔

”کیوں کیا ہوا؟“ وہ ایک دم فکر مند ہو گئیں۔ اسی دوران عانیہ سعید اپنا ریزہ ریزہ وجود بمشکل گھسیٹے ان کے درمیان سے نکل آئی۔ اپنے کمرے میں آنے تک وہ اچھی خاصی ندھال ہو چکی تھی۔ عرشان داؤد کے بغیر تو زندگی جینے کا تصور ہی سوہان روح تھا۔

”نہیں۔۔۔ میں نہیں رہ پاؤں گی عرشان داؤد کے بغیر۔“ بیڈ پر گرتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”آپ میں کیا کروں۔ آنٹی کو ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا انہیں مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا۔“ ساری

رات وہ لمحے کے لیے بھی نہ سو سکی تھی۔ آنٹی کا وہاں بھرا لہجہ، وہ بھروسا، وہ یقین وہ اس کی محسنہ تھیں۔ انہوں نے اس کا تب ساتھ دیا جب انہوں نے بھی نظریں پھیر لیں اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ ایک طرف اگر آنٹی تھی تو دوسری طرف اس کی محبت تھی۔ دل کسی صورت بھی محبت سے دست برداری کے لیے تیار نہ تھا۔ داغ بالکل خاموش تھا اور وہ خود تو ساری رات رو رو کر ہلکان ہو چکی تھی۔ صبح تک جب اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا تو فجر کی نماز کے بعد سجدے میں گرتے تڑپ تڑپ کر رو دی۔

”مجھے عرشان سے جدا مت کرنا میرے مولا۔ میں نہیں رہاؤں گی اس کے بغیر۔“



وہ یہ تو جانتی تھی کہ مہمان آرہے ہیں، مگر شام کو منصور صاحب کو بمعہ فیملی دیکھ کر وہ کچھ تھوکنوں کے لیے ساکت سی رہ گئی۔

”ارے۔ او آؤ نا عانیہ۔“ اسے ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہی بت بنے دیکھ کر مسز منصور نے اندر بلا دیا تھا۔ اس کی نظر ان کے ساتھ بیٹھی آنٹی کی طرف اٹھی جنہوں نے مسکرا کر اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ناچاہنے کے باوجود بھی وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔ اسے دیکھتے خرم منصور کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ نظریں اس کے نازک سراپے پر ٹھہری گئیں جو اک جھجک لیے مسز منصور کے قریب بیٹھ گئی۔

”ہمیں آپ کی بھانجی بہت پسند ہے مسز منظر۔ میرا بیٹا بہت چوزی ہے اور عانیہ کو دیکھ کر تو مجھے اپنے بیٹے کی پسند دل سے پسند آئی ہے۔ واقعی بہت خوب صورت اور معصوم صورت پائی ہے عانیہ نے۔“ انہوں نے ستائش سے دیکھتے اس کا دایاں ہاتھ تھاما جو ٹھنڈا رخ ہو چکا تھا۔ اس دوران خرم کی نظریں ایک لمحے کے لیے بھی اس کے وجود سے نہ ہٹی تھیں۔

”تو اتنی اچھی صورتیں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں ماشاء اللہ!۔“ پھر انہوں نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر

اس کی انگلی میں ڈال دی۔ یہ سب اتنی جلدی میں ہوا تھا کہ عانیہ تو عانیہ، آنٹی ساڑھ بھی ورطہ حیرت سے بت بن گئیں۔ عانیہ تو ایسے ہو گئی جیسے کالو تو بدن میں لہونہ ہو۔ ساکت، جامد، ششدر۔

”پہلی بار اس نے کوئی لڑکی پسند کی ہے۔ بہت دھوم دھام سے شادی کروں گی۔ کوئی کسر نہیں چھوڑوں گی۔ اپنے بیٹے سے زیادہ تو میں خود بے چین ہو گئی ہوں اس چاند کو اپنے آنگن میں اتارنے کو۔“ مسکراتے ہوئے وہ دھیرے سے جھکیں اور پھر پتھر کی مورت بنی عانیہ کی پیشانی چوم لی۔

”اب یہ آپ کے پاس میرے خرم کی امانت ہے۔“ مسز منصور نے خرم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو مسکراتی ہوئی نظروں سے مسلسل عانیہ کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ ساڑھ بیگم کے پاس جیسے کہنے کو کچھ بھی نہ رہا۔ انہوں نے عانیہ کی طرف دیکھا جس کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ چکا تھا۔ وہ کچھ پریشان ہو گئیں۔ کیا عانیہ اس منگنی سے خوش نہیں ہے؟ مہمانوں کے جانے کے بعد وہ عانیہ کے کمرے میں آگئیں جو بیڈ پر الٹی لیٹی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھیں۔

”عانیہ۔“ عانیہ سر اٹھاتے شکایتی نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ روز کو چہرہ سوچ چکا تھا۔

”کیا تم اس منگنی سے خوش نہیں ہو؟“

”آنٹی میرے تو سب خواب آپ نے ریزہ ریزہ کر دیے۔“ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ چپ رہ کر اپنی محبت کسی صورت قربان نہیں کرے گی۔ اسے اس محاذ پر لڑنا تھا اور وہ لڑنے کے لیے خود کو تیار کر چکی تھی۔

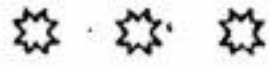
”کیا مطلب خواب۔؟“ کافی دیر کے بعد انہوں نے الجھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”م۔۔۔ میں کسی اور کو چاہتی ہوں۔“

”ک۔۔۔ کیا۔۔۔؟“ آنٹی ساڑھ برتو جیسے حیرتوں کے ہاڑ ٹوٹ پڑے۔ آنکھیں بے یقینی سے پھیل سی گئیں۔

”یہ۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ وہ سر پکڑ کر بیڈ پر بیٹھ

”مجھے معاف کر دینا عانیہ میں یہاں تھوڑی خود غرض ہو گئی ہوں۔ یہ زبان کٹ تو سکتی ہے مگر اپنے کئے سے پھر نہیں سکتی۔ اسے تم کچھ بھی کہہ لو، مگر مجھے معاف کر دینا۔“



اس کے ہاں کرتے ہی اس کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ عرشاں کام کے سلسلے میں ایک ہفتے کے لیے آؤٹ آف شٹی گیا تھا۔ وہ بار بار اسے فون کر رہا تھا، مگر ہر بار اس کا فون بند ملتا۔ وہ از حد پریشان ہو گیا جب کسی پل چین نہ ملا تو وہ کام ادھورا چھوڑ کر آگیا۔ پہلے بھلا کب ایسا ہوا تھا کہ اتنے دن ان کی بات نہ ہو سکے۔ وہ سیدھا آٹنی سارہ کی طرف ہی آیا تھا۔ زینی کے ہاتھ عانیہ کو پیغام بھیج کر وہ بے چینی سے ڈرائنگ روم میں ٹہلتے اس کا انتظار کرنے لگا۔ نجانے کیوں، مگر دل کچھ مضطرب سا تھا۔

تو وہ لمحہ آگیا عانیہ سعید جس لمحے سے تم اتنے دنوں سے بیچ رہیں تھی۔ کیا کر پاؤ گی اس کا سامنا؟ کس منہ سے جاؤ گی اس کے سامنے اور کیا کہو گی؟ اور اسے اتنے دنوں بعد رو رو دیکھتے کیا خود پر کنٹرول رکھ پاؤ گی؟

نہیں۔ میں اس سے نہیں ملوں گی۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے۔ بھگی پلکوں سے اس نے زینی کی طرف دیکھا۔

”اسے کہو میں گھر پر نہیں ہوں۔“

”کیوں کہاں گئی ہے؟“ زینی کا جواب اس کی توقع کے بالکل برعکس تھا۔

”میڈم سارہ کے ساتھ ہی گئی ہیں۔“

”اس کا سیل کیوں آف ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے نا؟“ اس کے چہرے سے پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔ زینی نے آہستہ سے سر اثبات میں ہلا دیا۔

”وہ ٹھیک ہیں۔“

”پھر فون کیوں بند ہے اس کا۔“ وہ کسی صورت مطمئن نہ ہو رہا تھا۔ بے قراری تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

گئیں۔

”پہلے کیوں نہیں بتایا تم نے مجھے۔“ وہ انتہائی حد تک سنجیدہ سی گویا ہو میں۔

”میں نے اسی وقت بتانا چاہا تھا، مگر پھر انکل مظہر آگئے۔“ وہ ایک دم پریشان ہو گئیں بہت زیادہ پریشان۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ عانیہ نے انہیں اتنا پریشان پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”جانتی ہو انہوں نے جب تمہارا نام لیا تو میں کتنی مطمئن ہو گئی تھی۔ اک ماں لپے میں نے ہاں کی تھی، مگر تم بھی آشنا کی طرح ہی نکلیں۔ بیٹیاں کبھی ماں کی تکلیف کو نہیں سمجھ سکتیں۔ ٹھیک ہے جسے تم نے مجھ پر فوقیت دی ہے اپنا، اسے میں تمہارے معاملے میں کبھی انٹرفیئر نہیں کروں گی، بس اب دوبارہ میرے سامنے کبھی مت آنا۔“ وہ ٹونے پھونٹے لہجے میں کہتی دروازے کی طرف بڑھیں جب عانیہ نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مجھے آپ سے محبت ہے، مگر۔“ اس کے آنسو ایک پل کے لیے بھی نہ رکے تھے۔

”مگر اتنی بڑی قربانی۔“ انہوں نے زخمی شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہاتھ چھڑانا چاہا۔

”میں اپنی انا خوداری پر ایک حرف نہ آنے دوں گی۔ میں نے بہت غلط کیا تم پر بھروسہ کر کے۔ اب اس کی سزا تو مجھے ملنی ہی چاہیے۔ میں جانتی ہوں کہ زبان سے پھر جانے کا طعنہ میری زندگی سے بھی زیادہ بڑا اور موت سے زیادہ ازیت ناک ہو گا، مگر مجھے یہ طعنہ اب سننا ہی ہو گا کیوں کہ تم ایسا چاہتی ہو۔“ اور پھر ان کی بو جھل آواز نے عانیہ کو ہرا دیا۔ وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

”ایسا نہیں ہو گا آٹنی! یہ آپ کی دوسری بیٹی کا وعدہ ہے۔ آپ کا سر کبھی کسی کے سامنے نہیں جھکے گا۔“ وہ تڑپ تڑپ کر رو دی تھی جب سارہ بیگم نے اسے قدموں سے اٹھاتے اس کے ہلکتے وجود کو بانہوں میں بھر لیا۔

ہوں۔" وہ سوچا سمجھا بہانہ حسب معمول دہرانے لگی تھی مگر پھر اس کے تیور دیکھتے اپنی گھبراہٹ میں سچ بتا گئی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اس کی۔" اس نے غصے اور طنز سے اس کی طرف دیکھا اور پھر عانیہ کے روم کی طرف بڑھ گیا جبکہ زینی کی گھبراہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا۔

"نجانے اب کیا ہو۔" وہ فقط سوچ کر رہ گئی۔
 "وائلس پر اہلم و دیو عانیہ کیوں میرے ساتھ اس طرح کر رہی ہو؟" دروازہ کھولتے وہ سرعت بھرے انداز میں اندر داخل ہوا تھا۔ اس کی غیر متوقع آمد پر عانیہ بو کھلاتے ہوئے بیڈ سے اٹھی۔

"آپ۔۔۔؟" اسے ہرگز امید نہ تھی کہ وہ اس طرح اس کے بیڈ روم میں چلا آئے گا۔

"ہاں میں۔" وہ اس کے رویہ آکھڑا ہوا پھر اس کے گھبرائے ہوئے چہرے پر سنجیدہ سی نظر ڈالتے بولا۔
 "کیوں مجھے اوائیڈ کر رہی ہو پر اہلم کیا ہے؟"

"مہم۔ میں کب اوائیڈ کر رہی ہوں آپ کو؟"

"تو پھر یہ سب کیا ہے تمہارا سیل بند ہے گھر کے نمبر پر کل کرو تو تم آتی نہیں ہو ملنے آؤ تو ایک ہی بہانہ سننے کو ملتا ہے کہ ہمیں گھر پر نہیں ہیں تو پھر ان سب کا مقصد کیا ہے؟ کیوں ایسا ایٹی ٹیوڈ اپنا رہی ہو میرے ساتھ۔ مجھے سچ بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟" وہ اس کے دونوں کندھے تقریباً "بھنجوڑتے ہوئے بولا اور عانیہ جو بات کرنے کے لیے اپنے دماغ میں لفظوں کو ترتیب دے رہی تھی ایک دم جیسے ڈھے سی گئی وہیں کارپٹ پر بیٹھتے رودی۔

عرشمان کو اس کے آنسوؤں سے ہی اپنے لہجے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ لمبا سانس ہوا میں خارج کرتے اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑتے وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کا یوں بلک بلک کر رونا اس کی جان نکالنے لگا۔

"کیوں میری جان کے درپہ ہو بتاتی کیوں نہیں ہوا کیا ہے؟ پلیز سیمز کرو مجھ سے۔" اس نے اس کے دونوں ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹائے عانیہ نے بھیگی

"ان کا سیل خراب ہو گیا ہے۔" اسے بروقت بہانہ سوجھ ہی گیا۔

"اؤ۔۔۔" اسے عرشمان داؤد کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آئی۔

"میں ایسے ہی اتنے دن ڈسٹرب رہا۔ ویسے تمہاری میم نے میری جان نکالنے میں کسر نہیں چھوڑی تھی کوئی۔"

وہ جب بھی گھر آئے اسے میرا مسج دوے دینا کہ مجھے فون کرے۔ "بلکا پھلکا ہو کر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ راہداری سے گزرتے عرشمان داؤد کی پشت کو عانیہ سعید نے بہتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پھر زینی کے گلے لگتی بچکیوں سے رودی۔

"مجھ۔۔۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا زینی یہ دکھ بہت بڑا ہے۔ یہ مجھے اندر ہی اندر حتم کر رہا ہے۔ میں ایک بیٹی بن گئی تھی نے اپنی محبت کو جیتے جی مار دیا اور اور جب عرشمان کو پتا چلا تو۔۔۔" ایک دم وہ ہراساں سی ہو گئی۔

"نجانے اس کا کیا رد عمل ہو وہ مجھے معاف بھی کر سکے گا یا نہیں۔"

"وہ بہت پیار کرتے ہیں عانیہ آپ سے مجھے نہیں لگتا کہ وہ خاموش بیٹھیں گے۔ میں نے ان کی آنکھوں میں آپ کے لیے محبت کا ایک جہان آباد دیکھا ہے۔" زینی نے اسے نئی پریشانی میں مبتلا کر دیا۔
 کیا واقعی عرشمان داؤد خاموشی سے پیچھے ہٹ جائے گا یا۔۔۔



"عانیہ کہاں ہے؟"

"جی ہاں۔"

"میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا سچا جواب دو زینی اور اس بار کوئی بہانہ نہیں۔"

"سر وہ عانیہ میم تو ابھی ابھی باہر۔"

"زینی۔۔۔" وہ غصے سے دھاڑا۔

"اپنے روم میں گئی ہیں۔ مہم۔ میں ابھی بتاتی

پلیس اٹھائیں۔ برٹمان داؤد کو اپنا آپ ان میں ڈوٹا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے جیب سے رومال نکالا اور پھر نرمی سے اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔

”او کے آئی ایم سوری مجھے واقعی تم سے اتنی سختی سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی، لیکن پارلیمنٹ کرو اس ایک ہفتے میں مجھے ایسے لگا جیسے میں باگل ہو جاؤں گا اور اس ہفتے کی ساری فرسٹریشن ناچاہتے ہوئے بھی تم پر نکل گئی۔“

تمہاری بے رخی میں کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا عانیہ، تمہاری وجہ سے ہی میں اپنا کام ادھورا چھوڑ کر واپس آیا ہوں اور ادھر ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ سننے کو ملتا، میں اتنا بے بس آج تک کبھی نہیں ہوا جتنا میں نے گزرے اس ہفتے میں خود کو محسوس کیا ہے۔ اٹھو تم یہاں سے۔“ پھر اسے اٹھاتے اس نے بیڈ پر بٹھایا اور خود اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”عانیہ کیا ہمارا تعلق ایسا نہیں ہے کہ تم اپنی پرابلم میرے ساتھ شیئر کر سکو۔“ پریشانی، فکر، پروا، تشویش کیا کچھ نہ تھا اس وقت برٹمان داؤد کی آنکھوں اور لہجے میں عانیہ سعید خود کو ملامت کرنے لگی۔ اپنے لیے فکر مند ہوتے اس بے حد عزیز اور پارے شخص کو دیکھتے اس کے دل میں ٹہسوں سی اٹھنے لگیں۔ وہ کتنا اچھا تھا کتنا مہربان اور کتنا مخلص اور عانیہ سعید کو اس اتنے اچھے اور خالص بندے کے دل کو توڑنا تھا۔ اس سے دور جانا تھا اسے چھوڑنا تھا، دل ہانے یا نہ مانے۔

”آپ کو یوں میرے کمرے میں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ وہ خود کو سمیٹ چکی تھی۔ دل کے ماتم سے بچاتی دونوں کانوں کو مسدود کر چکی تھی۔ اس کے لہجے کی تبدیلی برٹمان کو کسی انہونی کی طرف اشارہ کرتی محسوس ہوتی۔ اسے کچھ کھٹکا مگر کیا۔ بس نہیں آکر وہ الجھ گیا۔

”میں اس وقت کسی کے گھر میں پناہ لیے ہوئے ہوں۔ وہ اس طرح آپ کو میرے کمرے سے نکلتا ہوا دیکھ کر کیا سوچیں گے۔ آپ کو خیال کرنا چاہیے تھا۔“ کھڑے ہوتے وہ نا محسوس انداز میں اس کی طرف سے پیٹھ موڑ گئی۔ کیوں کہ اب جو وہ کہنے جا رہی تھی وہ کسی

صورت ان لفظوں کے بعد اس دلربا شخص کے چہرے پر بکھرتے درد اور آنکھوں سے اڑتی حیرت و بے یقینی کو دیکھنے کی خود میں ہمت نہیں پاتی تھی جبکہ اس کے رویے کو دیکھتے برٹمان داؤد کی الجھن مزید بڑھ گئی۔ ان کا تعلق جس اسٹینس سے تھا وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے کمرے سے نکلنے دیکھ کر کوئی کچھ بھی نہ سوچتا پھر وہ اس طرح کیوں کہہ رہی تھی۔

”میری انگیجمنٹ ہو چکی ہے بہت جلد شادی ہونے والی ہے اور آپ کا اس طرح یوں میرے روم میں آنا۔“ آگے اس نے بات ادھوری چھوڑ دی یا پھر مزید کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ رہی تھی۔ اس کے آنسو بننے لگے۔ کتنی دیر گزر گئی، مگر ان دونوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ وہ اپنے دھک دھک کرتے دل کی دھڑکنوں کو گنتے اس کے رد عمل کا انتظار ہی کرتی رہی، مگر اتنی دیر گزرنے کے باوجود ان کے درمیان موجود خاموشی نہ ٹوٹی۔ اتنی زیادہ خاموشی کی توقع وہ ہرگز نہ کر رہی تھی۔ وہ آہستہ سے پلٹی اور پھر جیسے ساکت رہ گئی۔

اسے برٹمان داؤد کے وجود پر کسی بت کسی پتھر کا گمان گزرا خود کو ہلکی سی بھی جنبش دیے بغیر یہاں تک کہ اپنی پلکوں کو جھپکے بغیر وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”کیا کہا تم نے، میں نے ٹھیک سے سنا نہیں۔“ اس کے پلٹنے پر اس نے پوچھا تھا۔ عانیہ کی ساری ہمتیں جواب دے گئیں۔ اسے لگا کہ اب وہ کچھ نہ کہہ پائے گی وہ نہ حال سی دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپاتے رو پڑی۔

”رونے سے کبھی کوئی پرابلم حل نہیں ہوتی، ڈسکس کرو مجھ سے، اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے کس طرح کہہ دی تم نے۔ بتاؤ مجھے،“ درشتی سے کہتے اس نے اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹانے چاہے جب اس کی انگلی میں جگمگاتی رنگ پر اس کی نظر پڑی۔ وہ پہلی بار ٹھٹکا ہاتھ ہوا میں ہی معلق ہو کر رہ گیا۔ تو کیا وہ سچ کہہ رہی تھی؟

”عانیہ۔۔۔ رنگ والے ہاتھ کو تھامتے اس کی آواز میں گہری بے چینی تھی۔“

”کیا یہ سچ ہے؟“ عانیہ کی آنکھیں جھکتی چلی گئیں۔ اس کی نادم سی خاموشی نے عرشان داؤد کو جیسے اندر باہر سے ہلا کر رکھ دیا۔

”کیوں عانیہ۔۔۔ کیوں۔۔۔؟“ اسے دونوں کندھوں سے جھنجھوڑتے صدے کی شدت سے اس کی آواز پھٹ سی گئی۔ عانیہ کے آنسوؤں میں اور تیزی آگئی۔ ”ایک ہفتہ پہلے تک تو سب ٹھیک تھا پھر ایک دم ایسا کیا ہو گیا۔“ وہ جیسے تڑپ اٹھا پھر دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر جماتے متغیر سی حالت لیے مسکراتے ہوئے بولا۔

”مم۔۔۔ میں جانتا ہوں تم۔۔۔ تم مذاق کر رہی ہو مجھ سے! بے نایہ ہی بات۔۔۔ بے نایہ سب جھوٹ ہے نا؟“ اس کی حالت دیکھتے عانیہ کا دل گٹکنے لگا۔

”یہ۔۔۔ یہ سچ ہے عرشان۔“ اسے اپنی آواز کسی گہری کھائی سے آتی ہوئی لگی۔ اس دوران پہلی بار عرشان کا چہرہ شدید اشتعال کی گرفت میں آیا۔ اس کا پارہ ہائی ہونے لگا۔ اس کے ہونٹوں سے سننے کے باوجود جیسی اس نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ اس کا دل کسی صورت مان ہی نہیں رہا تھا کہ عانیہ اس کے ساتھ اس طرح کر سکتی ہے، مگر وہ اس کے ساتھ اس طرح کر چکی تھی۔ اس کے چہرے کا تناؤ بڑھنے لگا عضلات اک دماغ کچھاؤ کی لپیٹ میں آنے لگے۔

”میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو، ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے کیا بکواس کی ہے۔“

”پلیز عرشان۔۔۔ ایک بار کہہ چکی ہوں کہ میری منتہی ہو چکی ہے پھر کیوں یقین نہیں کر لیتے آپ۔ ثبوت کے طور پر انگوٹھی بھی آپ دیکھ چکے ہیں۔“ لاکھ چاہنے کے باوجود بھی وہ اس کی آنکھوں میں نہ دیکھ سکی بلکہ اس کے چہرے پر بھی نظر نہ ڈال سکی۔

”بچھلے تین ماہ سے پھر جو ہمارے درمیان چل رہا تھا پھر وہ کیا تھا۔“ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں عجب انتہائی تلخ اور سرد ہو گیا۔ دل چاہ رہا تھا اسے

جھنجھوڑ کر رکھ دے جو ایک گھنٹے سے مسلسل اس کے ضبط و برداشت کو آزمایا رہی تھی اس کے جذبات کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

”میں نہیں جانتی کہ وہ سب کیا تھا، میں بس اتنا جانتی ہوں کہ میری منتہی ہو چکی ہے۔“ وہ بھرائی آواز میں بولی۔

”منتہی۔۔۔ زخمی لہو لہو آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے وہ اذیت و تکلیف کی نجانے کس اسٹیج پر جا پہنچا تھا پھر اس کے کندھوں کو چھوڑتے درد سے چور لہجے میں بولا۔

”کتنی ظالم ہو تم، تمہیں ذرا احساس نہیں کہ تمہارے یہ الفاظ کسی نشتر کی طرح میرے دل کو گھائل کر رہے ہیں، میں اس وقت کتنی تکلیف سے گزر رہا ہوں۔ کیوں اتنی سنگدل ہو گئی ہو کہ محبت بھرے دل کو اتنی بے رحمی اور سفاکی سے توڑ رہی ہو۔ جانتی ہونا کہ نہیں رہ سکتا تمہارے بغیر پھر کیوں میری تکلیف کا مزا لے رہی ہو یا کہ مجھے آزما رہی ہو۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو مجھے بتاؤ، مگر اتنی بڑی سزا نہیں عانیہ۔ میں نہیں سہ پاؤں گا۔“ اک بے قراری سے اس نے اس کا ہاتھ تھاما عانیہ کو اس کی آواز بھیگی سی لگی۔ اس کا دل عجیب سی توڑ پھوڑ کر شکار ہونے لگا۔ عرشان کے لفظوں میں اتنی سچائی اور لہجے میں اتنا درد تھا کہ اس کا دل تڑپنے لگا۔ اسے خود کو سنبھالنا مشکل لگنے لگا۔ وہ ہارنے لگی اور یہ ہی وہ لمحہ تھا جب وہ کمزور پڑ سکتی تھی، مگر اسے کمزور نہیں پڑنا تھا، کسی صورت نہیں پڑنا تھا۔ آئی سارہ کے احسانوں کا بوجھ اتارنے کے لیے ان کی عزت پر اپنی محبت قربان کرنی ہی تھی۔ اس کے لیے چاہے وہ خود اندر سے ہمیشہ کے لیے مرجاتی، مگر اسے ایسا کرنا ہی تھا۔

”ایک بار آپ سے کہہ چکی ہوں کیوں سمجھ میں نہیں آتا آپ کی۔ کچھ دنوں میں شادی ہے میری اس لیے پلیز یہاں بار بار آکر میرا اور اپنا ٹائم ضائع مت کریں۔ میں نے کبھی بھی کسی بھی قسم کے عہد و پیمانے نہیں باندھے آپ سے، چند دن آپ کے ساتھ ہنس

بول کر کیا گزار لیے آپ تو پیچھے ہی پڑ گئے اور پلیز اس طرح مجھے تنگ کر کے یہ سوچنے پر مجبور نہ کریں کہ جو وقت آپ کے ساتھ گزارا وہ میری زندگی کا برا ترین وقت تھا۔ بہت ہمت کرنی پڑی اسے یہ سب کہنے کے لیے جبکہ عرشان داؤد تو پتھر کا مجسمہ بنانا قابل یقین نظروں سے اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ اسے کسی صورت یقین نہ آیا کہ یہ سب عانیہ سعید نے کہا ہے۔ اس کی عانیہ سعید نے جسے اس نے ٹوٹ کر چاہا اور جس کے اندر اس کی جان بستی تھی جس کے بیٹھے نرم لہجے میں اس کی زندگی دھڑکتی تھی۔ کتنے سنگین الفاظ تھے اس کے اور کس قدر بے رحمی سے ادا کیے گئے تھے جبکہ عانیہ اسے وہیں ساکت بے یقین چھوڑ کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

”میں نے بہت برا کیا ہے اس کے ساتھ زہنی بہت برا بڑی بے دردی سے اس کا دل توڑا ہے میں نے وہ جو عورت پر یقین کرنے سے ڈرتا تھا میں نے اس کے ڈر کو سچا ثابت کر دیا ہے۔ وہ اب کبھی کسی عورت پر یقین نہیں کر پائے گا۔ اب وہ شاید کبھی کسی بر بھروسا نہ کر پائے اگر قسمت نے ہمیں ملانا ہی نہیں تھا تو پھر ایک دوسرے کے قریب ہی کیوں لانی بہت ظالمانہ کھیل کھیلا ہے تقدیر نے ہم دونوں کے ساتھ بہت ظالمانہ۔“ وہ زہنی کے گلے لگتی پھوٹ پھوٹ کر رودی اس کی اس قدر تکلیف پر زہنی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس ٹوٹی پھوٹی لڑکی کی جھولی خوشیوں سے بھر دے۔

گھر آنے کے بعد بھی وہ کتنی دیر بے یقین ہی رہا۔ اسے لگا جیسے وہ سب ایک برا خواب ہو وہ آنکھیں کھولے گا اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کیوں کیوں اس کا دل یقین نہیں کر پاتا تھا۔ آخر کیوں نہیں۔ اس کا اتنا سنگدلانہ رویہ دیکھنے کے باوجود بھی یہ دل کیوں اسی کے لیے تڑپ رہا تھا اسی کے بارے میں مسلسل سوچے جا رہا تھا اسی سے محبت کر رہا تھا۔ عانیہ سعید اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی اور جسے اس نے دل کی تمام تر گمراہیوں سے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ وہ

عورت ذات پر اعتبار کرنے لگا اور اب۔۔۔ اسے لگا جیسے اس کے دامن میں کچھ نہ بچا ہو۔ اس کے نزدیک اس کے بغیر جینے کا تصور ہی نہ تھا اور اب کیا وہ اس کے بغیر جی پائے گا ہر گزرتا لمحہ اس کے لیے بھاری سے بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ وہ پچھلے دو گھنٹوں سے مسلسل لان میں ٹہل رہا تھا پریشانی ایسی تھی کہ ایک لمحے کے لیے بھی سکون نہ تھا۔ اپنی پوری زندگی میں وہ کبھی اتنا پریشان نہیں ہوا تھا جتنا ان گزرے کچھ گھنٹوں میں ہوا تھا۔ وہ جتنا سوچتا جا رہا تھا اتنا ہی مزید الجھتا جا رہا تھا دونوں ہاتھوں میں سر تھامے وہ وہیں سگی بیچ پر بیٹھ گیا۔



وہ یونیورسٹی جانے کے لیے گھر سے نکلی تھی اس کی گاڑی ابھی تھوڑی دور ہی چلی تھی جب ڈرائیور کو بریک لگانی پڑی، سامنے عرشان داؤد اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے گھڑا تھا گاڑی رکتی دیکھ کر وہ ڈرائیور کی طرف بڑھا پھر کھڑکی کی طرف جھکتے بولا۔

”تم گھر جاؤ عانیہ کو میں یونیورسٹی چھوڑ دوں گا۔“ ڈرائیور کی اتنی مجال نہ تھی کہ وہ اس سے کسی قسم کا کوئی سوال جواب کرتا اسی لیے دھیرے سے سر اشارت میں ہلاتے باہر نکل آیا جبکہ اسے گاڑی میں بیٹھے دیکھ وہ گھبرا گئی۔

”آپ۔؟ آپ یہ کہاں لے جا رہے ہیں مجھے؟“ روٹ تبدیل ہوتا دیکھ کر وہ پریشانی سے گویا ہوئی۔ ”ڈونٹ وری تمہیں اغوا کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے کسی بھی پر سکون جگہ پر جا کر گاڑی روک دوں گا تاکہ تم سے تھل کر بات کر سکوں۔“ بیک ویو مرر سے اس کی ڈری سہمی صورت دیکھتے وہ نارمل سے انداز میں بولا۔

”کیسی بات۔۔۔؟“

”کیوں پریشان ہوتی ہو اچھی طرح جانتی ہو کہ تمہارے اور میرے درمیان صرف ایک ہی ٹاپک پر بات ہو سکتی ہے۔“ پھر وہ کم ریش والی جگہ پر گاڑی روکتے پیچھے مڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہم

آگے آنا پسند کرو گی یا پھر میں پیچھے آؤں؟“

”عرشمان پلیزیہ آپ کیا کر رہے ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں نمی چھانے لگی۔

”لگتا ہے مجھے ہی پیچھے آنا پڑے گا۔“ پھر اس کے آگے سے پیچھے آکر بیٹھنے تک عانیہ دھڑ دھڑ کرتے دل کی دھڑکنیں ہی سنبھالتی رہی ہاتھ ایک دم ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ انگلیاں چمکاتے وہ اپنی گھبراہٹ کو کسی صورت کم نہ کر پائی تھی۔

”ہوں۔۔۔ اب بتاؤ کیا سمجھ کر تم اتنا عرصہ مجھے بے وقوف بناتی رہیں۔ میرے جذبات سے کھیلتی رہیں۔“ اس کے قریب بیٹھتے وہ بہت ریلیکس انداز میں بولا تھا اور یہی انداز تو عانیہ کو کھٹک رہا تھا اس کی گھبراہٹ میں مزید اضافہ کر رہا تھا۔

”مم۔۔۔ میں نے کوئی کھیل نہیں کھیلا آپ کے ساتھ۔۔۔“

”گڈ“ تو اس کا مطلب ہے تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے۔“ زچ ہوتے اس نے بھیگی پلکیں اٹھائیں۔ وہ کیوں بار بار اسے اسی موڑ پر لاکھڑا کرتا تھا جس سے وہ بچنا چاہ رہی تھی۔

”دیکھیں عرشمان بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔“
”بات کو ہی تو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کئی دنوں سے اور بات ہی تو سمجھ میں نہیں آرہی۔“ وہ اس کی بات کاٹتے تیز لہجے میں بولا تب وہ بھی بیخ پرڑی۔
”میں آپ کو نہیں چاہتی، کتنی بار تاؤں آپ کو۔“
”پھر مجھے یقین کیوں نہیں آرہا۔“
”یہ آپ کا مسئلہ ہے۔“

”میرے اور تمہارے مسئلے کب سے الگ الگ ہو گئے عانیہ؟“ اس کی آواز گہمیر ہو گئی۔

”ویسے تم نے مجھے بہت تکلیف پہنچائی ہے۔ اتنی کہ آج تک کسی نے نہیں پہنچائی، مگر چونکہ تم دل کی ملکہ ہو تو تمہاری ہزار خطا میں بھی معاف۔“ وہ اس کی طرف جھکتے اس کے چہرے پر لہرائی اکلوتی لٹ کو نرمی سے چھوتے ہوئے بولا۔ لہجے کی گہمیر تا اور پیش عانیہ کے حواسوں پر چھانے لگی۔ دلفریب کلون کی

مہک ارد گرد حصار باندھتے اسے بے بس کرنی لگی۔
”عرشمان پلیزیہ۔ آپ یہ کیوں کر رہے ہیں؟ کیوں تنگ کر رہے ہیں مجھے جب سب ختم ہو چکا ہے تو۔“ وہ تقریباً کھڑکی کے ساتھ چپک سی گئی۔

”تو اس کا مطلب ہے ہمارے درمیان ”کچھ“ تھا جس کا تم نے خود ابھی اعتراف کیا ہے۔“ وہ اس کی بات پکڑتے یکلخت سنجیدہ ہوا تھا۔ ”اور وہ کچھ کیا تھا عانیہ، وہ صرف محبت تھی جو ہم ایک دوسرے سے کرتے تھے، کرتے ہیں، کیوں بھاگ رہی ہو اس محبت سے؟ کیوں میری زندگی میں خوشیوں سے کھیل رہی ہو، ایسا کیا ہو گیا ہے جو تمہیں مجھ سے دور جانے پر مجبور کر رہا ہے اور تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں اتنی آسانی سے تم سے دستبردار ہو جاؤں گا۔ تم میری واحد خوشی ہو اور میں تمہیں کسی صورت اپنی خوشی چھیننے کی اجازت نہیں دوں گا۔ کیسی منگنی اور کونسی منگنی میں نہیں مانتا اس منگنی کو۔“

اس کی بھاری ہوتی آواز، لہجے میں چھپی حسرت و محبت، لفظوں سے جھلکتا سچ عانیہ سعید کو اندر سے کمزور کرنے لگا۔ آنکھیں پانی سے بھرنے لگیں۔ کیا اس دلربا سے شخص کو کھو کر وہ جی پائے گی؟ کتنی بار اس نے سوچا تھا کہ وہ اس سے اتنی بد تمیزی اتنی سختی سے بات کرے گی کہ وہ بد زن ہو کر خود ہی اس سے نفرت کرنے لگے گا مگر پھر اس کے سامنے آتے وہ ہر چیز ہی بھول جاتی سوائے اپنی بے بسی کے۔ وہ لاکھ چاہنے کے باوجود بھی اس سے سخت لہجے میں بات نہ کر پائی تھی کیونکہ عرشمان داؤد اس کے لیے اس کی پوری زندگی تھا۔ قسمت نے اسے اس موڑ پر ضرور لاکھڑا کیا تھا مگر یہ ہی قسمت عانیہ سعید کے دل سے عرشمان داؤد کی محبت ایک انچ بھی کم نہ کر پائی تھی بلکہ جب سے احساس ہوا تھا کہ وہ اس کا نہیں دل اور دیوانہ ہونے لگا تھا۔ وہ سر جھکا گئی اتنا کہ اس کے آنسو عرشمان داؤد کی گہری نظروں سے بھی چھپ گئے۔

”اب سرگیوں جھکا رہی ہو بات کر لو مجھ سے۔ کہو کہ وہ سب ایک مذاق تھا گھٹیا مذاق، مت آزماؤ میرے

پیار کو نہیں جی سکتا میں تمہارے بغیر۔“ اس نے ہاتھ سے اس کا چہرہ اونچا کرنا چاہا جب اس کا ہاتھ جھٹکتے وہ جیسے پھٹ پڑی دل و دماغ کی اس لڑائی میں وہ نیم پاگل ہو کر رہ گئی تھی۔

”کیا چاہتے ہیں آپ؟ مرحاؤں میں خود کشی کر لوں؟ تو ٹھیک ہے میں یہ بھی کر گزروں گی پھر آپ خوش ہو جائیے گا۔“ اپنے آنسوؤں کو بے دردی سے رگڑتے وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولی جبکہ عرشمان داؤد کا منہ کچھ کہنے کے لیے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اتنا شدید رد عمل۔

”عانیہ۔“ وہ فقط اتنا ہی کہہ پایا۔

”جان چھوڑ دس میری اللہ کے واسطے ورنہ میں واقعی خود کشی کر لوں گی ختم کر دوں گی خود کو موت آئیں بار بار میرے سامنے تکلیف ہوتی ہے آپ کو دیکھ کر بہت تکلیف ہوتی ہے۔ رحم کھا میں مجھ پر۔“ وہ اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ضبطی کی آخری سیڑھی پر جا پہنچی تھی۔ عرشمان داؤد حیران پریشان اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا جب وہ دروازہ کھولتے تیزی سے باہر نکلی اور پھر فٹ پاتھ پر بھاگنے لگی اس سے پہلے کہ وہ اس تک پہنچتا وہ قریب سے گزرتے رکشے کو روک کر اس میں سوار ہو گئی۔



اس ملاقات کے بعد اس نے بہت کوشش کی عانیہ سے ملنے کی مگر اس نے تو جیسے گھر سے باہر نہ نکلنے کی قسم کھا رکھی تھی ہر وقت اپنے کمرے میں ہی بند رہتی۔

عرشمان داؤد جیسے شخص کو کھو کر جینا موت سے بھی بدتر تھا وہ بہت بار کمزور پڑی تھی مگر پھر اسے خود کو خود ہی دلائل دیتے سمجھانا پڑا۔ خرم نے ایک دو بار اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا مگر وہ سختی سے انکار کر گئی یہاں اسے آنٹی سائرہ بھی فورس نہ کیا میں۔ وہ اسے شاپنگ پر لے جانا چاہتی تھیں مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ ادھر جب اس کی شادی کا کارڈ عرشمان داؤد

تک پہنچا تو صحیح معنوں میں اس کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ساری دنیا کو آگ لگا دے۔

بی بی کی گود میں سر رکھے وہ دردی کی نجانے کونسی حد پر تھا۔ اسے اتنا ٹوٹا بکھرا دیکھ کر بی بی جی کے کلبجے پر بھی ہاتھ پڑا تھا۔ وہ کتنی دیر بے یقینی سے کارڈ کو دیکھتی رہیں پھر آہستہ سے بڑبڑا میں ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ انہیں جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو انہوں نے سائرہ بیگم سے عرشمان اور عانیہ کے رشتے کی بات کی تھی تب تو انہوں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا اور عرشمان داؤد تو ایسے تھا جیسے پوری دنیا سے ناراض ہو چکا ہو۔ کتنے دن گزر گئے اسے اپنے کمرے میں بند۔ کھانا پینا سونا جیسے وہ سب بھول گیا وہ خود سمیت ساری دنیا کو بھول گیا ہو سکتا تھا کہ اس فرسٹریشن میں وہ خود کو ختم کر لیتا کہ اس دن آنٹی سائرہ چلی آئیں۔ وہ کمرے میں مکمل اندھیرا کیے پڑا تھا۔ وہ اندر داخل ہوئیں اور پھر آہستہ سے لائٹ جلادی عرشمان نے کافی ناگواری سے اس عمل کو دیکھا تھا۔ اندھیرے میں رہنے کی تو جیسے اسے عادت سی ہو گئی تھی۔ وہ روشنیوں سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اسے لگا کوئی ملازم ہو گا مگر پھر آنٹی سائرہ کو دیکھ کر وہ خاصا حیران ہوا تھا۔

”آپ!؟“

جبکہ وہ ساڑھی کا پلو سنبھالتے ایک ادائے نزاکت سے چلتی گردن اکڑائے اس کے قریب چلی آئیں۔

”ہاں میں؟“ پھر اس کی بڑھی ہوئی شیو، ملکے شکن آلود لباس، آنکھوں کے گرد پڑے ہلکوں اور کئی دنوں کی رتہ جگموں کے احساس سے سرخ دوڑے لیے دیران بچر آنکھوں کو دیکھ کر افسوس سے سر ہلاتے ہوئے بولیں۔ ”یہ کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی؟ تم تو پچھانے ہی نہیں جا رہے پورے مجنوں بنے ہوئے ہو۔ اس بے وفائے کی وجہ سے اس طرح جوگ لینا سوٹ نہیں کرتا تم پر۔ تم داؤد اینڈ سٹریٹ کے اکلوتے مالک، گروٹوں نہیں بلکہ عربوں کے تہاوارث ہو۔“ عرشمان داؤد کی آنکھوں کی سرخی بڑھنے لگی۔ ہزار چاہنے کے باوجود وہ ان کی آمد

کا مقصد نہیں جان پایا تھا جبکہ وہ کہہ رہی تھیں۔
 ”نومائے سن نو عرشان داؤد کو یہ زہب نہیں دیتا کہ وہ
 دو ٹکے کی لڑکی کی خاطر خود کو برباد کرے۔ دیکھو تو کتنی
 گھٹن ہو رہی ہے تمہارے روم میں۔ زندگی کی ذرا سی
 رمت کا بھی احساس نہیں ہو رہا ہے۔ ہر چیز سے اداسی
 ٹپک رہی ہے خیر تم اپنے کمرے میں کس طرح رہتے
 ہو یہ تمہارا ذاتی مسئلہ ہے میں تو تم سے صرف اتنا
 پوچھنے آئی ہوں کہ جب ایک انسان کا دل ٹوٹتا ہے تو
 اسے کیسا محسوس ہوتا ہے۔“ عرشان داؤد کی آنکھوں
 میں الجھن چھانے لگی آخر وہ کہنا کیا چاہ رہی تھیں وہ
 سمجھنے سے قاصر تھا جبکہ وہ استہزائیہ مسکراہٹ ہونٹوں
 پر لاتے ہوئے بولیں۔

”کبھی اتنی ہی بے دردی سے تم نے بھی کسی کا دل
 توڑا تھا۔“ وہ اس دوران پہلی بار چونکا۔ یعنی جیسا وہ
 سوچ رہا تھا ویسا کچھ بھی نہ تھا معاملہ کچھ اور تھا۔ آنٹی
 سائہ اس کے زخموں پر مزہم نہیں بلکہ نمک چھڑکنے
 آئی تھیں۔ ”کیوں آئی ہیں آپ یہاں؟“ وہ از حد
 سنجیدہ سا گویا ہوا۔ جب مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے
 انہوں نے کہا۔

”کتنی کمزور یادداشت ہے تمہاری ابھی بتایا تو ہے۔
 ویسے ایک بات ہے تمہیں اس طرح دیکھ کر میرے دل
 کو بہت سکون مل رہا ہے جیسے کرنی دہی بھرنی۔“
 ”آ۔۔ آپ۔“

”ہاں میں۔ اُنہ غصے سے چیخیں۔“ آج سے ایک
 سال پہلے اپنے زعم میں جس معصوم کا تم نے بڑی بے
 دردی سے دل توڑا تھا وہ کوئی اور نہیں میری اپنی بیٹی تھی
 جو اس دن کے بعد سے مسکراتا تک بھول چکی ہے
 زندگی کو ایک بوجھ کی طرح گزار رہی ہے۔ اسی دن میں
 نے تم سے انتقام لینے کی قسم کھائی تھی اور پھر خوش
 قسمتی سے میری ملاقات عانیہ سے ہو گئی۔ واہ کیا
 صورت پائی تھی اس نے اور کیا معصومیت تھی چہرے
 پر۔ اگر میری ابھی نظر ٹھنک سکتی تھی تو پھر تمہاری
 کیوں نہیں۔ چارے کے طور پر تمہارے سامنے پیش
 کیا تھا میں نے اسے بڑا سجا سنوار کر پیسے تک کی پروا

نہ کی اور تم“ وہ سنیں بڑی عجیب سی ہنسی تھی۔ ”تم تو
 چارہ کھانے کے لیے ایک دو ملاقاتوں کے بعد ہی
 اناولے ہو گئے حسن بھی کیا چیز ہوتا ہے انسان کی
 سدھ بدھ ہی کھو دیتا ہے۔ وہ سب ایک پری پلان تھا
 ڈیڑ۔“ اور عرشان داؤد کا چہرہ حیرت سے بتدین گیا جبکہ
 آنکھیں بے یقینی کے احساس سے قدرے پھیل سی
 گئیں۔ اسے کسی صورت یقین نہیں ہو رہا تھا کہ آنٹی
 سائہ اس کے ساتھ اس طرح بھی کر سکتی ہیں۔ ہاں
 اسے اب بھی اچھی طرح یاد تھا ایک سال پہلے اشنا کے
 اظہار محبت پر وہ پہلے تو کتنی دیر بے یقین اور حیران رہا
 مگر پھر بہت نرمی اور رسلان سے ہلکے ہوئے لہجے میں
 اسے سمجھایا کہ اس کا جذبہ یک طرفہ ہے وہ اس کے
 پارے میں اس طرح نہیں سوچتا۔ تب اشنا بہت روئی
 تھی اسے اپنی محبت کے واسطے بھی دیے تھے مگر عرشان
 داؤد جیسے اپنے دل کے آگے مجبور تھا جو اس کے بارے
 میں اس طرح سوچنے کو کسی صورت تیار نہ تھا۔ عرشان
 نے بہت ندامت محسوس کرتے اس سے معذرت کی
 تھی اسے حقیقتاً ”بہت دکھ ہوا تھا کہ اس کی وجہ سے
 اشنا کا دل ٹوٹا تھا تب آنٹی سائہ وہاں موجود نہیں تھیں تو
 اس کا مطلب ہے یہ سب کیا دھرا اشنا کا تھا اس نے اپنی
 ماما کو ان دونوں کے درمیان ہو میں ساری باتیں بتائی
 ہوں گی۔“

عرشان داؤد نے سلگتی ہوئی نظریں اٹھا میں سامنے
 کھڑی شاطرانہ انداز میں مسکراتی عورت اس کی سگی
 چاچی تھیں وہ چاہتا تو انہیں ذلیل کر سکتا تھا انہیں بہت
 کچھ سنا سکتا تھا مگر وہ بولا تو فقط اتنا۔

”کیا عانیہ بھی آپ کے اس پلان میں شامل تھی؟“
 سائہ بیگم اک اداسے مسکرائیں جیسے وہ اس سے اسی
 سوال کی توقع کر رہی تھیں۔ اس کی موجودہ حالت ان
 کے دل کو سکون فراہم کر رہی تھی۔ پھر وہ کیوں نہ خوش
 ہوتیں۔ ان کا دل چاہا کہ وہ زور زور سے تمہارے لگائیں۔
 جس طرح اس شخص نے ان کی بیٹی کو رلایا تھا یہ خود بھی
 اسی طرح رونے والا تھا۔ وہ بازی جیت چکی تھیں
 انہوں نے جیسا چاہا تھا بالکل ویسا ہی ہوا تھا پھر وہ اس کی

طرف طنزیہ دیکھتے ہوئے بولیں۔

”ہاں وہ تمہاری ہیروئن بھی اس پلان میں شامل تھی ملل کلاس کی لڑکیوں میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے کہ وہ پیسے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ میں نے کسی امیر لڑکے کے ساتھ اس کی شادی کروانے کا وعدہ کیا تھا اور اس کے بدلے میں اسے تمہارے جذبات کے ساتھ کھیلنا تھا، تمہارا دل توڑنا تھا اور اب جبکہ وہ ایسا کر چکی ہے تو وعدے کے مطابق اس کی شادی میں تمہارے جتنے ہی امیر لڑکے سے کروا رہی ہوں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو اسے، تمہارا ہی بزنس پارٹنر خرم منصور تمہارے ہم پلا ہی ہے۔ تمہیں تو شاید خبر بھی نہ ہوگی خود کو کمر بند کیے پورے مجنوں بنے بیٹھے ہو۔ میں تو تمہیں خاص بلاوا دینے آئی تھی کہ کل اس کی بارات پر ضرور آنا۔ انتظار رہے گا تمہارا۔“

وہ اتنے فراتے سے جھوٹ بول رہی تھیں کہ کسی کو بھی ان کے جھوٹ پر یقین آجاتا جبکہ عرشان داؤد کا پورا چہرہ ضبط سے سرخ انگارہ ہو گیا آنکھیں خون چھلکانے لگیں ہاتھوں کی مٹھیاں شدید اشتعال سے جھینچ سی گئیں۔ وہ جو عانیہ کے رویے سے ابھی تک الجھا ہوا تھا سب سمجھ گیا۔ اس کا اعتماد بھروسا یقین بڑی بری طرح کرچی کرچی کیا گیا تھا۔ وہ لڑکی جس کا چہرہ تو معصوم تھا مگر داغ انتہائی شاطر اور اس کی جھوٹی محبت کی خاطر کتنے دن وہ خود کے ساتھ ظلم کرتا رہا تھا لڑتا رہا تھا اپنا قصور تلاش کرتا رہا تھا۔ جینا تک بھول گیا تھا۔ محبت نے اسے بڑی بے دردی سے رسوا کیا تھا، بہت کڑی سزا دی تھی۔ اس کا بھروسا اسی طرح توڑا تھا کہ اب ساری زندگی وہ کسی پر بھروسا نہ کرپاتا فقط کچھ لمحے لگے تھے خود کو سمیٹنے میں خود کو جوڑنے اور سنبھالنے میں اس نے اپنی ذات کی بہت رسوائی دیکھ لی، بہت عانیہ اور آئی سائے جیسے لوگوں کو تسکین فراہم کر دی اب نہیں بالکل نہیں۔ ایک لمحہ لگا تھا بس اور پھر اس کا چہرہ ہر احساس ہر تاثر سے عاری ہوتا گیا۔ وہ آئی سائے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرایا۔

آئی سائے نے بے حد حیرانی سے اس کی نا سمجھ میں آنے والی مسکراہٹ کو دیکھا۔

”عرشان داؤد ناقابل تسخیر ہے آپ کی وہ زر خرید لوٹتی اس میں اتنی طاقت کہاں کہ وہ مجھے زیر کر سکے۔ محبت۔ ہلہلا کیسی محبت اور کونسی محبت اس کی اتنی اوقات ہے کہ وہ عرشان داؤد کے دل کی ساتھ کھیل سکے۔“ سائے بیگم کا چہرہ لمحوں میں متغیر ہوا تھا جبکہ وہ ان کا ساکت انداز دیکھتے مضبوط چال چلتا ان کے رویہ آکھڑا ہوا۔

”عرشان کا مطلب تو آپ خوب جانتی ہوں گی عرش کا شہزادہ اور شہزادوں کو بھلا یا بند یوں کی کیا کمی بس عانیہ سعید بھی ایک باندی ہی تھی جس کے ساتھ عرشان داؤد نے کچھ دن گزارے، عیش کیا اور پھر چھوڑ دیا۔“ سائے بیگم کا چہرہ لمحوں میں شدید اشتعال کی گرفت میں آیا تھا۔ آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ وہ تو اس کی ہار کا مزا لینے آئی تھیں مگر اس وقت وہ استہزائیہ نظروں سے تکتا، زہر خند مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے ان کی ٹھکست کا مزالے رہا تھا۔ کسی زہریلی ناگن کی طرح ان کے اندر زہر پھیلا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنے لہجے اور تیز ناخنوں کے وار سے اس کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے نوج ڈالتیں جو ان کو کسی صورت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ عرشان داؤد نے آج دوسری بار انہیں شدید تکلیف سے دوچار کیا تھا انہیں چوٹ لگائی تھی، ملت دی تھی وہ برداشت کرتی بھی تو کس طرح شہر بھری سرخ نظروں سے اسے گھورتے وہ ایک دم پلٹی تھیں جب اس کے پکارنے پر انہوں نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔

”یہ جو آپ میری حالت دیکھ رہی ہیں نا وہ سچ ہے مگر وہ عانیہ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ایک جان سے عزیز دوست کی ڈیٹھ کی وجہ سے ہے۔“ وہ مزید وہاں رک کر اپنا تماشا نہیں بنوانا چاہتی تھیں سو ایک جھٹکے سے مڑیں اور تن فن کر لی کمر اچھوڑ گئیں، جبکہ ان کے جاتے ہی عرشان داؤد وہیں گھنٹوں کے بل زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ اتنا بڑا دھوکا، محبت کا یہ فریب ناقابل برداشت

ہے کیونکہ وہ میری بیوی کی حیثیت سے اس وقت میرے بیڈ روم میں ہے اور اگر آپ دلہما کا انتظار کر رہی ہیں تو وہ بھی بے فائدہ ہی ہے کہ بارہا اب کبھی نہیں آئے گی۔“

”واٹ! کیا بکواس کر رہے ہو تم؟“ کئی لمحے تو سناٹوں کی زد میں رہ کچھ بول ہی نہ پائی تھیں مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ بولی نہیں بلکہ پھنکاری تھیں۔ عرشمان کی آواز کو وہ لمحوں میں پہچان گئی تھیں ان کے غصے اور اشتعال کے گراف کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔

”مجھے کیا ضرورت ہے بکواس کرنے کی نہ تو آپ کا ڈرائیور ہی آپ کے پاس ہے اور نہ ہی زینی۔ وہ دونوں بھی باحفاظت میرے پاس ہی ہیں۔ آپ تو انہیں اب کبھی نوکری پر نہیں رکھیں گی تو ظاہر ہے ان کا خیال بھی تو مجھے ہی رکھنا پڑے گا اور رہا سوال دو لہے کا تو یہاں آپ سے تھوڑی سی غلطی ہو گئی۔ کم از کم دو لہے کی حیثیت سے آپ کو میرے فرینڈ کو تو کسی صورت چننا نہیں چاہیے تھا اب وہ اپنے دوست کا دل تو نہیں توڑ سکتا تھا جیسا میں نے اسے کہنا تھا اس نے ویسا ہی کرنا تھا۔“

”عرشمان۔۔۔“ وہ حلق کے بل چیخی تھیں۔ آواز کی تیزی گلے کو چیرتی ہوئی گزری تھی۔ رہی سہی امید بھی اسی بل دم توڑ چکی تھی۔ باہر موجود مہمانوں کے سامنے کا ڈرا نہیں اندر تک حواس باختہ کر چکا تھا۔

”آہستہ آہستہ آہستہ۔۔۔ میں بہرہ نہیں ہوں اور ویسے بھی آج تو میری سہاگ رات ہے اس لیے آپ سے زیادہ بحث نہیں کر پاؤں گا۔ اس بحث کو ہم کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں ابھی تو میری پیاری بیوی میرا ویٹ کر رہی ہوگی سو گڈ بائے اب باہر موجود مہمانوں سے آپ نے کیا کہنا ہے یہ آپ جانیں اور آپ کا کام میری طرف سے تو گڈ ٹائٹ۔“

”نیو باسٹریٹ۔ ایڈیٹ بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارے ساتھی۔“ ادھر سے سیل آف ہونے کے باوجود بھی وہ گالیوں اور کوسنوں کی صورت دل کی بھڑاس نکالتی

رہیں۔ شاید اسے ہی مکافات عمل کہتے ہیں۔ انہوں نے جو اس کے ساتھ کیا سو کیا، مگر آج ان کے ساتھ وہ انتہائی برا کر چکا تھا ان کی بازی ان ہی پر الٹ چکی تھی۔ آج کی رات کے بعد یقیناً وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں۔ ان کا ٹھمنڈا ان کا غرور لمحوں میں چکنا چور ہوا تھا۔ عانیہ، عرشمان اور خرم کو بددعا میں دیتے وہ وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھتی چلی گئیں۔



رو کر اس نے اپنا برا حال کر لیا تھا۔ اسے ابھی تک یقین نہیں ہو رہا تھا جو عرشمان داؤد اس کے ساتھ کر چکا تھا۔ وہ اسے برا بھلا بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ دل کی سلطنت کا ابھی تک وہ تہما مالک تھا۔ نہ جانے آئی پر کیا گزری ہوگی وہ اس وقت کس حال میں ہوں گی۔ اسے نہ پا کر بارہا ات یقیناً ”واپس لوٹ چکی ہوگی“ آئی کی کتنی انسلٹ ہوگی۔ عرشمان نے تو ان کی عزت کا بھی ذرا خیال نہ کیا۔

”اف میرے اللہ یہ سب کیا ہو گیا۔“ وہ گھٹنوں میں سر دیے ایک بار پھر سے رو پڑی۔ اسی وقت دروازہ کھولتے عرشمان داؤد اندر داخل ہوا۔ عانیہ نے گردن اٹھاتے اسے خائف نظروں سے دیکھا جو اس کی طرف ذرا بھی متوجہ نہ تھا۔ اس نے کوٹ اور ٹائی کو بڑی بے دردی سے صوفے پر اچھالا تھا اور پھر کف لنکس اوپر کرنا از حد سنجیدہ سا اس کے روبرو آکر بیٹھ گیا پھر کتنی دیر وہ اس کے روئے روئے سرخ چہرے کو پر سوچ نظروں سے گھورتا رہا۔ سامنے بیٹھی اس لڑکی میں کبھی اس کی جان بستی تھی وہ اسے اپنانے کے خواب دیکھا کرتا تھا مگر آج جب وہ اس کی ہو گئی تھی تو اس کے سرد تاثرات میں جذبول نے ذرا اپچل نہ چائی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے سب احساسات پر برف سی جم گئی ہو نہ دھڑکنوں نے ادھم مچایا نہ دل نے کسی قسم کی خوشی کا اظہار کیا۔ اس وقت اس کے دل میں جتنی آگ لگی تھی وہ ساری آگ اس پر اندیل دینا چاہتا تھا اور اس نے ایسا ہی کیا تھا اب کب اسے کسی کی پروا رہی تھی۔

”عرش کا مطلب تو تم جانتی ہی ہوگی میں نے خود ہی تو بتایا تھا تمہیں۔“ لکھت ہی اس کی آنکھیں کسی پرانی یاد کے زیر اثر سرخ ہوئی تھیں۔ اس نے بڑی تیزی سے اپنے دماغ کو جھٹکا تھا۔ وہ اب کبھی بھی پرانی یادوں کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”عرش کا شہزادہ اور شہزادوں کو تو باندیاں رکھنے کی عادت ہوتی ہی ہے۔ تم بھی اس گھر میں ایک باندی کی ہی حیثیت سے رہو گی۔ تم سے نکاح کرنا میری خواہش نہیں بلکہ ضرورت تھی۔ تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنی تحویل میں رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا ورنہ تمہاری وہ خالہ کہاں تک کر بیٹھنے والی تھیں۔“ اس کا لب و لہجہ انتہائی تھرد نکلاں یہاں تک کے دیکھنے کا انداز بھی تبدیل ہو چکا تھا۔ عانیہ کا پورا وجود سن ہونے لگا۔ وہ تو اس بالکل اجنبی اور برے ہوئے عرشان داؤد کو دیکھ کر حیرت و دکھ سے مجسمہ سی بن گئی۔ آنکھوں سے دیکھ لینے کے باوجود بھی اسے لگا جیسے سامنے بیٹھا شخص عرشان نہیں بلکہ اس کا بہروپ ہو جس کا چہرے کے سوا اور کچھ بھی عرشان سے نہ ملتا ہو۔ نہ اخلاق نہ دیکھنے کا انداز اور نہ آواز کی لطافت وہ اس ایک ہی وقت میں بہت سی کیفیات کا شکار ہوئی تھی۔ بے یقینی حیرت، صدمہ، دکھ، ناسف، خوف و ہراس ان تمام چیزوں نے مل کر اسے محنتل الحواس سا کر دیا جب وہ اس کی طرف جھٹکا اور پھر بڑی بے دردی سے اس کا چہرا پکڑتے غرایا۔

”کسی امیر و کبیر شخص سے شادی کی ہی خواہش تھی نا تمہاری تو آج پوری ہو گئی۔ چہرہ چہرے“ پھر افسوس سے سر نگی میں ہلاتے اس نے ایک جھٹکے سے اس کا چہرا چھوڑا۔

”مگر افسوس اس کے پاس تم پر ڈالنے کے لیے محبت کی ایک نگاہ بھی نہیں ہے۔“
 ”تم۔“ پھر وہ ایک دم طیش میں آ کے بولا۔
 ”تم ہر رات میری سجاوگی مگر محبوبہ یا بیوی بن کر نہیں بلکہ باندی بن کے سنا تم نے۔“ اپنی لہو ہوتی، تشقر بھری نظریں اس کے زرد پڑتے چہرے پر گاڑھتے

وہ بلند آواز میں چیخا، کتنی نفرت و حقارت تھی اس وقت اس کی آنکھوں اور چہرے پر عانیہ کا پورا جسم ٹھنڈا ہونے لگا۔ تذلیل کے احساس سے وہ کانوں کی لووں تک سرخ ہو گئی۔ اس نے دھندلائی آنکھوں سے صدمے سے چور ہوتے اس کی طرف دیکھا۔ کانوں کو کسی صورت یقین نہ آیا کہ وہ اتنی گری ہوئی بات بھی کر سکتا ہے۔ اگر وہ اس کے انکار سے ہرٹ ہو کر یہ سب کر رہا تھا تو یہ سب بہت زیادہ تھا۔ عانیہ کی توقع سے تو اور بھی زیادہ۔ اسے اس کی شعلے برساتی، سلکتی آنکھوں اور نفرت و اشتعال لیے سرخ پتھر لیے سرد چہرے سے ایک دم خوف محسوس ہوا۔ وہ سر اچھٹا سی بے ساختہ پیچھے کی طرف سر کی۔ عرشان داؤد مسخرانہ انداز میں مسکرایا اور پھر اس کے لہنگے پر اپنا ہاتھ جھاتے اس کی کوشش کو ناکام کر دیا۔ عانیہ کسی ہنسی کی طرح سم گئی۔

”عرشان۔۔۔ پلیز چھوڑیں مجھے، آپ ہوش میں نہیں ہیں۔“ وہ رو پڑی تھی۔

”اب ہی تو ہوش میں آیا ہوں، سویت ہارٹ۔“ بہت عجیب سے انداز میں وہ ہنسا تھا۔ جب بے بسی لاچاری کی نہ جانے کون سی حد کو چھوتے وہ سسک سسک کر رو دی تھی اور اس کا یوں ہچکیوں سے تڑپ تڑپ کر دینا کچھ لمحوں کے لیے سہی مگر پرانے عرشان کو جگا گیا تھا۔ اسے تکلیف ہوئی تھی، آنکھوں کی سرخی بڑھنے لگی، مگر پھر اگلے ہی لمحے وہ اپنا ہر جذبہ ہر احساس اپنے اندر ہی دبا گیا، جو کسی کے سچے جذبوں کی ناقدری کرے، کسی کے خلوص ساتھ کھیلے۔ کسی کو محبت میں دھوکا دے اس کے ساتھ ایسا سلوک کرنا عرشان کی ڈکٹری میں بالکل جائز اور درست تھا۔ وہ اسے معاف کر دیتا، بخش دیتا، اگر ایک مل کے لیے سہی، مگر اس نے اسے چاہا ہوتا اس کی تمنا کی ہوتی، مگر اب وہ کسی صورت رعایت دینے کے حق میں نہ تھا۔ اسی لیے اگر یہ رات ایک وجود نے روتے تڑپتے بلکتے گزارا تو دوسرے وجود نے حاکمیت کے نشے میں چور کسی بے بس انسان کی بے بسی کو اپنے قدموں تلے

روندتے ہوئے گزاری۔



اکلی صبح عانیہ سعید کے لیے بالکل مختلف تھی۔ اس کے اندر کی لڑکی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی تھی۔ راحت عثمان کے سلوک نے اسے اچھی طرح باور کروایا تھا کہ اس کی نظر میں اس کی اوقات صرف ایک زر خرید باندی کے جیسی ہے۔ وہ ہار گئی تھی۔ وہ ٹوٹ چکی تھی۔ بڑی بے رحمی سے اس کے بھروسے کو توڑا گیا تھا اور ستم ظریفی یہ تھی کہ توڑنے والا کوئی غیر نہیں اس کے دل کا مکیں اس کا شوہر تھا۔

وہ صوفے پر بیٹھی تھی رو رو کر اس کی آنکھیں سوچ چکی تھیں۔ عثمان داؤد قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا بالوں کو برش کر رہا تھا۔ عانیہ کی تھکی تھکی نظریں کتنی دیر سے یک ٹک اسی کو ہی دیکھنے جا رہی تھیں مگر اس بے نیاز شخص نے پلٹ کر ایک بار بھی اس کی طرف نہ دیکھا تھا۔ اسے ذرا احساس نہ تھا کہ رات اس نے اس معصوم سی لڑکی کے خوابوں کو کس طرح ریزہ ریزہ کیا تھا۔ برش کرنے کے بعد اس نے خود پر پرفیوم اسپرے کیا اور پھر اک نگاہ غلط بھی اس پر ڈالے بغیر مضبوط چال چلتا کرا چھوڑ گیا۔ عانیہ نے سر صوفے کی پشت سے نکلتے آنکھیں موند لیں، اتنی بے بسی، لا تعلقی، بیگانہ پن، اس کی بند آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور پھر وہ ایک ہفتے بعد دوبارہ لوٹا تھا۔ یہ پورا ایک ہفتہ اس نے ڈر ڈر کر گزارا تھا۔ سوائے چوکیدار کے اور کوئی نہ تھا۔

وہ دوپہر میں آیا تھا اور پھر شام ہوتے ہی جس خاموشی سے آیا اسی خاموشی سے لوٹ بھی گیا۔ نہ اس نے اس کا حال پوچھا اور نہ اس نے بتایا کہ کوئی اور کسی بھی قسم کی بات ہوئی۔ وہ صرف اس کی پاندی تھی اور پاندیوں کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ حاکموں کو اس کی پروا نہیں ہوتی۔ اس کے جاتے ہی وہ تکیے میں سر دیے رو دی تھی۔ عثمان داؤد کا رویہ اس کی جان نکالنے کے لیے کافی تھا۔ اس کی لاپرواہی، بیگانگی، لا تعلقی حقیقتاً

اسے اندر سے ختم کر رہے تھے۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ لاکھ چاہنے کے باوجود وہ اس سے نفرت نہیں کر پار ہی تھی۔ دل ابھی بھی اسی کھٹور کے نام پر دھڑکتا تھا اور پھر بند رہ دن گزر گئے، مگر اس نے دوبارہ پلٹ کر اس ٹوٹی بکھری لڑکی کی طرف نہ دیکھا۔ اس کی نمازوں میں سجدے طویل ہو گئے۔ وہ اپنا ہر دکھ اپنی ہر اذیت اپنے اللہ سے کہنے لگی۔ نماز تو وہ پہلے بھی نہیں چھوڑتی، مگر ان دنوں وہ اللہ کے اور قریب ہو گئی تھی۔ اسے اب ہی احساس ہوا کہ اللہ سب سے اچھا سامع ہے۔ وہ اس کے سامنے روتی، تڑپتی، بلکتی اپنے اندر کی ساری ٹھن، سارے غم، آنسوؤں کے ذریعے بہا دیتی اور پھر جیسے اسے سکون ملنے لگتا، دل ٹھہرنے لگتا۔

وہ نماز پڑھ کر ابھی اٹھی ہی تھی جب اسے زور کا چکر آیا کرنے سے بچنے کے لیے اس نے ادھر ادھر ہاتھ مارتے کسی چیز کا سہارا لینا چاہا، مگر پھر وہ سرے ہی لمحے لہراتی ہوئی نیچے آگری۔ قریب بڑی چھوٹی ٹیبل سے اس کا سرری طرح ٹکرایا اور پھر خون کا فوارہ سا چھوٹ گیا۔ اللہ جی۔ اس کی حلق سے بے اختیار چیخ نکلی تھی۔ بندھل سے انداز میں وہ اپنے ماتھے پر اپنا ہاتھ جما گئی۔ رات کے اس پہر چوکیدار کے علاوہ اس اتنے بڑے گھر میں اور کوئی نہ تھا۔ آخر وہ بلائی بھی تو کس کو بلائی۔ اس نے اٹھنے کی کمزوری کوشش کی، مگر پھر جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک دم اندھیرا سا چھا گیا۔ وہ یہاں تڑپ تڑپ کر رہی جائے تو کسی کو کچھ خبر نہ ہوگی۔ ایسی بے بسی اور لا چاری پر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے دل کی شدت سے اپنے رب کو پکارا تھا۔ اب تو تکلیف برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی۔ اسی وقت گاڑی کا ہارن بجا اور چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ عثمان داؤد نے جس وقت کمرے میں قدم رکھا۔ وہ درد کی شدت برداشت نہ کرتے ہوئے بے ہوش ہو چکی تھی۔

عانیہ۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا اس کے قریب آیا تھا جو دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھے دنیا مافیہا سے بے خبر زمین پر بے ہوش پڑی تھی۔ اسے بانہوں میں بھرتے وہ

اپنے منتشر حواسوں کے ساتھ تیزی سے باہر بھاگا تھا۔
گرنے سے چوٹ تو گہری آئی ہے، مگر بروقت لانے
کی وجہ سے زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ ہیشنٹ ہے تو
خطرے سے باہر، مگر خون کی بہت کمی ہے۔ ایک تو ان
کی حالت ایسی ہے اور اوپر سے خون بھی ضائع ہو گیا۔
وہ جو اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑتے ریلیکس ہونے لگا
تھا۔ لیڈی ڈاکٹر کی اگلی بات پر بری طرح چونکا، کیسی
حالت۔ اس کی لاعلمی پر لیڈی ڈاکٹر پیشہ ورانہ
مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے بولی۔

”آپ کی وائف ماں بننے والی ہیں، چونکہ ابھی
بہت کم عرصہ گزرا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ وہ خود بھی
انجان ہی ہوں گی۔“

”کیا۔۔۔“ اسے حیرت کا شدید ترین جھٹکا لگا تھا۔ منہ
کھلے کا کھلا رہ گیا۔ جی۔۔۔ یہ میں کچھ میڈیسن لکھ کے
دے رہی ہوں، برابر دیتے رہیے گا اور منتہلی چیک
اپ تو لازمی ہے، چونکہ یہ کافی ویک ہیں اور اوپر سے
خون کی بھی کافی کمی ہے، تو ان کی ڈائینٹ کا خاص خیال
رکھیے گا۔ میں آپ کو ڈائینٹ چارٹ دے دیتی ہوں،
اسی کے مطابق ہی خوراک دیجیے گا۔ ”وہ ہدایات دینے
کے ساتھ ساتھ کانڈرپریٹیشن بھی لکھ رہی تھی، جبکہ
وہ بے یقین اور حیران سا کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اسے سمجھ
میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح کاری ایکٹ کرے،
اگر سب کچھ نارمل حالات میں ہو، ہوتا اور عانیہ سعید
ایک دھوکے باز لڑکی نہ ہوتی تو اس وقت وہ پھولے ناسا
رہا ہوتا، مگر اب۔۔۔ اس کے اندر گہرا سکوت سا چھا گیا۔
وہ عانیہ سعید کے وجود سے تو کبھی کبھی کسی بھی قسم کی
خوشی نہ لینا چاہتا تھا، کبھی بھی نہیں۔

واپسی پر وہ انتہائی حد تک سنجیدہ تھا اور عانیہ
خاموش، اس کے سپاٹ تاثرات عانیہ کے اندر عجیب
سی دکھن پیدا کر رہے تھے۔ یعنی اتنی بڑی خوشی بھی اس
پر مثبت اثرات نہ ڈال رہی تھی۔

”میں یہ بچہ نہیں چاہتا۔“ گھر آکر اس نے دھماکا کیا
تھا۔ عانیہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر
رہ گئی۔

”یہ۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہے؟“ اسے اپنی آواز گہری
کھائی سے آتی ہوئی لگی تھی۔ اسے اپنی سماعتوں پر شبہ
گزرا۔ آخر وہ کس طرح اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے
کہہ سکتا تھا۔ اسے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی ہوئی
لگی، وہ بے اختیار ہی بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔

”ٹھیک کہہ رہا ہوں میں۔ تم جیسی دھوکے باز لالچی
مکار عورت میری اولاد کو جنم دے، میں یہ کسی صورت
برداشت نہیں کروں گا۔“ عیسے کی شدت سے اس کی
آواز قدرے بلند ہو گئی، جبکہ اتنے شدید اور سنگین
الفاظات پر عانیہ ہکا بکا رہ گئی۔

”کیسا دھوکا۔۔۔ کون سا فریب، تمہے میں نے آپ
کو کوئی دھوکا نہیں دیا۔ عرشان اور بھلا میں آپ کو کیوں
دھوکا دوں گی۔ میں مجبور ہو گئی تھی۔ میں مانتی ہوں کہ
میں نے آپ کو ہرٹ کیا، مگر میں بے وفا نہیں ہوں۔ یہ
سب میں نے آنٹی کی محبت میں ان کی عزت کی خاطر
کیا۔ میں نے اپنی محبت کو ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں
دفن کر دیا، کیونکہ میں آنٹی کے احسانوں کا بوجھ اتارنا
چاہتی تھی۔“

اب وہ کسی حال میں بھی اس پر یقین نہیں کرنا چاہتا
تھا۔ ”میرا بھروسہ سا اٹھ چکا ہے تم پر سے، تم کچھ بھی کراؤ،
یہ بھروسہ تمہاری ذات پر دوبارہ بحال نہیں ہو سکتا۔
تمہاری کوئی اوقات، کوئی حیثیت نہیں ہے میری نظر
میں، تم صرف ایک باندی ہو اور باندیوں سے وارث
پیدا نہیں جاتے۔ یہ بچہ تو اس دنیا میں کبھی نہیں آئے
گا۔“

”اگر آپ مجھے باندی سمجھتے ہیں تو ہاں ہوں میں
باندی۔“ وہ بھی جیسے پھٹ پڑی۔ بات اس کی اولاد تک
آچکی تھی۔ پھر وہ کس طرح برداشت کرتی۔ صبر کرتی
بھی تو کیسے۔

”آپ نے میرے ساتھ جس طرح کا چالاک سلوک
کیا۔ میں کوئی حرف شکایت زبان پر نہ لائی، مگر آج
معاملہ میری اولاد کا ہے اور کوئی ماں اپنی اولاد پر اتنا بڑا
ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ ابھی تو وہ دنیا میں بھی نہیں
آئی اور آپ اسے ختم کرنے کی بات کر رہے ہیں۔“

اس کی آواز زندہ سی گئی، مگر وہ چپنہ ہوئی۔

”میں نے آپ کے ساتھ جو کیا وہ آپ کو حرف بہ حرف یاد ہے، مگر جو آپ نے میرے ساتھ کیا، کیا وہ ٹھیک تھا؟ ٹھیک شادی کے وقت آپ مجھے زبردستی یہاں لے آئے اور زبردستی ہی مجھے اپنے نکاح میں لیا۔ میرے بارے میں نہ سوچتے، مگر اپنی سگی چاچی کے بارے میں ہی سوچ لیتے، کتنی ذلت اٹھانی پڑی ہوگی انہیں، مگر آپ۔۔۔“

”سٹ اپ۔۔۔ آئی سے سٹ اپ اور ماؤتھ۔۔۔“ وہ بولتے بولتے ہانپنے لگی تھی۔ جب وہ غصے سے دھاڑا۔ اشتعال کے شدید احساس سے اس کے ماتھے کی رکیں تک ابھر آئیں۔ سارا غصہ سگی چاچی کہنے پر تھا۔ کیسی دیدہ دلیری تھی۔ وہ اب بھی ان ہی کی وکالت میں بول رہی تھی۔

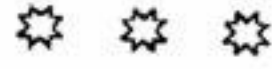
”شکر کرو کہ میں نے اتنے میں چھوڑ دیا تم دونوں کو، ورنہ عرشان داؤد کو دھوکا دینے والوں کا انجام اس سے بھی بدتر ہوتا۔ نفرت ہے مجھے تم سے اور تمہاری اس آئی سے۔“ وہ حلق کے بل چیخا تھا۔ آواز اتنی بلند تھی کہ گلے میں خراشیں پڑ گئیں۔ اس کے غصے کی شدت سے سرخ انگارہ ہوتے چہرے کو عانیہ نے دہل کر دیکھا۔ اتنے غصے میں تو وہ تب بھی نہیں آیا تھا، جب عانیہ نے اس سے سب تعلق توڑ دے تھے۔ جب اس نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ اس کی شعلے برساتی آنکھیں، آگ اگلتی زبان، ضبط گریہ سے آتش فشاں بنا لہجہ اور سب ہنس کر دینے والا انداز۔ عانیہ بے اختیار سہم کر دو قدم پیچھے سرکی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ عانیہ سمیت ساری دنیا کو آگ لگا دینا چاہتا تھا اسے لگا اگر اب اس نے مزید ایک لفظ بھی کہا تو وہ اس کا گلا باندھے گا۔ سراسیمہ آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں، بہت واضح نظر آرہی تھیں، جبکہ عرشان داؤد غصے بھری کاٹ دار گھری نظر ڈال کر قریب پڑی میز کو زوردار ٹھوکر رسید کرتے باہر نکل گیا۔ وہ وہیں بیٹھ کر رونے لگی۔ اس واقعہ کے بعد دو ہفتے گزرنے کے باوجود بھی وہ نہ آیا تھا۔ ہاں اتنا ہوا کہ ایک کل وقتی

ملازمہ کا بندوبست ہو چکا تھا اور وہ ملازمہ کوئی اور نہیں، بلکہ زینبی تھی۔ وہ کتنی دیر اس کے گلے لگ کے روئی رہی اور زینبی بھی روتے ہوئے اس کے ہڈی حال وجود کو سنبھالتی رہی۔

”وہ اتنا کھٹور تو کبھی نہیں تھا زینبی، اتنا ظالم، اتنا سنگ دل میں، میں اس کا ہر ظلم سہ جالی، کبھی اف تک نہ کرتی، جانتی ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ وہ سخت بدگمان ہے، مجھ سے ہونا بھی چاہیے کہ میں نے اس کا محبت بھرا دل توڑا ہے۔ انہیں تکلیف پہنچانی ہے، مگر اس میں اس بچے کا کیا قصور ہے۔ وہ کیوں اپنی ہی اولاد کو دنیا میں آنے سے پہلے ختم کرونا چاہتا ہے۔“ آج کتنے دنوں بعد وہ آیا تھا، مگر پھر عانیہ کی بھیگی آواز سننے وہیں دروازے پر ہی رک گیا۔ آنکھوں کے گوشے سرخی کی لپیٹ میں آنے لگے، کیا واقعی اسے اپنی غلطی کا احساس ہے۔ اپنے کیے پر پشیمانی ہے اور کیا وہ اتنے بڑے دل کا مالک ہے کہ سب بھول کر اس کی خطائیں معاف کر سکے، مگر پھر عانیہ کے اگلے جملے نے تو جیسے اسے ششدر سا کر دیا۔

”تم جانتی ہو وہ میری زندگی میں آنے والا پہلا مرد ہے۔ دل کی گہرائیوں سے ٹوٹ کر چاہا ہے میں نے اسے، اس کے اتنے ظلموں کے باوجود بھی یہ دل اس سے نفرت نہیں کر پا رہا، میری بے بسی دیکھو زینبی وہ جب سامنے آتا ہے تو میں سب بھول جاتی ہوں، کچھ یاد نہیں رہتا۔ اس اتنی بڑی دنیا میں میرا اس کے سوا اور کون رہا ہے۔ آئی سائرہ کے ساتھ انجامے میں ہی سہی، مگر میں بہت برا کر چکی ہوں۔ وہ تو اب میری شکل تک دیکھنا نہیں چاہیں گی۔ میری وجہ سے بہت رسوا ہوئی ہوں گی وہ۔ بیٹیوں کی طرح چاہا تھا انہوں نے مجھے۔ تب میرا ساتھ دیا جب سب اپنوں نے بھی منہ پھیر لیا تھا۔ ان کی عزت کی لاج رکھنے کے لیے میں نے ناچا ہتے ہوئے بھی اتنا بڑا قدم اٹھایا اور اب میں ہی ان کی رسوائی کا سبب بن گئی ہوں۔ وہ کبھی مجھے معاف نہیں کریں گی، کبھی بھی نہیں۔“ وہ رو دی تھی۔ عرشان داؤد کے ماتھے پر پر سوچ لیکریں ابھرنے لگیں۔

دلغہ الجھنے لگا۔ آخر وہ کیا کہتا چاہ رہی تھی۔ اس کے پرورد الفاظ، لہجے کا سوز تو کوئی اور ہی کہانی بنا رہے تھے۔ وہ جس خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔



”یہ۔۔۔ یہ کیا کیا، کیا ما آپ نے؟“ ان کے منہ سے پوری بات سن کر اشنا نے حیرت سے پوچھا اب سے کسی صورت یقین نہ آ رہا تھا کہ اس کی ماما عرشان اور عانیہ کے ساتھ اس طرح بھی کر سکتی ہے۔ وہ بے یقینی سے ان کی طرف دیکھنے لگی جو کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھیں۔ چہرے پر غصے کی سرخی تھی۔

”ٹھیک کیا تھا میں نے کچھ غلط نہیں۔ مگر افسوس جس طرح چاہا تھا ویسا نہیں ہوا۔“

”ماما اس میں عرشان کا کیا قصور، میرا جذبہ یک طرفہ تھا۔ مجھے اس سے محبت ہوئی تھی، اسے مجھ سے نہیں، جب مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں تو پھر آپ نے اتنا بڑا قدم کس طرح اٹھالیا، بلکہ آپ اتنی انتہا تک بھی جاسکتی ہیں میں کبھی سوچ نہیں سکتی تھی اور اس بے چاری عانیہ کا کیا قصور تھا جسے آپ نے اتنی بڑی سزا دی۔ وہ بے سہارا یتیم لڑکی جو آپ کے آسرے پر تھی، کتنا برا کر چکی ہیں آپ اس کے ساتھ۔ کیا کل کو آپ سے پوچھ نہ ہوگی، اس کے بارے میں۔“ اشنا نے انہیں آئینہ دکھانا چاہا۔ جب انہوں نے اسے گھور کر دیکھا۔

”یہ سب میں نے تمہاری خاطر، تمہاری وجہ سے کیا۔“

”مگر افسوس کے آپ نے غلط کیا۔“ وہ تاسف سے بولی۔

”مجھ سے تمہاری خاموشی، تمہارا دکھ دیکھا نہیں جاتا تھا۔“

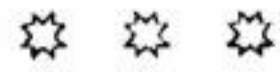
”مگر اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہ تھا کہ آپ انتقام پر اتر آئیں۔ عرشان نے مجھے کوئی دھوکا نہیں دیا، وہ تو اتنا نائس انسان ہے کہ سب جاننے کے باوجود بہت نرمی

اور سلجھے ہوئے انداز میں مجھے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر مجھے ہی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، اس کی محبت میں اندھی ہو چکی تھی۔ دیوانی بن چکی تھی، مگر اس سب کے باوجود میں نے کبھی اس سے انتقام لینے کے بارے میں نہ سوچا۔ میں خاموش ہو گئی اور پھر مجھے صبر آنا گیا اور میرے اسی صبر کی وجہ سے اللہ پاک نے رحمان احمد کو انعام کے طور پر میری قسمت میں لکھ دیا۔ رحمان احمد کی محبت کو جیسے جیسے میں جانتی گئی مجھے خود پر ناز ہونے لگا، کوئی اتنی شدت سے بھی کسی کو چاہ سکتا ہے اور چاہے جانے کا احساس کتنا دلفریب ہونا ہے یہ میں نے اب محسوس کیا ہے۔ میں اپنے ماضی کو بھول چکی ہوں۔ مجھے بس رحمان احمد یاد ہے۔ میں بہت جلد آپ سے اور پاپا سے اس کے حوالے سے بات کرنے والی تھی۔

مما تقدیر سے کبھی لڑا نہیں جاسکتا، کیونکہ تقدیر سے لڑنے کا مطلب اللہ سے لڑنے کا ہے۔ وہی تو تقدیریں بناتا ہے۔ میری تقدیر میں رحمان احمد ہی تھا اور جسے میں قبول کر چکی ہوں۔ عرشان کی تقدیر میں عانیہ ہی تھی جسے آپ نے لاکھ اس سے جدا کرنا چاہا، مگر کرنے پائیں۔ ہوا وہی نا جو اللہ چاہتا تھا، اگر آپ بہت سے لوگوں کے سامنے رسوا ہو چکی ہیں تو اس میں کسی اور کا کوئی قصور نہیں، غلطی آپ کی ہے۔ انتقام کی آگ میں جتنا جلیں گی وہ آپ کو اتنا ہی اندھا کرتی جائے گی۔ پلیز پلٹ آئیے واپس۔ اپنے لیے نہ سہی، میرے لیے پاپا کے لیے۔“ اشنا نے روتے ہوئے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ”ہر بچہ اپنی ماما کو بہت اچھا دیکھنا چاہتا ہے۔ میں بھی چاہتی ہوں۔ مجھے کسی کی بددعاؤں سے بہت ڈر لگتا ہے، ماما بہت مشکل سے خوشیاں تلاش کر پائی ہوں، یہ نہ ہو کہ ان خوشیوں کو کسی یتیم کی آہ لگ جائے۔ پلیز ممالوٹ آئیے ان اندھیروں سے۔ میری خاطر ہی آپ نے یہ سب کیا ہے، نا تو اب میری خاطر ہی اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیجئے آپ کو میری محبت کا واسطہ ہے۔“

”اشنا، لن کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ پھر اشنا کو

گلے لگاتے وہ رو پڑی تھیں۔ جبکہ اشنا، آہستہ آہستہ ان کی کمر سہلانے لگی۔



وہ کچھ ضروری سامان لینے مارکیٹ آیا تھا، جب اس کی ملاقات اشنا سے ہوئی۔ وہ اسے ایک سر نظر انداز کرتے سنجیدہ سا قریب سے گزر جانا چاہتا تھا۔ مگر اس کے پکارنے پر مجبوراً اسے رکن پڑا۔

”کیا بات ہے عرشمان قریب سے یوں گزر رہے تھے۔ جیسے جانتے ہی نہ ہو۔“ اپنا یوں سر راہ نظر انداز کیا جانا اشنا کو عجیب سی تکلیف میں مبتلا کر گیا، جب وہ از حد سنجیدہ سا گویا ہوا۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مجھے دھوکے باز لوگوں سے کتنی نفرت ہے اور تم بھی ان میں سے ہی ایک ہو۔“ اس کے لہجے کی تلخی کو پیتے اشنا کے دل میں چھین سی اتری تھی۔

”میرا خیال ہے کہ ہمیں بات کرنے کی ضرورت ہے۔“

”اور میرا خیال ہے کہ ہمیں کبھی بھی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ سرد انداز میں کہہ کر آگے بڑھ گیا، جبکہ وہ تقریباً دوڑتے ہوئے اس کے قریب پہنچی۔ ”پلیز عرشمان، میری بات تو سنیں، جیسا آپ سوچ رہے ہیں ویسا کچھ بھی نہیں، آپ کو شدید قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے، جو کچھ ممانے آپ کے ساتھ کیا اس میں شامل ہونا تو دور کی بات مجھے تو علم ہی کچھ دن پہلے ہوا ہے، پلیز بلیو می۔“ اس کے چہرے پر نہ جانے ایسا کیا تھا کہ وہ رک گیا۔

”سامنے ہی کفے ٹیرا ہے، بس کچھ دیر بیٹھ کر میری بات سن لیں۔ پلیز۔“ اس کی ہنسی صورت دیکھتے وہ خاموشی سے اس کے تعاقب میں چل پڑا۔

”ممانے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا وہ نہایت غلط تھا، مگر میرا یقین کریں عانیہ کی طرح میں بھی بالکل لاعلم تھی۔“

”کیا مطلب عانیہ۔“ وہ جو بے توجہی سے اس کی

بات سن رہا تھا عانیہ کے ذکر پر بے ساختہ ٹھٹکا۔

”عانیہ کے والدین کی ڈلتھ کے بعد ممانے عانیہ کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ میرے لیے یہ قابل تعجب بات نہ تھی، حیرت تو مجھے عانیہ کو اس قدر پروٹوکول دینے پر ہوئی تھی، مگر میں نے اس کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا، مگر کچھ دن پہلے جب ممانے مجھے اپنے منہ سے بتایا کہ وہ سب ایک پلان تھا۔ ایسی چال جس میں تم سب کو ٹریپ کرنے کے لیے عانیہ سعید ان کا سب سے خاص مہو تھی۔“ اور پھر کس طرح انہوں نے اس معصوم مہرے کو اپنی انگلیوں پر نچاتے بادشاہ کو مات دی اور پھر وہ آہستہ آہستہ وہ سب کہتی گئی جو سارہ بیگم نے خود اپنے منہ سے اسے بتایا تھا۔ اس کی باتیں سنتے عرشمان داؤد کا چہرہ ایک ایک پل میں کئی کئی رنگ بدل رہا تھا۔

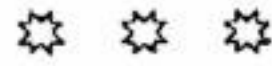
”میں مانتی ہوں عرشمان کہ ممانے بہت غلط کیا ہے، مگر پلیز آپ اور عانیہ انہیں معاف کر دینا۔ یہ سب انہوں نے میری محبت میں کیا۔ مجھے بددعاؤں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ عانیہ سے کہنا کہ وہ ہمیں بددعا میں نہ دے۔ وہ بہت اچھی اور معصوم لڑکی ہے، وہ ہمیں ضرور معاف کر دے گی۔ تم۔ تم پلیز اسے بہت سی خوشیاں دینا، کیونکہ وہ ڈیزرڈ کرنی ہے۔“ یکلخت ہی اس کی آواز بھینگ گئی، جبکہ عرشمان داؤد تو آک سا کڈ کی کیفیت میں گم صم ساکت جاہد شہدر سا کسی بت کی مانند بیٹھا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اشنا اور کیا کہہ رہی تھی وہ تو بس اتنا جانتا تھا کہ اس کی عانیہ بے قصور ہے۔ اس کی عانیہ دھوکے باز نہیں ہے یہ احساس اتنا آسودہ تھا کہ ایک عرصے کے بعد جیسے اس نے کھل کر سانس لیا تھا، مگر دوسرے ہی لمحے جب اپنا سلوک، ظلم اور زیادتی یاد آئی تو اس کا سر جھٹکا چلا گیا۔

اشنا نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔ ”آہم سوری عرشمان۔“ عرشمان نے سرخ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں نے بہت غلط کیا ہے، اشنا اس معصوم لڑکی کے ساتھ اس نے مجھ سے ٹوٹ کر محبت کی اور میں

نے اسے اتنی ہی تکلیف دی۔“

”مجھے اندازہ تھا عرشان، تمہاری شدت پسند طبیعت سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ اسی لیے تو تمہیں سچائی سے آگاہ کیا ہے۔ میری محبت میں مجبور ہو کر انہیں ذرا احساس نہ ہوا کہ وہ ایک تیم بے سہارا لڑکی کے ساتھ کتنا غلط کر رہی ہیں۔“ اور غلط تو عرشان داؤد نے بھی کچھ کم نہ کیا تھا اس کے ساتھ۔ اسے لگا جیسے وہ ساری زندگی اس کے سامنے سر نہ اٹھا سکے گا۔ پچھتاوے ایسے تھے کہ کسی زہریلے ناگ کی طرح اسے ایک ایک پل میں ہزار ہزار بار ڈس رہے تھے۔



وہ پردے برابر کرنے کے ارادے سے ابھی کھڑکی کی طرف بڑھی ہی تھی جب اسے لان میں کوئی ہیولا سا نظر آیا۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ ڈر سی گئی۔ رات کے اس پہر آخر وہاں کون ہو سکتا ہے۔ اس نے انٹرکام پر چوکیدار کو مطلع کرنا چاہا تھا، مگر پھر جو کچھ چوکیدار نے کہا وہ اسے حیران کر گیا۔ عرشان۔ اس وقت یہ کب آئے۔ دل میں سوچتے اس کی نظر بڑی تیزی سے وال کلاک کی طرف اٹھی تھی جو رات کے گیارہ بج رہا تھا۔ وہ لان میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ نہ جانے وہ کب سے ٹہل رہا تھا کہ پھر تھک کر وہاں پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کتنی دیر تو شش و پنج میں مبتلا وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی، مگر جب دل کو کسی صورت سکون نہ ملا تو لان میں چلی آئی۔

”عرشان۔“ قریب پہنچ کر اس نے دھیرے سے پکارا تھا جب آنکھیں موندے کرسی کی بیک سے سر نکائے عرشان داؤد نے سرعت سے آنکھیں کھولیں اور پھر یک ٹک کتنی دیر اس کے معصوم صبح چہرے کی طرف دیکھا رہا۔

”عرشان چلیں اندر۔“ اس کے گم صم بے اختیار انداز نے عانیہ کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔

”عانیہ۔“ اس نے زیر لب پکارا، مگر آواز اتنی آہستہ تھی کہ عانیہ تک نہ پہنچ سکی۔ اس کی آنکھوں

کے سرخ کو نے غیر محسوس سی نمی کی لپیٹ میں آنے لگے۔ اس نے گزرے چار مہینوں میں اتنی اس سے محبت نہ کی تھی جتنی ان تین مہینوں میں اس سے نفرت کی تھی جو صرف محبت کے قابل تھی۔ ملال، دکھ، تکلیف، بدامت کا احساس تھا کہ برہتا ہی جا رہا تھا۔

”چلیں اندر چلتے ہیں۔“ اس کا ہاتھ پکڑے ہی وہ اندر کی طرف برہ گئی۔ عرشان داؤد نے اپنا ہاتھ کھینچنے کی ذرا کوشش نہ کی۔ کمرے میں آتے اس نے اسے بیڈ پر بٹھایا، مگر پھر جیسے ہی اس کے چہرے پر اس کی نظر پڑی تو وہ پریشان ہو گئی اور بولی۔

”اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتادیں۔“ وہ اٹھ

کھڑی ہوئی۔

”ہاں اگر ایک کپ کافی مل جائے تو۔“ عانیہ سعید حیران حیران سی کمرے سے باہر نکلی تھی اور پھر کافی بناتے ہوئے بھی اس کی حیرت کم نہ ہوئی تھی۔ وہ کافی بنا کر جیسے ہی کمرے میں آئی عرشان داؤد گہری نیند میں جا چکا تھا۔ اتنے کم وقت میں اتنی گہری نیند، وہ حیرت سے سوچ کر رہ گئی، پھر کافی کا ٹک سائیڈ ٹیبل پر رکھتے وہ تکیہ اٹھا کر صوفے پر آکر لیٹ گئی۔ عرشان داؤد کی کمرے میں موجودگی اسے عجیب سا سکون اور تحفظ فراہم کر رہی تھی۔ وہ آج ہر طرح کے ڈر، خوف کو پس پشت ڈالتے بہت سکون کی نیند سوئی تھی۔

صبح حسب معمول فجر کی اذان کے وقت ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ ابھی اٹھ کر بیٹھی ہی تھی جب دائیں طرف عرشان کو جائے نماز پر بیٹھے اور ہاتھ دعا کی صورت اٹھائے دیکھ کر حیران ہوئی، مگر پھر اس کی بند آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھ کر وہ بے ساختہ ٹھکی۔ وہ کیا مانگ رہا تھا، وہ نہیں جانتی تھی، مگر وہ جو بھی مانگ رہا تھا بڑی لگن اور شدت سے مانگ رہا تھا۔

”یا اللہ تیرا بندہ جو بھی مانگ رہا ہے اسے دے دے۔ میں اسے اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی۔“ اس نے دل ہی دل میں دعا کی اور پھر روپا اوڑھتی وضو کی نیت سے واش روم میں گھس گئی۔ وضو کر کے جب وہ باہر آئی تو عرشان داؤد اسے کہیں نظر نہ آیا، ہاں جاو

نماز کو تہ نہیں کیا گیا تھا۔ یعنی وہ جانتا تھا کہ اس نے بھی نماز ادا کرنی ہے۔ وہ جاء نماز پر آکر کھڑی ہو گئی۔ نماز ادا کرنے کے بعد اس کی تمام تر دعاؤں کا دارودار عرشان داؤد کے ہی ارد گرد گھومتا رہا۔ دعا کے بعد اس نے قرآن پاک کی تلاوت کی۔ ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی تھی مگر پھر دھیان جیسے ہی عرشان داؤد کی طرف گیا تو وہ کچھ بے چین سی ہو گئی۔ باہر آگئی مگر پورے گھر میں اس کا کوئی پتہ نہ تھا۔ انٹرکام پر چونکدار سے پوچھنے رہی معلوم ہوا کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔ وہ افسرہ اور بو جھل سے دل کے ساتھ کمرے میں لوٹی نہ جانے اب وہ دوبارہ کب آئے۔ وہ بیڈ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جب سائیڈ ٹیبل پر پڑے کاغذ پر اس کی نظر پڑی۔ وہ ہینڈ رائٹنگ عرشان داؤد کی تھی اور یہ ہی وجہ تھی کہ وہ اسے تمام گئی۔

اگر تم جان جاؤ تو

محبت تم ہی ہو میری

میرے دل پر

میرے دل میں

جو پسلا عکس ابھرا تھا

وہ تیرا چاند چہرہ تھا

محبت تم ہی ہو میری

کہ چاہت تم ہی ہو میری

اس کی آنکھیں تیزی سے بھیگی تھیں۔ بھیگی بھیگی پلکوں سے وہ کتنی دیر ان لفظوں کو دیکھتی رہی پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا سامی کہ دراز سے قلم نکل کر لکھنے لگی۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

بھکاری بن بھی جائے من

محبت پھر نہیں ملتی

اندھیری رات میں اکثر

جھپک کر بھیگی پلکوں کو

وہ پہروں چاند کو تکنا

وہ جامد چپ سے دائروں میں

تمہارا ذکر رکھ لینا

تمہاری فکر رکھ لینا
تمہیں کیسے بتاؤں میں
تمہارا نام ہونٹوں پر
ہنسی بن کر مہکتا ہے
تمہارا ذکر راتوں میں
خوشی بن کر جھکتا ہے
دھڑکتے دل کی

ہر دھڑکن

تمہارا نام لیتی ہے

تمہارا اور دکر لیتی ہے

محبت روشنی بن کر

میری آنکھوں میں رہتی ہے

اس نے وہ صفحہ دوبارہ اسی ٹیبل پر رکھ دیا اور خود آکر بیڈ پر لیٹ گئی۔ اسے اپنے اعصاب کچھ کھلے کھلے سے لگے، آنکھیں موند کر اس نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی اور پھر کب اس کی آنکھ لگی اسے کچھ خبر نہ ہوئی۔ پھر تقریباً "نوبے کے قریب جا کر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اتنی بھر پور نیند نے اس کی طبیعت کو ایک دم ہشاش بشاش کر دیا۔ دوپٹا اوڑھتے وہ بیڈ سے نیچے اترنے لگی تھی جب اس کی نظر صوفے پر بیٹھے عرشان داؤد کے وجود سے ٹکرائی۔ اس کے ہاتھ میں وہی صفحہ تھا وہ گھبرا سی گئی۔ ان بدلتے موسموں سے وہ ابھی تک اچھی طرح آگاہ نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اس کے رد عمل کے حوالے سے کسی بھی قسم کا اندازہ ٹھیک سے نہیں لگا سکتی تھی۔

وہ اٹھا۔ عانیہ کا دل بے ساختہ دھڑکا۔ نہ جانے

اب کیا کہہ دے۔ وہ بیڈ پر اس کے قریب ہی آ بیٹھا۔

"تھینکس۔۔۔" عانیہ نے نظریں اٹھائیں۔ وہ

تھینکس کی وجہ نہ سمجھ پائی تھی۔ "میری فیلنگز کو

کمپلیٹ کرنے کے لیے" وہ مسکرایا، آج کتنے

عرصے کے بعد اس نے ان ہونٹوں کو مسکراتے ہوئے

دیکھا تھا، نظر جیسے نکھری گئی۔ "یہ نظم نہیں، یہ ہماری

فیلنگز ہیں۔ اس میں ہم دونوں کے احساسات و

جذبات چھپے ہیں۔ یہ میرے لیے بہت اہم ہے۔

ماہنامہ کرن 143 اکتوبر 2015

کسی قیمتی خزانے کی طرح سنبھال کر رکھوں گا میں اسے۔ نہیں، بلکہ ایسا کروں گا اس کا بہت خوب صورت فریم بنا کر اپنے بیڈ روم میں لگا دوں گا، تاکہ یہ ہر پل ہم دونوں کی نظروں کی گرفت کے سامنے رہے۔“ وہ دھیمی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے کہہ رہا تھا اور عانیہ کی سماعتوں پر حیرتوں کے پہاڑ توڑ رہا تھا۔ یہ انداز، یہ لب و لہجہ عرصہ گزرا جیسے اس کے لیے اجنبی ہو چکا تھا۔

”عانیہ۔۔۔“ اس نے دھیرے سے پکارا تھا۔

”مگر صبح کا بھولا لوٹ آئے تو۔۔۔ کیا تم اسے معاف کر دو گی۔“ اس نے عانیہ کا کپکپاتا ہاتھ تھاما جو ابھی تک بے یقین نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ”انسان تو خطا کا پتلا ہے نا، غلطیاں بھی ہوتی ہیں اور غلط فہمیاں بھی۔“ عانیہ کی آنکھیں بھینکنے لگیں۔ وہ چہرہ جھکا گئی۔

”آئی آم سوری عانیہ! رسلی ویری سوری۔ میں جانتا ہوں میں نے تمہارے ساتھ بہت غلط کیا ہے، مگر میرا یقین کرو ان دنوں میں ایسی کیفیت کے زیر اثر تھا کہ پوری دنیا کو آگ لگا دینا چاہتا تھا۔“

اس کی حالت دیکھتے عانیہ کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ آنکھوں کے آنسوؤں کے ساتھ ساتھ ہونٹوں سے ہلکا سا شکوہ بھی پھسل آیا۔ ”اتنی سنگ دلی عرشان“

”جانتا ہوں میں نے بہت ظلم کئے ہیں تم پر۔ میں معافی کے قابل تو نہیں ہوں، لیکن اگر تم معاف کر دو تو۔۔۔ میں دنیا بھر کی خوشیاں لا کر تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا، تمہیں اپنے پیار، اپنی محبت کی بارش میں اس طرح سے بھگو دوں گا کہ تمہارے تمام دکھوں کا مداوا ہو جائے۔ جانتی ہو اگر ابھی مجھے سچائی کا پتہ نہ چلتا تو یہ جنون، یہ وحشت مجھے نہ جانے اور کہاں تک لے جاتی۔“

”سچائی۔۔۔ کیسی سچائی۔۔۔“ عانیہ نے کم فہمی سے اس کی طرف دیکھا۔ جب وہ آشنا سے ملاقات کی ساری باتیں آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگا۔ عانیہ کے

چہرے نے ایک ایک پل میں کئی کئی رنگ بدلے تھے۔ اسے جیسے اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا۔ حیران پریشان چہرے اور بے یقینی کے احساس سے پھیلی آنکھوں سے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

آئی سائہ جسے اس نے اپنی ماں کا درجہ دیا تھا، ان کا اتنا بھیا تک روپ وہ کسی صورت برداشت نہ کر پائی تھی۔ عرشان داؤد نے اس کے ہچکولے کھاتے وجود کو بہت نرمی سے اپنے ساتھ لگا لیا۔ اس کی اندرونی کیفیت کو وہ بہت اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

”میں آشنا کی اس اتنی بڑی نیکی کی خاطر ہی اس کی ماں کو معاف کرتی ہوں، میرا اللہ بھی انہیں معاف کرے۔“ اور عرشان داؤد تو جیسے متحیر سا رہ گیا۔ آخر کیا تھی وہ جس کی وجہ سے اسے اتنی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا اسے اس نے پل میں معاف کر دیا تھا۔ اس کے دل میں اس کے لیے محبت کے ساتھ ساتھ قنفذ بھی بلند ہوا۔ ایک دم کچھ یاد آنے پر وہ بولی۔ ”آپ اتنی صبح صبح کہاں گئے تھے اور وہ بھی بارش میں؟“ وہ کچھ بھی کہے بغیر اٹھا اور پھر الماری کے نیچے جانے والے خانے سے بڑا سا پیکٹ نکالتے دوبارہ اس کے قریب چلا آیا۔ ”یہ لینے۔“

”یہ کیا ہے؟“ اتنے بڑے بوری نما پیکٹ کو دیکھتے وہ حیرانی سے بولی۔

”خود ہی دیکھ لو۔۔۔“ اس نے سارا پیکٹ بیڈ پر الٹ دیا۔ عانیہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ بہت خوب صورت ڈریس، جوٹا، جیولری، چوڑیاں، پرفیوم، میک اپ اور بھی نہ جانے کیا کچھ نکلا تھا اس پیکٹ سے۔

”یہ ساری شاپنگ میں نے کل کی تھی تمہارے لیے، یہ سب ادھر والے گھر میں تھا، آج صبح یہ ہی لینے گیا تھا۔“

”عرشان۔۔۔“ عانیہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ”جو ہو گیا اسے ایک بھیا تک خواب سمجھ کر بھول جاؤ عانیہ، آگے تمہاری راہوں میں پھول ہی پھول ہوں گے۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ کبھی بھول سے بھی

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیراٹل

SOHNI HAIR OIL

- ✿ کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- ✿ بے ہال آگاتا ہے۔
- ✿ بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- ✿ مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- ✿ یکساں مفید۔
- ✿ ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت - 120/- روپے

سوہنی ہیراٹل 12 جلی بوتلوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دتی خرید جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف - 120/- روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے منی آڈر بھیج کر رجسٹرڈ پارسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے ----- 300/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے ----- 400/- روپے
- 6 بوتلوں کے لئے ----- 800/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھجئے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیراٹل ان جگہوں سے حاصل کریں
بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

کسی دکھ کو تمہارے قریب نہیں آنے دوں گا اور اب پلیز جلدی سے تیار ہو جاؤ، کیونکہ تمہارے اصل گھر میں تمہارے اپنے تمہارا شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔“

”بی جی اور انکل کیا وہ سب جانتے ہیں، کیا وہ مجھے ایکسیپٹ کر لیں گے؟“ اس نے نامعلوم سے کسی ڈر کے زیر اثر پوچھا۔

”بی جی سے تو آج صبح ہی خاصی ڈانٹ کھا کر آیا ہوں، بہت مشکلوں سے منایا ہے، انہیں اس وعدے کے ساتھ کہ آج تم ان کے روبرو ہوگی۔ خاصی بے چینی سے ویٹ کر رہی ہوں گی تمہارا اور پیپا کے ساتھ تو نکاح سے اگلی صبح ہی کافی جھڑپ ہوئی تھی میری۔ آئی نے کافی نمک مرچ لگا کر پیپا کے میرے خلاف کلن بھرے تھے۔“

”اور اب کیا وہ مجھے قبول کر لیں گے؟“ وہی

خدا شہ۔

”پانگل۔ ایک ہفتے بعد ہی انہوں نے مجھے کہہ دیا تھا کہ میں تمہیں گھر لے آؤں، کیونکہ وہ ولیمہ کی دعوت کرنا چاہتے تھے، مگر پھر میری خود سری اور ضد کے آگے وہ کافی مایوس اور ناراض ہوئے تھے۔ میں تو انتقام کی آگ میں ایسا اندھا ہو چکا تھا کہ کچھ بھی سمجھنے کو تیار نہ تھا۔ پیپا نے مجھے کافی سمجھایا تھا، مگر پھر مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا اور اس وقت بی جی اور پیپا دونوں ہی بڑے بے چینی سے تمہارا ویٹ کر رہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ تم انہیں ان کا ولی عہد دینے والی ہو۔“

”کیا۔ آپ نے انہیں یہ بھی بتا دیا۔“ اس کا چہرہ شرم سے ایک دم سرخ پڑ گیا۔

”اور اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ وہ اس کی منہ سی ناک دباتے مسکراتے ہوئے بولا۔ جھینپتے ہوئے سرخ چہرے کے ساتھ وہ آہستہ سے سر اثبات میں ہلا گئی۔

ریڈ کلر کی میٹ کی فرائک اپنے ساتھ میچنگ جیولری جوڑتی اپنے اور ہلکا ہلکا میک اپ کیسہ اس وقت

انتہا کی خوب صورت لگ رہی تھی۔ ڈورینگ روم سے وہ جیسے ہی باہر آئی عرشمان داؤد کی نظر واپس پلٹتا بھول گئی۔

”ایسے لگتا ہے جیسے آج چاند زمین پر اتر آیا ہو۔“ اس کی طرف بڑھتے وہ بے خود سا بڑبڑایا تھا۔ عانیہ سعید کی دھڑکنیں اٹھل پٹھل ہونے لگیں۔ رخساروں پر لالی چھانے لگی۔ عرشمان داؤد کے دیکھنے کا انداز آنکھوں سے پھوٹی روئیاں ہاتھوں سے لپکتے استحقاق کے جگنو ہونٹوں پر مچلتی بے تاب حسرتیں عانیہ سعید کو سر سے لے کر پاؤں تک محبت کی بارش میں بھگوتی چلی گئیں۔ لالچ کے مارے اس کی آنکھیں بند ہونے کے قریب تر ہو گئیں۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ عرشمان داؤد زندگی کے کسی موڑ پر اس پر اس طرح بن بادل برسات کی طرح برس کر اسے اندر تک معتبر کر دے گا۔ وہ معصوم سی لڑکی اپنی بے ربط دھڑکنوں کو سنبھالتے خود پر جھکے اپنے سامنے تلے جیسے کھل طور پر چھتی جا رہی تھی۔ فقط کچھ ہی لمحے سر کے تھے مگر ان لمحوں نے عانیہ سعید کو انمول کر دیا تھا۔

”چلیں۔ اس حسن و رعنائی کے پیکر کو دیکھتے عرشمان داؤد نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ آنکھیں تھیں کہ سیر ہی نہ ہو رہی تھیں۔ عانیہ سعید نے جھکی جھکی پلکوں سے اپنا ٹھنڈا کپکپاتا ہاتھ اس کی مضبوط مردانہ ہتھیلی پر رکھ دیا۔ وہ دونوں ایک ساتھ ہی کمرے سے نکلے تھے سامنے ہی زینی ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے کھڑی تھی۔ عرشمان داؤد کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکالتے وہ تقریباً دوڑتے ہوئے اس کے قریب گئی اور پھر بڑی شدت سے اس کے گلے لگی تھی۔

”تم مجھے بہت عزیز ہو زینی، کیونکہ تم میرے دکھ سکھ کی ساتھی ہو، میری سکھی ہو۔“

”میں جانتی ہوں، مگر کیا آپ یہ جانتی ہیں کہ یہ عرشمان صاحب بھی جانتے ہیں، اسی لیے تو وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر جا رہے ہیں، صرف اور صرف آپ کے لیے، آپ کی خوشی کی خاطر۔“

”کیا۔ واقعی۔“ عانیہ کو خوش گوار حیرت ہوئی تھی، اسی لیے تیزی سے پلٹ کر اس نے عرشمان داؤد سے پوچھا جس نے مسکراتے ہوئے تائیدی انداز میں سر اثبات میں ہلا دیا اور عانیہ سعید کے اندر تک اطمینان پھیلتا چلا گیا۔

”تھینک یو عرشمان! تھینک یو سو مچ۔ یہ بہت اچھا تحفہ ہے میرے لیے۔“ اس کے قریب آتے عانیہ نے سرشاری سے مسکراتے ہوئے کہا، عرشمان داؤد کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

عانیہ سعید کا استقبال اس انداز میں ہوا کہ کیا ہی کبھی کسی نے کسی کا کیا ہو۔ ان کی گاڑی کو گیٹ سے باہر ہی روک دیا گیا تھا۔ پورا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ اندر کا سارا منظر واضح نظر آ رہا تھا۔ عانیہ تو گاڑی سے نکلتے جیسے دم بخود سی رہ گئی۔ گھر تو بہت خوب صورت طریقے سے سجایا گیا تھا۔ پوری روش سرخ کلابوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ دائیں طرف بہت سے لوگ ہاتھوں میں مختلف قسم کے قیمتی کے تھامے اس کے استقبال کے لیے کھڑے تھے، جبکہ بائیں جانب ایک میوزیکل گروپ اپنی دلکش آواز کے جاؤ جگاتا، اسے دل کم کہہ رہا تھا۔ گھیر دار سرخ نیٹ کی بے تحاشا قیمتی فراک دونوں ہاتھوں سے تھامے عرشمان داؤد کے قدموں سے قدیم ملا کر چلتی وہ کسی ریاست کی شہزادی ہی لگ رہی تھی۔ اس کے ایک قدم پیچھے چلتی زینی تمام بکے تھام کر ساتھ چلتے ملازموں کو پکڑاتے جا رہی تھی۔ روش کے سرے پر ہی بی بی جی اپنی یا نہیں کھولے بھکی پلکوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ بھاگی اور پھر ان کی کھلی بانہوں میں آسپائی۔ وہ جیسے ہی بی بی جی کے گلے لگی بہت تالیوں کی گونج میں بہت سے پھولوں کی برسات ان پر ہوئی تھی۔

”میری دھی۔“ انہوں نے فرط مسرت سے اس کی مسکتی پیشانی چوم لی۔ عانیہ سعید کے اندر تک ٹھنڈک اترنے لگی۔ آنکھوں کے گوشے بھگنے لگے ان سے مل کر وہ آہستہ سے چلتے داؤد انکل کی طرف بڑھی۔ جنہوں نے اک خوب صورت سی مسکراہٹ

میری محبت

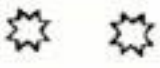
میری وفا

میرا یقین

میرا جنون

میری دیوانگی ہو

تمہارے لیے تو میں جتنا بھی کروں کم ہے۔ میں
تمہارا اسیر ہوں اور اس اسیری میں تمام عمر قید رہنا
چاہوں۔ اسی میں میری اور میرے دل کی خوشی ہے۔
دونوں کی آنکھیں محبت کے معتبر احساس سے
چمک رہی تھیں اور محبت بہت شاداں و فرحاں ان کے
درمیان موجود دھیمے دھیمے مسکرا رہی تھی، محبت نے
ہارنا کب سیکھا ہے اور یہاں بھی جیت آخر محبت کی ہی
ہوئی تھی۔



خواتین ڈائجسٹ

نہ صرف خواتین کے لیے آپنا اور ہوس

دست کو ذکر

نوزیرہ یاسمین



قیمت - 750 روپے

کتبہ عثمان ڈائجسٹ 37 - اردو بازار، لاہور۔ فون نمبر 32735021

کے ساتھ دست شفقت اس کے سر پر رکھا۔
”ویل کم ٹومائے پیلس مائے سویٹ ڈائٹ۔ آپ ہم
سب کے لیے بہت اہم ہو عانیہ، جو ہو گیا اسے بھول کر
اب اس حقیقت کو اہک سپیٹ کر لیں کہ آپ اسی گھر کا
ایک حصہ ہیں۔ میں اکثر بی بی کی بہت کمی محسوس کرتا
تھا، مگر اب آپ کے آنے سے وہ کمی دور ہو گئی ہے۔“
داؤد صاحب کے کہنے پر بڑی تیزی سے اس کے آنسو
چمکے تھے۔

”نسب۔ نسب۔ رونا نہیں بچے۔ اب آپ کے خوشی
کے دن شروع ہو چکے ہیں اور زندگی کی آخری سانس
تک ہم سب آپ کو خوش ہی دیکھنا چاہیں گے۔“ داؤد
صاحب نے اس کے سر کو سہلایا۔

اتنی محبت، اتنی چاہت۔ اس کی نظر بے اختیار
دائیں طرف کھڑے عرشان داؤد کے چمکتے چہرے پر ٹھہر
سی گئیں۔ ”تمہارا بہت بہت شکریہ اے میرے دل
کے میچا۔ واقعی تم نے اپنا کما حقہ ثابت کر دیا ہے۔
میرے تمام دکھوں کا دوا ہو گیا ہے۔ میرا دل اندر تک
پر سکون ہو گیا ہے۔ ان خوب صورت لمحوں کے عوض
تو میں اپنے تمام دکھ بھول چکی ہوں۔ تم نے میری
زندگی کو مسرتوں سے بھر دیا ہے۔“ دھیمی مسکراہٹ
سجائے ہونٹوں اور نمکین بھیگی پلکوں سے اس کی طرف
دیکھتے عانیہ سعید نے آنکھوں کے رستے اسے پیغام
پہنچایا تھا۔ اس خاموش پیغام کو عرشان داؤد نے بڑی
تفصیل سے بڑھتے اسی تفصیل سے جواب دیا۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں ہے اے میری زندگی میں جب
تک جیوں گا میری سوچوں کے دائرے میں تمہاری فکر،
تمہارا ذکر اور تم سے وابستہ ہر خوشی کا خیال ہو گا۔ تم
نے مجھے معاف کر کے میری زندگی میں لوٹ کر جو مجھ پر
احسان کیا ہے میں زندگی کی آخری سانس تک اس کا
قرض ہی اتارنا رہوں گا۔ تمہارے دامن میں اتنی
خوشیاں ڈالوں گا کہ وہ کم پڑ جائیں گی، مگر خوشیاں کم نہ
ہوں گی۔ تم میری زندگی ہو، میرا دل ہو، میرے سب
سے خوب صورت اور قیمتی خواب کی تعبیر ہو۔“

میری چاہت

پندرہ کون 147 اکتوبر 2015

نظیر قافلہ



”لے لیا تو ہی دس بھلا ملک ہو راں کے جانور ہوئے تے سمجھو ہمارے ہی ہوئے نا۔ ان کا چار اپانی اور نمل سیوہ تے سب میں نے ہی کرنی ہے نا۔“

طیفی نے ابا کو مخاطب کر کے گویا اماں کی شکایت لگائی۔

”ہاں مفت کانو کر جو ہتھ آجاتا ہے اونہاں دے۔“

اماں نے سر جھٹکا۔

”اماں! ایسی باتیں نہ کریا کر۔ کیا ہوا جو اللہ نے ہمیں قربانی کی توفیق نہیں دی تو وہ ہر سال ہمیں قربانی کے جانوروں کی خدمت کرن کا موقع تو دیتا ہے نا اور تجھے پتا ہے جو قربانی کے جانوروں کی خدمت کرتا ہے نا اللہ اوس سے بھی خوش ہوتا ہے۔ چلو اتنا خوش نہیں ہوتا ہو گا جنہاں قربانی کرنے والوں سے ہوتا ہے پر خوش ہوتا ضرور ہے۔“

طیفی نے اماں کا گھٹنا دیا۔

”چل ہٹ دے پاگلاں تیریاں گلاں وی دکھریاں ای ہوندیاں نے۔ نا مجھے بتا تجھے ملک صاحب ہو راں کے جانوروں کے پیچھے اپنی جان مارنے کا کیا فیدہ ہوتا ہے۔ ڈھنگ کی دو بوٹیاں تک تو تجھے دیتے نہیں وہ لوگ۔“

اماں نے اس کا ہاتھ اپنے گھٹنے سے ہٹایا۔

”ابا دیکھ یہ اماں وی نہ ایویں بولتی رہتی ہے۔ ہر سال دو بکروں کے کھڑوڑے اور سریاں ملک ہو راں مینوں ہی دپتے ہیں۔ ساتھ میں گوشت الگ اور پنچ سو روپے وی۔ فیروی اماں کہہ رہی ہے کہ مجھے دیتے ہی کیا ہیں؟“

طیفی برا مان گیا۔

”ہاں یہ دونوں چیزیں ان کے گھروچ کوئی کھاتا

”اماں! اماں! وڈے ملک صاحب قربانی لئی دو گاواں تے پنچ تین بکرے لے آئے ہیں۔“

طیفی نے سائیکل چھوئے سے صحن کی مغربی دیوار کے ساتھ کھڑی کی اور سبزی بناتی اماں کے پاس بیٹھ گیا۔

طیفی کا ابا بھی آکر چار پانی پر بیٹھ گیا۔ دونوں باپ بیٹا قصبے کے قریب نیلسٹائل مل میں دھاڑی دار ملازم تھے۔ دونوں صبح اکٹھے جاتے اور شام کو اکٹھے واپس آجاتے۔

طیفی کے فیکٹری جانے سے ابا کو ایک فائدہ ہو گیا تھا کہ صبح شام سائیکل چلانے کی مشقت سے جان چھوٹ گئی تھی۔ طیفی انہیں پیچھے بٹھا کر لاتا لے جاتا تھا۔

دونوں باپ بیٹا ابھی ابھی فیکٹری سے واپس آئے تھے اور آتے ہوئے گلی میں ملک صاحب کے گھر کے سامنے لگے شامیانے میں بندھے جانور دیکھ آئے تھے۔ ہر سال قصبے میں سب سے پہلے قربانی کے جانور ملک صاحب کے ہاں ہی آتے تھے اور بقول طیفی کے ”رج کے سوہنے اور ستھرے جانور“ تو ملک صاحب ہی خریدتے تھے۔

”اماں تجھے بتا رہا ہوں۔ پر تو میری بات کا کوئی نوٹس ہی نہیں لے رہی۔“

طیفی کی بات سن کر اماں بغیر کوئی جواب دیے سبزی بنانے میں مصروف رہی تو طیفی برا مان گیا۔

”ہاں تو تو کیوں باولا ہو رہا ہے۔ قربانی کے جانور ملک ہو راں نے خریدے ہیں تیرے ابا نے نہیں۔“

اماں نے جل کر جواب دیا۔

”چل پتر! جا کے ٹھنڈا پانی لے آگیاں فیر کر لیتا۔“
 ایسے نے دونوں کی بحث ختم کی۔
 ”اچھا ابا“ طیفہ ٹھنڈے پانی کے کولر کی طرف گیا،
 جس میں محلے کے فریج والے گھروں سے برف مانگ
 کر ڈالی جاتی تھی۔ ابھی یہ بھی شکر تھا کہ اس محلے کے

جو نہیں، تو وہ تمہیں چکا دیتے ہیں اور وہ آدھا کلو
 گوشت جس میں ڈیڑھ پاؤ تو چربی ہی ہوتی ہے۔ اور بیچ
 سو روپے دس دنوں کی محنت کے حساب سے کچھ وی
 نہیں۔“ اماں نے منٹوں میں حساب کر دیا۔ ابا دونوں
 ماں بیٹی کی باتیں خاموشی سے سن رہا تھا۔



”ہاں شاواں بھی شاواں۔“ ملک صاحب نے اس کو شاباش دی۔

طیفا صبح فجر کی اذان کے بعد سے فیکٹری جانے تک اور فیکٹری سے آنے کے بعد رات گئے تک کا سارا وقت ملک صاحب کے گزار رہا تھا۔ وہ جانوروں کی حفاظت اس کے مالکوں سے بھی برہ کر کرتا۔ محلے کے لوگ اکثر اس کا مذاق اڑاتے۔

”اوطیفے صاحب کے جانور دیکھو، کتنے نگرے ہیں۔“ طیفا مسکرا کر یوں جانوروں کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا جیسے واقعی ان کا مالک ہو۔



عید کے روز نماز کے بعد طیفا کپڑے بدل کر ملک صاحب کے گھر چلا گیا۔ اب اسے قربانی کی تیاری سے لے کر آخر میں ساری صاف صفائی کرنے تک وہیں رہنا تھا۔

ملک صاحب کی قربانی بھی زیادہ تر لوگوں کی طرح معاشرتی تعلقات بنانے کا ذریعہ تھی۔ ان کے قربانی کے جانوروں کا اچھا اچھا گوشت یا تو ان کے ہم پلہ دوستوں اور رشتہ داروں کو جاتا تھا یا ان کے گھر کے دو ڈیپ فریزرز میں۔ غریبوں کے حصے میں تین حصے چربی اور ایک حصہ گوشت ملا جلا کر، محلے کے چند غریب گھروں کو دے کر ہاتھ جھاڑ لیے جاتے۔ باقی شام تک آنے والے فقیروں کو جھاڑ پلا کر رخصت کر دیا جاتا۔ جس سے اصل ضرورت مند محروم رہ جاتے اور سارا سال پیٹ بھر کر گوشت کھانے والوں کے ہاں ڈھیر لگ جاتے۔

آج بھی اس ساری کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد طیفے کی محنت کے صلے میں اس کو دو بکروں کے پائے، سریاں اور ایک کلو کے قریب چربی ملا گوشت دیا گیا۔ ساتھ میں پانچ سو روپے الگ کہ جتنا کام طیفے اکیلا کرتا تھا اس کے لیے دو مزدور بھی کم ہی تھے۔

طیفا اپنی محنت کا صلہ لے کر خوشی خوشی گھر جا رہا تھا۔ جیسے ہی وہ اپنی گلی کی نگر مڑا۔ وہاں پر ایک ہتیسہ

لوگ اس حوالے سے ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے، ورنہ اس منگائی کے دور میں جو برف خرید کر پانی ٹھنڈا کرنا پڑتا تو طیفے کے خانہ ان جیسے لوگ اس سے بھی محروم ہوتے۔

طیفے اور اس کے اے کی کوڈ شیڈنگ کی وجہ سے کبھی دباڑی لگ جاتی اور کبھی نہیں۔ گھر کا وال دلیا مشکل سے ہی سہی پر چل رہا تھا۔ اس کی وجہ طیفے کی محنتی فطرت تھی۔ جن دنوں فیکٹری میں دباڑی نہ لگتی، طیفے کو جو کام مل جاتا کر لیتا۔ کبھی ٹھیکیدار کے ساتھ مزدور کی حیثیت سے کام کر لیتا، کبھی فرنیچر بنانے والوں کے ساتھ فرنیچر کی پالش وغیرہ کروا دیتا اس طرح اسے اتنے پیسے مل جاتے تھے کہ دو وقت کی روٹی پوری ہو جاتی تھی۔ طیفے کی ایک ہی بہن تھی جو کسی گاؤں میں بیاہی ہوئی تھی۔ اس دو کمروں کے کچے گھر میں تینوں بیاں بیٹا رہتے تھے۔ اماں نے دو تین بکریاں پال رکھی تھیں جن کے دودھ سے چائے وغیرہ بن جاتی تھی۔ طیفا اور اس کا باپ درویش منش لوگ تھے جو ہر حال میں خوش رہتے تھے۔ اماں بھی کوئی لالچی عورت نہیں تھی، پر جب کئی کئی روز مل میں دباڑی نہ لگتی اور خرچے منہ کھولے کھڑے ہوتے تو وہ جز جزئی ہو جاتی تھی۔



ملک صاحب کے گھر جانور آتے تو سمجھو طیفے کی عید ہو جاتی۔ وہ دن رات کی تمیز بھلائے ان کی دیکھ رکھ میں مصروف رہتا۔ ملک صاحب بھی طیفے کی وجہ سے جانوروں کی طرف سے بے فکر رہتے تھے۔

”اوطیفے پتر! جانوروں کی دیکھ بھال وچ کوئی کمی نہیں رہنی چاہی دی۔“ شام کو ملک صاحب شامیانی میں کرسی ڈالے بیٹھے تھے اور طیفا جانوروں کو چارا ڈال رہا تھا۔

”اور ملک صاحب تسی بے فکر رہو۔ میں سب کچھ صحیح سے کر لوں گا۔“ طیفے نے اپنا پنکا جھاڑ کر ملک صاحب کی تسلی کروائی۔

بیچنے والا کمزور سا بوڑھا شخص کھڑا تھا۔ وہ آواز لگاتے لگانے طیفی کے ہاتھ میں پکڑے شاپروں کو دیکھنے لگا۔ طیفی اپنی دھن میں آگے بڑھ گیا۔ پھر کچھ قدم چل کر رکا اور واپس مڑا۔ وہ آدی اپنے میلے سے پٹکے سے اپنی آنکھیں صاف کر رہا تھا۔

”چاچا! کیا بات ہے آج عید کا روزا ہے اور تو رو رہا ہے۔“ طیفی نے سارے تھیلے نیچے زمین پر رکھ دیے۔

”پتر! عید بھی پیسے والوں کی ہوتی ہے۔ ہم غریبوں کی بھلا کیا عید ہونی ہے۔“ بوڑھے کے لہجے میں اداسی تھی۔

”نا چاچا! ایسے نہیں کہی دا۔“ طیفی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”فیر کی کراں پتر۔ آج کا دن جب اللہ سوہنے کی راہ میں لکھاں جانور قربان ہوتے ہیں ہم غریبوں کے لیے دو بوٹیاں وی نہیں ہوتیں۔ صبح سے ہر اس گلی میں ہتھسا بیچنے کے لیے آواز لگا رہا ہوں جہاں قربانی ہونی ہے مگر کسی نے ایک بوٹی وی مجھے دینا گوارا نہیں کیا۔ پتر کیا میری شکل سے پتا نہیں چل رہا کہ میں وی ضرورت مند ہوں۔ قربانی کے گوشت وچ ضرورت مندوں کا حصہ وی ہوتا ہے پر مجھے ابھی تک یہ حصہ نہیں ملیا پتر۔ ہتھ میں پھیلا نہیں سکدا۔ اے سوچ کے رونا آگیا سی کہ شام کو خالی ہاتھ گھر جاواں گاتے میرے تیم پوتے پوتیاں جو آج بوٹی کھانے کی آس لگا کر بیٹھے ہیں ان کی آس ٹٹ جائے گی۔“ بوڑھے کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے۔

”او چاچا! لے پھر یار اے چار کھڑوڑے تے اے گوشت تولے جا۔ چاڑ کھڑوڑے تے اے سریاں میں لے جاتا ہوں۔ چل لے یہ سب اور گھر جا کے پکا کر سب مل کر کھاؤ۔“ طیفی نے دو شاپر اس کی طرف بڑھا دیے۔ بوڑھا دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔



”لے اماں! پکڑ سب کچھ۔“ اماں خوشی خوشی آگے

بڑھی مگر شاپر کھولتے ہی طیفی کے پاس واپس آئی جو اپنے باپ کے پاس بیٹھ کر پانی پی رہا تھا۔

”وے طیفی! یہ کیا صرف چار کھڑوڑے تے دو سریاں“ اماں نے عصبے سے پوچھا۔ وہ تو گوشت کے لیے مسالا بھی چڑھا چکی تھی اور یہاں گوشت سرے سے تھا ہی نہیں سو اس کا غصہ بجاتا تھا۔

”اماں! وہ نہ راستے میں ایک غریب آدی ملا تو چار کھڑوڑے اور گوشت اس کو دے دیا۔“ اس نے مسکرا کر اماں کو جواب دیا۔

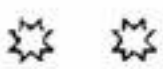
”ہاں وہ غریب تھا اور تو کسے نواب دی اولاد ہے جو سخاوت کر دی۔“ اماں کو پٹنگے لگ گئے۔

”اماں! کوئی گل نہیں ہم تو ہر سال ہی بڑی عید پر گوشت کھاتے ہیں اس دفعہ نہیں کھا میں گے تو کیا ہوا۔ کسی اور کا بھلا ہو جائے گا۔“ طیفی نے ابا کی طرف مدد کے لیے دیکھا۔

”چل بھلیے لو کے جا جو کچھ ہے وہی پکا لے۔ اللہ مالک ہے۔“ ابا کی بات سن کر اماں بڑبڑاتے ہوئے چلی گئی۔

”ابا! میں ٹھیک کیتا ہے نا۔“ طیفی نے ابا کو دیکھا۔

”بالکل پتر آج اللہ نے تجھے وی قربانی کرنے کی توفیق دی ہے۔ بس فرق صرف ایٹا ہے کہ لوگ آج اللہ کی راہ میں جانوروں کی قربانی کر رہے ہیں اور تو نے آج اپنی ضرورت کی قربانی کر کے اللہ کو خوش کر دیتا ہے۔ تجھے پتا ہے اپنی ضرورت چھڑ کے کسی دوسرے کی ضرورت پوری کرنا وڈی قربانی ہوندی ہے اور آج تو نے وہ وڈی قربانی دی ہے۔ شہاباش میرا پتر جا جا کے نہادھو کے کپڑے بدل فیروٹی کھانے آں۔“ ابا نے اس کے کندھے پر کھسکی دی تو طیفی مطمئن دل سے اٹھ کھڑا ہوا۔





”وہ۔۔ میری بیسٹ فرینڈ ہے، مگر آپ۔۔ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ شہوار نے الجھی نگاہوں سے بڑے بھائی کی جانب دیکھا۔

”واقف۔۔ شی۔۔ ان۔۔ امیزنگ۔۔“ عکرمہ نے مسکرا کر تعریف کی، وہ ابھی تک سحرزہ ساتھ اس کا حسن اتنا مکمل اور معصوم تھا کہ ڈھونڈنے سے بھی کوئی نقص نہیں مل پایا۔

”اے بھائی۔۔ پلیز۔۔ اس معاملے میں کوئی مذاق نہیں۔۔ چلے گا۔۔ ویسے بھی ہشتمہ آپ کے مزاج کی لڑکی نہیں۔۔ بہت معصوم ہے۔۔ لڑکوں سے سو فٹ دور بھاگتی ہے۔“ شہوار نے زور زور سے انکار میں سر ہلاتے ہوئے اس پر بڑی صفائی سے چوٹ کی۔

”مذاق۔۔ کیا مطلب ہے؟ میں۔۔ مذاق۔۔ نہیں اس کے ساتھ شادی کرنے والا ہوں۔“ وہ چکا۔۔ تو شہوار بے ہوش ہوتے ہوتے پچی۔

”اور۔۔ سنو۔۔ یہ۔۔ میرے مزاج کو کیا ہوا؟“ عکرمہ نے مصنوعی غصے سے کہا اور بہن کا حیرت سے کھلا ہوا منہ بند کر دیا۔

”بھائی۔۔ پلیز۔۔“ شہوار اس کی ضد سے واقف تھی، دو سرے لمحے ہی سر تھام کر بیٹھ گئی۔

”پہاری بہنا پریشان نہ ہو۔۔ میں اس معاملے میں واقعی سنجیدہ ہوں۔۔ تم یقین کرو، مجھے ہشتمہ کی شکل میں۔۔ آج وہ گوبرنایاب مل گیا جس کی مجھے کب سے تلاش تھی۔۔ اب تو بس وادی جان کو جا کر خوش خبری سنانی ہے۔“ عکرمہ کی تیز رفتاری سے چلتی زبان پر شہوار ہول اٹھی۔

”بھائی۔۔ پہلے مہاسے تو بات کر لیں۔۔ ایسی جلدی

آسمان پر چھائے بادلوں کی اوٹ سے سورج سرخی مائل گولے کی مانند دھک رہا تھا۔ اس نے ٹھوس ماتھے پر آنے والا پسینہ پونچھا۔ گاڑی ذرا آہستہ ہوئی، وہ کلج گئی بڑی سی عمارت کے سامنے پہنچ کر رک گیا، بے چینی سے کئی بار بڑے سے سیاہ گیٹ کی جانب دیکھا، دوسری لڑکیاں ہنستی مسکراتی باتیں کرتی ٹولیوں کی شکل میں باہر آرہی تھیں، مگر شہوار کا کوئی اتاپتا نہیں تھا۔ گاڑی کا اے سی کل ہی خراب ہوا تھا، آج ٹھیک کروانے کا ارادہ تھا، جس اور گرمی سے اس کا برا حال ہونے لگا۔

”اب تو بس گھر جا کر لمبی تن کر سونتا ہے۔۔ آفس سے چھٹی کا کچھ تو فائدہ ہونا چاہیے۔“ عکرمہ منظور نے سوچا اور طویل انگڑائی لیتا چاہی، مگر ہاتھ چھت سے جا ٹکرائے وہ ہنس دیا۔ ادھر ادھر کا جائزہ لینے کے بعد ایک بار پھر نگاہ اٹھا کر کلج کے گیٹ کی طرف دیکھا تو ایسا لگا جیسے زمین و آسمان کی گردش ٹھم سی گئی ہو، سہل بدل گیا۔ وہ سحرزہ سا ہونے لگا، شہوار کے ساتھ باہر آنے والی وہ لڑکی تھی یا حسن و نزاکت کا مجسمہ۔ نکھری نکھری مومی رنگت، چہرے سے چھلکتی شادابی، بڑی بڑی بھوری آنکھیں، جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی ہوں، وہ ایک ٹکڑے بھٹا رہ گیا۔

”بھائی۔۔ کیا ہوا چلیں۔۔؟“ شہوار نے کب گاڑی کا دروازہ کھولا اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ کر زور سے چٹکی بجائی، اسے پتا ہی نہیں چلا۔

”وہ۔۔ لڑکی۔۔ جو ابھی تم سے باتیں کر رہی تھی۔۔ کون ہے؟“ عکرمہ نے کھوئے کھوئے انداز میں سوال کیا اور گلاسز آنکھوں پر چڑھائے۔

جاسکیں۔ محبت کی گاڑی کو بعد میں دھکا لکوا بیجے گا۔“
شہوار نے جل کر دانت پیسے اور اسٹیمرنگ پر ہاتھ رکھا۔
”ہونہ۔۔۔“ مگر وہ نے گاڑی اشارت کرنے کی
کوشش کی، مگر وہ گھر۔ گھر کی آواز نکل کر بند
ہو گئی۔

”کیا ہوا۔۔۔؟“ شہوار نے گرمی سے پریشان ہو کر
ہاتھ سے خود کو پکھا جھلتے ہوئے پوچھا۔

نہ چائیں۔ پتا ہے نہ دادی نے گھر میں آپ کی شادی
کے لیے بقرعید تک کا الٹی میٹم دیا ہوا ہے۔ وہ توڑ
جائیں گی۔“ شہوار نے رسائیت سے سمجھایا۔
”میری محبت کی گاڑی کو تمہیں ہی دھکا لگا کر
اشارت کروانا ہے۔“ وہ سن کہاں رہا تھا بس اپنی ہی
کے جا رہا تھا۔ جان جان کر اسے چھیڑ رہا تھا۔
”نی الحال۔۔۔ یہ والی گاڑی کو اشارت کریں تاکہ گھر



”یہ تو جھلی ہے“ سمعیہ نے اپنی پیاری سی کزن کو چھیڑا، مگر ادھر سے کوئی جوانی کارروائی نہ ہوئی جس کا صاف مطلب تھا کہ ہشمتہ کا موڈ واقعی بہت خراب ہے۔

”اوہو۔ ابھی تو۔ بقرعید میں دیر ہے پھر یہ بلا وجہ کی بحث و تکرار کیوں ہو رہی ہے؟“ حمیرا کی برداشت ختم ہونے لگی تو چڑ کر پوچھا، مگر سب نے انہیں انکوری کیا۔ ”میری جان۔ ایک نظر دیکھو تو صحیح۔“ تاب دار نے محبت سے بیٹی کو پکارا اور بڑی احتیاط سے عتلیٰ سبز رنگ کے بنارسی اور شہفون کے امتزاج سے بنائے گئے انار کلی سوٹ کو ہنجر میں لٹکایا۔

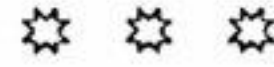
”ہائے ہشمتہ تم واقعی ناشکری ہو۔ سچ میں نے مال میں بالکل اسی اسٹائل اور کامبینیشن کا سوٹ دیکھا تھا، مئی سے لینے کی نمد بھی کی، مگر پراس ٹیک دیکھتے ہی جان نکل گئی مجبوراً دو سراسوٹ خریدے۔“ سمعیہ نے ایک بار پھر لپٹائی ہوئی زبہوں سے فراک کی طرف دیکھتے ہوئے سمجھایا۔

”ہاں۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو، یہ ڈریس بھی مشہور ڈیزائنر کی کاپی ہے، میں ان لوگوں کے کپڑے سننے سے پہلے کسی بھی مشہور بوتھک میں جا کر ڈیزائن دیکھ کر فماغ میں بٹھاتی ہوں اگر موقع مل جائے تو سیل فون سے اس کی تصویر بھی لے لیتی ہوں، پھر ویسا ہی کپڑا اور لیس وغیرہ بازار سے خرید کر سلائی شروع کرتی ہوں۔ اسی وجہ سے وہ سو ڈیزائن بنانے میں آسانی رہتی ہے۔“ تاب دار نے نزدیکی بیٹی کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے سادہ سے انداز میں تفصیل بتائی۔

”امی۔ پلیز۔ میں بقرعید پر کوئی اچھا سا ڈیزائنر سوٹ پہنوں گی، میری فرینڈز کا بارلی کیو پارٹی کرنے کا ارادہ ہے، میں وہاں پر یہ سوٹ پہن کر ہرگز نہیں جاؤں گی۔“ ہشمتہ ماں سے کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ تاب دار کو بیٹی پر حیرت ہوئی وہ ایسی ضدی تو نہیں تھی انہیں اس کا انداز برا بھی لگا مگر سب کی موجودگی میں کچھ کہنے سے گریز کیا۔ حمیرا کے ہونٹوں پر طنز مسکراہٹ چھا گئی جبکہ سمعیہ نے حیرت سے

”یہ گاڑی بھی لگتا ہے تم سے دھکا لگوا کر اشارت ہوگی۔“ عکرمہ نے برابر میں بیٹھی بہن کو دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے پریشانی سے کہا۔ ”کیا۔ نہیں۔“ وہ بھائی کے مضبوط شانوں پر مکا مارتے ہوئے چیخی۔

”ہا۔ ہا۔ ہا۔“ عکرمہ نے گاڑی اشارت کی اور ہنس پڑا۔ شہوار بھائی کی شرارت برجل بھن گئی، مگر سفر شروع ہونے پر شکر ادا کیا۔ عکرمہ بہن کو نئی فکر میں مبتلا کر کے بے فکری سے سیٹی پر ایک پیاری سی دھن بجاتے ہوئے ہشمتہ کے خیالوں میں گم ہو گیا۔ شہوار اس وقت کو کوٹنے لگی جب اس نے عکرمہ کو کل کر کے کلج سے پک کرنے کے لیے کہا، اصل میں آج ڈرائیور نے طبیعت خرابی کی وجہ سے اچانک چھٹی کر لی اور عکرمہ بہن کو مستعدی سے لینے پہنچ گیا۔ شہوار بھی خوش اور اسی بہانے پیاری پیاری لڑکیوں کا دیدار بھی ہو جاتا، اپنے طور پر ایک تیر سے دو شکار کرنے نکلا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود کیو پڈ کے تیر کا ہدف بن گیا۔



”بیس عید پر یہ سوٹ نہیں پہنوں گی۔ بس۔ آپ کسی کو بھی گفٹ کر دیں۔“ ہشمتہ نے بے رخی سے کہا تاب دار ابھی بیٹی کو کوئی کرارا سا جواب دینے والی تھیں کہ چھوٹی نندا اور اس کی بیٹی کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر چپ رہ گئیں۔

”ہائے کتنا زبردست لگ رہا ہے۔ مملانی۔ آپ واقعی میں بہت آرٹسٹک مائنڈ ہیں۔“ سمعیہ نے کھلے دل سے تاب دار کے ہاتھوں میں تھامی ہوئی انار کلی فراک کی تعریف کی تو حمیرا نے برا سامنے بنا کر بیٹی کو گھورا۔

”شکر ہے۔ تمہیں تو پسند آیا۔ اب ذرا اپنی دوست کو بھی سمجھاؤ جس نے صبح سے رونا دھونا مچایا ہوا ہے کہ یہ سوٹ نہیں پہننا۔“ تاب دار نے مسکرا کر کہا اور ان لوگوں کو کمرے میں بٹھایا۔



ابھی واپس لوٹی تھی اور ہشتمہ کا ہاتھ پکڑ کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”ممتی۔ تم بڑوں کے بیچ میں نہ بولو۔ ویسے بھی اس دور میں کسی کو شوق نہیں جو اپنی آنکھیں پھوڑے“ آج کی لڑکیوں کے پاس نہ تو اتنا وقت ہے نہ ہی جان گرس۔“ حمیرا نے دال موٹھ پھانکتے ہوئے بھلونج کا مذاق اڑایا۔ ممتی نے منہ بنا کر اس کو دیکھا۔

”حمیرا۔ کمال ہے۔ تم بیٹی کی اچھی بات کی حوصلہ افزائی کرنے کی جگہ مذاق اڑا رہی ہو۔“ تاب دار نے بھنویں اچکا کر نند کو گھورا۔ وشمہ اور شعاع نے بھی پھوپھو کو ناگواری سے دیکھا وہ جب بھی آتیں کوئی چھوٹی سی بات نکال کر ان کی ہاں کے پیچھے پڑ جاتیں۔

”میری لڑکی کی تو رہنے ہی دیں۔ ایسے ہی ہر چیز پر جان دینے لگتی ہے، مگر آپ تو سمجھ دار ہیں۔ آج کل مقابلے بازی کا دور ہے۔ لڑکیاں تو ایک سے بڑھ کر ایک نمٹنے ڈیزائنڈ سوٹ پہنتی ہیں۔ آپ جو کپڑوں کو جوڑ توڑ کر کے اپنی سلیقہ مندی کا ڈنکا پیٹنے کے لیے بچیوں کو ایسے کپڑے پہننے پر مجبور کرتی ہیں تو یہ بات کچھ جھجکتی نہیں۔“ حمیرا بھی سینہ ٹھوک کر میدان میں اتر آئیں۔

”حمیرا۔ میں کفایت شعاری کو برا نہیں سمجھتی نہ ہی تمہارے فلسفے کو مانتی ہوں۔“ تاب دار نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”لو۔ ان کی سنو۔ بہن یہ شو۔ شا کا دور ہے۔ پیٹ میں کیا ہے، لوگ نہیں دیکھتے، مگر تن پر کیا ہے وہ سب کی نگاہوں میں چلتا ہے۔ اب بھلا۔ اتنی سادگی دیکھ کر کون ان لڑکیوں کے لیے رشتے بیچے گا۔“ حمیرا نے جلے دل کے پھوپھو لے پھوڑے۔

”لڑکیوں کو ہر حال میں گزارا کرنا چاہیے اللہ میری بچیوں کی قسمت اچھی کرے۔ وقت آنے پر ساری آرنڈیں پوری ہو جائیں گی اور جہاں تک رشتے کی بات ہے تو وہ نصیب سے جڑتے ہیں۔ چیزوں سے نہیں۔ بس نیت، اچھی ہو تو سارے کام اپنے وقت پر صحیح طریقے سے ہوتے چلے جاتے ہیں۔“ تاب دار کو

”پھوپھو۔ یہ ڈرنک لیں۔ اتنی گرمی سے آئی ہیں۔“ تاب دار کی منجھلی بیٹی وشمہ کو پچن کے کاموں سے بہت لگاؤ تھا وہ مہمانوں کی تواضع کے لیے فوراً گلاسوں میں ڈرنک اور پلیٹ میں نمکو نکل کر لے آئی۔

”شعاع بیٹا۔ فریزر سے چکن کا پیکٹ نکال کر سنک میں رکھنا میں آئی ہوں۔“ تاب دار جانتی تھیں کہ نند اب رات کا کھانا کھائے بغیر واپس نہیں جلنے والی۔

”میں تو ہشتمہ کو لے کر آتی ہوں۔ بلا وجہ ایک سوٹ کو لے کر اپنا موڈ خراب کر رہی ہے۔“ ممتی نے مسکرا کر کہا اور اندر چلی گئی۔

”افسوس۔ بھابھی کیا ہو گیا جو بیٹی سے اتنی ضد باندھ لی۔ جب بازار میں اتنی اچھی چیزیں بنی بتائی مل رہی ہیں تو پھر ایسے جھنجھٹ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟“ حمیرا نے عادت کے مطابق ہنستے ہوئے طنز کیا اور ڈرنک کا سب لیا۔

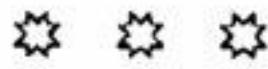
”حمیرا۔ میں کسی کو مجبور تو نہیں کر رہی ہوں جس کو جیسا مناسب لگے وہ ویسا ہی کرے، مگر جب میں بچیوں کے ایک سے ایک کپڑے سی سکتی ہوں تو کیا ضرورت ہے کہ بلا وجہ ہار کیٹ جا کر ہزاروں روپے ایک وقت کی شاپنگ میں پھونک آوں۔“ تاب دار نے شیفون کے عنالی روپے پر سلور ڈوری پائپنگ لگاتے ہوئے پل بھر مشین روگ کر رک کر انہیں جواب دیا۔

”ممی۔ ڈیزائننگ۔ بھی ایک آرٹ سے اور ممانی اس میں ماہر ہیں۔ اسی وجہ سے تو ان کا سلائی کٹائی کا سینٹر بھی دن بہ دن ترقی کر رہا ہے۔ میں سوچ رہی ہوں چھٹیوں میں یہاں آکر سلائی سیکھوں۔“ ممتی کو ماں کا انداز برا لگا تو دل رکھنے کے لیے حمایت میں بولی، حالانکہ اسے سوئی پکڑنے سے بھی دلچسپی نہ تھی۔ وہ

مند کی بات بہت بری لگی۔ منہ بنا کر جواب دیا۔

”اللہ۔۔۔ تو یہ۔۔۔ بھابھی۔ میں نے ایسا کیا کہہ دیا جو آپ بھڑک اٹھیں، انسان کما تا کس کے لیے ہے، اولاد کے لیے، اب اگر وہ ہی خوش نہیں تو کیا فائدہ، بھائی اتنی اچھی پوسٹ پر کام کرتے ہیں۔ اب ایسا بھی نہیں کہ ہشتمہ عید پر ایک ڈھنگ کا جوڑا نہ خرید سکے، مگر آپ کی منطق ہی نرالی ہوتی ہیں اور یہ سمعی جو مسنی بنی ممانی کی حمایت میں ماں سے لڑ رہی ہے نا، اس نے خود اپنے پیپا سے ضد کر کے بقر عید کے لیے پورے دس ہزار کا سوٹ خریدا ہے۔“ تمیرا کے تو جیسے آگ لگ گئی، ہاتھ نچا نچا کر بولیں، ہشتمہ نے ماں کو بڑی حتراتی زناہوں سے دیکھا۔

”کوئی بات نہیں۔ سب کی اپنی مرضی ہے، مگر میں تو وہ ہی کروں گی جو مجھے مناسب لگے گا۔ ویسے بھی ابھی میٹھی عید پر ان کے پیپا کو بونس ملا تو تینوں کی پسند کے سوٹ دلائے تھے اس بار سب سے اہم قربانی کا فریضہ ہوتا ہے۔“ تاب دار نے سلانی مشین کو کور کرتے ہوئے اتنے فیصلہ کن انداز میں اپنی بات دہرائی کہ سب کی بولتی بند ہو گئی۔ تاہم ہشتمہ کو ماں کی کئی ایک آنکھ نہیں بھائی۔



”ہماری بیٹی کا چہرہ اتنا اترا ہوا کیوں ہے؟“ رمیض احمد دفتر سے لوٹے تو خلاف معمول پشتہ کوچپ چپ صوفے پر بیٹھا دیکھ کر سوال کیا۔

”کچھ نہیں۔ بس اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“ تاب دار نے بات بتائی، ان کی عادت تھی کہ وہ شوہر سے گھر کے مسائل حتی الامکان چھپائے رکھتیں، رمیض لباس تبدیل کرنے اندر کی جانب بڑھ گئے۔

”میں جانتی ہوں کہ پیسہ کماتا آسان نہیں، تمہارے پیپا باہر سے کتنی مشکلوں کو جھیل کر گھر لوٹتے ہیں، اگر یہاں بھی جج جج لگی رہے تو ان کا سکون برباد ہو جائے گا کہ نہیں؟“ انہوں نے بظاہر وشمہ سے کہا، مگر مخاطب بڑی بیٹی تھی۔ وہ فریش ہو کر لوٹے تو

موضوع گفتگو بدل دیا گیا۔

”وشتمہ میرا پیار سا بچہ۔ ذرا ادھر تو آؤ۔“ رمیض نے منجھلی بیٹی کو لاڈ سے بلایا اور کرسی پر بیٹھ کر پاؤں پھیلا لیے۔

”جی پیپا۔ کیا ہوا؟“ وشمہ کے ساتھ چھوٹی شعاع بھی چلی آئی۔

”یہ لوچاٹ۔ اسے پلیٹ میں نکال کر لاؤ، چائے کے ساتھ سب مل کر کھا میں گے۔“ رمیض نے بیٹی کو شاہر تھمایا۔ وہ خوش خوش کچن کی طرف چل دی۔ تاب دار ان کے برابر میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گئیں۔

”اوپر والے پورشن کا کتنا کام رہ گیا ہے؟“ انہوں نے شہر گوریلکس دیکھا تو فکر مندی سے پوچھا۔

”ارشاد ٹھیکیدار، دن بہ دن نئے نئے کام نکالتا ہے، میں نے تو اس کام کے لیے جتنا بجٹ رکھا تھا وہ بھی ختم ہو گیا، مگر کام ہے کہ ختم ہی نہیں ہو پارہا۔“ رمیض نے اوپر والی منزل کو غور دیکھتے ہوئے پریشانی سے کہا۔

”جی۔ میں بھی یہ ہی سوچ رہی تھی، بقر عید سر پر ہے، اس پر گھر کا پھیلاوہ ہے کہ سمٹ ہی نہیں رہا۔ ارشاد بھائی سے کہیں بس ایک ہفتے میں اپنا سارا کام ختم کر دیں۔ ہم تو ان کو ٹھیکہ دے کر پھنس گئے ہیں۔“ تاب دار نے جذباتی پن کا مظاہرہ کیا تو رمیض مسکرا اٹھے۔

”پیپا۔ یہ آپ کی گرام گرم چائے اور یہ سب کے لیے مزے دار چاٹ۔“ وشمہ نے ٹرے ٹیبل پر رکھ کر چٹکارا بھرا، شعاع بھی چچہ پالہ ہاتھ میں تھامے اس کے پیچھے وہیں آگئی، مگر ہشتمہ اس سے مس نہ ہوئی۔

”ہشتمہ۔ آجاؤ۔ بیٹی۔ میں نے تمہاری پسند کی پارڈی الگ سے ڈلوائی ہے۔“ انہوں نے چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد بڑی کو آواز لگائی، اس کی مسلسل خاموشی اب رمیض کو پریشان کر رہی تھی۔

”پیپا۔ بعد میں کھالوں گی۔ ابھی موڈ نہیں۔“ ہشتمہ نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں وہیں سے جواب دیا۔

”تاب۔ ہوا کیا ہے؟“ رمیض نے چونک کر

بیوی کو دکھا، وہ بیٹی کے مزاج آشنا تھے، سمجھ گئے کہ کوئی بات ہوئی ہے۔

”افندہ کچھ نہیں۔ بس بیگم صاحبہ کا داغ خراب ہو گیا ہے۔“ انہوں نے ہشامہ کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا۔

”پاپا۔ ممانے ہم تینوں کے لیے بہت پیاری انارکلی فرائگ سی ہیں، مگر آپ کی کو اپنا سوٹ پسند نہیں آ رہا، وہ بقرعید میں سمعہ بابتی کی طرح کاسوٹ لینا چاہ رہی ہیں۔“ شعلع نے ماں کی آنکھیں دکھانے کے باوجود پول کھول دی۔

”اچھلے تو تاب۔ اگر بچی کا دل نہیں تو اسے بازار سے دلا دو۔“ رمیض نے ہشامہ کو محبت سے دیکھ کر بیوی سے سفارش کر دی۔

”کہاں سے دلا دوں۔؟ ہزار۔ پانچ سو کی بات نہیں ہے۔“ تاب دار نے دانت ڈیس کر کہا۔

”اس۔ کیوں بھئی۔ کتنے کاسوٹ ہے؟“ رمیض نے آنکھیں سکیٹریں اور پوچھا، انہیں خواتین کے کپڑوں کی قیمتوں کا بھلا کیا اندازہ۔

”پورے دس ہزار کا۔ آج ہی تو پھوپھو اور سمعہ آئی آئے تھے تو بتا رہے تھے۔“ وشمہ نے ہاتھوں کی پانچوں انگلیاں کھڑی کر دیں۔

”افندہ حمیرا آئی تھی۔ چلی گئی کیا۔؟“ رمیض نے پوچھا۔

”جی۔ وہ اچانک رفاقت بھائی کا فون آ گیا۔ ان لوگوں کو کہیں اور جانا تھا۔ اس لیے وہ جلدی چلی گئی۔“ تاب دار نے وشمہ کو گھورتے ہوئے شوہر کو جواب دیا جس نے سارا بھائی اچھوڑا۔

”بیٹا۔ اداس نہ ہو۔ کچھ نہ کچھ کرتے ہیں۔“ رمیض سے بیٹی کی اداس صورت دیکھی نہ گئی اس وقت تو ہاتھ ویسے ہی بہت تنگ تھا۔ ورنہ کچھ نہ کچھ ضرور کرتے۔ ”مجبوراً“ چائے چھوڑ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے باہر نکل گئے۔

”بس۔ خوش ہو گئیں۔ باپ بے چارہ باہر سے کما کر تھا کا ہارا آیا، مگر تم لوگوں کو کیا فکر اپنے دکھڑے

سنانے بیٹھ گئیں۔“ تاب دار جو جوش میں شروع ہوئیں تو انہیں چپ کرانا مشکل ہو گیا۔ ہشامہ کو بھی اپنے رویے پر افسوس ہونے لگا۔

رمیض نے سیدھی سڑک پر چلتے ہوئے بچیوں کے بارے میں سوچا اور ان کے اچھے نصیب کے لیے اوپر والے سے دل سے دعا مانگی۔ رمیض جانتے تھے کہ چھوٹی بہن حمیرا کے شوہر رفاقت علی کا اچھا خاصا چلتا ہوا بزنس تھا ان کے لیے دس بیس ہزار معمولی رقم تھی، اسی لیے سمعہ کی ہر فرمائش پوری ہو جاتی جبکہ وہ خود نوکری پیشہ آدمی تھے۔ بڑھتی ہوئی منگائی نے کمر توڑ کر رکھ دی۔ ایک تنخواہ میں گزارا مشکل ہونے لگا تھا۔ اس پر تین لڑکیوں کو پانچنے کی فکر آگئی یہ تو تاب دار کی سلیقہ مندی تھی جو اس نے گھر بیٹھے سلائی کڑھائی کا چھوٹا سا اسکول کھول لیا۔ وہاں سے ملنے والے پیسوں سے کمیٹیاں ڈال کر اوپر والا پورشن بنوانا شروع کیا تاکہ کرائے پر دے کر مزید آمدنی کی سبیل کی جاسکے۔ تاب دار کی وجہ سے ہی آج تک پوری برادری میں ان کا بھرم قائم تھا۔



عکرمہ نے آہستہ سے گاڑی چلاتے ہوئے کلائی پر بندھی کھڑی میں بوقت دکھا، آج اس نے دانستہ طور پر وہ ہی راستہ اختیار کیا، جہاں اسے اپنی منزل کا نشان ملا تھا، مگر مہا بہا سے بات کرنے سے پہلے وہ ایک بار خود پر یقین کرنا چاہتا تھا۔

”بس۔ اس معاملے میں کچھ نہیں کروں گی۔“ شہوار نے جل کر آج کلج کی چھٹی کی۔ بھائی کی تملون مزاجی سے باخوبی واقف تھی، اسی لیے ہشامہ والے معاملے میں ہری جھنڈی دکھا دی۔ وہ بھی اپنی مدد آپ کے تحت چھٹی کے ٹائم پر کلج جا پہنچا۔

ہشامہ نے سیاہ گیٹ سے نکل کر ادائے بے نیازی سے اوہر اوہر دیکھے بنا بس اسٹاپ کی جانب قدم بڑھا دیے۔ چاند سے چہرے پر اداسیوں کے بادل چھائے ہوئے تھے، اسے اپنی ضد پر افسوس ہونے لگا جس کی

وجہ سے باپ کو فکر میں مبتلا رکھا۔

”بس۔ امی کا سیاہا سوٹ پہن کر ہی باہر کیو پارٹی میں چلی جاؤں گی۔“ ہشیمہ نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا اور مسکرا دی۔ گرمی کی حدت سے چہرے پر چھائی لالی، وہ مسکراتی ہوئی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ عکرمہ نے اسے ایک ٹکدہ دیکھا۔

”تمہارا۔۔۔ تو۔۔۔ ہر روپ بے مثل ہے۔“ عکرمہ نے پیار سے سراہا، مگر ہشیمہ نے گاڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے بھی اس پر اچھتی سی نگاہ نہ ڈالی۔ وہ ایک لمحے کے لیے شاک رہ گیا۔

”سمجھ میں نہیں آیا۔ تم سے۔ ایسے ایک دم سے کیوں کر دل لگا بیٹھا؟ واقعی۔ تم میں کچھ تو ہے جو من کی اتھاہ گہرائیوں تک بغیر رکے اترتی چلی گئیں۔“ عکرمہ نے سر جھٹک کر اس کی بے اعتنائی کا لطف اٹھایا، وہ اپنے سارے پس پوائنٹ کو بے کار جاتے دیکھ کر بھی بے مزا نہیں ہوا، ورنہ چمکتی گاڑی، منگا لباس، زبردست پرمینہٹی لڑکیوں کو فوراً ہی اپنی جانب کھینچ لیتی تھی۔

”تمہیں جلد از جلد اپنا بنا پڑے گا، کیوں کہ میں نہیں چاہتا کہ دن رات تمہیں پانے، کھونے تم سے ملنے یا پھرنے کے اندیشوں میں مبتلا رہ کر خود کو تباہ کروں۔“ عکرمہ نے ہشیمہ کو دیکھتے سنجیدگی سے عہد کیا اور گھر روانہ ہو گیا۔



سمیرا اور شہوار کے کئی دفعہ لگائے جانے والے پھیروں اور تقاضوں کا یہ اثر ہوا کہ ہشیمہ کے گھر میں عکرمہ کے رشتے کے لیے سنجیدگی سے بات چیت شروع ہو گئی، ورنہ وہ معاشی مشکلات کی وجہ سے ابھی بیٹی کا رشتہ طے کرنا نہیں چاہتے تھے، دونوں میاں بیوی میں یہ طے پایا کہ لڑکے والوں سے تیاری کے لیے دو سال کا وقت لیا جائے۔ تاب دار کے کہنے پر ہشیمہ نے عکرمہ کے آفس جا کر ایک ملاقات بھی کر لی، وہاں سے وہ کافی مطمئن ہو کر لوٹے اور اس بات پر اللہ کا شکر

ادا کیا کہ شہر کا اتنا معزز گھرانہ بیٹی کا طلب گار بنا ہوا ہے۔ ہر طرف سے مثبت اشارے ملنے پر ان لوگوں نے ہاں کرنے کا سوچا۔ کیوں کہ وہ فوری طور پر ہشیمہ کی شادی کے متحمل نہ تھے اس لیے شادی کے لیے وقت مانگ لیا۔

”اف۔۔۔ دو سال۔۔۔ میری ساس تو پورے گھر کا جینا حرام کر دیں گی۔“ سمیرا نے دو سال کا سنا تو ہول اٹھیں۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر درد بھری آواز نکلی۔

”مسز رمیض۔ ہم تو بقر عید کے دو سرے ہفتے میں شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ سمیرا نے انہیں فون پر اپنی بے تالی سنائی۔

”یہ۔۔۔ بات۔۔۔ تو مشکل ہو جائے گی۔“ تاب دار نے صائب لہجے میں انہیں حتمی اور فون رکھ دیا۔

”اب کیا کروں۔ اتنی مشکل سے تو کوئی لڑکی پسند آئی ہے۔“ سمیرا سوچ میں پڑ گئیں۔ دراصل ان کی ساس مہتاب خانم کا آج کل بس نہیں چل رہا تھا کہ پوتے کو سہرا باندھ کر بارات لے کر ہشیمہ کے گھر جا پہنچیں، صحت دن بہ دن گرتی جا رہی تھی، اس لیے چاہتی تھیں کہ زندگی میں ہی عکرمہ کو اپنے گھر میں شادی آباد دیکھ لیں۔

”آئے۔ لڑکی تو بہت ہی پیاری ہے۔“ انہوں نے چشمہ لگا کر جیسے ہی ہشیمہ کی تصویر دیکھی واری صدتے جانے لگیں۔

”سمیرا۔۔۔ آپ جا کر بات پکی کر لیں۔ تاکہ شادی کے انتظامات شروع کے جا سکیں۔“ منظور علی نے بھی ماں کی طبیعت کی وجہ سے بیٹی کی جلد شادی پر زور دیا، وہ نہیں چاہتے کہ ان کے دل میں کوئی خلش رہ جائے۔ سمیرا کم سم بیٹھی رہ گئیں۔

”آئے۔۔۔ دلہن۔۔۔ پہلے تو عکرمہ کو کوئی لڑکی پسند نہیں آتی تھی، اب جو وہ شہوار کی سہیلی سے شادی پر تیار ہوا ہے تو تم لوگ دیر لگا رہے ہو۔“ انہوں نے آنکھوں پر ہاتھوں کا چھجا بنا کر بہو کو گھورتے ہوئے تاکید کی۔ ستر سالہ مہتاب خانم آج کل بچوں کی طرح ہر بات پر ٹھکنے لگتیں۔

”چھا۔ اہل جی۔ ان لوگوں سے۔ دوبارہ۔ بات کرتی ہوں۔“ سمیرا نے انہیں تسلی دی۔

”صرف بات نہیں کرنی۔ کی بات کرنی ہے۔ کیوں عکرمہ؟“ متاب خانم نے مسکرا کر پوچھے منہ سے ہوتے کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا تو وہ زور زور سے سر ہلا کر تائید کرنے لگا۔ سمیرا گھبرا کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔



دوسرے دن شام کو وہ ہشامہ کے گھر جا کر بات کرنے کا سوچ ہی رہی تھیں کہ وہاں سے تاب دار کا معذرت بھرا فون آ گیا۔

”ہم نے بہت سوچا مگر کوئی راستہ نہ پا کر مجبوراً اس بات کو یہیں ختم کر رہے ہیں۔“ تاب دار نے دہلی زبان میں افسردگی سے کہا۔ انہیں عکرمہ اور اس کی فیملی دل سے پسند آگئی تھی، مگر اتنی جلدی شادی جیسا بڑا کام کرنا ناممکن تھا۔

”مسز رمیض۔ ایسی بھی کیا بات ہو گئی ہماری فیملی پسند نہیں آئی؟“ سمیرا نے لجاجت سے پوچھا انکار کا سنتے ہی ان کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔

”ارے۔ نہیں۔ آپ کا خاندان تو واقعی بہت اچھا ہے۔ میری بیٹی کی خوشی قسمتی ہوتی اگر اتنے قدر دان لوگوں کا ساتھ مل جاتا۔ مگر ہر انسان کی اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں۔“ تاب دار نے ٹھنڈی آہ بھر کر دکھی لہجے میں بتایا۔

”مجھے اپنا سمجھ کر ساری پریشانی کہہ ڈالیں۔ سمجھیں بات صرف ہم دونوں تک ہی محدود رہے گی۔“ سمیرا نے بے حد پر خلوص انداز میں ان پر دباؤ ڈالا۔

”دیکھیں۔ ہم اتنی جلدی شادی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ پھر۔ گھر بنانے کی وجہ سے قرضے کی لپیٹ میں بھی آگئے ہیں۔“ تاب دار نے دہے لفظوں میں اپنا بھرم رکھتے ہوئے مختصر بتایا اور مزید بحث سے بچنے کے لیے عجلت میں فون رکھ دیا۔

شہوار جو وہیں بیٹھی تھی یہ سب سن کر رونے بیٹھ گئی۔

”بالکل چپ۔ منہ سے بھاپ بھی نہیں نکالنا۔ گھر میں کسی کو انکار والی بات کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔ ورنہ عکرمہ سے پہلے اہل جی نے سوگ ڈال دیتا ہے۔“

سمیرا نے اسے سختی سے چپ کرایا۔

”ڈرائیور سے گاڑی نکلاؤ، ہم ابھی مسز رمیض کے گھر جائیں گے۔“ انہوں نے کچھ دیر سوچا اور فیصلہ کن انداز میں اٹھ کھڑی ہوئیں شہوار میں کامنہ دیکھتی رہ گئی۔



”تجی جلدی۔ میرا مطلب ہے۔ سب کچھ اچانک کیسے ہو گا؟“ سمیرا کی بات پر تاب دار کے دماغ میں ایک فکر لاحق ہو گئی، عکرمہ کے گھر والے تو ہاتھ پاؤں پھلانے میں ماہر دکھائی دے رہے تھے۔

”آپ لوگ کن باتوں میں پڑ گئے ہیں۔ اگر جینز کی وجہ سے پریشان ہیں۔ تو بے کار ہے۔ یہ مسئلہ نہ بھی ہوتا۔ تب بھی میں اس قسم کے لین دین کے حق میں نہیں ہوں۔ ویسے بھی۔ میرا عکرمہ بہت چوڑی ہے۔ اس نے ابھی اپنے روم کو نئے سرے سے فرنشڈ کروایا ہے۔ آپ کا جینز میں دیا ہوا سارا سامان بلا وجہ بیس منٹ میں خراب ہوتا رہے گا۔“ سمیرا ان کی مشکل سمجھتی تھیں، اسی لیے ہلکے پھلکے انداز میں سمجھانے لگیں۔

”آپ۔۔ کیوں نہیں سمجھ رہی۔ ایسا کہاں ہوتا ہے۔ دنیا کیا کہے گی؟“ تاب دار بڑی تذبذب میں پڑ گئیں۔

”واہ۔ بھئی۔ رشتہ ہم دو خاندانوں کے بیچ میں ہو رہا ہے۔ یہاں دنیا کہاں سے آگئی؟“ سمیرا ایک دم کھل گئیں۔

”نہ تو ٹھیک ہے مگر۔ بہن۔“ کمرے میں موجود رمیض نے بھی منہ کھولا، مگر سمیرا نے ہاتھ اٹھا کر انہیں بولنے سے روک دیا۔

”بس۔ جب بہن۔ بول دیا۔ تو مجھ پر اعتماد بھی

کرس۔ یہ روایتی باتیں نہیں۔ حقیقتاً۔ ہمیں ہشتمہ تین گھنٹوں میں قبول ہے۔“ سمیرا نے قطعیت سے بات ختم کی اور چائے کلسب لیا۔

”اچھا۔ مگر۔ ایسے خالی ہاتھ کیسے؟“ تاب دار کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دیں گھبرا کر شوہر کو دیکھا۔

”خالی ہاتھ تو نہیں جائیں گے، ہم اس گھر کی سب سے مہنگی اور قیمتی چیز لے کر جانے والے ہیں۔ آپ ہشتمہ کا موازنہ بے جان چیزوں سے کیوں کر رہی ہیں۔“ انہوں نے سوار کے ساتھ اندر داخل ہوئی ہشتمہ کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔ سوچنے تو دیں۔“ تاب دار نے گھبرا کر کہا۔

”مسز رمبھن۔ ہتنا چاہے سوچ لیں۔ مگر۔ اس رشتے کے لیے ہماری بس ایک شرط پوری کر دیں۔“ سمیرا منظور نے اچانک سنجیدہ اور رت بنا کر کہا۔

”جی۔ وہ کیا۔؟“ تاب دار نے حیرانی سے پہلے انہیں پھر برابر میں بیٹھے شوہر کی جانب دیکھا۔

”گلے ہفتے میں نکاح کی تقریب سادگی سے ادا کی جائے گی اور بقرعید کے بعد رخصتی۔“ تاب دار کی سانس بحال ہوئی ورنہ وہ تو سوچ رہی تھی کہ اتنا بڑا گھرانہ ہے، جانے سمہن جینز لینے سے منع کرنے کے بعد کون سی فرمائش کرنے والی ہیں۔ مگر دوسری فکر پڑ گئی۔

”گلے ہفتے نکاح؟“ دونوں میاں بیوی چونک کر بولے۔

”جی ہاں۔“ سمیرا تو جیسے ہتھالی پر سرسوں جملنے پر تلی بیٹھی تھیں۔ ماں کے کہنے پر شوہار نے دوست کو چنگلی کٹی۔ ہشتمہ کے ہونٹوں پر شرمیلیں مسکراہٹ چھا گئی۔

”آپ پریشان مت ہوں۔ نکاح بہت آسانی سے ہو جائے گا ہماری طرف سے میرے اور منظور صاحب کے بہن بھائی۔ سمجھیں کل ملا کر پچیس لوگ ہوں گے۔ آپ بھی اپنی سہولت سے قریبی عزیزوں کو مدعو

کر لیے گا، باقی دھوم دھڑکاہم رخصتی پر کر لیں گے۔“ سمیرا نے ان کے چہرے کی اثراتی رنگت دیکھی اور گھر کے بنے ہوئے گرم سموسوں پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے مزے سے صلاں جڑی۔

”یہ تو ہاں کروا کر ہی دم لیں گی۔“ تاب دار نے ٹھنڈی سانس بھر کر شوہر سے سرگوشی میں کہا۔

”ایسے اچھے رشتے کو لوٹانا کفرانِ نعمت ہو گا۔“ رمبھن نے سوچا اور بیوی کو اشارے سے رضامندی دے دی، تاب دار نے بھی مسکرا کر ہاں کر دی۔

”بھائی۔ آپ کی محبت کی گاڑی چل پڑی ہے۔“ شوہار نے بھائی کو فوراً ہی ٹیکسٹ کیا تو اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ وہ دادی کو خوش خبری سنائے بھاگا۔



”آئی لو پو ماما۔“ شوہار ہشتمہ کے گھر سے واپسی پر ماں سے چمٹ گئی۔

”اچھا ہوا بتا دیا۔ مجھے تو پتا ہی نہیں تھا۔“ سمیرا نے شکستگی سے اس کے بل سنوارتے ہوئے کہا۔

”سیر سلی ماما۔ آپ تو چھا گئیں“ شوہار نے ہاتھ اٹھا کر دادی۔

”وہ کیوں بھئی۔“ سمیرا نے اسے نہ سمجھ میں آنے والی نگاہوں سے دیکھا۔

”آپ کی۔ ہشتمہ کو سادگی سے بہوتانے والی بات نے انکل آئی کی کتنی بڑی پریشانی دور کر دی تھی۔“ شوہار خوشی سے چمکی۔ اسے بہر حال عکرمہ سے بہت محبت تھی، بھائی کی دل کی مراد بر آئی تو وہ کیوں کر خوش نہ ہوتی۔

”وہ تو میں نے ایک پرانا قرض لوٹایا ہے۔“ سمیرا کے مسکراتے چہرے پر اداسی کا رنگ غالب ہوا۔

”کیا مطلب۔ میں سمجھی نہیں؟“ شوہار نے ماں کو مڑ کر دیکھا۔

”بس بیٹا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میری اور تمہارے پاپا کی منگنی کے بعد لپا جی کا اچانک انتقال ہو گیا، میں اور اماں ایک بڑی مشکل میں گرفتار ہو گئے،

تھے؟ مشہوار نے بے چینی سے سوال کیا۔
 ”تمہاری دادی نے مایوس ہو کر ان کے لیے
 دوسری لڑکی تلاش کرنا شروع کر دی۔ آخر پوری
 برادری میں یہ خبر پھیل گئی کہ منظور کے لیے دوسرا
 رشتہ ڈھونڈا جا رہا ہے۔ اماں کے کانوں تک بھی یہ
 باتیں پہنچیں۔ انہوں نے بیٹوں کو بلا کر فاسٹل بات کی
 مگر وہ ایک بار پھر ٹل گئے۔ ”میرا نے پھکی مسکراہٹ
 ہونٹوں پر سجائی۔

”اوہ مائی گاڈ۔ پھر؟ مشہوار نے پوچھا۔
 ”ایک دن اچانک تمہارے پاپا۔ اماں سے ملنے
 آگئے۔ اور بڑی رسائیت سے شادی نہ کرنے کی وجہ
 معلوم کرنے لگے، میری ماں کی وضع داری منہ سے کچھ
 کہنے کی اجازت نہیں دیتی تھی، مگر انہوں نے اماں کے
 چہرے پر رقم کرب اور مجبوری کی داستان پڑھ لی۔ بس
 واپس گھر جاتے ہی تمہاری دادی سے جا بے کس انداز
 میں بات کی کہ وہ مجھے ایک مہینے میں سادگی سے
 رخصت کرا کر اس گھر میں لے آئیں، بھائیوں کو بعد
 میں شرم محسوس ہوئی تو میرے اکاؤنٹ میں کچھ پیسے
 ٹرانسفر کروا دیئے۔ مگر میں تمہارے پاپا کی آج تک شکر
 گزار ہوں جنہوں نے ایک بیوہ اور مجبور عورت کا بھرم
 رکھا۔“ وہ افسردہ ہو کر بولتی رہیں۔

”وہ پھر کیا ہوا؟“ مشہوار کے دل میں ماں کا درد
 اترنے لگا۔

”میرے سسرال میں قزم رکھنے کے بعد جیسے
 قسمت کی دیوی اس فیملی پر مہربان ہوتی چلی گئی، یوں
 ہن برسے لگا کہ سنبھالے نہیں سمجھتا۔ اس بات کا
 کریڈٹ آج تک تمہارے پاپا اور دادی مجھے دیتے
 ہیں۔ حالانکہ یہ تو اوپر والے کی دین ہے۔“ میرا نے
 سگوں سے آنکھیں موندیں۔

”واہ یعنی میری دادی بالکل بھی روایتی ساس نہیں
 بنیں۔“ مشہوار کی آنکھیں چمک اٹھیں، دل میں
 مہتاب خانم کے لیے موجود محبت میں بے انتہا اضافہ
 ہو گیا۔

”نہیں یہ بات سچ ہے کہ اماں جی۔ بہت نیک روح

تمہاری دو خالوں اور تین ماموں کی اس وقت تک
 شادی ہو چکی تھی۔ میں ہی چھوٹی اولاد ہونے کی وجہ
 سے باقی بچی تھی، اباجی کا جو بھی فنڈ وغیرہ ملا، اماں نے
 اس میں سے بڑا حصہ میری شادی کے لیے مختص کرنا
 چاہا، مگر اس وقت تمہارے تینوں ماموں اس بات پر اڑ
 گئے کہ وہ پیسہ فی الحال ان میں بانٹ دیا جائے اور جب
 سمیرا کی شادی ہوگی تو ہم بھائی مل کر یہ کام کریں گے،
 کیوں کہ وہ سب اچھی نوکریوں پر لگے ہوئے تھے تو
 اماں نے ان پر یقین کر کے سارا پیسہ فیاض بھائی کے
 حوالے کر دیا، جو باجی کے بعد گھر کے سربراہ بن گئے
 تھے، انہوں نے سارا پیسہ پانی کی طرح بہا کر تین الگ
 الگ پورشن بنوائے ایک دو کمروں کا چھوٹا پورشن میرا
 اور اماں کا بھی بنا دیا گیا، اس کے بعد سب الگ الگ
 شفٹ ہو گئے۔ ”سمیرا کی آنکھیں ماضی کو یاد کر کے نم
 ہوئیں۔

”وہ تو تانی کا گھر پہلے ایک تھا۔“ مشہوار نے پوچھا۔
 ”ہو نہ۔ اس کے بعد سب اپنی اپنی زندگیوں میں
 لگن ہو گئے، وقت گزرتا چلا گیا، مگر میری کسی کو فکر ہی
 نہیں۔ اماں جب بھی ان تینوں کو بٹھا کر میری شادی کی
 بات کرتیں، وہ سب بہانے بناتے، اتنی جلدی کیا
 ہے؟ کون سی عمر نکلی جا رہی ہے۔ اپنے مسئلے مسائل کا
 رونا روتے ہوئے وہاں سے اٹھ جاتے، ادھر تمہاری
 دادی کو بھی اب فکر لگ گئی، وہ اماں کو فون کر کے شادی
 کا کہتیں۔ اماں مجبور ہو کر کہتیں۔ تمہاری خالائیں
 اپنے سسرالوں میں بڑی تھیں، بھائیوں کو فون کر کے
 سناٹیں۔ میری شادی کا بوتلیں مگر کوئی اثر نہیں ہوتا۔
 تین سال اسی کشمکش میں گزر گئے، اماں ان کو کوئی
 مثبت جواب ہی نہیں دے پارہی تھیں۔ ہر دفعہ ایک
 نیا بہانا۔ ان لوگوں کی آمدورفت گھٹنے لگی۔ فون بھی آنا
 کم ہو گئے۔ تمہاری تانی کو فکروں نے بیمار کر ڈال دیا۔
 مگر بھائی اپنی بیویوں کے کہنے میں آکر ہمیں فراموش
 کرتے چلے گئے۔ ”میرا نے دکھ بھری سانس لی مشہوار
 بڑی توجہ سے ماں کی داستان سننے میں لگن تھی۔
 ”پھر کیا ہوا۔ میرا مطلب۔ پاپا کچھ نہیں بولتے

ہیں۔ میں ان کی اچھائی کبھی نہیں بھول سکتی۔ اسی لیے تم نے دیکھا ہوگا۔ گھر میں ان کی ہر بات کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ عکرمہ کی شادی بقرعید کے بعد ہوگی تو میں نے اس بات کو ممکن بنانے کے لیے اپنا سارا زور لگا دیا۔ ”میرا نے مسکرا کر کہا۔

”واؤ۔ ممما یہ بات تو ہے۔“ شہوار ہنس دی۔
”اچھا ہوا۔ آپ نے جذبات میں آکر مجھے اپنی اور پاپا کی محبت کی داستان سنا دی۔ ورنہ میں تو ان باتوں سے محروم ہی رہ جاتی۔“ شہوار نے شوخی دکھائی تو سمیرا نے ایک دھپ لگائی۔

”کون سی محبت کی داستان۔ میں تو ان سے اس وقت بات بھی نہیں کرتی تھی، اصل میں منظور نے سوچا کہ ایک لڑکی جو اتنے سالوں سے ان کے نام پر بیٹھی ہے۔ یہ رشتہ ختم ہو جانے کے بعد اس کی کتنی بدنامی ہوگی۔ وہ ایک خاندانی آدمی نکلے اور مجھے تین کپڑوں میں خوشی خوشی رخصت کرا کر لے گئے، بس میں نے اسی دن دل میں عہد کیا کہ عکرمہ کی شادی کروں گی تو بیٹی والوں کو زیر بار نہیں کروں گی، تاب دار کی ہچکچاہٹ دیکھ کر میرے سامنے تمہاری تانی کا چہرہ آگیا اور میں نے فوراً فیصلہ کر لیا۔“ سمیرا نے بات ختم کی تو شہوار نے ماں پر فخریہ نگاہ ڈالی۔

”آپ نے یہ بات تو بہت اچھی کی مگر پاپا والی بات میں پھر بھی جھول رہ گیا۔“ شہوار نے شرارت سے نچلا لب دیا۔

”جھول۔ کیا مطلب کون سا جھول؟“ سمیرا نے حیرت سے پوچھا۔

”میری ممما۔ اتنی پیاری ہیں۔ وہ کیسے اتنی حسین لڑکی کو ہاتھ سے جانے دیتے۔ رشتہ ختم ہونے کا تو بہانہ بنایا۔ ورنہ شادی تو انہوں نے آپ سے ہی کرنی تھی۔“ شہوار نے ماں کو یوں چھیڑا کہ ان کی ہنسی چھوٹ گئی۔

سفید ہو گیا“ وہ دونوں حمیرا کے ڈرائنگ روم میں سر جھکائے بیٹھے، ان کی بری بھلی سن رہے تھے۔
”حمیرا۔ یقین کرو۔ سب کچھ بہت جلدی میں طے ہوا، جیسے ہی ہاں کی سب سے پہلے تمہارے پاس آیا ہوں۔“ رمیض نے بہن کے برابر میں جا کر بیٹھتے ہوئے لجاجت سے کہا۔

”بس۔ بس۔ یہ کہانیاں کسی اور کو سنائیے گا۔ وہاں نکاح کی ڈیٹ تک لکھیں ہو گئی، کسی کو مجھ غریب کا خیال نہیں آیا کہ ایک فون کر کے بلا لیتے۔“ حمیرا نے باکس سے نشوونگہ کر بلا وجہ آنکھیں پونچھیں۔ تاب دار نند کو دیکھ کر ان کے دل پر گزرنے والی کیفیت کا اندازہ کر رہی تھیں، وہ جو ہمیشہ ان کی بیٹیوں کو حقیر سمجھتی آئیں، اتنی اچھی جگہ رشتہ طے ہو جانے کی خبر ہضم کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

”اب تم جو بھی سمجھو۔ مگر میں نے پوری بات سچائی سے بیان کر دی ہے، بقرعید کے بعد رخصتی ہے، اگر تمہیں سچ سچ میری اولاد سے محبت ہوگی تو چلی آنا ورنہ تمہاری مرضی۔“ رمیض نے زندگی میں پہلی بار بہن کی ناجائز بات کے آگے مزاحمت کی، تاب دار منہ کھول کر شوہر کو دیکھنے لگیں۔ حمیرا تو ایسی ہو گئیں جیسے کاتو بدن میں لہو نہیں۔

”تاب۔ چلو۔ اور جگہ بھی بلاوا دینے جانا ہے۔“ رمیض جھٹکے سے کھڑے ہوئے تو وہ بھی ہوش میں آئیں اور میاں کے پیچھے سر جھکائے باہر نکل گئیں۔ حمیرا نے ہمیشہ سے بھائی کے گھر پر اپنا تسلط قائم رکھا، چھوٹی ہو کر بھی بڑے بھائی کو دیا۔ رمیض نے بھی بہن کے من سلان میں کوئی کمی آنے نہ دی، مگر شاید آج ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ حمیرا اپنی جگہ بیٹھی سوچتی رہ گئیں۔



”بس ٹھیک ہے۔ تو سب طے پا گیا۔ اب آپ لوگ ہشما کو بھول جائیں۔“ سمیرا نے تہجے سے پلاؤ پر راستہ ڈالتے ہوئے مزے سے کہا۔ وہ آج یہاں سچ

واہ۔ بھائی۔ بھابھی تو غیر سسی، سکے بھائی کا بھی خون



تائم میں پہنچی تو تاب دار نے جلدی جلدی تھوڑا اہتمام
کر ڈالا۔

کنیں۔



”تم یہاں بیٹھو۔ میں آدھے گھنٹے میں آرہی
ہوں۔“ شہوار ہشتمہ کا ہاتھ تھامے ایک بڑے آئس
کریم پارلر میں داخل ہوئی اور عکرمہ کے سامنے والی
چیر پر بٹھا کر خود نو دو گیا رہ ہو گئی۔ ہشتمہ اس صورتحال
پر حیران رہ گئی۔

”پلیز۔ میں نے ہی شہوار کو کہا تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھ
جاؤ کچھ باتیں سن لو پھر چلی جانا۔“ وہ غصے میں واپس
جانے کے لیے مڑی تو عکرمہ کی بھاری آواز نے رکنے پر
مجبور کر دیا۔ وہ اس کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

”ہشتمہ، میری چاہت پر ہمیشہ بھروسہ رکھنا۔ عکرمہ
منظور اس دن سے صرف آپ کا ہو گیا جس دن پہلی بار
دیکھا اور ہمیشہ آپ کا ہی رہے گا۔“ وہ اسے اپنی محبتوں
کامل دیتے ہوئے وفا کا یقین دلانے لگا۔

”آپ۔ کیا کہہ رہے ہیں؟“ ہشتمہ ایک دم
ششدر رہ گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ رشتہ شہوار
کے بجائے عکرمہ کی پسند پر طے پایا ہے۔

”ہاں۔ میں نے جب آپ پر پہلی نگاہ ڈالی تو اسی
وقت دل نے گواہی دی کہ بس یہ وہ لڑکی ہو جسے میری
زندگی میں شامل ہونا ہے۔“ عکرمہ نے مسکرا کر اقرار
کیا۔ جھکی جھکی پلکوں سمیت وہ سامنے بیٹھی دل میں
اتری جا رہی تھی۔

”اچھا۔ مجھے تو ان باتوں کی کچھ خبر نہیں۔“ ہشتمہ
نے دھیرے سے لب کھولے۔

”ہاں۔ مجھے آپ کی عزت کا بہت پاس تھا اس لیے
میں نے ہی یہ بات کسی کو نہیں بتائی اور شہوار کو بھی
دس کلوز کرنے سے منع کر دیا کیوں کہ آپ کا ساتھ تا
عمر کے لیے پانا تھا۔ اس لیے کورٹ شپ چلانے کی
جگہ سچا اور سٹھرا راستہ اپنایا۔“ اس کا شرارتی لہجہ اندر
کی سچائی کا مکمل ساتھ دے رہا تھا۔

”سامنے بیٹھا یہ شخص کتنا خالص ہے جس نے
میری معمولی سی ذات کو ایک دم سے اتنا معتبر کر دیا۔“

”کد۔ کیا۔ مطلب؟“ تاب دار نے حیرت سے
پوچھا اس بات پر ان کے چھکے چھوٹ گئے۔

”میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آج سے ہشتمہ
ہماری ذمہ داری ہے۔ اب آپ لوگ اسے بھول کر
باقی دو بیٹیوں کی فکر کریں یہ تو میری بیٹی بن گئی ہے۔“
سیرانے اتنے خلوص سے ہشتمہ کو ساتھ لگا کر کہا کہ
ان دونوں کی آنکھیں بھیگ گئیں پاس بیٹھی شہوار نے
بھی دوست کو خود سے لپٹا لیا۔

”لو کے ہشتمہ تم جا کر تیار ہو جاؤ۔“ انہوں نے
ہاتھ دھونے کے بعد لیمن ٹی پیٹے ہوئے لمحہ بھر ٹھہر کر
کہا۔

”کیوں۔ کہاں جانا ہے؟“ تاب دار نے چونک کر
پوچھا ہشتمہ نے بھی شہوار کو دیکھا۔ اتنی جلدی بیٹی کا
رشتہ ہو جانے کے بعد سے وہ منظور فیملی کی اپنائیت
کے مظاہروں پر یا تو حیران یا پریشان ہوا ٹھہرتی۔

”اومالی گاڈ۔ منظور صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ میں
واقعی بوڑھی ہو گئی ہوں۔ مسز رمبھن میں بتانا بھول
گئی۔ ہمارا آج شاپنگ کا پروگرام ہے۔ شہوار اور
ہشتمہ کو نکاح کے ڈریسز اور جیولری وغیرہ دلانی ہے۔
اس کے علاوہ مجھے اپنی بہو کو بقرعید کا اچھا سا سوٹ بھی
تو دلانا ہے۔“ سیرانے سر پر ہاتھ بار کر ہنستے ہوئے کہا تو
تاب دار انہیں دیکھتی چلی گئیں ان کے چہرے پر
خاص قسم کی ملاحظت تھی شاید ان کی اچھائیوں کی وجہ
سے ایسا تھا۔

”اچھا۔ ٹھیک ہے۔“ تاب دار نے بیٹی کی سوالیہ
نگاہوں پر اثبات میں سر ہلایا۔

”میڈم جلدی کرو۔ بھائی کی فرمائش ہے کہ ہشتمہ
کے سارے ڈریس شہر کے سب سے مشہور ڈیزائنر
سے بنوائے جائیں۔ ممانے اسی لیے آج کا ٹائم لیا ہوا
ہے۔ اب ہمیں وہاں پہنچنا ہے۔“ شہوار نے ہشتمہ کو
بے تکلفی سے بتاتے ہوئے اس کے روم کی جانب
دھکیلا تو تاب دار اوپر والے کی عنایتوں پر حیران رہ

ہشتم نے گرائی میں جا کر سوچا اور اس کا دل اپنے رب کے حضور سر بہ سجود ہونے کے لیے بے قرار ہونے لگا۔

”آپ۔ کبھی بھی میرا ساتھ نہ چھوڑیے گا۔“
عکرمہ نے اسے سوچوں میں گم دکھا تو خوف زدہ ہو کر یقین دہانی چاہی۔

”میں کبھی آپ سے دور نہیں جاؤں گی۔“ ہشتم نے اس کے اصرار پر سر ہلا کر یقین دہانی کروائی۔

”میں بہت خوش قسمت ہوں۔ جو آپ جیسی پیاری اور معصوم سی لڑکی میری شریک حیات بننے جا رہی ہے۔“ اس کے چہرے کو تکتے ہوئے عکرمہ کی آنکھیں لودینے لگی۔ وہ شرماتے لگی۔

”ہشتم! کبھی مجھ سے جدا نہ ہونا۔ وجہ چاہے کچھ بھی ہو، آپ سے بچھڑ کر عکرمہ کے لیے جینا مشکل ہو جائے گا۔“ گیبیر لہجے میں اپنے جذبات کا اظہار کرتا عکرمہ اس کے ہاتھ پاؤں پھلائے دے رہا تھا۔

”جی۔ کبھی۔ نہیں۔“ ہشتم نے بڑی فرمانبرداری سے اقرار کیا۔ عکرمہ کو لگا گویا سکون کی ایک لہر اس کی روح کے اندر تک سرایت کر گئی ہو۔ عکرمہ کی بڑی خواہش تھی کہ نکاح سے پہلے ایک بار ہشتم سے مل کر اپنے دل کا حال بیان کرے اس نے بہن کی اتنی منت سماجت کی کہ وہ پگھل ہی گئی۔ یہاں آنے سے پہلے ہشتم کو بالکل نہیں پتا تھا کہ ایسی سچویشن سے بالاپڑے گا۔ وہ تو شہوار کے کہنے پر شاپنگ کے لیے گھر سے نکلی۔ جس نے اچانک گاڑی کا رخ اس طرف موڑ دیا۔



عید الاضحیٰ کا چاند دکھائی دے گیا اور علاقے بھر میں جانوروں کی بولیاں سنائی دینے لگی۔ شعاع کے سارے فرینڈز روزانہ رات کو اپنے جانوروں کو لے کر واک پر نکلتے تو اس کا دل بھی چل چل جاتا۔ بکروں کو زیور وغیرہ پہنا کر تیار کیا جاتا پھر ان کا بیوی کو نٹسٹ ہوتا، جیتنے والے جانور کو انعام میں اسپیشل قسم کا چارہ کھانے کو دیا جاتا۔ شعاع یہ سب دیکھ کر دل موس کر رہ جاتی کہ

ابھی تک ان کا بکرا کیوں نہیں آیا۔

”اے۔ ہمارا جانور کب آئے گا؟ وہ بڑی آس لے کر ماں کے پاس پہنچی، جو تخت پوش سینے میں مگن تھیں۔

”بیٹا۔ آپ کی نکاح کی تقریب اچانک کھڑی ہو گئی ہے۔ خرچے اتنے بڑھ گئے ہیں۔ اس بار تو لگتا ہے مسجد میں گلے کا حصہ ڈالنا بھی مشکل ہو گا۔ بکرا خریدنے کی تو سکت ہی نہیں رہی۔“ تاب دار نے چھولی بیٹی کے بل سنوارتے ہوئے رسائیت سے سمجھایا۔ وہ صابر پنہی تھی ضد کیے بنا چپ چاپ سر جھکائے کونے میں جا کر بیٹھ گئی۔ تاب دار کے دل کو دھچکا پہنچا، مگر وہ اس معاملے میں کیا کر سکتی تھیں۔

”بہن۔ بہن۔ بہن۔“ تھوڑی دیر بعد ہی وہ دونوں بکرے کی صداؤں پر چونکے، جو گھر کے دروازے کے باہر سے آرہی تھی۔ اتنے میں کسی نے بار بار اطلاع کھنٹی بجائی۔ شعاع نے دوڑ کر دروازہ کھولا اور حیران رہ گئی۔

”تاب۔ یہ بکرا۔ کہاں بندھوا نا ہے؟“ رمیض نے گھر میں ٹھتے ہی پوچھا، تاب دار نے حیرت سے شوہر کے پیچھے جھانکا تو سفید رنگ کا بڑا بکرا دکھائی دیا۔

”یہ۔ کیا۔ میرا مطلب ہے۔ بکرا۔ کیوں؟“ تاب دار کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

”ہاں۔ یہ بکرا ہے۔ مگر آپ کا نہیں۔ میری شعاع کا ہے۔“ رمیض کی شگفتگی عروج پر تھی انہوں نے جانور کو اذر لاکر رسی چھولی کے ہاتھ میں پکڑائی۔ وہ صحن میں کٹھے ہو کر بہنوں کو جوش سے آوازیں دینے لگی۔

”وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر ابھی آگے کتنے خرچے پڑے ہیں۔“ وہ جھجک کر بولیں۔

”یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے۔“ رمیض نے بڑی شوخ نگاہوں سے بیوی کو دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔

”میرا بہن نے جو کہا وہ ان کی بڑائی ہے مگر ہم بیٹی کو یوں خالی ہاتھ گھر سے وداع نہیں کر سکتے، میں چاہتی ہوں کہ ہشتم کی شادی میں کوئی کمی نہ ہو کے بعد میں سسرال میں میری بیٹی کا کسی مقام پر بھی سر جھکے۔“

تاب دار نے خود پر ان دیکھا بوجھ محسوس کیا تو آزرگی سے دل کا حال سنایا۔

”اس کی فکر مت کرو سب ہو جائے گا ادھر آؤ۔ آج میں تم سے ایک بڑی اہم بات شیئر کرنا چاہتا ہوں۔“ رمیض تاب دار کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئے اور اپنے قریب بٹھاتے ہوئے تسلی دی۔

”جی کیا بات ہے؟“ تاب دار نے شوہر کو کلنی پر سکون پایا تو پوچھا۔

”کلنی عرصے قبل آفس میں پلاٹ کی ایک اسکیم آئی تھی، قیمت بہت کم تھی میں نے فارم بھردیا۔ اتفاق سے قرعہ اندازی میں میرا نام نکل آیا، میں نے خرید لیا۔ پلاٹ جس جگہ واقع ہے وہ کلنی غیر آباد علاقہ تھا، میں نے فائل اٹھا کر ایک جانب رکھ دی اور بھول گیا۔ اور جب کہ تم ہشمد کی شادی کے انتظامات کے لیے پریشان ہو رہی تھیں تو میں نے اس علاقے کے بروکر سے پلاٹ کی قیمت کا تخمینہ لگایا، تم سن کر حیران رہ جاؤں گی کہ اب اس جگہ کی قیمت تین گنا بڑھ گئی ہے۔“ رمیض کا چہرہ جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔

”او۔ میرے اللہ۔ یہ تو بہت بڑی خوش خبری ہے۔“ تاب دار اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے۔

”ہمیں اب اس کے اتنے اچھے دام مل رہے ہیں کہ نہ صرف ہشمد کی شادی بہت اچھے طریقے سے ہو جائے گی۔ بلکہ سارا قرضہ بھی اتر جائے گا۔“ رمیض نے بیوی کو پکڑ کر بٹھایا اور کاندھے کے گرد ہاتھوں کا گھیرا بناتے ہوئے اپنی خوشی بانٹی۔

”کیا۔۔۔ سچ۔ شکر ہے۔ میرے مالک۔ تو نے ہماری لاج رکھ لی۔ مگر قیمت اچانک کیسے بڑھ گئی؟“ تاب دار نے پہلے تو ہاتھ اٹھا کر شکر ادا کیا، پھر تجسس سے پوچھا۔

”اس کے نزدیکی علاقے میں۔ کلنی سارے کیلکس بنا دیئے گئے۔ لوگ وہاں آکر بس گئے۔ آبادی میں دکانیں بھی کھل گئیں۔ دو سال کے اندر اندر وہ علاقہ اتنا کمرشل ہو گیا کہ آس پاس کی زمینوں کی قیمت ایک دم اوپر چلی گئیں۔“ رمیض نے بستر پر دراز

ہوتے ہوئے بتایا۔

”چلو۔ ایک بڑی فکر سے اتری۔“ تاب دار نے اندر داخل ہوتی بیٹی کو دیکھ کر کہا۔

”بس۔ اوپر والا تو نیت دیکھتا ہے۔ اس نے ہماری عزت رکھنی تھی تو یہ طریقہ ڈھونڈ نکالا۔ آج پلاٹ کا بیعانہ ملا تو میں نے سب سے پہلے قربانی کے لیے بکرا خریدا۔“ رمیض نے ہشمد کے ہاتھ سے پانی کا گلاس تھامتے ہوئے بتایا۔

”آپ نے یہ تو سب سے اچھا کام کیا۔“ تاب دار نے صحن میں بکرے کے پاس گھڑی شعاع کو دیکھتے ہوئے کہا جو بکرے کو چارہ کھلانے میں مصروف تھی۔ اس کی ساری فریزرز صحن میں جمع ہو چکی تھیں۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے

بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

300/-	ساری بھول ہماری تھی	راحت جبین
300/-	ادبے پروا سخن	راحت جبین
350/-	ایک میں اور ایک تم	تنزیلہ ریاض
350/-	بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی
300/-	دیمک زدہ محبت	صائمہ اکرم چوہدری
350/-	کسی راستے کی تلاش میں	میونہ خورشید علی
300/-	ہستی کا آہنگ	شرہ بخاری
300/-	دل موم کا دیا	سائرہ رضا
300/-	ساڈا چڑیا دا چنبا	نفیسہ سعید
500/-	ستارہ شام	آمنہ ریاض
300/-	مصحف	نمرہ احمد
750/-	دست کوزہ گر	فوزیہ یاسمین
300/-	محبت من محرم	بمیر احمد

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

تاب دار کاموں میں مصروف ہونے کے باوجود بیٹی کو نم آنکھوں سے بار بار دیکھ رہی تھیں۔

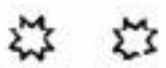
ڈنر کا انتظام ان کے گھر کے لان میں کیا گیا تھا، طعام کھل گیا تو مہمان وہاں جا کر کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔ ان دونوں کو تھوڑی دیر کے لیے تنہائی میں بات چیت کا موقع میسر آ گیا۔

”آپ کا کیا خیال ہے؟ آج ہی رخصتی لے لوں؟“
عکرمہ نے دھیرے سے ہشمتہ کو چھیڑا جو ٹھہر ٹھہر کر اس پر حاوی ہو رہی تھی۔

”جانے آج موسم نے آپ سے رنگ ادھار لیے ہیں یا آپ پر موسم کی خوب صورتی کا اثر ہو چلا ہے۔“
عکرمہ نے قدرے جھک کر کہا تو وہ مزید سمٹ گئی۔
دونوں کی آنکھوں میں مستقبل کے خواب سنبھل گئے۔

”سب کہہ رہے تھے کہ مجھ پر یہ کرنا بالکل سوٹ نہیں کر رہا۔ آپ کا کیا خیال ہے۔“ عکرمہ نے تھوڑی دیر بعد پریشانی سے کہا تو ہشمتہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔
پہلی بار دونوں کی نگاہوں کا ٹکراؤ ہوا، وہ اس کی شرارت سمجھ گئی، ورنہ براؤن کڑھائی والے کرتے میں عکرمہ بہت خوب رو دکھائی دے رہا تھا، ہشمتہ کی محویت پر عکرمہ کے بھرے بھرے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر لوگوں کی موجودگی کے خیال سے ہشمتہ نے جلدی سے آنکھیں جھکا لیں، وہ اپنی پھوپھی حمیرا کو باتیں بنانے کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھی، جو بیٹی کا اتنی بڑی جگہ رشتہ ہونے پر بڑی مایوس دکھائی دے رہی تھیں، مگر ہشمتہ کو آج اپنی ماں کی تمام باتوں پر یقین آ گیا۔

”جن کی نیت صاف ہو، جیت ان کا ہی مقدر ٹھہرتی ہے۔“ وہ سچ کہتی تھیں۔ بند دروازوں کے آگے کھڑے ہو کر مایوسی سے عمر گزارنے کے بجائے کھلے درپچوں سے آئی روشنی کی جانب رخ پھیرنے کا مثبت ہنر سیکھنے والوں کو ہی جیت نصیب ہوتی ہے۔



نکاح کے بعد ہشمتہ کی بہنیں اور کزنز اسے دونوں طرف سے تھامے، چھیڑ چھاڑ کرتی، اپنے جلو میں لے کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ جہاں مہمانوں کو بٹھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ عکرمہ کی پیاسی نگاہیں اپنی دلہن پر رک گئیں۔ چہرے پر گویا خوشیوں کے عکس جھللا اٹھے۔ وہ جب بھی ہشمتہ کو دیکھتا، ہر بار وہ ہلے سے زیادہ خوب صورت دکھائی دیتی مگر آج تو جیسے اگلی پچھلی ساری کسر نکل گئی۔ پرل، سلور ماتھا پٹی والے دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ بڑی لوہے رہا تھا، ہلکا سا میک اپ، ایک سائیڈ پر بنا بالوں کا اسٹائل جس کو گلاب اور موتیے کے پھولوں سے سجایا گیا۔ ہندی کے نقش و نگار سے سجائے گئے جگمگاتی انگوٹھیوں والے نرم ہاتھ۔ ستواں ناک پر بھی سونے کی بالی جس میں ہیرا جڑا تھا۔ عکرمہ نے ایک سانس بھری۔ وہ مزید جھک گئی۔ اب چہرہ صحیح سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”آپ کے وجود سے اٹھنے والی ہلکے گلابوں کو ناشاد کیے دے رہی ہے۔“ ہشمتہ کو پہلو میں بیٹھا دیکھ کر عکرمہ کے دل سے خود بخود صدانگلی خوشیوں کا عکس جیسے اس کے ماتھے پر سجے ٹیکے میں جھللا لگا، عجیب سحر انگیز کیفیت تھی۔ عکرمہ نے سب کی پروا کیے بغیر بڑے استحقاق سے جھک کر اپنی منکوحہ کا بغور جائزہ لیا، تو اس کے کزنز نے میٹھل اور تالیاں بجا بجا کر دلہا میاں کا ریکارڈ لگانا شروع کر دیا، ہشمتہ پر لجاہٹ سوار ہوئی، اس کے مومی ہاتھ کپکپانے لگے۔

عکرمہ اس کے حیا کے رنگوں میں کھو کر، پلکیں جھپکاتا ہی بھول گیا۔ سب نے دل کھول کر تعریف کی، حمیرا کا خوشی سے برا حال تھا، مشہور الگ بھائی بھانج کو دیکھ دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھی۔

مہتاب خانم نے لرزتے ہوئے کھڑے ہو کر کئی بار دلہا دلہن کے پاس جانے کی فرمائش کی مگر نرم خدو خدل والے، کالی شیر والی سوٹ میں ملبوس منظور احمد ماں کو پکڑ کر آرام نہ کر سی، پر بٹھانے لگ جاتے۔ رمیض اور تاب دار مہمانوں کی خاطر تواضع میں لگے ہوئے تھے،

عابدہ احمد

سنگ و پتھر



چند لمحے وہ یونہی ایک دوسرے کو تکتے رہے اور جب اس کا درد (محبت) غصے میں ڈھلنے لگا تو وہ اک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور پاؤں پختے ہوئے اندر کو جاتی روش مضبوط قدموں سے پار کر گئی۔ چھت پہ کھڑے وجود نے بہت ضبط سے یہ منظر دیکھا تھا اس کا خیال تھا روٹھنا، غصہ کرنا صرف اسی کا حق ہے، لیکن اس محبت سے گندھی لڑکی کا ایساری ایکشن دینا اسے نئے سرے سے ناؤ دلارہا تھا۔



وہ چلی گئی تھی اور وہ یونہی چھت پہ جما کھڑا کتنی دیر تک اس جگہ کو تکتا رہا جہاں سے وہ اندر غائب ہوئی تھی۔ وہ جو اسے کئی دنوں سے انور کر رہا تھا۔ اسے خود کو روکیے جانا، ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ ”وہ سارے وعدے کیا ہوئے؟ دعویٰ۔ بیان۔ چاہت۔ سوچوں کا تعفن اس کے دماغ میں پھیلنے لگا۔

”بس ایک خواہش تو تم پوری نہ کر سکیں۔ پوری زندگی کیا خاک ساتھ نبھاؤ گی؟“ اپنے اندر عدالت لگائے منصفی کے منصب پہ فائز سارے گناہ ہی اس کے کھاتے میں ڈال کر وہ خود بری الزمہ تھا۔

”چلو پھر بی بیوں تو یوں ہی سی۔“ پتا نہیں کیا سوچ کے کیا سوچنے کا فیصلہ کر لیا تھا اس نے۔ سینے میں عجیب سی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر یونہی ادھر سے ادھر چکرانا چھت پہ پڑے پتھروں کو ٹھوکروں سے اڑاتا رہا۔ پھر بھی بے قراری میں کمی کی بجائے اضافہ ہی ہوا۔ یکایک اس کے سر میں شدید درد اٹھا تھا۔ چائے کی طلب نے اسے زیادہ دیر چھت پہ ٹہلنے نہ دیا۔ سر کو دبانا، دھڑا دھڑا سیڑھیاں اترنا، وہ نائلہ (چھوٹی بہن) کے کمرے کی طرف آگیا۔ اس کا دروازہ دھکیل کر کھولنے کو اٹھا ہاتھ اندر سے آنے والی آوازوں نے روک دیا۔

”تو پھر اب کیا کرو گی۔“ یہ صائمہ (سائرہ کی چھوٹی بہن جو کہ نائلہ کی ہم عمر ہی تھی) کی آواز تھی۔ وہ چہرے پہ ناگہمی کے تاثرات لیے دروازے سے

سرخ صاف شفاف اینٹوں کا فرش آوارہ ہوا کے گولوں سے چکراتے قدموں میں بکھرتے سوکھے پتوں سے بھر چکا تھا۔ کئی پتے اس کے قدموں کے نیچے آکر چر مرا گئے۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس کا نرم و نازک دل کسی بے درد کے ہاتھوں میں آکر چر مرا گیا تھا۔ وہ مزید اداس ہوئی اسے اپنی قسمت بھی بالکل ایسے ہی محسوس ہوئی۔ ٹوٹتے پتوں کی طرح ڈولتی۔ بکھرتی۔ وہ بے قرار ہو کر یہاں سے وہاں چکراتی اپنے لٹے ہاتھ کی تیسری انگلی میں پڑی انگلی گھمانے لگی۔ کبھی اتارتی چڑھاتی، کتنے خیالات اس کے ذہن کی چوکھٹ پار کر کے اس کے دماغ میں ادھم مچانے لگے۔ اس کا سردھم دھم بچنے لگا۔ اسے لگا وہ گر جائے گی۔ صحن میں نیچے کو جاتی بنی چار سیڑھیوں میں سے دوسری پہ وہ تھکے تھکے سے انداز میں بیٹھ گئی۔

”شاید آندھی آنے والی ہے۔“ سر اٹھا کر گدلے سے آسمان کو دیکھا کچھ دیر یونہی گردن پیچھے گرائے آسمان کو تکتی رہی۔ ذہن میں جانے کیا چل رہا تھا۔ وہ تو یہ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی کہ وہ سوچ کیا رہی ہے؟ وہ تھک چکی تھی۔ پچھلے کئی دنوں سے اس کے اندر جاری جنگ نے اسے ادھ موا کر دیا تھا۔ اسے کسی پل قرار نہیں آیا تھا اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کسے رازداں بنائے کسے وحشتوں کا سا بھی۔ وہ جو زندگی بھر کا سا تھی تھا اسی کی تو دان کی ہوئی یہ سوغات تھی۔ بے چینی کی سویاں بھی تو اسی نے جسم میں چھوئی تھیں جن کی اذیت وہ روح تک میں محسوس کر رہی تھی۔ وہ کیسے یہ سویاں بدن سے نکالتا۔ اک آہ سی اس کے لبوں سے بے آواز نکلی تھی۔ اچانک اس کی نظر گھر کی چھت کی طرف اٹھی تھی۔ گھر کے چاروں طرف گولائی میں بنی چھت پہ وہ دونوں بازو نکائے اس نظر میں جمائے جانے کب سے کھڑا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اس کے دل میں درد کا ایک نیا طوفان سر اٹھانے لگا۔

”محبت جب درد بن جائے تو بہت اذیت دیتی ہے۔“ اس کی تو روح تک میں اذیت گھس آئی تھی۔

بالکل لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تھی تو انتہائی زنانہ اور غیر اخلاقی حرکت لیکن اسے جانے کیوں صائمہ کی آواز میں ایک غیر معمولی پن محسوس ہوا تھا اس لیے وہ متحسب ہو گیا تھا جاننے کے لیے۔

”تم جانتی ہو کہ میں ناصر کی یہ فرمائش پوری نہیں کر سکتی۔“ نائلہ کی بھرائی آواز سے اس کے کان مزید کھڑے ہوئے۔ یہ کس بارے میں بات کر رہی ہے۔؟ الجھن کے آثار اس کے چہرے پر نمودار ہوئے۔ ناصر اس کے ماموں کا بیٹا اور نائلہ کا بچپن کا منگیتہ تھا اچھا خاصا سمجھ دار لڑکا تھا اس کی نظر میں۔

”اگر وہ ناراض ہو گیا تو۔۔۔“ صائمہ کی آواز میں ایک رازدار سیلی کی سی فکر مندی تھی۔

”ناراض تو وہ ہو گیا۔“ اس کی آواز میں پھیکا پن تھا۔

”مطلب وہ ناراض ہے اور تم یونہی بیٹھی آنسو بہاتی رہو گی بجائے اس کے کہ اسے مناؤ۔“ اب شاید صائمہ اس کی بیوقوفی پر جھنجھلائی تھی۔

”تمہارا کیا خیال ہے میں نے نہیں منایا اسے۔ اتنی منتیں کیں۔ سمجھایا مگر نہیں وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ مجھ سے ملو۔ عید پہ کوئی بہانہ کر کے گھر سے نکلو۔ دماغ کی وہی کردی اس ناصر کے بچے نے۔“ اب کہ نائلہ نے اصل بات انتہائی حقے ہوئے انداز میں اگلی جو کہ باہر دروازے سے لگے کھڑے تو قیر کے گلے میں ہڈی بن کر پھنس گئی اسے ایک دم سے اپنے کزن ناصر۔ ڈھیر سارا غصہ آیا۔

”شکل کتنی شریفوں والی ہے اور کروت۔“ اس کا دماغ کھولنے لگا۔

کیا سوچ کر اس نے میری بہن کو یوں ورغلانے کی کوشش کی۔ جب گھر میں آنے جانے کی کوئی روک ٹوک نہیں تو پھر اکیلے میں ملنے۔؟ اسے تو میں پوچھتا ہوں۔“ روایتی بھائی کی غیرت بھرپور انگڑائی لگے کر بے دار ہوئی تھی۔ اندر جانے وہ دونوں اور کیا باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ دروازہ زور سے دھکیل کر وہ اندر داخل ہو گیا۔ بیڈ پہ ایک دوسرے

کے قریب بیٹھی باتیں کرتی وہ دونوں چونکی تھیں۔

”بھائی آپ“ دونوں نے اس کے غصیل چہرے پہ چسپاں عبارت کو جیسے پڑھ لیا تھا۔ اس کے تیور انہیں ڈرانے کو کافی تھے۔ ویسے بھی اس گھر کا اکلوتا لڑکا ہونے کی وجہ سے ساری نئی پود اس کے رعب تلے دبی رہتی تھی۔ اپنی دو بہنیں اور چچا (سامہ کے ابو) کی سامہ سمیت تین بیٹیاں سب اس سے چھوٹی اور ڈرنے والوں میں سے تھیں۔ نائلہ کے سہمے چہرے میں اسے کسی کی مانوس سی جھلک دکھائی دی۔ کس کی جھلک تھی یہ؟ اسے یاد آیا ابھی کچھ دن پہلے بالکل یہی سرا سمگی سامہ کے چہرے پہ بھی ابھری تھی۔ جب اس نے۔۔۔ ہاں تو کیا فرق ہوا؟ مجھ میں اور ناصر میں۔“ اندر کوئی ایک دم سے آئینہ لیے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس سے اپنا چہرہ اس آئینے میں دیکھا نہ گیا۔ وہ نظریں چرانے لگا۔ سارا غصہ شرمندگی میں ڈھل چکا تھا۔

”بھائی۔“ نائلہ کی کانپتی آواز میں بھائی کی پکار نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ اس کا دل ایک دم موم ہوا تھا۔ ورنہ تو وہ نائلہ سے سخت باز پرس کے ارادے سے ہی اندر داخل ہوا تھا۔

”ہاں! وہ میں۔۔۔ میں“ اسے مناسب الفاظ نہ سوچنے یوں دندناتے بہن کے کمرے میں گھس آنے کے لیے۔ بھائی کو تذبذب میں پا کر نائلہ نے ”شاید بھائی نے نہ سنا ہو۔“ کی امید کا سرا تھا۔

”کچھ چاہیے تھا بھائی۔“ ہچکچاتے ہوئے اس کے الفاظ نے تو قیر کی مشکل آسان کر دی۔

”ہاں نا! سر میں درد تھا اگر میری گڑیا چائے بنا دے تو۔“ دو قدم چل کر بیڈ کی طرف آیا اور اس کے بال بکھیر ڈالے۔ دونوں کی انگلی سانسیں بحال ہوئی تھیں اس کا بحال ہوتا موڈ دیکھ کر۔ اس نے مسکراتے ہوئے سر ہلادیا تھا اور بیڈ پر سے اترنے لگی کہ اس نے روک دیا۔

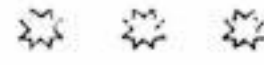
”چلو چھوڑو! یوں کرو یہ رکھو۔“ اس نے کچھ سوچ کر اپنی جینز کی پاکٹ سے والٹ نکال کر ہزار کے دو نوٹ نکال کر نائلہ اور صائمہ کی ہتھیلی پر رکھے۔ دونوں

کی آنکھیں بھائی کی کمال سخاوت پہ چمک اٹھیں۔
”تھینک یو بھائی“ کوئی کام ہے ہم سے۔ ”صائمہ“
آنکھیں گول گول گھماتے ہوئے شوخ ہوئی۔

”انڈر اسٹڈی بات ہے کہ اس دنیا میں کچھ بھی
فری نہیں۔ اب جیسے کہ اس نوٹ کی قیمت آپ
دونوں ناریوں کو ابھی کے ابھی چکانی ہے۔“ وہ بھی اسی
کے انداز میں شوخی سے بولا تو دونوں کھلکھلا کر ہنس
پڑیں۔

”آپ بے فکر ہو کر چھت پر چلے جائیں۔ آپ کا
چاند وہاں طلوع ہو چکا ہے۔“ نائلہ اس رشوت کا کارن
سمجھ گئی تھی اس لیے اس کی طرف جھک کر رازداری
سے بولی تو اس نے مصنوعی گھوری ڈالتے ہوئے اس
کے سر پر چپت لگادی۔ اب کی بار وہ تینوں ہنس دیے
تھے۔

”اور ہاں! ناصر کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔
تمہارا بھائی اسے سمجھالے گا۔“ وہ جاتے جاتے مڑا
تھا۔ ایک میل کو نائلہ کی سانسیں رکی تھیں۔ لیکن پھر
جیسے بھائی کے الفاظ نے اس کامنوں بوجھ اتارا تھا۔ وہ
گیلی آنکھوں سے ہلا گئی۔



کچھ ماہ پہلے ہی محلے میں آنے والی صداقت راؤ کی
فیملی سے یونین سرسری سی ہونے والی ہیلو پائے کچھ ہی
دنوں میں اچھی خاصی دوستی میں بدل چکی تھی۔ توقیر
اور سمیع راؤ اب تقریباً ”ہمہ وقت ساتھ ہی پائے
جاتے۔ بڑا فرینڈی اور ہنس مکھ بندہ تھا یہ سمیع راؤ۔
ہمیشہ گھسیٹ کر توقیر کو اپنے گھر اور یار دوستوں کی محفل
میں لے جاتا۔ حتیٰ کہ اپنی منگیتر سے بھی اسے زبردستی
ملوا کر اور دوستی کروا چکا تھا۔ اس کی منگیتر کہاں کسی سے
پیچھے تھی جب سمیع کی لائن بڑی ہوتی تو اسے فون
کردیتی اور گھنٹوں اس کا سر کھاتی رہتی۔ اس کی بے
وقت کالز کی وجہ سے تو اسے گھر میں بھی کافی پریشانی کا
سامنا کرنا پڑا تھا۔ امی (توقیر کی امی) کو تو یقین ہو گیا تھا کہ
لڑکا کسی دوسری کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ وہ تو اس کے سر

ہو گئیں۔

”کیوں اپنے باپ اور پورے خاندان سے ماں کی
تربیت کے بارے میں گوہر افشائیاں کروانی ہیں۔ جو
بھی چیزیں ہے سچ سچ بتادے مجھے۔“

سو اس نے بڑی مشکل سے سمیع سے بات کر کے
اس کی منگیتر کی بے وقت کالز کا سلسلہ بند کروایا تھا۔
ابھی تو صرف اماں کو شک ہوا تھا۔ ایک ہی گھر ہونے کی
وجہ سے اس کی سسرال چھوڑا اگر اس کی منکوہہ سائرہ
کے دماغ میں بھی اگر شک کا کیرا گھس جاتا تو اس کی
ناک میں دم آجاتا۔

سائرہ جو اس کے اکلوتے چچا کی دو بیٹیوں میں سب
سے بڑی تھی۔ اس کی پہلی محبت کزن اور منکوہہ
تھی۔ جانے کب بچپن میں ہی دونوں کا نکاح کر دیا گیا
تھا۔ دونوں ہی اپنے اپنے ماں باپ کی پہلی اولادیں۔
سارے چاؤ ان ہی پہ پورے کیے گئے حتیٰ کہ نکاح کا
ارمان بھی ان کے بچپن میں ہی نکال لیا گیا تھا اور اب
ان کے بڑے ہونے پہ سب ٹھنڈے ہو کے بیٹھے
ہوئے تھے۔ ایک ہی راگ ملہا سائرہ سمیت دونوں
کے والدین کے منہ پہ چڑھا رہتا ”پہلے تعلیم پھر شادی
کی بین“ وہ بہت تاؤ دکھاتا تھا کہ جب ہوش نہیں تھا
اس وقت پکڑ کر نکاح کروا دیا اور اب جب وہ روندو سی
لڑکی ایک ہی گھر میں ہمہ وقت سامنے رہتے ہوئے
ہوش اڑائے رکھتی تھی اس کی کسی کو پروا نہیں تھی۔
یہ نہیں تھا کہ ملنے بات کرنے پہ پابندی تھی۔ لیکن
وہی آزادی بھی نہیں تھی جو اس نے سمیع کے قریب
رہ کر اس کے اور اس کی منگیتر کے مابین محسوس کی
تھی۔ جہاں وہ جسمانی طور پر بڑا ہوا تھا وہیں
”خواہشوں“ کا آتش بھی تو اس کے ساتھ مل کر جوان
ہوا تھا وہ کیا کرتا۔ سب یار دوست اپنی اپنی گریڈ فرینڈز
اور منگیتروں کو کسی اعزاز کی طرح ساتھ لیے گھومتے
اور وہ ایسی کسی بھی گید رنگ میں غلو بن کے رہ جاتا۔
شروع شروع میں تو اس نے اتنا خیال نہیں کیا۔ اس
کے گھر کا ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ لحاظ تمام رشتوں میں
موجود تھا اب چاہے وہ اس کی منکوہہ کیوں نہ ہو؟ کھلی

چھوٹ آزادی کا کوئی تصور نہ تھا۔ گھر کے چیدہ چیدہ معاملات کی دیکھ رکھ اور کئی فیصلوں کا اختیار اس کے ابو اور چچا جان کے پاس تھا۔ خواتین سے صلاح مشورہ ضرور کیا جاتا لیکن آخری حرف ان دونوں بھائیوں کا ہی ہوتا تھا۔

وہ اسے بالکل نارملی ایک کزن کے طور پر ہی لیتی تھی۔ وہ شروع دن کی ہچکچاہٹ، شرماہٹ تو کب کی قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ کیا خوب احساس تھا۔ جب بڑے ہونے پہ پتا چلا تھا کہ وہ اس کے نام لکھی جا چکی تھی۔ ان دنوں اسے اپنا آپ معتبر اور منفرد سا لگتا تھا۔ سا بھی لڑکوں میں ایک فخر سا اس کا سینہ پھیلائے رکھتا۔ اور وہ بھی تو لجائی سی سارے میں پھرا کرتی تھی۔ جانے پھر کیا ہوا کون سا انقلاب آیا کہ وہ چھوٹی موٹی سے کیکر کا درخت بن گئی۔ اول تو کوئی ذمہ معنی بات کرنے کی نوبت ہی نہ آتی اور اگر کبھی قسمت سے یہ موقع مل بھی جاتا تو وہ ایسی ہو جاتی جیسے کہ نیچر ٹالاق شاگرد کے ٹاپک سے ان ریلیٹڈ سوال پوچھے جانے پہ گھورتا ہے۔ بڑی مصیبت تھی وہ اپنے جذبات اپنے محسوسات اس تک پہنچانا چاہتا تھا، لیکن وہ چکنی مٹی کا گھڑا بنی رہتی نہ پنکوں کی لرزش نہ گالوں کی لالی نہ چیختی انگلیاں بالکل کوری تھی وہ یا پھر ظاہر ایسے کرتی تھی۔ اسے تو اب یہ شک بھی ہو چلا تھا کہ اسے اس سے ویسی والمانہ محبت نہیں ہے جیسی کہ اس کی خواہش تھی ورنہ لڑکیاں کیا کیا نہیں کر گزرتیں اپنے منگیتر کو خوش کرنے کے لیے اور یہاں تو معاملہ منگیتر سے بھی ایک درجہ اوپر کا تھا یعنی کہ شوہر کا۔ اسے بھی اب ضد ہو چلی تھی کہ ایک بار تو اس سے اپنی منوانی ہے۔ یہ کیا؟ ہمیشہ وہی بیسے شوہر کی ایکٹنگ کرتا رہے کبھی تو بی بی بھی نکلے نا اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد سے۔ قربت کے کتنے مواقع صرف سائزہ کے ٹھس پنے سے وہ گنوا چکا تھا۔

”وہ مجھ سے دور کیوں ہے۔“ یہ سوال اس کا بلڈ پرے شہر بھادریتا اور اس کا گھسا پٹا جواب

”کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ ابھی تمہیں صرف اپنی

تعلیم پہ توجہ دینی چاہیے۔“ لیکن اس کی تشفی ہونے کی بجائے مزید غصہ عود کر آیا۔

”تو اس کا مطلب کیا ہوا تمہیں مجھ پہ اعتبار نہیں یا میں ہی تمہیں پسند نہیں۔“ الفاظ اس نے اپنے دانتوں تلے چبا ڈالے۔

”تمہارا آخر مسئلہ کیا ہے؟ کیوں ہر دو سرے دن یہ بے تکیے سوالات پوچھ کر میرا دماغ چاٹ جاتے ہو۔“ وہ تو شاید پہلے ہی کسی بات پہ جلی بیٹھی تھی اس لیے ایک دم ہی چڑی تھی۔

”مسئلہ میرا نہیں تمہارا ہے اور یہی میں جانا چاہتا ہوں کہ تم میری ہر بات کی نفی کیوں کرتی ہو۔“ اپنے غصے کو فی الوقت کنٹرول کرتے ہوئے اس نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

”میں تمہاری ہر بات کی نفی نہیں کرتی صرف بے تکی باتوں کی۔“ اس کا جواب اسے جھلسا گیا۔

”کون سی بے تکی بات کر کے میں نے جنابہ کی شان میں گستاخی کر ڈالی؟“

”تمہیں پتا ہے میں کیا بات کر رہی ہوں۔ شادی سے پہلے میں تمہاری کوئی فرمائش پوری نہیں کروں گی۔ یہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے پھر بھی۔“ اس کا لہجہ دو ٹوک اور ہموار تھا اس نے بڑے ضبط سے اپنی مردانگی (اس کے خیال میں) کی نفی برداشت کی تھی۔

”میرے کچھ دوستوں نے عید کی رات کو کھلڑ کی گیٹ ٹو گیدر اریج کی ہے۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتا ہوں اس بار۔ گھر میں کیا بہانہ کرنا ہے اب یہ تم پر ہے۔“ سرد تر حتمی لہجے میں اس نے کہا۔

گو کہ یہ سچ تھا کہ سمیع لوگوں نے اس بار بھی عید کی رات کو میوزیکل شو کا پروگرام بنایا تھا اور اسے بھی اپنی منگیتر کے ہمراہ آنے کی دعوت دی تھی۔ ہریار کی طرح اس نے ایسی کسی بھی محفل میں شمولیت سے معذرت کر لی تھی، لیکن جانے کیا سوچ کر اس نے یہ بات کر دی تھی اور جواب بھی وہ جانتا تھا، لیکن پھر بھی۔ کبھی کبھی ہم دوسروں سے زیادہ خود کا امتحان لینے کے لیے کچھ ایسی مانگیں کر بیٹھتے ہیں جو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ

پوری نہ ہوں گی۔ وہ اس سے زیادہ خود کا ضبط آزار ہا تھا کہ کہاں جا کے یہ طنائیں ٹوٹی ہیں۔ ”ہرگز نہیں۔“ تین حریفی جواب کو دینے میں اسے کئی سو روزیاں کے گوشوارے کھنگالنے پڑے تھے۔ اس کا جواب سن کر اس کا چہرہ کسی ربڑ کی طرح کھینچ گیا۔

”شرطوں پہ محبت نہیں تجارت ہوتی ہے۔ تم چاہے جتنے بھی ناراض ہو جاؤ میں ایسا کام کبھی بھی نہیں کروں گی جس کی وجہ سے ہمارے گھر والوں کی سبکی ہو۔“ انگلی اٹھا کر خود کو گھورتے تو قیر کی آنکھوں کے آگے لرائی۔

”اچھا! اپنے شوہر سے زیادہ تمہیں سب کی فکر ہے۔ میری عزت کی کوئی پروا نہیں؟ میری کتنی انسلٹ ہوگی دوستوں میں۔“ اس نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا لیا تھا۔

”بہت خوب! تمہاری عزت بنانے کے لیے میں اپنی عزت تمہارے ہاتھوں گروی رکھ دوں؟“ اپنا بازو چھڑاتے ہوئے اس نے انتہائی دکھ سے کہا تھا۔

”کیوں اپنے ماتھے پر ذلت کی مہر لگوا لوں۔ کیوں؟ وہ گیلی لکڑی کی طرح سلگی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیسے اس شخص کے دماغ میں سوراخ کر کے وہ سب کچھ انڈیل دے جس کے خدشے اسے لرزاتے تھے۔ وہ جو خود پہ بے نیازی کا خول چڑھائے رکھتی تھی اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اسے اس سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ راتوں کو بے جا جانے والے اس کے سپنوں کا بے تاج بادشاہ تھا۔ گھر میں چلتے پھرتے اس کی ایک جھلک اس کے اندر طمانیت پھیلا دیتی تھی۔ وہ تو آنے والوں کی آہٹ اور دستک تک میں سے اس کا مخصوص انداز پہچان جاتی تھی۔ وہ نجانے کیوں ایک دم سے تنہائی میں ملنے۔ قربت کی چاہ میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ تو اس کے سامنے رہتی تھی۔ سارا دن۔۔۔ پھر کیا تھا؟

”او نہ! ذلت۔۔۔ پتا بھی ہے یہ ذلت ہے کیا بلا؟ بس رسالوں سے دوچار لفظ پڑھ کر خود کو استائی جی ثابت کرنے پر تلی رہی ہو۔“ استہزائیہ لب و لہجہ وہ لب

بھینچے اسے دیکھتی رہی۔

”ذلت تو میری ہوگی یا دوستوں میں۔ تمہارا کیا جائے گا۔ گھر اور کالج کے علاوہ تمہاری دنیا میں اور ہے کیا؟“

”لڑکیوں سے زیادہ ذلت کا مفہوم اور کون جانتا ہوگا۔ یہ ایک ایسی بلا ہے جس پہ کوئی دم درود اثر نہیں کرتا۔ یہ جس پہ سوار ہو جائے وہ ساری عمر اس لاشہ اٹھائے پھرتے ہیں۔ دفنانے کو دو گز زمین بھی نہیں ملتی۔“ اس کی بات اور لہجہ بہت گہرائی لیے ہوئے تھا۔ سمجھنے والا سمجھ جاتا، لیکن وہ ایسی سمجھ پہ ہزار لعنت بھیجتا تھا جو اسے دل کی کرنے سے روکے۔

”رسالے ذرا کم پڑھا کرو بالکل میری ماں کی کاربن کاپی لگ رہی ہو ذلت پہ لیکچر دیتے ہوئے۔“ وہ بے مزا ہوا تھا۔

”بہر حال عید آنے میں ابھی کچھ دن ہیں۔ سوچنا ضرور اس بارے میں جب تمہارا جذباتی پن کا دورہ ختم ہو جائے۔“ اسے آگ لگا کر وہ بر سکون ہو گیا تھا۔

”بڑا بے نیازی کا گلشیر بنتی تھیں۔ اب پکھلو۔“ کھینچی سی سوچ اس کے ذہن میں آئی تھی۔

”ابھی بیوی نہیں بنی ہوں۔ منکوہ ہوں صرف منکوہ۔“ وہ چبا چبا کر منکوہ پر زور دے کر بولی تھی۔

”میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمہاری ہاں کا منتظر رہوں گا۔ ورنہ رات کو نوبت کے بعد صرف پانچ سو میں بیوی مل جاتی ہے ایک رات کے لیے۔“ یہ تو کہنے کا اس کا بالکل ارادہ نہیں تھا، لیکن منہ سے نکل گیا تو وہ خود کو از حد پر سکون ظاہر کرتا اس کا سارا سکون غارت کر کے چلتا بنا۔ پیچھے وہ کھلے منہ اور ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کی پیٹھ تکتی اس کی آخری بات کا وزن ہی کرتی رہ گئی۔

وہ سوچ کے در پر پہروں بیٹھی رہتی، لیکن کوئی حل نظر نہ آیا۔ کالج میں تبھی غائب دماغی سے لیکچر سنتی رہتی پوچھو چائے کی کہتی مصر کی۔ گھر آتی تو بھی گپ چپ سی کتابیں پھیلائے بیٹھی رہتی۔ وہ تو شکر تھا کہ سارے میں آج کل بقر عید کا غلغلہ اٹھا ہوا تھا اس لیے مرد

حضرات تو دکان کے بعد بکروں کے پیچھے بکرا منڈی میں ہی زیادہ وقت بتاتے اور گھر کی خواتین روز مرہ کے دھندوں میں الجھی رہتیں۔ وہ وہی بہنیں تھیں صائمہ اور وہ۔ بھائی کوئی تھا نہیں، سو اس طرف سے تو اسے سکون تھا ورنہ کسی کا بھی دھیان اس کے بچھے چہرے پہ پڑ جاتا تو سوالات نے اسے ناک تک عاجز کر دیتا تھا۔



زیادہ پرانی بات نہیں تھی جب ان دونوں کی اپنے درمیان موجود رشتے سے آشنائی ہوئی تھی۔ سنتے تو بچپن سے آئے تھے سمجھا اب تھا۔ محسوس اب ہوا تھا۔ ان دیدہ سی کشش دونوں کو ایک دوسرے سے تھوڑا قریب لے آئی تھی۔ لڑکپن کا شمار کچھ وعدے، یہاں ان دیکھی جذبوں کی زنجیریں ان کے پاؤں سے آپٹی تھیں۔ وہ مرد تھا رقص بھی کرتا تو ان زنجیروں کا شور اس کی اپنی ذات کے اندر ہی گنبدوں میں گونجتا رہتا۔ پر وہ لڑکی تھی ایک پاؤں بھی ذرا زور سے اٹھاتی تو چھنا چھن سارے جہان کو سنائی دیتی اور سب سے پہلے سننے والوں میں سے اس کی تائی ہی تھیں گو کہ وہ کوئی روایتی کردار نہیں تھیں، لیکن کبھی کبھی روایتی پن ان کے لہجے میں جھلک ہی پڑتا۔

اس دن بھی تائی معمول کی طرح ان کے پورشن میں بیٹھی امی کے ساتھ پالک تڑوا رہی تھیں تو قیر کرکٹ میچ کھیلنے کے بعد ان کو ڈھونڈتا وہیں چلا آیا۔ امی نے فوراً ہی آواز لگا کر اسے اسکول کے کام سے اٹھا کر تو قیر کے لیے مینگو شیک بنانے کو کہا۔ اندر کمرے میں پڑھتی سائرہ تو قیر کے نام کی پکار سنتے ہی چھلانگ لگا کر اٹھی تھی اور آسنے کے سامنے جا کھڑی ہو گئی جلدی جلدی درازیں کھنگالیں۔ میک اپ کے نام پہ صرف ایک کاجل ہی مل سکا کہ امی اسکول کالج جانے والی لڑکیوں کے میک اپ کی اشیاء تک رسد کے نمل خلاف تھیں اسی کو غنیمت جانتے ہوئے جلدی جلدی گہرا کاجل لگا اور چوٹی میں بندھے بالوں کے اوپر سے ہی برش پھیر کے باہر کو بھاگی کہ آوازوں پر آوازیں

پڑ رہی تھیں جیسے ہی وہ لیونگ روم میں بیٹھی تائی کے پاس سے گزری تو انہوں نے بغور اس کی کاجل سے اور اپنے فرزند کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر در آنے والی چمک کو دیکھا تھا۔ وہ کچھ ہی دیر میں مینگو شیک کا ایک بڑا سا ٹھنڈا ٹھار گلاس لیے چلی آئی قبل اس کے کہ وہ گلاس تو قیر کو پکڑا تو اس کے ساتھ بیٹھی تائی نے گلاس اچک لیا۔ تو قیر کا برہا ہوا امی کا پالک کے پتے توڑتا ہاتھ بیک وقت ساکت ہوا تھا۔

”چل تو گھر۔ کتابیں کھول کے بیٹھ اپنی سارا دن آوارہ گردیاں ہی ختم نہیں ہوتیں تیری۔“ ملک شیک کی ٹھنڈک ان کے کبھے میں بھی اتر آئی تھی۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی ماں کا موڈ سمجھ گیا تھا اس لیے بلا جیل و جت اٹھ کھڑا ہوا۔

”یہ لے جا۔“ اسے قدم بڑھاتے دیکھ کر انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا گلاس اس کی طرف بڑھایا تھا۔ وہ بس ”جی“ ہی کہہ سکا۔ امی حیرانگی سے آیا کا بدلتا موڈ اور لہجہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ”یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا آپا کو“ وہ حیرت میں گھری سوچ کر رہ گئیں۔

”سائرہ بیٹا! لڑکی کی آنکھ میں حیا کی سرخی سے زیادہ کوئی کاجل، سرمہ نہیں چچتا۔ جا کے منہ دھو اور ساتھ ہی ایسا کوئی خیال بھی اس نالائق کے لیے سجنے، لہانے کا نہ لائے۔ ابھی رخصتی میں بڑا ٹائم ہے اتنا اچھی نہ لگ اسے کہ جب تمہارا ٹائم آئے اسے تم میں کچھ پسند نہ آئے۔“

زین۔ زین۔ زین۔ اس کے اوپر سے ریل گزر گئی تھی۔ وہ شرمندگی کے دریا میں ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔ امی کی کٹیلی نگاہیں سمہ ہن کی خطرناک حد تک ہاں میں ہاں ملانے والی تھیں تائی تو کہہ کر پھر سے پالک چننے لگی تھیں اور وہ بولنے سے بھی قاصر تھی۔ بس اس دن سے وہ رک گئی تھی۔ وہیں اور وہ اندھا دھند بھاگتا بہت آگے نکل گیا تھا۔



مرد فطری طور پر حاکمیت پسند اور جارح ہوتا ہے اور

پیوی سے بڑھ کر اس مشق ستم کا بہتر مددگار اور کوئی نہیں ہوتا۔ وہ بھی ایک مرد ہی تھا۔ عام مرد۔ خاص مرد بھی عام ہی بن جاتا ہے پیوی کے معاملے میں۔ خصوصیت صرف پسندیدہ پیوی کے حصے میں ہی آتی ہے وہ اسے بہت پسند تھی۔ دل بھاتی، دل ربانی کے گر سے نا آشنا۔ پہلے پہل وہ اس کے نفس جذبات سے عاری چہرے کو پھر بھی کسی طور برداشت کر لیتا تھا، لیکن جب سے سب کی سنگت ملی تھی وہ اس سے جانے کیسی کیسی امیدیں لگا بیٹھا تھا۔ کسی بھی خواہش کے جواب میں اس کے پاس ایک لمبا جوڑا اخلاقیات اور اس معاشرے کے اصولوں سے بھجھوتہ کرنے والا لیکچر موجود ہوتا تھا جو اس کا حلق تک کڑوا کر دیتا اور کتنے ہی دن وہ منہ پھلائے پھرتا رہتا، لیکن وہاں پروا کسے تھی؟ یہ اس کا محض خیال تھا وہ بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتی تھی، لیکن لڑکی تھی یوں شتر بے مہار کی طرح ”محبت“ جیسے اڑیل گھوڑے کو نہیں چھوڑ سکتی تھی وہ ڈرتی تھی معمولی لغزش سے پاؤں کہیں گندگی میں نہ جا پڑے۔ چھینٹے تو اسی پہ بڑے تھے اور وہ ان لوگوں میں سے تھی جو جسمانی صفائی اور روحانی بالیدگی پہ یقین رکھتے ہیں۔ اسی لیے کنھور پنے کی سرحدوں پہ جا کھڑی ہوئی اور اس باؤنڈری لائن کے اس پار کھڑے تو قیر کے دماغ سے عقل نامی شے بخارات بن کر ہوا میں تحلیل ہونے لگتی اور پیچھے بس غصہ۔ بہت غصہ، بے تحاشا غصہ رہ جاتا۔ اور اسی غصے میں اب کی بار وہ اسے آزمانے کو یہ چیلنج دے گیا تھا۔

ابھی تو اسے اور ستانے رلانے کا پروگرام تھا اس کا کہ یونہی اچانک بے دھیانی میں نائلہ اور صائمہ کی باتیں سن لیں۔ نائلہ کے منگیتر کا اکیلے میں ملنے کا مطالبہ اور اس کی پریشانی جان کر اس کی برادرانہ غیرت کا سویا ہوا شیر ایک دھاڑ سے بے دار ہوا تھا۔ وہیں اس کے اندر آئینوں کا جیسے شیش محل آگ آیا تھا اسے خود یہ ندامت محسوس ہوئی تھی۔ شرمندگی۔ پچھتاوا۔۔۔ نائلہ کی آواز کا دکھ اس کے دل میں اتر گیا تھا۔ وہ بھی تو کتنے دن سے ڈسٹرب تھی روئی روئی آنکھیں اور سرخ

ناک لیے سارے میں پھرا کرتی، لیکن اس کے اندر خواہشات کی جلتی لکڑیوں پہ ایک دم سے ڈھیر سارا پانی آگرا تھا۔ یہی تو۔ یہی بے چینی۔ کسک۔ تکلیف۔ دھیمی دھیمی سلگتی آج اس تک بھی پہنچ ہی گئی تھی وہ پکھل رہی تھی۔ بس۔ اسے اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔ خواہش پوری ہوئی۔ مردانگی کا زعم برہا تھا، لیکن ابھی وہ صحیح سے اس کی یہ پل پل بدلتی کیفیات سے لطف اندوز بھی نہیں ہو پایا تھا کہ کسی کا ویسا ہی مطالبہ اپنی بہن کے لیے اس سے برداشت نہ ہوا۔ وہ اپنی خواہشوں کے اڑن کھٹولے میں اونچا اڑتا کیسے فوراً ہی نیچے آیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ دماغ کی گریں بھی کھل گئی تھیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے منانا ہے۔ ہاں اس سے غلطی ہوئی تھی، لیکن اسے اپنی محبت پہ یقین تھا کہ وہ اس کی سنے نہ سنے محبت کی لاج ضرور رکھے گی۔ وہ بڑے شگفتہ موڈ میں چھت کو جاتی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ جہاں پہ باوثوق ذرائع (ناکلیہ اور صائمہ) سے کنفرم اس کی موجودگی کی اطلاع تھی۔

باہر کا موسم کتنا خوش گوار ہو چلا تھا آندھی آنے کے بعد بارش کی ہلکی پھوار سے گرد بیٹھ چکی تھی۔

”کاش کہ انسانی جذبوں اور ذہنوں پہ بھی جی گردیوں صاف ہو جائے۔“ ایک خاموش خود کلامی اس کے اندر ابھری تھی۔ وہ اک گہرا سانس بھرتے ہوئے یونہی چلتی گولائی میں بنی منڈیر سے نیچے جھانکنے لگی۔ اس کھلے سے بڑے صحن کے ایک طرف بنے باغیچے میں اس وقت اک رونق کا سماں تھا۔ ابو اور نایا مٹونے تازے بکروں کو گھیرے کھڑے تھے۔ گھر کے جملہ افراد خانہ بھی چہروں پہ خوشی لیے بکروں کی سیوا کرنے میں مصروف تھے۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا جس نے اس کے ہونٹوں سے ہنسی نوج لی تھی۔ ایک بار پھر اسے سوچتے اس کا دل دکھ سے اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ وہ ہونٹ چباتے ہوئے منڈیر سے پیچھے ہٹتے ہوئے کسی سے ٹکرائی۔ وہ فوراً ”مڑی تھی۔ آنسوؤں سے دھندلائی آنکھوں کے

سامنے جو منظر تھا اسے دیکھ کر اس کے لب بھینچ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کے پہلو سے نکل جاتی اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کا راستہ روکا تھا۔

”پلیز میری بات سن لو۔“ اس نے جیسے التجا کی۔ رکنے کا نہ موقع تھا نہ موڑ۔ نیچے سب جمع تھے کسی کی بھی توجہ اس کی غیر موجودگی کی طرف جاتی تو اسی وقت ہر کارے دوڑا دیے جاتے وہ کسی بن بلالی بدنامی کا حصہ نہیں بننا چاہتی تھی اور اب اسے کیا بات کرنی تھی؟ اس دن تو ساری باتیں ختم کر کے گیا تھا۔ سارے تیر چلا کر۔ اب کیا زخم شمار کرنے تھے یا مزید آزار برہانے تھے اسے گھورتے جانے کیا کیا سوچے گئی۔ اتنا ہی تو زور درج ہو رہی تھی وہ اس دن سے۔ آنکھوں کے آگے تنی دھند کی چادر دو آنسوؤں کے قطرے چھلک جانے سے صاف ہو گئی تھی۔

”یار! سوری۔ تمہیں ہرٹ کیا نا۔“ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتے ہوئے وہ جلدی سے بولا۔ مبادا وہ اسے دکھیل کر چلتی ہے۔

”کس بات کی سوری تو قیر! مجھے بے توقیر کرنے کا یا۔“ وہ تراخ سے بولی دونوں ہاتھ کمر پہ جمائے نظروں سے ہی اسے جھسم کر دینے والا انداز۔

”مجھے احساس ہو گیا ہے کہ میں نے ناحق تم سے زیادتی کی۔ تم اپنے نظریات میں بالکل درست ہو بس مجھے ہی ضد سوار ہو گئی تھی۔ تمہیں ستانے کی۔“ نرم لہجے میں اسے پیار سے تکتے وہ ایک ہی سانس میں بولتا گیا۔

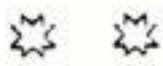
”ستانے کی یا جھکانے کی۔“ وہ تن کر کھڑی اس کے معذرتی الفاظ کا پوسٹ مارٹم کرتی اس کے دل میں کھینے لگی۔

”ہاں شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ تمہیں جھکانا ہی میرا مقصد تھا۔ اٹھے سروالی عورت کسی مرد کو اچھی نہیں لگتی۔ میں بھی روایتی مرد بن گیا تھا، لیکن آج ایک دم سے کسی میرے ہی جیسے مرد نے میرے مردانگی کے غبارے میں بھری ہوا نکال دی تو تمہارے کرب کا احساس مجھے بخیر ہو گیا۔“


پچھتاوا اس کے ہر لفظ سے چھلک رہا تھا۔ بہت غور سے اس کی باتیں سنتی سارہ کا اندر دھلنے لگا اسے لگا کر وہ سر خرو ہو گئی تھی اپنی ہی نظروں میں۔

”مجھے فخر ہے کہ تمہاری فراست کی چادریں میں آکر میری لغزشیں چھپ جایا کریں گی۔ میری حماقتوں کو تمہاری نصیحتوں کا سہارا رہے گا۔ مجھے تمہاری ضرورت۔ تمہاری چاہت، ہمیشہ چاہیے۔ ہر قدم پیسے۔“ وہ سارا ہی کھل کے اس کے سامنے آ گیا۔ کیا بچا تھا مزید سنانے کو۔ وہ سچ بول رہا تھا۔ یہ اس کا من چپ رہا تھا۔ وہ من گئی۔ مان گئی۔ سچی محبت کی طاقت کو خالص جذبوں کا بھار بڑا بھاری ہوتا ہے۔ اور یہ بھار دونوں فریقین اٹھا میں تب ہی مزاجے ورنہ فریق واحد اس کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتا ہے، مطلع صاف ہو گیا تھا، وہ ہلکی پھلکی ہو کر مسکرا دی اور ہاں میں سر ہلا دیا۔

محبت معتبر ٹھہری تھی۔ ایک بار پھر سے آسمان سے پھوار برسنے لگی تھی۔ دونوں نے سر اٹھا کر ایک ساتھ اوپر اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور ہنس دیے۔



ہستی پال لکچرنگ



مثرہ بخاری

قیمت - 300 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی - فون نمبر: 32735021

گنگا نالہ

اچھوں قسط

”زیان میری خالہ کی بیٹی ہے میری مگھتیر ہے۔ آخر مجھے سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ کیوں مجھے ملنے سے روکا جا رہا ہے۔“ نوار دجو کہ وہاب کے سوا کوئی بھی نہیں تھا جھنجلا سا گیا۔

”خدا بخش گیٹ کھولو میں خود ان کو اندر لے جاتی ہوں۔“ وہ یکدم اضطرابی انداز میں بولی۔
”لیکن ملک صاحب ناراض تو نہیں ہوں گے۔“
گارڈ ابھی تک تذبذب میں تھا۔

”نہیں ناراض ہوتے میں خود اس کی ذمہ داری لیتی ہوں۔“ نینہا نے وہاب کی طرف اشارہ کیا تھا ناچار اس نے گیٹ کھول کر وہاب کو اندر جانے کی اجازت دے دی۔

چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا وہاب ادھر ادھر دیکھتا دل ہی دل میں خاصا مرعوب ہو چکا تھا۔ ملک محل کی شان و شوکت کا رعب اس پہ طاری ہو چکا تھا۔

”زیان کی تو شادی ہو چکی ہے ملک ایک کے ساتھ اس حویلی کے مالک کے ساتھ۔“ نینہا نے انکشاف کرتے ہوئے بغور اس کے چہرے کے تاثرات بھی دیکھے وہ ایک دم یوں اچھلا جیسے بچھوٹے ڈنگ مارا ہو۔
”یہ کیسے ممکن ہے ہو ہی نہیں سکتا میں اور زیان ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں وہ بھلا کسی اور سے کیسے شادی کر سکتی ہے۔“ وہ سر جھٹکتے ہوئے بول رہا تھا۔ اس دوران وہ دونوں ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ نینہا اسے بٹھانے کے بعد عنیدہ بیگم کو اطلاع کرنے چلی گئی۔

نینہا خراماں خراماں چلتی گیٹ سے باہر نکلی۔ آج اس کی آنکھ خاصی دیر سے کھلی تھی۔ اچھی خاصی دیر ہو چکی تھی۔ اس وقت تک تو وہ سلائی کڑھائی کے مرکز کے آئس میں بیٹھی ہوتی تھی ناشتا کیے بغیر وہ تیار ہوئی۔ گیٹ سے باہر گاڑ ایک نوجوان کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

”مجھے فوری طور پہ زیان سے ملنا ہے۔ آپ مجھے اندر جانے دیں۔“ نوجوان کا انداز بے حد لجاجت بھرا اور التجائیہ تھا۔ نینہا کے قدم وہیں رک گئے وہ غور سے نوار دجو کو دیکھنے لگی۔ پینٹ شرٹ میں ملبوس وہ نوجوان خاصا معقول اور مہذب نظر آ رہا تھا لیکن نینہا نے پہلے اسے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ گارڈ اسے اندر لے جانے میں متامل نظر آ رہا تھا۔ ملک ارسلان کی طرف سے کسی اجنبی کے لیے ملک محل کا گیٹ کھولنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے گارڈ پس و پیش کر رہا تھا پر وہ نوجوان بار بار بے تکلفی سے زیان کا نام لے رہا تھا یہ بات نینہا کو چونکانے کا باعث بن رہی تھی۔

ملک ایک تو صبح سویرے ہی شہر کے لیے نکل چکا تھا ورنہ وہ اس نوار دجو کو ملک ایک سے ملنے کا مشورہ دیتی وہ زیان کا شوہر اس کے جملہ حقوق کا مالک تھا ایک اجنبی نوجوان کے منہ سے زیان کا نام سن کر جانے وہ کیا محسوس کرتا۔

”ملک صاحب کی طرف سے کسی اجنبی کو حویلی میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔“ گارڈ کا لہجہ بدستور سخت تھا۔

کے پیچھے کھڑی باری باری ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔
 ”کون ہو تم اور کس لیے یہاں آئے ہو؟“ ان کی
 شخصیت کی طرح آواز میں بھی عجیب سا وقار اور نرمی
 تھی۔ ”میرا نام وہاب ہے ذیان سے ملنے آیا ہوں۔“
 وہاب نے اعتماد کی کمزور پڑتی ڈور کو مضبوطی سے تھامنے
 کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ عنہزہ کے ماتھے پر
 ناگواری کی شکنیں ظاہر ہوئیں جیسے انہیں اس کے
 منہ سے ذیان کا نام سننا اچھا نہ لگا ہو۔

وہاب ڈرائنگ روم میں بچے قیمتی فرنیچر کا جائزہ لینے
 میں مصروف تھا جب عنہزہ اندر داخل ہوئیں۔
 وہاب انہیں دیکھتے ہی بے اختیار اپنی جگہ سے گھڑا
 ہو گیا۔ موسم کے لحاظ سے اسکن کلر کے سوتی کپڑوں
 میں ملبوس چادر لیے وہ بے انتہا پارعب اور خوب
 صورت نظر آرہی تھیں۔ ان کے نقوش میں نمایاں
 طور پر ذیان کی جھلک موجود تھی۔ انہوں نے ہاتھ کے
 اشارے سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نینل صوفے



”تم ہو کون کیا رشتہ ہے تمہارا زیان سے؟“

”زیان میری خالہ زریںہ امیر علی کی بیٹی ہے میری منگیتر ہے پچھلے چند ماہ سے میں زیان کو پاگلوں کی طرح تلاش کر رہا ہوں۔ خالہ مجھ سے ناراض ہو گئی ہیں اور زیان بھی۔ اس لیے مجھے بتائے بغیر یہاں آپ کے پاس چلی آئی ہے۔ آپ مجھے اس سے ملوادیں میں بہت پریشان ہوں۔“ وہاب کے لہجہ میں پریشانی اور اعتماد تھا۔ عنہزہ اب بھی نگاہوں سے اسے ٹکنے لگیں۔

بوارحمت نے ہی صغریٰ اور نواز کی معرفت ان سے رابطہ کیا تھا۔ پھر عنہزہ کی خود بوارحمت سے بات ہوئی انہوں نے امیر علی کے انتقال اور زیان کی مشکلات کے حوالے سے کھل کر بات کی تھی۔ زیان کو فوراً ”یہاں سے لے جانے کی درخواست کی تھی اور اب یہ وہاب جانے کیوں اس کی پرسکون زندگی میں ہلچل مچانے آیا تھا۔ عنہزہ کی سوچ تیزی سے کام کر رہی تھی۔

اس دوران انہیں نینہاں کی یہاں موجودگی کا دھیان ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تجسس آمیز دلچسپی سے وہاب کی سب باتیں سن رہی تھی۔

”زیان کی شادی ہو گئی ہے اور بوا مجھے سب حالات سے آگاہ کر چکی ہیں۔ میں بہت نرمی سے بات کر رہی ہوں۔ عزت سے واپس چلے جاؤ اور آئندہ تمہاری زبان پہ میری بیٹی کا نام نہیں آنا چاہیے۔“

”یہ کہتے ہی عنہزہ جھٹکے سے اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔ صد شکر اس وقت حویلی میں ملک جمائیکر ملک ارسلان یا ملک ایکب میں سے کوئی ایک بھی موجود نہیں تھا۔

عنہزہ دروازے کی طرف مڑیں نینہاں کو وہاں دیکھ کر انہیں پہلی بار اس پہ غصہ آیا مگر وہ مصلحتاً ”پی گئیں۔“

”میں نہیں باہر کا راستہ دکھاؤ۔“ وہ تحکم آمیز لہجے میں بولتیں ڈرائنگ روم میں سے باہر نکل گئیں۔

نینہاں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ گیٹ تک پہنچتے پہنچتے اس میں اور وہاب میں بہت سی معلومات کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ خاص طور پہ یہ معلومات

نینہاں کے لیے بہت مفید تھیں۔



گھر لوٹتے ہی ملک ارسلان کو کسی غیر معمولی تبدیلی کا احساس ہوا۔ کیونکہ عنہزہ کے چہرے پہ بے پناہ پریشانی چھائی ہوئی تھی۔

”کیا بات ہوئی ہے میرے پیچھے۔ میں تمہیں اچھا خاصا چھوڑ کر گیا تھا صبح۔“

”واقعی میں بے حد پریشان ہوں آج وہاب آیا تھا زیان سے ملنے۔“ وہ دونوں ہاتھ مسل رہی تھیں۔

”کون وہاب؟“ فوری طور پہ ملک ارسلان کو یادداشت کا خانہ کھنگالنے کے باوجود بھی وہاب نامی شخص یاد نہ آسکا۔

”آپ کو سب بتایا تھا تو میں نے جب زیان کو آپ خود جا کر لائے تھے۔ بوارحمت نے مجھے وہاں کے سب حالات بتائے تھے صغریٰ اور نواز آکر ہم سے ملے تھے آپ کو یاد نہیں ہے؟“ وہ اچنبھے سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ ارسلان کو فوری طور پہ سب یاد آ گیا۔

”میرا بیٹی پہلے ہی ان کے ہاتھوں رکھی سے اب وہ یہاں بھی پہنچ گیا ہے۔ جمائیکر بھائی اور ایکب کو زیان کے گزشتہ معاملات پتا نہیں ہیں اس لیے مجھے عجیب سا ڈر لگ رہا ہے۔ میں نے وہاب کو فوراً ”یہاں سے چلا گیا ہے اگر اس کی ملاقات میری جگہ جمائیکر بھائی، افشاں بھائی یا ایکب سے ہو جاتی تو کیا ہوتا!!“ وہ کیا سوچتے زیان کے بارے میں۔ کیونکہ وہ اس کے ماضی سے آگاہ نہیں ہیں اس کی مشکلات کا انہیں اندازہ نہیں ہے جو اپنے کے باپ کے پاس رہتے ہوئے اس نے برواشت کی ہیں۔ میں پہلے ہی کرانسیس میں ہوں ملک صاحب۔ زیان کا علاج کر رہے ہیں جلالی باب۔ اس مرحلے پہ وہاب والی بات کھلتی ہے تو سوچیں کیا ہوگا۔“ عنہزہ رو دینے کو تھیں۔

”سب سے پہلے تم یہ غلط فہمی دور کر لو کہ زیان صرف تمہاری بیٹی ہے۔ وہ اب ہماری بیٹی ہے۔ تمہیں کتنی بار کہا ہے خود کو مجھ سے الگ مت کیا کرو نہ سمجھا

کر۔ ہمارے دکھ سکھ ایک ہیں خوشیاں سا بھئی ہیں۔ رہی بات زیان کی تو میں اس کا بل بھی بیکا نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے اپنی بیٹی پہ تمہارے پورا یقین ہے۔“

”زیان بوا رحمت سے بہت الٹیج ہے اور دل ہی دل میں کلنی پریشان بھی ہے وہ شادی میں بھی تو شریک نہیں ہوئی ہیں۔ آپ بوا رحمت کو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ یہ آپ کا میری ذات پہ ایک اور احسان ہوگا۔ کیونکہ بوا کے مجھ پہ بہت احسانات ہیں۔ میں ان احسانات کا بدلہ چکانا چاہتی ہوں۔“ وہ لجاجت سے گویا ہوئیں۔

”بیگم صاحبہ جو آپ کا حکم بندہ انکار کی جرات نہیں کر سکتا۔“ وہ انہیں ٹینشن سے نکالنے کے لیے قصداً ”ملکے پھلکے انداز میں بولے۔ وہ اس میں کامیاب رہے۔ کیونکہ عزیزہ مسکرا رہی تھیں۔



وہاب ٹینٹوں کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ ٹینٹوں اندر سٹرل ہوم میں تھی۔ ”ملک محل“ میں تو وہاب سے ملاقات کرنا مشکل تھا۔ اس لیے اس نے وہاب کو یہاں بلوایا تھا۔ وہ جس طرح مایوس و ناکام ہو کر ملک محل سے نکلا تھا اس کے بعد ٹینٹوں سے ملاقات اس کے لیے امیدوں کا مرکز ثابت ہوئی تھی۔ ٹینٹوں سے کرید کرید کر زیان، امیر علی، زرینہ بیگم اور اس کے بارے میں سوال کر رہی تھی۔ وہاب نے بڑی تفصیل سے زیان کی گزشتہ زندگی کے ابواب ایک ایک کر کے اس کے سامنے کھولے تھے۔ ٹینٹوں کو زیان کے بارے میں کارآمد معلومات حاصل ہوئی تھی۔ وہاب سے ملاقات خاصی سو مند ثابت ہوئی تھی۔

”زیان اور میں ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے ہیں۔ میری خالہ نے ہمارے بیچ غلط فہمیوں کی دیوار کھڑی کی ہے۔ ایک سازش کے تحت خالہ نے زیان کو یہاں بھیجا ہے اس کے بعد بوا رحمت کے ساتھ خود بھی روپوش ہو گئی ہیں۔ میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا ہوں۔ زیان کو جب یہاں بھیجا گیا تو تب ہماری

شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ یہ انصاف نہیں ہے میری مہنگیتر کی شادی زبردستی میرے علم میں لائے بغیر کی گئی۔ میں آرام سے نہیں بیٹھوں گا۔ امیر خالو کی مرضی سے سب کچھ ہوا تھا۔ دھوم دھام سے منگنی ہوئی تھی ہم دونوں کی۔“ وہاب نے پوری طرح ٹینٹوں کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔

”تمہیں تمہاری پوری پوری مدد کروں گی۔ پر اس کے لیے تمہیں میری ہدایات پہ عمل کرنا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔ زیان کو حاصل کرنے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“ وہ جوش سے بولا۔

”اب تم جاؤ کل اس وقت ہم یہاں سے شہر کے لیے روانہ ہوں گے۔ ہم دونوں بہتر طور پہ ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں۔ تمہیں زیان اور میرا ایک مجھے مل جائے گا۔“ آخری جملہ ٹینٹوں نے دل میں کہا۔

وہاب نے تو اس کی ساری پراہلیز ہی حل کر دی تھیں۔ ورنہ ایک کا حصول اسے دنیا کا ناممکن ترین کام لگ رہا تھا۔ اندرونی بیجان اور اضطراب سے اس کی رنگت سرخ ہو رہی تھی۔ جانے سے پہلے اسے ایک کو کال کرنی تھی۔ آخر کو اسے وہاب کی آمد کی اطلاع دی گئی تھی۔ اس کے بعد ملک محل میں رکنابے کا رہنا۔ اسے اب ایک نئے نام اور نئے چہرے کے ساتھ ملک ایک سے ملنا تھا۔ ٹینٹوں نامی شخصیت کے ساتھ وہ ایک کو حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا حصول دشوار تھا۔ ہاں رنم کو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ رنم جو خوب صورت دلکش و حسین تھی۔ دولت مند تھی۔ اسے کوئی کافر ہی انکار کر سکتا تھا۔ اسے اب واپس احمد سیال کے پاس جانا تھا۔ اسے دوبار اپنے سامنے دیکھ کر انہوں نے اسے یقیناً ”معاف کر دینا تھا۔ کیونکہ وہ اس سے ناراض رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ ٹینٹوں کے لباوے اور چہرے سے وہ ویسے بھی تنگ آچکی تھی۔ اسے اب نئی شخصیت کے ساتھ ملک محل میں دھوم دھام سے واپس آنا تھا۔ بس رنم کے چہرے کے ساتھ پھر سے ایک کی زندگی میں زور دار انٹرویو تھی۔ وہاب ملک

محل سے نکل کر اس کے ساتھ ہی یہاں تک آیا تھا۔
اب کل اسے یہاں سے وہاں کے ساتھ ہی روانہ ہونا
تھا وہ بہت خوش تھی۔



جلالی بابا زیان کے علاج کے لیے کامیابی سے چلہ
کٹ رہے تھے ایک کے جانے کے بعد سے لے کر
اب تک زیان بالکل ٹھیک رہی تھی۔
جلالی بابا کے ٹالس میں آگر عینہ زہ بیگم نے گھریلو
باتیں بھی انہیں بتادی تھیں۔ اپنی امیر علی سے شادی کا
احوال زیان کی پیدائش، امیر علی سے علیحدگی، جوان
ہونے کے بعد زیان کی خود سے نفرت سب کچھ ہی تو
جلالی بابا کے علم میں آچکا تھا۔ جلالی بابا نفسیات انسانی
کے ماہر تھے۔

زیان تو سونے کا اینڈارینے والی مرغی ثابت ہوئی
تھی۔ چلے کے دوران انہوں نے عینہ زہ بیگم کے ساتھ
ساتھ افشاں بیگم سے بھی خوب مل بانی بنوڑا تھا۔ محل
میں آنے کی راہ ہموار ہوئی تھی۔ حالانکہ گھر کے تینوں
مردوں کو جلالی بابا کے طریقہ علاج سے اختلاف تھا۔
ملک جہانگیر اور ملک ارسلان دونوں بھائی اپنی اپنی
پیوپیوں کی وجہ سے خاموش تھے اور ملک ایک افشاں
بیگم کی وجہ سے چپ تھا۔ ورنہ اس نے جب رات کو
زیان کو جلالی بابا کے کمرے میں دیکھا تھا اس کا جی چاہ رہا
تھا کہ مار مار کر بابا کا حلیہ ہی بگاڑ دے۔ بھلا زیان کو تنہائی
میں آدھی رات کو بلا کر کون سا علاج ہوتا تھا۔ اس کی
حساس حس شامہ نے جلالی بابا کے کمرے میں قدم
رکھتے ہی ایک مخصوص بو فوراً محسوس کی تھی۔ اگرچہ
یہ بہت ہی خفیف سی تھی لیکن اس نے جان لیا تھا کہ
یہ شراب کی بو ہے۔ جلالی بابا نے قالین کے اس حصے
جہاں بوتل ٹوٹی تھی وہاں انگلیٹھی کے انکارے پھینکے
تھے تاکہ کسی کو شک نہ ہو لیکن اس احتیاط کے باوجود
بھی ایک کو معلوم ہو گیا تھا۔ تب ہی تو اسے شدید غصہ
آیا تھا۔ جلالی بابا کی گھبراہٹ اور خوف و ہراس اس نے
کمرے میں قدم رکھتے کے ساتھ ہی محسوس کیا تھا بعد

ازاں زیان کے جن کی وجہ سے بابا کو خود کو سنبھالنے کا
موقعہ مل گیا۔ ایک زیان کی طرف سے بے خبر نہیں
تھا اس نے حویلی میں کام کرنے والے اپنے ایک اعتماد
کے بندے کی ڈیوٹی لگائی۔

ایک کا یہ ملازم انور بہت سمجھدار تھا۔ وہ کسی کی
نظروں میں آئے بغیر جلالی بابا کی سرگرمیوں کی نگرانی
کر رہا تھا۔ اگر جلالی بابا زیان کو دوبارہ تنہائی میں طلب
کرتا تو اس موقعہ پہ اسے لازمی اپنی موجودگی ثابت کرنی
تھی ایک طرح سے وہ زیان کی حفاظت کر رہا تھا۔

ایک نے اپنے ایک پولیس ڈپارٹمنٹ میں موجود
قریبی دوست کو عامل جلالی بابا کے بارے میں تفصیلات
مہیا کر دی تھیں اب باقی کام اس کا تھا، بہت جلد اس کے
ہاتھ جلالی بابا کی موٹی چہیلی گردن کو ناپنے والے تھے۔



عامل جلالی بابا زیان کے علاج کے آخری مرحلے
میں تھے اس نے شکر ادا کیا تھا کہ بابا جی نے پھر اسے
اکیلے اپنی خلوت میں طلب نہیں کیا۔ اس رات زیان
نے بابا جی کی آنکھوں میں ناچتی ہوس فوراً محسوس
کرتی تھی۔ بابا جی نے جو مشروب اسے پینے کے لیے دیا
تھا وہ اس نے پھینک دیا تھا بول ٹوٹ گئی تھی۔ بابا جی
کی نگاہوں کا سحر اسے بے بس کرتا جا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا
تھا کہ اس کا ذہن عامل جلالی بابا کے قبضے میں جا رہا ہے
کیونکہ وہ بیک جھپکائے بغیر ان کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈال کر مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔
انہوں نے اس کی چال اس پہ آنانے کی سعی لاکھائی
کی تھی۔ زیان کچھ دیر اور ان کی آنکھوں میں دیکھتی
رہتی تو وہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہو چکے
ہوتے۔ وہ ویسے بھی انسانی نفسیات اور کمزوریوں سے
پوری طرح واقف تھے پہلی بار ہی بھانپ گئے تھے کہ
زیان ڈرامہ کر رہی ہے۔

زیان نے وہ بوتل کیا توڑی گویا بابا جی کا ٹرانس توڑ دیا
جس نے اس کے ذہن کو اپنے کنٹرول میں لیا ہوا تھا۔
بابا جی کے گل پہ لگنے والا پھپر اس بات کا ثبوت تھا کہ

دن ٹی وی دیکھتیں اخبار پڑھتیں کہ شاید کہیں سے
نہیں کی خبر مل جائے۔



احمد سیال کو اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔
یقین تو رنم کو بھی اپنی آنکھوں پہ نہیں آ رہا تھا۔ احمد
سیال زندہ سلامت اس کے سامنے موجود تھے اور وہ
اپنے گھر میں تھی۔ وہ بھاگ کر پوری شدت سے ان
سے لپٹی تھی۔ منظر تو پہلے ہی اس کی آنکھوں میں
دھندلا رہا تھا اب یہاں سے گلے مل کر آنسوؤں کو بننے
کا راستہ مل گیا تھا۔ اتنے ماہ کی دوری سخت زندگی اور
اپنی ضد کے منہ نکلنے نے اس کے سب کس مل نکال
دیئے تھے۔ وہ پاپا سے بے حد شرمندہ تھی ان سے
نگاہیں تک نہ ملا پار ہی تھی۔ وہ اسے لپٹائے اس کا ہاتھ
ہاتھ بیل ہا بار چومتے اس کے ہونے کا یقین کرنا چاہ
رہے تھے۔ وہ واقعی ان کی بلا ڈلی رنم تھی ان کا جگر گوشہ۔
وہ تو تقریباً "مایوس" ہی ہو چکے تھے۔ اب ان پہ شادی
مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ اتنے سارے دنوں
کا احوال بل بھر میں معلوم کر لینا چاہ رہے تھے۔
"پاپا میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گی پہلے اپنا گھر تو دیکھ
لوں۔ میں نے اپنا گھر بہت مس کیا ہے۔" وہ بھگی بھگی
آنکھوں سمیت مسکرائی۔ احمد سیال بھی مسکرا رہے
تھے۔

"او میں تمہیں گھر دکھاتا ہوں۔ تمہارے بغیر تو
میں جیسے مردہ ہو گیا تھا۔" احمد سیال نے اس کا ہاتھ پکڑ
لیا تھا۔ وہ چپہ چپہ گوشہ گوشہ دیکھ رہی تھی۔ خوش
ہو رہی تھی۔ نہیں بن کر اس نے جو زندگی گزار
تھی وہ بہت قابل رحم اور مشکل تھی۔ وہ سوچ رہی تھی
جیسی زندگی اس نے گزارا ہے وہی زندگی گزارنا وہ
بھی نہیں بن کر بہت مشکل ہے۔ جبکہ احمد سیال کی
بٹی کی حیثیت سے اس نے سپر لکڑری لائف انجوائے
کی تھی وہ اس کے بغیر ہی نہیں سکتی تھی۔ ملک محل
میں نہیں کی حیثیت سے اس نے اچھی طرح جان لیا
تھا۔

وہ کھل طور پر ٹرانس سے باہر آچکی ہے۔ اس کی عزت
جلالی پاپا جیسے گھبرے سے بچ گئی تھی۔ جلالی پاپا نے اس
کی عقل کی آنکھیں کھول دی تھی۔ تب ہی تو اس
رات ایک کے سامنا ہونے کے بعد سے اس پہ آتم
توش نہیں آیا تھا۔ اس نے آخری بار ملک ایک کو اپنا
رنگ دکھایا تھا۔ عنیزہ بے پناہ خوش تھیں عامل جلالی
پاپا واقعی بہت پہنچے ہوئے تھے۔ زیان کے جن کو قابو
کر لیا تھا۔ وہ اب پارل طریقے سے معاملات زندگی
میں حصہ لے رہی تھی۔



نہیں ملک محل سے غائب ہو گئی تھی۔ اس کے
کمرے سے اس کے ہاتھ سے لکھا ہوا پرچہ ملا تھا۔ اس
نے بغیر کسی القاب و آداب کے بطور خاص کسی کو بھی
مخاطب کیے بغیر لکھا تھا۔

"میں اپنی مرضی سے ملک محل چھوڑ کر جا رہی
ہوں۔ میں اپنی زندگی اور حالات سے تنگ آچکی
ہوں۔ مجھے اب مزید جینے کی تمنا نہیں ہے۔ میں اپنے
ہاتھوں زندگی کا خاتمہ کروں گی۔ میں گناہ موت مرنا
چاہتی ہوں اس لیے برائے مہربانی مجھے تلاش کرنے کی
کوشش نہ کی جائے۔ کیونکہ یہ کوشش بے کار ثابت
ہوگی میں یہاں سے نکل کر پہلی فرصت میں اپنی زندگی
ختم کروں گی۔"

فقط بد نصیب نہیں۔

خط بڑھ کر عنیزہ کا تو جو حال ہوا سو ہوا ڈیوان بھی
پریشان ہو گئی۔ افشاں بیگم بھی روہا سی ہو رہی تھیں۔
ملک ارسلان اور ملک جمانگیر نے اسے قریب کے
علاقوں میں تلاش کروانے کی ناکام کوشش کی۔ وہ جس
طرح ایک دن اچانک ملک محل میں آئی تھی اس طرح
اچانک غائب بھی ہو گئی تھی۔ اس کا کوئی اتا پتا کسی کے
پاس نہیں تھا۔ اس کی اصل حقیقت اس کی محسن
عنیزہ تک کو معلوم نہ تھی جو اسے ہونٹل سے بچا کر
اپنے ساتھ لائی تھیں۔ ملک محل میں کلنی دن نہیں
کے جانے کے بعد سوگواری چھائی رہی۔ عنیزہ تو پورا

پاپا اس کی باتوں میں آکر کسی کے ساتھ اس کی شادی کر بھی دیتے تو یقیناً "اس کا انجام حسرت ناک ہوتا۔ یعنی وہ صرف اس کی سوچ تھی بچکانہ سوچ کہ وہ پاپا سے شادی کے بعد کچھ بھی نہیں لے گی۔ اب سوچتی تو جھرجھری آتی۔ سہولیات اور اختیار کے بغیر بھی زندگی کوئی زندگی ہوتی ہے۔ اور اختیار دولت سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ ملک محل میں خادمہ کی زندگی نہ گزارتی۔ اب وہ بھی ملک محل کے مکینوں کی ہم پلہ ہو گئی تھی۔

احمد سیال کو اس نے حرف بہ حرف سب داستان کہہ سنائی تھی۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ اتنے ماہ وہ ملک جمانگیر کی حوٹلی میں رہی اور انہیں خبر ہی نہیں ہوئی۔ کاش دوست کی دعوت پہ وہ ایک کی شادی میں چلے جاتے۔ معاذ کے پاکستان آنے پہ چلے جاتے تو انہیں اتنی اذیت نہ اٹھانا پڑتی۔ رنم ان کے اتنے پاس رہ کر بھی دور رہی تھی۔ وہ انہیں گزرے دنوں کا حسرت ناک احوال سنا رہی تھی۔

"پاپا آپ کی بیٹی نے وہاں خادمہ کی سی زندگی بسر کی ہے۔ ایک آواز پہ بھاگ بھاگ کے کام کیے ہیں۔ ملازموں کی نگرانی کی ہے دیکھ بھال کی ہے۔ پاپا وہ ایک خواب تھا بھیا تک خواب۔ میں یہ خواب پھر بھی نہیں دیکھنا چاہوں گی۔ پاپا یہاں ہمارے گھر میں اتنے ملازم ہیں جبکہ وہاں میں خود نوکرانی تھی۔ پاپا یہاں میں پانی مانگ کر پیتی تھی جبکہ وہاں۔۔۔" رنم بھی ہوئی آواز کی وجہ سے اس سے بات بھی مکمل نہ کی گئی۔ احمد سیال نے اس کا رانے سینے سے لگا لیا۔ ان کا اپنا دل شدت غم سے پھٹا جا رہا تھا۔

"میرے بچے ملک جمانگیر نے تمہارا رشتہ اپنے بیٹے کے لیے ہی تو مانگا تھا۔ میں تمہیں عزت سے دھوم دھام سے رخصت کر کے ملک محل میں بھیجنا چاہ رہا تھا جبکہ تم خود میں آکر غلط طریقے سے وہاں پہنچی۔ ملک ایک نے کسی بھی قسم کا جینز نہیں لیا تم یہی چاہتی تھی ناں کہ تمہیں صرف تمہارے حوالے سے

قبول کیا جائے۔ تم ایک بار میری بات مان لیتیں تو ایک مضبوط حوالہ لے کر ملک محل میں جاتیں۔ مگر تم نہیں بن کر گھر سے اپنی ضد کی خاطر نکلیں اور سب کچھ گنواریا۔" احمد سیال جیسا مرویٹی کا دکھ یہ نہیں پایا تھا۔ وہ دور سے تھے۔ رنم بھی تو رو رہی تھی۔ اس کے دل کو جیسے کوئی سینے میں کس ل رہا تھا۔ زبان کی جگہ وہ بھی تو ہو سکتی تھی ملک ایک نے زبان کو ایسے ہی تو قبول کیا تھا۔ وہ بیوی جیسا مضبوط اور باعزت حوالہ لے کر اس کی زندگی میں آئی تھی۔ اور رنم نے پا کر بھی سب کچھ گنواریا تھا۔ دونوں باپ بیٹی اپنے نقصان پہ رو رہے تھے۔

بہت دن بعد رنم اپنے بیڈ روم میں گئے بیڈ پہ تھی۔ اس کا جہازی سا تڑبیڈ پر دے کارپٹ ڈیکوریشن پیرس کھڑکی سے باہر دکھائی دینے والے سرسبز مناظر۔ کچھ بھی تو نہیں بدلاتا تھا۔ حتیٰ کہ اپنا سیل فون جو گھر سے جاتے وقت وہ آف کر گئی تھی ویسا ہی پڑا تھا۔ اس نے عنیزہ بیگم کا دیا ہوا سیل فون بیگ سے نکالا۔ سیل فون ہاتھ میں لیتے ہی اس کے لبوں پہ مسخرانہ مسکراہٹ آگئی۔ اس میں ایک وہاب زبان عنیزہ اور دیگر ملک محل کے مکینوں کے فون نمبر تھے۔ ورنہ وہ یہ کبھی بھی اپنے ساتھ نہ لاتی۔ احمد سیال کی بیٹی کا فوق ایسا غریبانہ اور تھوڑا کلاس تو ہو نہیں سکتا تھا۔ اس نے نمبر ڈائری میں نوٹ کر کے سیل فون کمرے میں پڑے آرائشی ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ اسے اب اس گھٹیا کم قیمت فون کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

اپنے بیڈ روم میں بیڈ پہ لیٹتے ہی اسے چین آگیا۔ کل تک وہ ملک محل میں کھی سروٹ کو ارٹرز کے ایک کمرے میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ اب وہ اپنے اصل ٹھکانے پہ لوٹ آئی تھی۔



عنیزہ زبان کو لے کر افشاں بیگم کے پاس آئی تھیں۔ زبان نے اتنے ہفتے بعد سسرال میں قدم رکھا تھا وہ بھی بالکل تندرست و توانا ہو کر وہ آتم توش کی قید

سے آزاد ہو چکی تھی۔ ان کے لیے یہ خوشی بہت بڑی تھی۔ انہوں نے شکرانے کے نوافل ادا کر کے بہو کی نظر اتاری اور صدقے کے بکرے ذبح کروائے۔ زیان بھی سنوری بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ انہوں نے دل کی گہرائیوں سے رب کا شکر ادا کیا تھا۔

زیان سب کے ساتھ ہنس بول رہی تھی۔ گھر واپس آتے ساتھ ہی اس نے اپنے اور ایک کے مشترکہ بیڈروم کی سیٹنگ تبدیل کروائی۔ اپنے سارے کپڑے الماری میں رکھے۔ زیر لب گنگنائے ہوئے وہ بے حد مسرور تھی۔

افشاں بیگم نے گہری نگاہ سے اس کا جائزہ لیا۔ یہ وہی پہلے والی زیان تھی جسے انہوں نے ایک کے لیے پسند کیا تھا۔ آتم توش اس کے اور ایک کے درمیان سے ہٹ چکا تھا۔ دو دن بعد عنیزہ، ملک ارسلان، ملک جہانگیر اور افشاں بیگم کو دوسرے شہر ایک شادی میں جانا تھا۔ انہیں تین چار دن وہاں قیام بھی کرنا تھا۔ پہلے افشاں بیگم تذبذب میں تھیں جا میں کہ نہ جائیں۔ اب زیان ہی خوشی اپنے گھر واپس آ چکی تھی تو انہوں نے تیاری شروع کر دی۔ ان کے جاتے ہی ایک نے آجنا تھا اس لیے زیان کو ساتھ لے جانے کے لیے انہوں نے اصرار نہیں کیا۔



ملک جہانگیر، ملک ارسلان، افشاں بیگم اور عنیزہ کے ہمراہ تیار ہو کر ملک محل سے جا چکے تھے۔ ملک ارسلان نے اپنے جانے کی اطلاع ملک ایک کو کر دی تھی۔ اس نے یقین دہانی کروائی تھی کہ رات سے پہلے پہلے گھر زیان کے پاس پہنچ جائے گا۔

ملک ایک اس پل اس دن اس ساعت کے انتظار میں تھا۔ زیان سے دو دو ہاتھ کرنے کا ٹائم آ گیا تھا۔ سب کے سامنے ایک کو دیکھتے ہی اس کا جن جلال میں آجاتا تھا۔ دوروں میں بھی جان اور شدت بڑھ جاتی۔ وہ زیان کو سب کی موجودگی میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ لیکن آج اکیلے میں یہ کام اس نے آسانی سے

انجام دے لیتا تھا۔ قدرت نے یہ موقعہ بن مانگے فراہم کر دیا تھا۔ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا کفرانِ نعمت کے زمرے میں آتا۔ وہ جلد از جلد ملک محل پہنچنا چاہ رہا تھا۔

آنے سے پہلے اس نے اپنے ہوشیار ملازم انور کو فون کر کے کہا کہ آج رات سب ملازمین کو کسی بہانے رہائشی عمارت سے دور رکھے۔ انور بہت تیز تھا اس نے اسی وقت سوچ لیا کہ یہ کام کس طرح کرنا ہے۔ اس نے بیٹے کا عقیدہ کرنا تھا۔ ملک ارسلان اور ملک جہانگیر خود اس کے گھر جا کر نو مولود کو تحفے تحائف دے آئے تھے آج شام کو اس نے خود بھی گاؤں جانا تھا۔ ملک ایک کی کال آنے سے پہلے وہ چھوٹی لی لی زیان کے پاس اجازت لینے ہی جا رہا تھا۔ اب کال آنے کے بعد اس نے اپنے پروگرام میں تھوڑی سی ترمیم کر لی تھی۔ ملک محل میں کام کرنے والے سب ملازمین کو اس نے اپنے گھر ہونے والی دعوت میں شرکت کی دعوت دی انور کی سب کے ساتھ بہت بہتی تھی۔ اس لیے جب زیان سے اس نے بات کی تو اس نے بخوشی سب ملازمین کو دعوت میں شرکت کے لیے چھٹی دے دی۔ ایک رات ہی کی تو بات تھی۔

گیٹ پہ دو دو گاڑتھے خود عنیزہ کی طرف زیبا اور فریدہ تھیں جو گھر کی حفاظت کے نقطہ کے نظر سے انور کی دی جانے والی دعوت میں شریک نہیں ہوئیں۔ عشاء کی نماز کے بعد کھانا کھا کر اوپر بیڈروم میں آگئی تھی۔ زیبا اور فریدہ نے اسے پیش کش کی تھی وہاں اس کے ساتھ رکنے کی مگر اس نے انکار کر دیا کیونکہ گیٹ پہ چاق و چوبند گاڑ موجود تھے۔ فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔

رات دس بجے کا وقت تھا جب ملک محل کے گیٹ کے سامنے ملک ایک کی گرے ہجھور کی گیٹ پہ موجود گاڑوں نے اسے دیکھ کر زوردار سلام جھاڑا۔ گھر کا مالک آگیا تھا اب وہ دونوں مطمئن تھے۔ ملک ایک نے گیٹ سے ہی ڈرائیور کو ہجھور و سمیت ڈیڑھے کی طرف روانہ کر دیا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ رہائشی

اندرونی عمارت میں داخل ہوا۔ اس کی چال میں ہمیشہ کی طرح وقار اور اعتماد تھا۔ سب اندرونی لائیں آن گھسیں۔

دوسری منزل بھی روشن تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر اپنے بیڈروم کی طرف دیکھا۔ کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے تھے۔ خوش آئند بات یہ تھی کہ اس کے بیڈروم کا دروازہ ہلکا سا بھڑا ہوا تھا زیان نے ابھی تک لاک نہیں کیا تھا۔ وہ ابھی تک اندر نہیں گیا تھا۔ اس لیے زیان کی سرگرمیوں سے لاعلم ہی تھا۔



ایک نے بہت آرام سے کوئی آواز پیدا کیے بغیر دروازہ کھولا۔ کمرے میں خوشگوار حرارت پھیلی ہوئی تھی باہر کے مقابلے میں اندر کا درجہ حرارت معتدل تھا۔ زیان بیڈ کروئن سے ٹیک لگائے ٹیپ ٹاپ گود میں رکھے مصروف عمل تھی۔ وہ دوپٹے سے بے نیاز بے تکلف آرام وہ حلیمے میں تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس وقت ایک آسکتا ہے۔ اس نے قدم برہمائے اور اپنے پیچھے ہاتھ مار کر دروازہ بند کیا۔ آہٹ اور دروازہ بند ہونے کی آواز پہ زیان نے نگاہیں اٹھائیں۔

ملک ایک مضبوط پر اعتماد قدموں سے چلتا اس کی طرف آرہا تھا۔ وہ بے انتہا خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اچانک اس طرح وہ اس کے سامنے ہوگا۔ وہ چیخ مارنا چاہتی تھی پر اسے دیر ہو گئی تھی۔ ایک اس کے منہ پہ اپنا مضبوط ہاتھ رکھ چکا تھا۔ ایک کا ایک ہاتھ بازو سمیت اس کے کندھے کے گرد لپٹا ہوا تھا اور دوسرا مضبوط ڈھکن کی مانند اس کے منہ پر جمنا تھا۔ نہ وہ بھاگ سکتی تھی نہ منہ سے آواز نکال سکتی تھی۔ غنیمت تھا کہ وہ ناک سے سانس لے رہی تھی ایک کی مضبوط گرفت میں اس کا دم گھٹ رہا تھا اس کا نازک وجود گویا چرما کر رہ گیا تھا۔

شاید ایک اسے مارنے آیا تھا۔ خوف کسمپرسی و بے چارگی و رماندگی نے اس کی حالت قابل رحم بنا دی

تھی۔ اس وقت وہ یہی سوچ سکی تھی یقیناً "سب اس سازش میں شریک تھے تب ہی تو اسے گھر میں اکیلا چھوڑا گیا تھا تاکہ ملک ایک کو اپنے منصوبے پہ عمل کرنے میں کوئی مشکل نہ ہو۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

"بعد میں جتنا مرضی چاہے چیخ لیتا ڈرامہ بازی کر لیتا ابھی مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔" ایک اس کے کانوں کے قریب اپنے ہونٹ لگا کر بولا۔ اس کی آواز اور الفاظ میں شدید قسم کا غصہ تھا۔ اسے یقین تھا اب وہ شور نہیں کرے گی کیونکہ ملک ایک کے الفاظ اور تاثرات نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اب اداکاری سے کام نہیں چلے گا وہ اس کی ڈرامہ بازی سے واقف تھا۔ ایک نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا تھا وہ اب اس سے دور بیٹھا تھا۔ اس کے بولنے کے انتظار میں تھا جو اب ہاتھ پاؤں چھوڑ کر مرے مرے انداز میں بیٹھی تھی جیسے اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی معصوم گلا چار اور قابل رحم دوسرا نہیں ہے۔ ایک نے آج سے پہلے اسے تم کہہ کر کبھی بھی مخاطب نہیں کیا تھا آج اس کا ہر انداز بدلا ہوا تھا۔ یقینی طور پر وہ غیض و غضب میں بھرا ہوا آیا تھا۔

"میں وجہ جان سکتا ہوں کہ تم نے یہ سب کیوں کیا۔ کیوں ڈرامہ رچایا۔ ایسی کیا مشکل تھی جو تم نے ہم سب کو ذہنی عذاب میں ڈالا۔" وہ بڑی کوشش کے بعد اپنے لہجہ کو نارمل کر پایا تھا۔ جواباً "وہ خاموش رہی اس کا وہ حل تھا جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ نگاہیں جھکی ہوئی۔ جیسے وہ اس کے بجائے دیواروں سے مخاطب ہو۔

"کچھ بھی کرنے سے پہلے سوچ لیتا کہ گھر میں اس وقت باہر گیٹ پہ موجود گارڈز کے علاوہ کوئی نہیں ہے میں نے سب کو چھٹی دے دی ہے۔ اور ویسے بھی تمہارے ڈرامے اور اداکاری سے متاثر ہونے والے یہاں نہیں ہیں۔" اس کا اشارہ افشاں بیگم اور ملک جمنا گیری کی طرف تھا۔ زیان کٹ سی گئی۔

"اس لیے سچ بولنا اور کوئی الٹی حرکت مت کرنا۔"

وہ اپنی سوچوں کے حصار سے باہر آکر کسی نتیجے تک پہنچ چکا تھا۔

”زیان“ آپ کو اب کوئی بھی ڈرامہ یا الٹی سیدھی حرکت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے میری وجہ سے ’میری فیملی سے چڑ اور نفرت کی وجہ سے یہ سب کیا۔ جس وجہ سے بھی آپ نے یہ سب کیا اب آپ اس وجہ سے پریشان نہیں ہوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ آپ کو مجھ سے بھاگنے کے لیے یا فیملی کو اذیت دینے کے لیے کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ میں اپنے سے وابستہ کسی بھی رشتے یا شخص کو اذیت میں نہیں دیکھ سکتا۔ آپ پہلے بھی اپنی حماقت یا نفرت کی وجہ سے ہم سب کے جذبات سے کافی زیادہ کھیل چکی ہیں۔ میں آپ کو اور اس عمل کی اجازت نہیں دے سکتا۔

باقی جہاں تک عنیزہ چچی سے نفرت کی بات ہے تو دلوں کے حال اللہ جانتا ہے، لیکن ہم نے شروع سے ہی انہیں اپنی بیٹی کی یاد میں روتے تڑپتے دیکھا۔ انہیں دکھی دیکھ کر ارسلان چچا بھی پریشان ہوتے یہی وجہ ہے کہ جب عنیزہ چچی نے آپ کے بارے میں بات کی تو وہ پوری خوشی اور آمادگی سے خود آپ کو لینے گئے۔

انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ چچی کی دل جوئی کرتے رہے کہ کچھ بھی ہو جائے زندگی میں ایک بار کسی طرح بھی سہی انہیں ان کی بیٹی سے ملا دیں گے۔ قدرت نے خود ہی آپ کو ملک محل میں پہنچا دیا۔ آپ کے آنے سے ہم سب نے سالوں بعد چچی کو خوش دیکھا، مسکراتے دیکھا۔ اس سے پہلے ایسے لگتا تھا جیسے وہ خوش نظر آنے کا ڈرامہ کرتی رہی ہیں۔ ارسلان چچا خوش ہوئے انہوں نے بہت بار مجھے کہا کہ زیان مجھے اپنی اولاد کی طرح پیاری ہے اگر اللہ مجھے بیٹی دے تو وہ زیان جیسی ہوتی۔ یہ دونوں آپ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ان سچے رشتوں کی قدر کیجیے۔ ماضی پہ گڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ”وہ نرم دھیمے پھوار برساتے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ ایک ایک لفظ دل پہ اتر کر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں سچائی تھی۔

ایک نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی تو اس نے ہر اسامی رحم طلب نگاہوں سے اس کی سمت دیکھا۔ ایک کی نگاہوں میں ترحم یا ہمدردی کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ ”شاباش بولو جلدی جو بھی ہے۔ میں نے سونا بھی ہے سخت تھکا ہوا ہوں۔“ وہ جھنجھلایا ہوا تھا۔

”میں نے سب کچھ ماما اور آپ کی وجہ سے کیا۔“ اس کے حلق سے مری مری آواز برآمد ہوئی۔ ”گڈ آگے بولو۔“ وہ اس کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔ ”ماما مجھے چھوڑ کر آئی تھیں میں نے اپنی عمر کا وہ حصہ بہت کرب اور اذیت میں بسر کیا ہے۔ مجھے ماما اور ماما سے وابستہ ایک ایک شے ایک ایک رشتے سے چڑ تھی بچن میں آپ بھی شامل ہیں۔“ اب کی بار صاف لگ رہا تھا کہ وہ رو پڑے گی۔

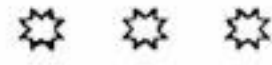
”گڈ اور بھی بتاؤ۔“ وہ بالکل نارمل لگ رہا تھا۔ زیان بولتی چلی گئی بے ربط ٹوٹے پھوٹے فقرے جس کا لب لباب یہی تھا کہ اس نے سب کچھ ماما اور ان کی تمام فیملی کو اذیت دینے کے لیے بدلہ لینے کے لیے انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کر کیا ہے۔ اسے ملک محل کے سب افراد سے ماما کی وجہ سے شدید چڑ ہے۔ ظاہر ہے ان میں ملک ایک بھی شامل تھا۔

زیان اپنا پول کھانے پہ شرمندہ تھی۔ ویسے بھی عامل جلالی بابا کی اندرونی خباثت سے واقف ہونے کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا کہ جلدی اس ڈرامے کا ڈراما پ سین کرے گی اور کوئی نیا طریقہ سوچے گی مگر یہ جان کر کہ ایک شروع دن سے ہی واقف تھا وہ اب اس سے نگاہیں تک نہ ملا پار ہی تھی۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی شرمندگی سے اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ زمین میں گھس جائے۔ ملک ایک کی پیشانی پہ لیکسوں کا جال سا بنا ہوا تھا وہ گہری سوچوں میں کم تھا۔ وہ اسے انجان اور بے وقوف اور خود کو بہت بڑی چیز سمجھتی رہی جو اپنی دانست میں سب کے جذبات سے کھیل کر انہیں بے وقوف بنا رہی تھی اور وہ خود انجانے میں نتائج سے لاپرواہ ہو کر اتنی بڑی بے وقوفی کر رہی تھی۔

ایک نے بہت دیر بعد سراٹھا کر اس کی طرف دیکھا

”باقی میں اپنی اور اپنی فیملی کے حوالے سے کوئی وضاحت نہیں دے سکتا نہ دینا چاہتا ہوں اس لیے میری باتوں کو ذہن میں رکھیے گا۔“

زیان بہت کچھ کہنا چاہتی تھی پر اب اس کی زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی۔ ایک اپنی بات پوری کر کے جس طرح آیا تھا اس طرح جا چکا تھا۔ وہ نڈھال سے انداز میں بیڈ پہ اوندھی ہو کر گر پڑی۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی اپنی جیت پہ ہنسے، خوشی منائے یا اپنی ہار پہ سوگ منائے ماتم کرے۔



احمد سیال، بیٹی کی پاکستان واپسی پہ سب دوست احباب کو ڈنر پہ انوائٹ کر رہے تھے۔ انہوں نے اس کی گمشدگی کے دوران بہت کراٹھیسس کو فیس کیا تھا۔ خاص طور پہ سب ایک ہی سوال کرتے تھے کہ رنم سیال اچانک کیوں باہر چلی گئی ہے جبکہ ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا اس کا۔ احمد سیال اس دعوت کے ذریعے سب کی سلی کروانا چاہ رہے تھے۔

یہ آئیڈیا رنم کا تھا۔ وہ ملک ایک کی پوری فیملی سے ایک نئی حیثیت میں ملاقات کرنا چاہ رہی تھی۔ اس لیے احمد سیال نے جب ملک جمانگیر کو فیملی سمیت انوائٹ کیا تو انہیں یہ جان کر اشد خوشی ہوئی کہ احمد کی بیٹی پاکستان واپس آئی ہے۔

رنم نے واپس آکر اپنی ایکٹوٹیز میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اس نے سب سے پہلے بیوٹی سیلون کا رخ کیا تھا۔ ملک محل میں رہتے رہتے اس کی اسکن ہاتھ پاؤں کی نرمی اور بالوں کا بیڑہ غرق ہو گیا تھا۔ اسے اپنا آپ پرانی کنڈیشن میں واپس لانا تھا۔ بیوٹی سیلون کے بعد اس نے ماریکیٹس اور شاپنگ مالز کا رخ کیا۔ بیوٹی سیلون میں صرف کیا گیا ماتم اس کے لیے اچھے نتائج لایا۔ وہ پرانی رنم نظر آنے لگی تھی۔ بالوں کی کٹنگ کروا کر اس نے انہیں نئی لک دی تھی۔ یہ اشائل پہلے سے بھی زیادہ اس پہ سوٹ کر رہا تھا۔ اس کی نرم چمکدار جلد کی شادابی مگالوں کی سرخی، بالوں کا رسمی ملائم پن ہاتھوں

پاؤں کی نرمی سب کچھ لوٹ آئی تھی۔ احمد سیال نے ملک جمانگیر کی فیملی کو انوائٹ کر لیا تھا۔ ان کے بیٹے کی شادی ہو گئی تھی وہ بھی اپنی بیوی کے ساتھ آ رہا تھا۔ رنم بے پناہ خوش تھی۔ سیال نے اس کا ملک محل میں نہیں والا روپ، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں دفن کر دیا تھا۔ یہ حقیقت صرف وہی دونوں جانتے تھے کہ رنم اتنے ماہ کہاں اور کیسے رہی ہے۔ وہ دونوں ہی نہیں نامی باب کو کھولنا نہیں چاہتے تھے۔ احمد سیال کو بس اتنا پتا تھا کہ رنم پڑھنے کے لیے باہر گئی تھی لیکن وہاں پایا کے بغیر اس کا دل نہیں لگاتو واپس آگئی۔ انہیں رنم سے برہ کر دنیا میں کچھ بھی عزیز نہیں تھا۔

اور رنم جانتی تھی دنیا میں اس کے لیے سب سے برہ کر قابل اعتماد اور قابل بھروسہ رشتہ صرف احمد سیال ہی کا ہے۔ رنم خوش تھی اور خوشی سے دعوت کی تیاری کر رہی تھی۔



زیان، ملک جمانگیر کے پاس بیٹھی انہیں ایک کتاب سے مختلف اقتباسات پڑھ کر سنارہی تھی۔ اشائل بیگم زیان کو نثار ہو جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں وہ اندرونی خوشی سے سرشار تھیں۔ اتنے دن سے زیان پہ جن نہیں آیا تھا اور نہ ہی دور دور تک کسی دورے کے آثار تھے۔ اس نے خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا تھا۔ سب سے برہ کر اس کی گم صم کیفیت ختم ہو گئی تھی۔ وہ ہنستی بولتی پہلے والی زیان سے الگ ہی لگتی اور تو اور اب وہ نوکرانیوں سے بھی بات چیت کرنے لگی تھی۔

”بابا جان کیا ہو رہا ہے؟“ ایک کمرے میں داخل ہوا۔ ملک جمانگیر بستر پہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

”پر سکون زندگی سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔“

ملک جمانگیر نے مسکرا کر جواب دیا۔

”آپ پہلے سے کافی بہتر لگ رہے ہیں۔“ ایک ان کے پاس بیٹھ گیا۔

”میں بس اپنی آنکھوں کی وجہ سے پریشان ہوں
ٹھیک طرح سے پڑھ ہی نہیں سکتا زیان کے ذریعے
اپنا شوق پورا کرتا ہوں۔“ انہوں نے بہت محبت سے
زیان کی سمت دیکھا تھا۔

”میں آپ کو شہر لے جاؤں گا اچھے ڈاکٹر سے چیک
اپ کر اؤں گا۔“ ایک نے انہیں تسلی دی۔

”اب ڈاکٹر کیا ٹھیک کریں گے مجھ سے جب سے
آنکھوں میں موتی اترے یہ مسائل پیش آرہے ہیں
۔ آپریشن کروانے کے باوجود بھی کبھی کبھی تو سب کے
چہرے ہی گنڈ ہو جاتے ہیں۔ رشتہ داروں کے علاوہ
کسی کی شکل ہی نہیں پہچان پاتا میں۔ خیر بڑھاپے میں
یہ سب تو چلتا ہی ہے، میں نے اسے جان کاروگ نہیں
بنایا ہے۔ تمہاری شادی کی خوشی میں نے اپنے جیتیمتی
دیکھ لی ہے اب معاذ کی فکر ہے۔“

”بابا جان معاذ کا آخری سمسٹر ہے وہ جلد ہی آجائے
گا۔“ ایک نے نرمی سے ان کے جھریوں بھرے ہاتھ
کو تھپکا۔ ملک جہانگیر نے اپنے کڑیل جوان بیٹے کو بڑی
محبت سے دیکھا۔

”تم نے ہمیشہ مجھے طاقت دی ہے اور ہاں احمد سیال
کے ہاں دعوت پہ بھی جانا ہے۔ اس نے پورے گھر
والوں کو بلایا ہے۔ اس کی بیٹی پاکستان واپس جو آئی
ہے۔“ ملک جہانگیر نے ایک بار پھر یاد دہانی کروائی۔

”ہاں بابا جان میں چلا جاؤں گا۔“ وہ سعادت مندی
سے بولا۔

”تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ زیان بھی ساتھ جائے گی
اور واپسی پہ تم سیدھے گھر آؤ گے۔ میں نے تم دونوں کو
شادی کے بعد ایک بار بھی اکٹھے ہنستے بولتے نہیں دیکھا
ہے۔ اب ٹھو کچھ دن گھر میں۔“ افشاں بیگم نے ٹوکا تو
وہ ہنسنے لگا۔

زیان نے نظر بچا کر اسے دیکھا۔ کھدر کے کرتے
شلوار میں ملبوس ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھے وہ مغرور
لگ رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی زیان کی سمت نہیں
دیکھا تھا۔

”امی جان آپ کی بہو پہ اگر جن آگیا تو میرا کیا بنے

گا۔“ زیان کو اچھی طرح علم تھا وہ اس پہ طنز کر رہا ہے
تب ہی تو اس پہ جیسے گھڑوں پالی بڑ گیا تھا۔
”چلو تم دونوں جاؤ اپنے کمرے میں جا کر آرام
کرو۔“ افشاں بیگم نے حاکمانہ انداز میں بول کر بات
ختم کرنی چاہی۔ ایک نے فوراً ”سعادت مندی سے سر
ہلایا۔ وہ زیان سے پہلے اٹھ کر گیا۔

زیان نے مرے مرے قدموں سے بیڈ روم کا رخ
کیا۔ ایک بیڈ کے بالکل کونے پہ لیٹا ہوا تھا۔ زیان کو
آتا دیکھ کر اس نے کروٹ بدل کر اس کی طرف پشت
کر لی۔ زیان کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹا تھا۔ ٹوٹی
کرچیوں کی چھین ناقابل برواشت تھی۔ اس کی
سسکیوں کی آواز فوراً ایک کے کانوں تک پہنچی
تھی۔ وہ جو تکیہ منہ پہ لیے لیٹا ہوا تھا۔ تکیہ منہ سے ہٹا
کر اس کی طرف آیا جھٹکے سے کبل اس کے منہ سے
سر کا یا۔

”اب کیا براہم ہے سب کچھ آپ کی مرضی سے
ہو رہا ہے، میں آپ پہ کسی قسم کا کوئی شوہرانہ حق بھی
نہیں جتا رہا ہوں جو آپ کو اس قسم کے ڈرامے کی
ضرورت محسوس ہوئی۔“ ایک کا اشارہ اس کی لال
آنکھوں کی طرف تھا۔ زیان کو اس کی باتیں تیر کی طرح
لگیں۔ اس کی باقی سسکیاں سینے میں ہی گھٹ گئیں۔

”میرے سر میں درد ہے اس لیے رونا آگیا تھا۔“
اس نے بمشکل خود کو سنبھالا۔

”تو کوئی پین کھلے لیں یا میری موجودگی کی وجہ
سے آپ کو براہم ہو رہی ہے۔ بتادیں میں دوسرے
روم میں سو جاؤں گا۔ آپ سے ویسے بھی ڈر لگنے لگا
ہے جانے کس وقت آپ پہ جن آجائے اور میرا تماشا
بن جائے۔“ ایک کا لہجہ نرم مگر الفاظ بہت کاٹ دار
تھے۔ ایک بار پھر زیان کا دل چاہا کہ وہ غائب ہو جائے۔

وہ ایک کی بات کا جواب دے بغیر کبل تان کر
لیٹ گئی۔ ایک بھی اپنی طرف آکر گھٹ گیا۔

”میں امی جان کی وجہ سے یہاں آنے اور سونے پہ
مجبور ہوں کیوں کہ مجھے سب کی نظروں میں موضوع
گفتگو بننا پسند نہیں ہے۔ پہلے ہی بہت تماشا اور مذاق

بن چکا ہے میرا۔ آپ کے جن کی وجہ سے۔“
اندھیرے میں اس کی آواز بر چھی کی مانند اس کے
کانوں میں آکر لگی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بار پھر
اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔



زیان بغیض احمد بغیض کا نسخہ ہائے وفا ہاتھ میں
پکڑے بیٹھی تھی۔ فیض کی شاعری اسے حد سے زیادہ
پسند تھی۔ وہ کتاب میں پوری طرح کھوئی ہوئی تھی
جب پاس پڑا اس کا سیل فون سریلے سر بکھیرنے لگا۔
اس نے مبروہ دیکھے بغیر فون آن کر کے کان سے لگا لیا۔
”زیان فون بند مت کرنا ورنہ حد سے بھی زیادہ
پچھتاؤ گی۔“ اس کی ہیلو کی جواب میں دوسری طرف
سے وہاب اپنی مخصوص سفاک آواز میں بول رہا تھا۔
زیان کی ریڑھ کی ہڈی میں سردی لہر دوڑ گئی۔

”کیوں کیا ہے فون مجھے تم نے۔“ اس نے اپنے
لہجہ میں اعتماد سمونے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔
”میں تو تمہارے گھر بھی آیا تھا کیا کسی نے بتایا
نہیں تمہیں۔ تمہاری ماں سے مل کر گیا ہوں باتیں کی
ہیں ان سے۔ تم یہ سمجھ رہی تھیں کہ گھر چھوڑ
کر نکلا جاؤ گی تو بیچ جاؤ گی مجھ سے۔ میں تمہیں پاتل
سے بھی ڈھونڈ نکالتا۔ تم تو مل گئی ہو اب مجھے زربہ
خالہ کو تلاش کرنا ہے۔ بہت حساب ہیں تم دونوں کی
طرف۔“ حیرتوں کے بہت سے پہاڑ اکتھے زیان کے سر
پہ ٹوٹے تھے۔ وہاب یہاں ملک محل میں آیا تھا اور
اسے پتا بھی نہیں چلا۔ وہ عمار سے ملا اور انہوں نے بھی
اس سے یہ بات چھپائی۔

وہ ملک محل میں کیسے پہنچا؟ کس نے اسے یہاں کا
پتا دیا تھا؟ اس کا پرستل مبروہ اب تک کیسے پہنچا۔؟ اور
اب وہ کس برتنے سے اتنی بڑی بڑی دھمکیاں دے
رہا تھا۔؟ وہ ملک محل میں آیا اور اسے ذرا بھی ڈر
نہیں لگا۔ گارڈ تو کسی اجنبی شخص کو ملک محل کے گیٹ
سے اندر تک نہیں داخل ہونے دیتے اور اس نے
عنیزہ سے ملاقات بھی کر لی۔ وہ ان سوالوں کے جواب

اپنے ذہن اور سوچ کے مطابق حاصل کرنے کی تک و
دو کر رہی تھی۔

”آئندہ مجھے فون کرنے کی کوشش مت کرنا۔“
زیان نے کمزور لہجہ میں اسے دھمکی دینے کی کوشش کی
جیسے واقعی وہ ڈر جائے گا۔ اس کی توقع کے برخلاف وہ
نور نور سے ہنسنے لگا۔ اس کی ہسی آج سے پہلے اسے
کبھی اتنی مکروہ نہیں لگی تھی۔

”تمہیں فون کرنا کیسے چھوڑ دوں۔ تم میری زندگی
کی ضمانت ہو، میری محبت ہو۔ کتنی مشکل سے تو تمہارا
سراغ پایا ہے اور تم کہتی ہو کہ مجھے فون ہی نہ کرو۔ یہ
کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے ٹوٹ کر محبت کی ہے تم سے
زیان۔ اور تم میری محبت، چاہت، وفاسب کچھ ٹھکرا کر
مجھ سے دور یہاں آگئیں۔ تم سوچتی ہو گی کہ میں کبھی
بھی تم تک نہیں پہنچ پاؤں گا، لیکن دنیا گول ہے اور
میرے لیے اتنی بڑی نہیں ہوئی ہے کہ تمہیں تلاش
نہ کر سکوں۔“ اس بار وہ بڑی ملانعت سے بولا تھا۔

”دیکھو مجھ سے ایسی باتیں مت کرو۔ میری شادی
ہو گئی ہے۔ میرے گھر میں سے کسی کو پتا چل گیا تو بہت
برا ہو گا۔“ وہ روہانی ہو رہی تھی۔ وہ وہاب کے ساتھ
بات کرتے ہوئے پوری طرح چو کنا تھی اور ادھر ادھر
بھی دیکھ رہی تھی۔ کوئی آتا تو اسے فوراً پتا چل جاتا۔
وہاب لمبی بات کرنے کے موڈ میں تھا۔ زیان نے
اچانک لائن کاٹ کر اپنا سیل فون ہی آف کر دیا۔

سیل فون آف کر کے زیان عنیزہ کی طرف چلی
آئی۔ وہ عصر کی نماز میں مصروف تھیں۔ اس نے
نوکرانی سے ماما کے بارے میں پوچھا تھا۔ زیب نے
انہیں بتایا تھا اس لیے وہ فوراً اس کی طرف آئیں۔
جہاں وہ بے قراری سے چکر کاٹ رہی تھی۔ زیان کے
چہرے پہ پریشانی اور اضطراب تھا۔ عنیزہ کے دل میں
خداشات سر اٹھانے لگے کہیں اس کے اور ایک کے
مابین کوئی جھگڑا یا تلخی تو نہیں ہو گئی ہے۔

”کیا بات ہے بیٹا۔ آؤ میری پاس بیٹھو۔“ انہوں
نے محبت سے اپنی طرف بلایا۔ خلاف توقع وہ اعتراض
اور انکار کیے بغیر ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ ورنہ جب

سے زیان نے انہیں اپنی نفرت سے آگاہ کیا تھا اس کے بعد سے ان دونوں میں شان و تلواریں ہی بات ہوتی تھی۔ ضرور کوئی نہ کوئی ایسی بات تھی جس نے زیان کی نفرت بھی بھلا دی تھی۔

”مما یہاں وہاں آیا تھا؟“ اس نے انگلیاں باہم ایک دوسرے میں پھنسا لی ہوئی تھیں۔ وہ امید افزا نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی جیسے وہ انکار کر دے گی۔ پر ان کا سر اثبات میں ہلا جو اس کے خوف کو کئی گنا بڑا گیا۔

”تمہیں کس نے بتایا ہے؟“ انہوں نے فوراً پوچھا۔

”میں نے تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ جلالی بابا تمہارا علاج کر رہے تھے۔ میں بے حد پریشان ہو گئی تھی۔ تمہیں اپنے ساتھ پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ بتاؤ تمہیں کس نے بتایا ہے۔ میرے علاوہ کوئی اس کا نام نہیں جانتا بلکہ ملک محل میں کوئی بھی اسے نہیں جانتا۔“

”مما ابھی اس کا فون آیا تھا۔“

”کیا! عین عینہ شاکنڈ تھیں۔“

”کیسے فون آیا اس کا؟“ وہ بدحواس ہو گئی تھیں۔

”مما میرے سیل فون پہ ابھی ابھی اس کی کل آئی تھی۔“

”تمہارا نمبر کس نے دیا ہے اسے؟“

”مما مجھے نہیں معلوم۔ میرا پرستل نمبر کیسے اس کے پاس پہنچا۔ ملک محل سے باہر میرا نمبر کسی کے پاس نہیں ہے۔ یہاں تک کہ میرا یہ نمبر بوارحمت کے پاس بھی نہیں ہے۔“ وہ بکھرے لہجے میں بولی۔

”پھر تمہارا نمبر اس نے کہاں سے لیا۔ پہلے وہ یہاں تک پہنچا پھر تمہارا نمبر حاصل کیا۔ پر یہ کیسے ہوا سب؟“ عینہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

”مما مجھے نہیں معلوم یہ سب۔ اس لیے تو آپ کے پاس آئی ہوں۔“ پریشانی سے اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

”تم نے کسی اور سے تو بات نہیں کی۔“

”نہیں ممما میں سیل فون آف کر کے آپ کے پاس آئی ہوں۔“

”کسی سنی الحلال بات مت کرنا۔“

”مما وہاں یہاں آیا تھا یہ بات کس کس کو پتا ہے۔“ اس نے رک رک کر پوچھا۔

”میں نے یہ بات صرف ملک صاحب کو بتائی ہے۔ ہم دونوں کے علاوہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہے۔“

”مما یہ بات ایک کو تو معلوم نہیں ہے نا؟“ اس بار اس نے ممما سے نظر حرائی تھی۔

”نہیں اسے یہ بات معلوم نہیں ہے اور نہ ہی جمانگیر بھائی کو۔ یہ مصیبت بھی تم پہ میری وجہ سے آئی ہے میرے باپسی کی وجہ سے آئی ہے۔ تمہاری نفرت میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہو گا۔“ عینہ ذہل گرفتگی سے گویا ہوئیں تو زیان ان کی طرف بس دیکھ کر رہ گئی۔

”آج تک تم نے جو دیکھا سنا وہ ایک طرف کا موقف تھا۔ میں مانتی ہوں برسوں کی دوری نے بہت کچھ بدل دیا ہے، لیکن میں چاہتی ہوں تم ایک بار مجھ سے بھی حقیقت کے بارے میں جان لو پھر تمہیں نتیجہ اخذ کرنے میں آسانی ہوگی۔“

عینہ کے چہرے پہ امید و بہم کی ملی جلی کیفیت تھی جیسے وہ آج ان کی بات سن لے گی۔ زیان ان کی بات کے جواب میں کچھ بھی نہیں بولی تھی۔ اس کی خاموشی کو عینہ نے اس کا اثبات تصور کیا اور تکلیف و ماضی کی طرف کھلنے والے درتے چپے نیموا کر دیے۔



عینہ طلاق لے کر ابو کے پاس لوٹ آئی تھی۔ امیر علی نے بچی اس سے چھین لی تھی۔ انہوں نے امیر علی کے خاندان کے بڑوں کو درمیان میں ڈال کر مصالحت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی کہ وہ بچی عینہ کے سپرد کر دے۔ پر امیر علی نے سب کو نکالنا جواب دیا۔ وہ تو بچی کی شکل تک ماں کو دکھانے کا روادار نہ تھا کجا کہ اس کے حوالے کر دیتا۔ اسے عینہ سے شدید قسم کی نفرت تھی اس نفرت کا نشانہ زیان اور عینہ

دونوں ہی بنی تھیں۔ دونوں کو جیتے جی ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا۔

عنیزہ کے سامنے عدالت سے مدد لینے کا راستہ بھی موجود تھا۔ برابونے یہ تجویز مسترد کر دی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے اگر انہوں نے بیٹی کی کسٹڈی کا کیس دائر کیا بھی تو جیت امیر علی کی ہوگی۔ اس کے پاس پیسے تھے وہ وکیل کو خرید سکتا تھا جھوٹے گواہ پیش کر سکتا تھا۔ ان کی رہی سہی عزت کو سرعام نیلام کر دیا سکتا تھا۔ وہ باپ بیٹی امیر علی کے مقابلے میں کمزور تھے۔ اس لیے چپ سادھ لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ عنیزہ کی مسلسل خاموشی قاسم صاحب کے دل پہ قیامت ڈھانے لگی۔ وہ خود کو بیٹی کا مجرم تصور کرنے لگے۔ انہوں نے ہی تو شادی کروائی تھی ایک بار بھی اس کی مرضی یا رضامندی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چپ چاپ ان کے فیصلے کی بھیینٹ چڑھ گئی پر اس قربانی کا کوئی فائدہ نہیں ہوا سب رائے گال ہو گیا۔

راحت نے ملک ارسلان کو اس سانحے کی خبر کر دی تھی۔ اس کے بچھے بچھے بے رونق چہرے پہ پھر سے خوشی نمودار ہونے لگی تھی۔ ادھر ملک جہانگیر کو بھی عنیزہ کے حالات سے آگاہی ہو گئی تھی۔ وہ پہلی بار جا کر قاسم صاحب اور عنیزہ سے ملے۔ ان کا چھوٹا سا گھر ایک عام متوسط علاقے میں تھا۔ مالی طور پہ وہ کسی طرح بھی ملک خاندان کے ہم پلہ نہیں تھے۔ پر یہاں ان کے چھوٹے بھائی کا دل اڑکا ہوا تھا اس کی خوشی اس چھوٹے سے گھر میں ہی موجود تھی۔ انہوں نے قاسم صاحب سے عنیزہ کا رشتہ اپنے چھوٹے بھائی کے لیے مانگا۔ خلاف توقع عنیزہ نے سختی سے انکار کر دیا۔ وہ کسی صورت بھی دوسری شادی کے حق میں نہیں تھی وہ اس امید پہ بیٹھی تھی کہ امیر علی بزبان کو اس کے سپرد کر دے گا۔ وہ باقی زندگی اپنی بیٹی کے ساتھ گزار سکتی تھی۔ اس کے انکار نے ملک ارسلان کو پھر سے مایوسی کے اتھاہ غار میں دھکیل دیا۔

امیر علی نے دھوم دھام سے دوسری شادی کر لی۔ عنیزہ نے قاسم صاحب کے ذریعے اپنی فریاد ایک بار

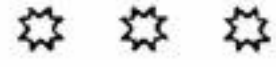
پھر امیر علی تک پہنچانے کی کوشش کی۔ پر وہ اس سے مس نہ ہوا بلکہ الٹا اس نے دھمکی دی کہ تم باپ بیٹی میں سے کوئی میرے گھر کے آس پاس بھی نظر آیا تو میں دونوں پہ جھوٹا مقدمہ بنا دوں گا۔

اسی غم میں قاسم صاحب نے ایک رات خاموشی سے آنکھیں موند لیں۔ اب اس اکیلے گھر میں صرف عنیزہ اور اس کی تنہائی تھی۔ محلے والوں نے کچھ عرصہ ساتھ دیا، لیکن کوئی کب تک خبر گیری کر سکتا تھا۔ سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ اس کے سامنے تنہائی اور پہاڑ سی زندگی تھی۔ ملک جہانگیر ایک بار پھر اس کے پاس آئے۔ اس بار ان کے سمجھانے بجھانے پہ عنیزہ نے خاموشی سے ان کی بات مان لی۔ اس کے سوا اب کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

ملک نخل میں سب نے کھلے دل سے اسے خوش آمدید کہا۔ ملک ایک اور ملک معاذ چھوٹے چھوٹے تھے۔ انہیں دیکھ کر عنیزہ کو زبان یاد آنے لگی۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے ایک بار پھر اسے ملنے کی سعی کی۔ اس مقصد کے لیے اس نے بوار رحمت کو خط لکھا اور زبان سے کسی بھی طرح چھپ کر ملاقات کروانے کو کہا۔ اس خط کے مندرجات الفاظ دل ہلا دینے والے تھے یہ صرف ایک خط نہیں تھا ماں کے دکھی دل کی فریاد تھی۔ اس نے جس جتن سے یہ خط بوا کو بھیجا یہ وہی جانتی تھی پر اسے خط کا کوئی جواب نہیں ملا۔

ملک ارسلان اس کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتے۔ وہ اسے گھمانے پھرانے کے لیے ورلڈ ٹور پہ لے گئے۔ پر عنیزہ کے دل کی بے کلی ختم نہ ہوئی۔ وہ کافی عرصہ نفسیاتی معالج کے زیر علاج رہیں، لیکن دل سے بیٹی کی یاد کونہ نکال سکیں۔ ملک ارسلان نے انہیں اندھیری راتوں میں سب سے چھپ کر اللہ کے سامنے فریاد کرتے روتے گڑ گڑاتے دعاؤں مانگتے دیکھا۔ عنیزہ کی دعاؤں کی قبولیت میں سالوں لگ گئے۔ پھر ایک دن وہ معجزہ ہو گیا جس کی توقع وہ جانے کب سے کر رہی تھیں۔ بوار رحمت نے خود ان سے رابطہ کیا اور زبان کو

اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کہا۔ اٹھارہ برس بعد یہ انہونی ہوئی تھی۔ خوشی سے ان کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔ ملک ارسلان عنیزہ کو خوش دیکھ کر خود بھی شانہ تھے۔ وہ بذات خود جا کر زیان کو لے کر آئے۔ عنیزہ جس بیٹی سے ملنے کی تمنا میں برسوں سے تڑپ رہی تھی یہ وہ نہیں تھی۔ زیان تو ان کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہ تھی۔



”بس یہ تھی میری زندگی کی کہانی اور سچائی۔“
عنیزہ ماضی کا سفر کر کے حال میں لوٹ آئی تھیں۔ انہوں نے زیان کی طرف دیکھا دونوں بغیر پلک جھپکائے ایک دوسرے کی سمت دیکھ رہی تھیں۔ اچانک زیان اپنی جگہ سے اٹھی اور بھاگ کر ان کے گلے سے آگئی۔ آنسوؤں کی جھڑی اس کی آنکھوں سے بہ رہی تھی۔ اپنی غلط فہمیوں غلط سوچوں پہ وہ جی بھر کر شرمندہ تھی۔ اپنی ماں کی مجبوریوں کا اور اک اسے اب آکر ہوا تھا۔

زیان نے انہیں ہمیشہ انہیں قصور وار اور مستوجب سزا ہی تصور کیا، کتنا برا کرتی آئی تھی وہ ان کے ساتھ۔ پھر انہوں نے اپنی تکلیف کا اظہار کبھی بھی نہیں کیا۔ ذہنی اذیت، کرب، آنسو جو وہ انہیں دے چکی تھی کچھ بھی تو بھولنے کے قابل نہ تھا۔ زیان اپنی گزشتہ زندگی اور رشتوں سے بدگمان ہی رہی۔ امیر علی کی کمزوری اور نفرت کی بدولت زرینہ بیگم کے ہاتھ مضبوط ہوئے جس کی وجہ سے وہ زیان کو اذیت دیتی رہیں۔ امیر علی گھر کے سکون کو خراب ہونے سے بچانے کی خاطر خاموش رہے ان کی یہی خاموشی اور چشم پوشی زیان کو اذیت پرستی اور خود اذیتی کے گہرے اندھیروں میں لے جانے کا باعث بنی۔ وہ خود سے وابستہ خود سے چاہنے والوں کو اذیت دینے کی عادی ہوتی گئی۔

یہ بات بھی قابل غور تھی کہ وہ خود سے وابستہ بہت قریبی رشتوں کو ہی اذیت دیتی آئی تھی سب سے پہلے

امیر علی ہی اس کا نشانہ بنے تھے نفرت کا جو بیج انہوں نے بویا تھا اب زیان کی صورت کاٹنا تو تھا۔ اسے انہیں بے سکون کر کے نظر انداز کر کے عجیب سے خوشی ملتی۔ امیر علی کے بعد عنیزہ اور پھر ایک کا نام اس فہرست میں تھا۔ وہ ملک ارسلان سے بھی برگشتہ رہی تھی اس کے خیال میں وہ بھی برابر کے قصور وار تھے۔ اب وہ عنیزہ کی گود میں سر رکھے رو رہی تھی۔

ملک ارسلان اچانک اس طرف آئے تھے دونوں ماں بیٹی کو دھواں دھار روتے دیکھ کر وہ بغیر کچھ پوچھے ہی سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے ہی دونوں کو چپ کروایا۔ عنیزہ کے آنسو اب بھی نہیں رک رہے تھے۔ ملک ارسلان کا ایک ہاتھ زیان کے سر پہ تھا وہ اسے تسلی دے رہے تھے وہ ننھے بچے کی طرح ہمک کر ان کے دائیں بازو سے آگئی۔

”بابا۔۔۔ آئی ایم سوری بابا! میں آپ دونوں کو غلط سمجھتی رہی۔“ ندامت سے اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ ملک ارسلان نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ عنیزہ زیان اور ارسلان۔ تینوں ایک ساتھ۔ روتی آنکھوں کے ساتھ چہرے پہ مسکراہٹ لیے۔ یہ تصویر اب مکمل تھی۔



احمد سیال کی طرف سے دی گئی دعوت میں ملک جہانگیر، افشاں بیگم ملک ایک اور زیان چاروں ہی آئے تھے۔ زیان کا اس قسم کی دعوت میں آنے کا پہلا اتفاق تھا۔ احمد سیال کا تعلق بزنس کلاس سے تھا ان کے مدعو کئے گئے مہمان، اکثر ان کے سوشل سرکل سے تعلق رکھتے تھے۔

احمد سیال نے بڑی گرمجوشی سے ان سب کی اور خاص طور پہ زیان کی خیر خیریت دریافت کی تھی۔ اسے ایک ٹائیپ کے لیے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے انہوں نے اسے گہری نگاہ سے دیکھا ہو۔ بعد میں یہ احساس پوری تقریب کے دوران اس پہ حاوی رہا۔ احمد سیال نے اپنی اکلوتی صاحبزادی سے ان کا تعارف کروایا۔ ریڈ کلر کے

ماڈرن ڈریس میں ان کی بیٹی شعلہ جو الہ نئی ہوئی تھی۔
 زیان بھی ڈیپ ریڈ کلر کے کلڈار سوٹ میں ملبوس تھی،
 مگر نہ جانے احمد سیال کی بیٹی سے تعارف حاصل
 کرنے کے بعد زیان کو اپنی تیاری اپنا قیمتی ڈریس،
 میچنگ جیولری نفاست سے کیا گیا میک اپ سب کا
 سب ہی انتہائی فضول لگنے لگا۔ احمد سیال کی لاڈلی بیٹی
 پوری محفل پہ چھائی ہوئی تھی۔

زیان اسے دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ وہ احمد سیال کے
 گھر میں ان کی بیٹی کے روپ میں اس حلیے میں اسے
 نہ ملتی تو وہ کبھی بھی اسے رنم سیال ماننے پہ آمادہ نہ ہوتی
 ۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے یہ فیملی کی شہادت لیے رنم
 سیال ہے، لیکن یہ سونی صدا احمد سیال کی بیٹی رنم تھی
 بھلا کہاں نہیں ایک عام سی لڑکی اور کہاں رنم سیال
 ایک بزنس ٹائیکون کی ماڈرن بیٹی جو پڑھنے کی عرض
 سے پاکستان سے باہر گئی ہوئی تھی۔

کچھ ایسا ہی حال ملک ایک کا بھی تھا جب احمد سیال
 نے رنم کا تعارف ملک فیملی سے کروایا۔ وہ بے یقینی
 سے رنم سیال کو دیکھ رہا تھا جس کے ریڈ لپ اسٹیک
 سے سجے ہوئے بہت خوب صورتی سے مسکرا رہے
 تھے۔ اس نے انتہائی گرم جوشی سے ملک ایک سے
 ہاتھ ملایا۔ خیر مقدمی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے
 جدا ہی نہیں ہو رہی تھی۔ ایک بہت غور سے اسے
 دیکھ رہا تھا جبکہ رنم کی آنکھوں میں شناسائی کی کوئی
 رنم تک نہ تھی۔

ایک اور زیان تو اسے دیکھ کر چونک گئے تھے جبکہ
 افشاں بیگم کا رویہ نارمل رہا۔ کیوں کہ رنم سیال کی
 پوری لک ہی چیخ تھی صرف ہلکی پھلکی نقوش کی
 مشابہت سے کیا ہوتا تھا۔ وہ گئے جہاں گئے تو ملک محل
 میں بہت کم ان کا سامنا نہیں سے ہوا تھا اور انہوں
 نے اس پہ خاص توجہ ہی نہیں دی تھی۔ ویسے بھی
 موتیے کے آپریشن کے بعد ان کے ساتھ بصارت کے
 مسائل ہو رہے تھے ایک اور زیان دونوں رنم سیال
 کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ اس کا ہر انداز نہیں
 سے مختلف تھا۔

ڈنر کے بعد گاؤں واپسی کے لیے ٹائم نہیں رہا تھا۔
 احمد سیال نے بڑی محبت کے ساتھ انہیں رکنے کی پیش
 کش کی۔ تقریب ختم ہو چکی تھی ان کے سوا بقی سب
 مہمان واپس جا چکے تھے۔ رنم نے اپنے کلاس فیلوز میں
 سے کسی کو بھی مدعو نہیں کیا تھا۔ انہیں اس کے آنے
 کی ابھی تک خبر بھی نہیں ملی تھی۔ وہ دل ہی دل میں ان
 سے ناراض تھی، خاص طور پہ کوئل اور فراز سے تو وہ
 انتہائی بدگمان اور برگشتہ تھی۔ اس لیے تو اس نے ان
 دونوں کو ابھی تک اپنی واپسی کا بھی نہیں بتایا تھا۔

رنم بہت خوش تھی ایک پہلی بار اسے ملا تھا وہ رنم
 سیال کے چہرے کے ساتھ تھی اس کی حیرت دیکھ دیکھ
 کر محفوظ ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ الجھن تھی۔
 یہی حال زیان کا بھی تھا، پر رنم نے اسے خاص اہمیت
 نہیں دی تھی۔ اس کی پوری توجہ ملک ایک کی طرف
 تھی۔ ملک جہاں گئے افشاں بیگم احمد سیال اور زیان ایک
 ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے بلکہ زیان صرف سامع
 کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ جبکہ رنم ایک
 الگ صوفیہ پہ ملک ایک کے ساتھ بیٹھی باتیں
 کر رہی تھی۔ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ
 معلومات حاصل کرنے کے چکر میں تھی۔

”چھا آپ شہر کے ساتھ ساتھ گاؤں میں بھی
 راجیکٹ پہ کام کر رہے ہیں واؤ گریٹ۔“ رنم نے
 آنکھیں پھیلاتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔
 ”جی ہاں میں ایک اسکول بھی بنوا رہا ہوں تعمیر کے
 مراحل میں ہے۔ اور انڈسٹریل ہوم مکمل ہو کر کام
 شروع کر چکا ہے۔“

”میں آپ کے گاؤں آؤں گی۔ اسکول اور
 انڈسٹریل ہوم دیکھنے۔ مجھے بھی گائیڈ لائن چاہیے جس
 پہ کام شروع کر سکوں۔“

”آپ آئے گا میں آپ کا انتظار کروں گا۔“ ملک
 ایک بہت خوش ہوا۔ اس ماڈرن لڑکی کے منہ سے
 غریب اور غریب لوگوں کے مسائل سن کر اسے بہت
 اچھا محسوس ہوا۔

آہستہ آہستہ سب ہی سونے کے لیے جا چکے تھے

صرف ایک اور رنم ہی وہاں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ باتوں کے دوران انہیں تیزی سے گزرتے وقت کا احساس تک نہ ہوا۔ اچانک سوال کلاک یہ ایک کی نظر پڑی جو ڈھائی بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ تب ایک اسے گڈ نائٹ کہہ کر اٹھا۔

زیان صوفے پہ سگری سٹی لیٹی ہوئی تھی پر وہ سو نہیں رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پہ اس نے بے اختیار گردن موڑ کر دیکھا۔ دوسری نظر اس نے وال کلاک پہ ڈالی۔ عام طور پہ وہ اتنی رات گئے جاگنے کا عادی نہیں تھا کیوں کہ اس کا پورا دن مصروف گزارتا تھا اس لیے وہ رات جلدی سے سوتا اور صبح جلدی بے قرار ہوتا تھا۔ آج وہ اپنے معمول سے کافی لیٹ تھا۔ زیان کو نئی جگہ اور رنم سیال کی وجہ سے نیند نہیں آرہی تھی۔ رنم سیال بالکل نیند کی ہم شکل تھی۔ نیند کی براسرار گمشدگی اور رنم کا اسے مشابہت رکھنا دونوں باتیں اسے ناقابل یقین لگ رہی تھیں جتنا سوچتی الجھتی جاتی۔

”کیا بات ہے ابھی تک آپ سوئی نہیں ہیں؟“ ایک نے ایک دوستانہ نظر اس پہ ڈالی۔ ورنہ تنہائی میں وہ کم ہی اس سے مخاطب ہوتا۔ وہ شہر میں کافی مصروف ہو گیا تھا ہفتے میں دو چکر گاؤں کے لگتے اور تب بھی وہ مصروف ہی ہوتا۔ سارا دن گھر سے باہر رہتا رات کو آتا تو بڑے سو جاتا۔

اس دن کے بعد سے وہ تو زیان کے لیے جیسے بالکل ہی اجنبی ہو گیا تھا۔ افشاں بیگم نے اس کی بے تحاشہ مصروفیت کی وجہ سے گھر میں ٹک کر بیٹھنے اور رہنے کی پابندی لگا دی تھی۔ انہیں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی مصروفیت کی وجہ سے زیان نظر انداز ہو رہی ہو۔ تب ہی انہوں نے کہا کہ کچھ دن گھر میں رہو زیان کو گھمانے پھرانے لے جاؤ اسے ٹائم دو۔ جواب میں اس نے نہ انکار کیا نہ اقرار۔

ملک ارسلان نے ایک کامصروف ترین شیڈول دیکھتے ہوئے زیان کو آگے اپنی تعلیم جاری رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ گھر میں کسی کو بھی اعتراض نہیں تھا۔ وہ

اپنا تعلیمی سلسلہ شروع کرتی تو لامحالہ اسے شہر میں رہنا پڑتا۔ اور شہر میں ملک ایک کے پاس اپنی رہائش تھی اس صورت میں دونوں زیادہ سے زیادہ اکٹھے رہ سکتے تھے کیوں کہ ملک ایک کا زیادہ وقت شہر میں ہی گزارتا تھا آج کل وہ گاؤں میں بھی مصروف تھا۔

”جی نیند نہیں آرہی ہے۔“ زیان نے اس کی طرف حیرانی سے دیکھا کیوں کہ ایک نے اسے خود سے مخاطب کیا تھا۔ وہ صوفے پہ بیٹھ کر شوڑا اتار رہا تھا۔ زیان نے دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اب ایک پاؤں میں پہنی گئی جرابیں اتار رہا تھا۔ اس کے پاؤں بالکل صاف ستھرے ناخن شہپ میں تراشے ہوئے تھے اس کے پاؤں کی انگلیوں پہ ہلکے ہلکے پل موجود تھے جو بہت بھلے لگ رہے تھے۔ اب وہ اپنی شرٹ کے اوپری دو بٹن کھول رہا تھا کوٹ اس نے پہلے ہی اتار کر صوفے کی بیک پہ ڈال دیا تھا۔ اس کی شرٹ کی آستھنیں فولڈ تھیں جو صوفے پہ بیٹھے بیٹھے اس نے ابھی ابھی کی تھیں۔ اس کی ہاتھ کی پشت اور بازوؤں پہ بھی کھنے پل تھے وہ غور سے دیکھ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے آپ کا جائزہ کھل ہو چکا ہے میں چیخ کر لولہ بڈرا۔“ ایک نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا وہ ہاتھ روم کی طرف جا رہا تھا۔ زیان اس کی بات پہ جھینپ سی گئی۔ اس نے زیان کی نگاہوں کی چوری پکڑ لی تھی۔ اسے شرمندگی ہونے لگی۔ اس نے منہ کبیل کے اندر کر لیا۔ ایک شراور لے کر آیا تو وہ کبیل میں سر سے پاؤں تک ملفوف تھی یہاں تک کہ اس کی ایک انگلی یا پل تک بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ ایک لائٹ بند کر کے بیڈ پہ آگیا۔ وہ اب فارغ تھا۔ زیان کی طرح وہ بھی نیند اور رنم کی حیرت انگیز مشابہت پہ حیران تھا۔ لیکن اپنی حیرانی اس نے رنم سیال پہ ظاہر نہیں کی۔



گھر لوٹنے پہ زیان سب سے پہلے عنیزہ کی طرف گئی۔ وہ انہیں کچھ بتانے کے لیے بے چین تھی۔ عنیزہ لان میں بیٹھی خوش گوار دھوپ سے لطف اندوز

ہو رہی تھیں۔ زیان بھاگنے والے انداز میں ان کے پاس آکر بیٹھی تھی۔ وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہو میں۔ زیان کے چہرے پہ جوش جھلک رہا تھا۔
 ”مما۔۔۔ ماما میں نے نہیں سے ملتی جلتی لڑکی دیکھی ہے۔“ اس نے دانستہ طور پہ اپنے لہجہ میں مسہنس سمویا تھا۔
 ”کہاں دیکھی ہے؟“ عنیزہ فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

”مما ہم جن کے گھر دعوت میں گئے تھے ان کی بیٹی بالکل نہیں کی ہم شکل ہے۔ وہ پاکستان سے باہر تھی حال ہی میں وہ واپس آئی ہے۔“
 ”اوہ تو تم سب جہانگیر کے دوست احمد سیال کی طرف گئے تھے۔“ عنیزہ نے پرسکون سانس لی۔
 ”آپ کو جہانگیر انکل نے بتایا تو تھا کہ ہم سب ان کی طرف انوائٹ ہیں۔“

”ہاں میرے ذہن سے یہ بات نکل ہی گئی تھی۔ جہانگیر بھائی کو اپنے اس دوست کی بیٹی بہت پسند تھی ایک کے لیے جا کر دیکھ بھی آئے تھے ہم سب نے بھی احمد سیال کی بیٹی دیکھنے کے لیے جانا تھا، لیکن پھر بعد میں پتا چلا کہ وہ پڑھنے کے لیے باہر چلی گئی ہے یوں بات آگے بڑھے بغیر ہی ختم ہو گئی۔“ عنیزہ نے اپنی دھن میں بے ساختہ اسے بتایا۔ زیان کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ اس سے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ اس سے پہلے بھی ایک کے لیے کسی کو پسند کیا گیا ہے ابھی ماما کی زبانی اسے علم ہوا تھا اور جانے کیوں اسے یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔ بات مکمل کر کے عنیزہ نے اس کی طرف دیکھا تو انہیں اواسی نظر آئی۔ انہوں نے جیسے اس کا چہرہ اور نگاہیں پڑھ لی تھیں۔

”اصل میں احمد سیال کی بیٹی جہانگیر بھائی کو معاذ کے لیے پسند تھی پر اس نے کہا کہ میں لڑکی دیکھے بغیر شادی نہیں کروں گا اس نے جہانگیر بھائی کو ٹال دیا تھا۔ معاذ نے کہا میں تو ابھی شادی کروں گا نہیں، آپ کو اپنے دوست کی بیٹی اتنی ہی پسند ہے تو آپ ایک بھائی کے لیے بات چلا میں۔ یہ بات جہانگیر بھائی کے ذہن میں

بیٹھ گئی۔ حالانکہ افشاں بھا بھی اس کے لیے قطعی طور پہ راضی نہیں تھیں اور ایک بھی خاموش خاموش سا رہنے لگا تھا۔ پھر بعد میں خود بہ خود ہی بات ختم ہو گئی۔ تم یہاں آئیں تو افشاں بھا بھی کو پہلی نظر میں ہی بھا گئیں۔ جہانگیر بھائی کا بھی یہی حال تھا اور رہا ایک تو اسے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا اس نے خوشی سے تمہارے ساتھ شادی کے لیے رضامندی دی تھی۔“
 عنیزہ کو ٹوٹ کر زیان پہ پیار آیا اس وقت وہ چھوٹی سی بچی لگ رہی تھی۔

نہ جانے کیوں اسے رنم سیال سے حسد محسوس ہو رہا تھا اپنا آپ اسے کتر لگ رہا تھا وہ اپنا اور اس کا موازنہ کر رہی تھی۔ رنم سیال ایک امیر باپ کی بیٹی تھی جبکہ وہ کرب، ناک حالات سے گزر کر حویلی پوچی تھی۔ رنم سیال کے ساتھ شادی کی صورت میں ایک کو بے پناہ مالی فوائد حاصل ہوتے، لیکن اس نے زیان کو بغیر کسی لالچ کے اور جینز کے اپنی زندگی میں شامل کیا تھا۔ جوں جوں وہ سوچتی جا رہی تھی احساس کمتری کے گہرے غار میں اترتی جا رہی تھی۔



”پاپا مجھے گاؤں جانا ہے، ایک کے ساتھ مجھے بھی وہاں ایک پراجیکٹ شروع کرنا ہے۔“ وہ انہیں مطلع کر رہی تھی۔

احمد سیال نے اسے بے بسی سے دیکھا۔ وہ اس کی رگ رگ سے واقف تھے جس طرح وہ ایک میں کھلے عام دلچسپی لے رہی تھی وہ انہیں بہت کچھ بتانے کے لیے کافی تھا۔ جب وہ آئی تھی اس نے تفصیل سے پاپا کو ایک ایک بات سے مطلع کیا تھا۔ ایک سے اپنا گاؤں اور پسندیدگی ظاہر کرنے میں اسے کسی بھی قسم کی چمکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ ایک شادی شدہ ہے۔ وہ اسے بری طرح بھا گیا تھا۔ احمد سیال نے صرف اس کی خواہش پہ ملک جہانگیر کی فیملی کی خاطر اتنی بڑی تقریب منعقد کی تھی۔ وہ اس کی کوئی بات بھی نہیں ٹال سکتے

تھے۔ وہ ضدی تھی اس نے روتے ہوئے پیپا سے التجا کی تھی کہ وہ اسے کسی بھی طرح ایک سے ملو ادیس شادی کروادیں۔ وہ رو رہی تھی اور ان کا دل کٹ رہا تھا۔ پہلے بھی اپنی بات نہ ماننے یہ وہ گھر چھوڑ گئی تھی اس بار وہ کوئی انتہائی قدم اٹھالیتی تو وہ کیا کرتے۔ انہوں نے اس کی آنکھوں میں ایک نیارنگ دکھا تھا یہ جنون کا وحشت کا رنگ تھا۔

وہ ملک ایک پہ صرف اور صرف اپنا حق سمجھ رہی تھی کیوں کہ ایک کا رشتہ پہلے اسی کے لیے ہی تو آیا تھا۔ وہ گھر چھوڑ کر نہ جاتی تو آج ایک کی بیوی بن کر ملک محل میں بیٹھی ہوئی۔ اس کی محبتوں پہ بلا شرکت غیرے صرف اور صرف اسی کا حق ہوتا۔ کاش یہ بات اسے ملک محل میں رہتے ہوئے ہی معلوم ہو جاتی تو وہ کسی صورت بھی ایک اور زیان کی شادی نہ ہونے دیتی۔ بھلا زیان ہوتی کون ہے ایک کی زندگی میں آنے والی۔ جہا نکیر انکل نے اسے اپنے بیٹے کے لیے پسند کیا تھا۔ ایک صرف اسی کا ہے۔

وہ گاؤں میں ایک کے قریب رہنے کے لیے پلاننگ کر رہی تھی۔ احمد سیال نے اس مقصد کے لیے بھاری رقم اس کے اکاؤنٹ میں ڈال کر رکھ دی تھی۔ رنم سیال ملک محل آرہی تھی۔ ملک جہا نکیر اس کے لیے کیسٹ روم از سر نو ڈیکورٹ کروا رہے تھے۔ ملک جہا نکیر رنم سیال کی آمد پہ خوش تھے وہیں پہ زیان پریشان تھی۔ ایک کے ساتھ صرف ایک ملاقات کے بعد ہی اس نے گاؤں آنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا جو اب ملک ایک نے بڑے خلوص سے اسے گاؤں آنے کی دعوت دی تھی۔



”معاذ ہم ان کے گھر گئے تھے دعوت یہ۔ یقین کرو وہ بالکل نہیں جیسی ہے۔ میں تو اسے دیکھ کر چونک گئی تھی وہ ہو نہیں جیسی تھی شکل و صورت میں صرف ڈرینگ کا فرق تھا۔ حیرت انگیز مشابہت دیکھی ہے میں نے تو پہلی بار۔“ وہ معاذ کے ساتھ اسکا پ پہ

بات کرتے ہوئے جوش و خروش سے احمد سیال کے گھر جانے اور ان کی بیٹی سے ملنے کا احوال بتا رہی تھی۔ معاذ کو کچھ دن پہلے ہی نہیں کی گمشدگی کے بارے میں علم ہوا تھا۔ وہ اپنی پرہائی کی وجہ سے مصروف تھا اس لیے اتنی توجہ نہ دے سکا تھا۔ آج فرصت سے زیان سے بات ہو رہی تھی تو وہ اسے نئی نئی باتیں بتا رہی تھی۔

”تو آپ سب سے وہ کیسے ملی؟“ معاذ اندر سے چونک گیا تھا، لیکن زیان کے سامنے اس نے اظہار نہیں کیا۔

”ہم سب سے تو اچھے طریقے سے ملی تمہارے بھائی جن کو تو اس نے خاص طور پہ کمپنی دی ہے۔ پہلی ملاقات میں ہی بے تکلف ہو گئی اور اب وہ ہمارے گھر بھی آرہی ہے کیسٹ روم تیار ہے اس کے لیے۔“ آخر میں زیان جل کر بولی تو معاذ ہنسنے لگا۔

”وہ ہمارے گھر کیوں آرہی ہے؟“
”گاؤں دیکھنے آرہی ہے اور کچھ سوشل ورک کرنے۔“ زیان نے سادگی سے بتایا۔

”سوشل ورک کے لیے اسے شہر میں کچھ نظر نہیں آیا جو گاؤں آرہی ہیں وہ۔ اتنی دور۔“ معاذ دل میں کچھ سرچ رہا تھا۔

وہ اسے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ رنم کی طرف سے ہوشیار ہو جائیں۔ زیان پریشان ہو جاتی۔ احمد سیال کے گھر جب اس نے ان کی بیٹی کے فوٹو دیکھے تو نہ جانے کیوں آپ ہی آپ اس کی سوچوں کا دھارا نہیں کے گرد مڑ گیا تھا۔ معاذ اسے جان کر تنگ کرتا تھا۔ بہت سے مواقع پہ معاذ کو ایسا محسوس ہوا کہ نہیں اصل میں وہ ہے نہیں جو وہ خود کو ظاہر کرتی ہے اگرچہ اس نے خود کو ملک محل کے رنگ میں ڈھالنے کی پوری پوری کوشش کی تھی پھر بھی معاذ کی حساس اور زیرک نگاہ کو کسی گزیر کا احساس ہوتا رہا۔ وہ معاذ کے سوالوں سے ڈر جاتی۔ اس کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش کرتی۔

احمد سیال کی بیٹی اب اچانک بیرون ملک سے واپس آئی تھی جس طرح اچانک گئی تھی۔ نہیں عائب ہوئی

تو وہ منظر عام پہ آگئی۔ جانے کیا گورکھ دھندا تھا۔ پہلی ملاقات میں ہی ایک سے بے تکلفی بھی معنی خیز تھی۔ معاذ اس کے بارے میں شاید کبھی بھی ایسے تجسس کا شکار نہ ہوتا اگر وہ اسے اتفاقاً ”زیان بھابھی“ کی طرف عجیب حسد سے بھری نفرت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے نہ پکڑتا۔ وہ کیسی عجیب مبہم نگاہیں تھیں جن کی نفرت کا جواز پیش کرنا مشکل تھا۔ معاذ کو ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے نیناں اور اب رنم سیال ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں۔ اس نے اپنے اندازے اور محسوسات سے زیان کو لاعلم ہی رکھا تھا۔ وہ بے پناہ حساس طبیعت کی مالک تھی پریشان ہو جاتی۔



ملک ایک تیار ہو کر رینوم اسپرے کر رہا تھا۔ سلمیٰ ادھر ہی پاس بیٹھی اس کے جوئے پالش کر رہی تھی۔ زیان سیل فون ہاتھ میں تھامے خراٹھواہی مصروف نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک رینوم اسپرے کر کے بیٹھ گیا تھا۔ زیان نے گردن موڑ کر ایک کی طرف دیکھا وہ صاف دھلی ہوئی جرابیں پہن رہا تھا۔ اس کی ظاہری حالت بھی بہت منظم تھی اس کی شخصیت کی طرح۔ وہ اسے مجبور کر رہا تھا کہ زیان اس کی طرف دیکھے کچھ ایسا سحر تھا اس کی شخصیت میں۔ سلمیٰ نے آخری بار اپنے دوپٹے کے کونے سے ایک کے شوز پہ لگی ٹاپیہ گرد جھاڑی۔ اس سے اس کی نگاہوں میں ایک کے لیے خاموش سی عقیدت تھی کیوں کہ وہ بغیر اس کے اس کی ضرورتوں کو سمجھ کر اکثر و بیشتر اس کی مدد کرتا تھا اس لیے وہ اس کا بے پناہ ادب کرتی تھی۔ زیان کے اندر تک جلمن اور کڑواہٹ پھیلی تھی۔

”سلمیٰ جاؤ میرے لیے پانی لے کر آؤ۔“ اس کی آواز اس سے غراہٹ سے مشابہ تھی۔ سلمیٰ نے دہل کر چھوٹی بی بی کی طرف دیکھا۔ وہ بہت تیزی سے وہاں سے بھاگی۔ چھوٹی بی بی کے جن سے وہ بھی ڈرتی تھی۔

”آپ سلمیٰ سے آرام سے بھی یہ بات کہہ سکتی

تھی۔“ ایک نے خاصے رساں سے زیان کو اس کے روپے کی بد صورتی کا احساس دلایا تھا۔

”تمہیں نے کیا کیا ہے؟“ زیان کے انداز میں حیرت آمیز رنج تھا جیسے اسے ایک کی بات سے تکلیف پہنچی ہو۔

”سلمیٰ کو ہم نے کبھی بھی نوکر نہیں سمجھا ہے۔ ان لوگوں کی بھی عزت نفس ہوتی ہے آپ نرمی سے محل سے بات کیا کریں سب کو وہ ہم ہی رہتا ہے آپ کے بارے میں۔ نہ جانے آپ بول رہی ہیں یا آپ کا جن۔!“ وہ مسکراہٹ لبوں میں دبا گیا تھا۔ وہ آرام سے بول کر اس کے پاس گزرتا جا چکا تھا۔ زیان کو شدید غصہ آرہا تھا، لیکن وہ ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے جن کی آڑ میں وہ خوب چیخ چلا سکتی تھی، لیکن ایک جن کی حقیقت سے واقف ہو چکا تھا اب وہ صبر اور جبر ہی کر سکتی تھی خود پہ۔



رنم سیال ملک محل آگئی تھی۔ نوکرانیاں اسے دیکھ کر ششدر تھیں ایسے لگ رہا تھا نیناں کپڑے بدل کر ماڈرن سوانگ بھر کر پھر سے آگئی ہے۔ حیرت انگیز مشابہت تھی دونوں کی۔ عنیزہ بھی اسے دیکھ کر چونک گئی تھیں پر رنم سیال کی نگاہوں میں شناسائی کی کوئی بھی رمتی نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا ملک محل میں اسے ایسے رد عمل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے اس لیے وہ ذہنی طور پہ خود کو سمجھا بچھا کر لائی تھی۔ اپنی اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب تھی۔ کیونکہ نوکرانیاں اور ملک محل میں رہنے بسنے والے اللہ کی شان کے گن گار ہے تھے وہ چاہے تو کیا نہیں بنا سکتا پھر ایک جیسی شکل کے دو انسان کیوں نہیں بنا سکتا۔

عنیزہ انشاں بیگم خاصی محبت سے ملی تھیں اس سے ایک اسکول کی طرف تھا۔ وہ بھی رنم سیال کی وجہ سے جلدی گھر آ گیا تھا۔ کھانے میں خاصا اہتمام تھا ڈائننگ ہال میں سب کے ساتھ کھانا کھا کر رنم کو اپنی انا اور عزت نفس کے سرخرو ہونے کا احساس

بک شیف سے ایک کتاب نکال کر بیڈ پر آگیا۔
 آوے گھنٹے بعد زیان بھی آگئی۔ دروازہ بند کر کے اس
 نے اپنا کبل اٹھایا اور صوفے پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر
 بعد ایک نے اس کی طرف دیکھا وہ سوچتی تھی۔ اس
 نے کتاب رکھ دی۔

آج سردی کافی زیادہ تھی اس نے فالتو کبل لا کر
 صوفے پر دراز زیان کے اوپر ڈالا۔ کچھ بھی سہی وہ اس
 کی ذمہ داری تھی۔ زیان ہلکی نیند میں تھی۔ ایک نے
 اس کے اوپر کبل ڈالا تو وہ پوری طرح بے وار ہوئی۔
 ایک اس پر کبل ڈال کر جاچکا تھا۔ وہ اس دن کے بعد
 سے بیڈ پر نہیں سوئی تھی، آخر کو یہ بھی عزت نفس
 رکھتی تھی۔ اتنی گری پڑی نہیں تھی۔ جب وہ اسے
 اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھا تو اسے بھی زبردستی
 بوجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سوچوں سے پیچھا
 چھڑاتے سونے کی کوشش کرنے لگی۔



(آئندہ ماہ آخری قسط ملاحظہ فرمائیں)

اور ماہانہ سبکدوش
 سے بہانے کے لیے خاص حاصل

میرزا علی

حکایتِ حیات

قیمت - 400 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
 37، اردو بازار، کراچی
 فون نمبر: 32735021

ہوا۔ اس ملک محل میں وہ نہیں کی عام حیثیت میں
 رہی تھی اب رنم سیال کی حیثیت میں سب کیسی
 عزت اور وقار کے ساتھ پیش آرہے تھے۔ اس کے
 جلتے دل پہ پھوار پڑ رہی تھی۔

کھانے کے بعد وہ آرام کرنے کے موڈ میں نہیں
 تھی جھٹ ملک ایک سے اسکول اور انڈسٹریل ہوم
 دیکھنے کی فرمائش کر دی۔ ایک اسے اپنی گاڑی میں
 پہلے انڈسٹریل ہوم دکھانے لایا۔ یہاں آکر رنم کو طاقت
 اور اختیار کا احساس ہوا۔ یہاں وہ میڈم کی حیثیت میں
 بیٹھا کرتی تھی۔ چھٹی ہو چکی تھی ورنہ سب عورتیں
 اسے دیکھ کر حیران ہوتیں۔ اس نے اشتیاق سے ایک
 ایک حصہ دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ یہاں اچھا
 خاصا ٹائم لگ گیا تھا۔ اسکول دیکھنے جاتے تو رات کا
 اندھیرا پھیل جاتا۔ سو ایک نے اسے واپسی کا کہا۔ اس
 نے فوراً مان لیا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ کلنی دیر
 ایک کے ساتھ سٹنگ ایریا میں بیٹھی رہی۔

زیان بیڈروم میں معاذ کے ساتھ بات کرتے
 ہوئے تازہ ترین صورت حل سے آگاہ کر رہی تھی۔
 ایک اٹھ کر آیا تو زیان اور معاذ میں رنم سیال کی باتیں
 چھڑی ہوئی تھیں۔ ایک کے آتے ہی زیان نے فوراً
 موضوع تبدیل کر دیا۔ وہ سب کم میں معاذ ایک کو دیکھ
 کر اس تبدیلی کی وجہ جان چکا تھا۔ زیان نے جلدی
 بات ختم کر دی۔ وہ نما کر آیا تو زیان کمرے میں نہیں
 تھی۔ ایک نے تو لپے سے بل خشک کرتے ہوئے
 دروازے سے باہر نظر دوڑائی وہ سخت سردی میں ٹیرس
 کی دیوار پہ کہنیاں نکائے کھڑی تھی۔

”باہر ٹھنڈ ہے زیان آپ بیڈروم میں آجائیں۔“
 وہ اس کے پیچھے پیچھے آگیا تھا۔ ایک ہلکی سی شرٹ میں
 بغیر کسی گرم کپڑے کے تھا۔

”میں چاند کو دیکھ رہی ہوں“ آجاؤں گی۔“ وہ
 قدرے رکھالی سے بولی تو ایک سرہلا ٹاپلٹ گیا۔ اس
 نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ٹھنڈی ہوائ نے اندر کی
 حرارت کو سردی میں تبدیل کر دیا تھا اور پھر سے زیان
 نے ہیٹر بھی آن نہیں کیا تھا۔ ایک نے ہیٹر آن کیا اور

کے کچے کھری

پر مصروف تھا، اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے اس نے فون پر اختتامی کلمات کہے اور پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے فائل آگے بڑھائی۔ وہ اسے بڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ ہانیہ نے وال کلاک میں دیکھا، پانچ پینتیس ہو چکے تھے اس کے ہونٹ بھنج گئے، آج بے عزتی سے بچ جانا، ناممکنات میں سے تھا۔

اس نے ایک کی طرف دیکھا جو فائل کے بجائے خود اس کے مطالعے میں محو تھا۔ ٹیبل پر کہنی ٹکائے، ہاتھ کی مٹھی بنا کر اس پر ٹھوڑی رکھے، اپنی طلسمی نگاہیں ہانیہ پر جمائے، بڑی دلجمعی سے اسے دیکھ رہا تھا، وہ سٹیٹاسی گئی، اسے متوجہ دیکھ کر اس نے اپنی پوزیشن تبدیل کی اور کرسی کی بیک سے ٹیک لگا کر بازو سینے پر باندھ لیے نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔

”میں جاؤں سر۔“ اس نے اجازت طلب کی۔

”بیٹھیں میں نے چائے منگوائی ہے۔“

”نہیں سر، پلیز میں آل ریڈی بہت لیٹ ہو چکی ہوں۔“

”ہو چکی ہیں نا، تو کچھ دیر اور سہی، چائے پی کر کچھ فریش ہو جائیں گی۔“

”ساری فریش نیس نکل دیں گی تیلی امی۔“

وہ بے بسی سے سوچ کر رہ گئی تھی، اسی اثنا میں چائے آچکی تھی، اس نے اتنی تیزی سے چائے ختم کی کہ اس کا آخری گھونٹ بھی بہت گرم تھا، مگر وہ اس کے ٹھنڈی ہونے کے انتظار میں مزید دیر کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی، سو فوراً ”اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اٹھتے ہی ایک بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا، اس نے اپنا کپ

آج کام بہت زیادہ تھا، ہانیہ کے ہاتھ بہت تیزی سے کی بورڈ پر چل رہے تھے، وہ کسی طرح سے بھی پانچ بجے تک کام نمٹالینا چاہتی تھی کہ ٹائم سے گھر پہنچ سکے، پچھلے دو دن سے کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ لیٹ پہنچ رہی تھی اور اس کے نتیجے میں ’تائی امی کی سخت ست بھی سننا پڑی تھیں۔ آج وہ کام جلدی کرنے کے چکر میں لہج بھی نہیں کپائی تھی۔ اب بھی چائے کی شدید طلب کو دبائے، وہ مصروف تھی۔

”ٹھک ٹھک“ دو انگلیوں سے اس کی ٹیبل بجائی

کارولٹ

گئی، اس نے حیرت سے انگلیوں سے چہرے تک کا سفر طے کیا اور گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ”جی سر“

”بیٹھئے پلیز۔“

ایک۔ اس کا باس، ہاتھوں میں چند پیپر لیے کھڑا تھا، اسے متوجہ پا کر وہ پیپر اس کی طرف بڑھا دیے۔

”نہیں بھی فیڈ کر دیجیے۔“

”ٹیس سر۔“ وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ یعنی مزید

”کیا بات ہے، آپ تھک گئی ہیں یا۔“

”نہیں سر میں کرتتی ہوں۔“

وہ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر واپس اپنے آفس چلا گیا۔ ”توبہ آنکھیں ہیں یا ایکسرسے اندر باہر دیکھ لیتے ہیں۔“ وہ پھر سے مصروف ہو گئی، پھر جیسے ہی کام ختم ہوا وہ کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کر کے پیپر سمیٹ کر قائل میں لگا کر پاس کے آفس میں آگئی۔ وہ فون

جب تھکی ہوئی ہوتی ہیں تب ہی لیتی ہیں۔ ”اپنے اتنے
قریب سر ایک کی آواز سن کر وہ اچھل ہی پڑی۔
”سر آپ۔“ وہ ہکلا سی گئی۔

”جی میں۔“ وہ اسی طرح اس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ
گیٹ کی طرف بڑھ گئی اور وہ پارکنگ کی طرف آگئی وہ
گیٹ سے باہر نکلی ہی تھی کہ اس کی کار اس کے قریب
آکر رکی، ساتھ ہی فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھلا تھا۔
”آئے مس ہانیہ“
وہ چکر اسی گئی۔ ”سر پلیز میں چلی جاؤں گی۔“

وہیں چھوڑ دیا جو آدھا چائے سے بھرا ہوا تھا کیوں کہ وہ
بہت آرام سے پی رہا تھا۔

”اوکے سر میں اب جاؤں۔“
”چلیں۔“ اس نے اس کے لیے دروازہ کھولا، وہ
تیزی سے اس کے قریب سے گزر کر باہر نکلی، اس کی
مسور کن خوشبو اس کے ساتھ ساتھ آئی تھی، اس
نے ایک لمبا سانس لے کر اس خوشبو کو اپنے اندر
محفوظ کر لیتا چاہا تھا۔
”یہ اتنے لمبے لمبے سانس آپ عادتاً لیتی ہیں یا



”نو فارملٹیسی“ آئے ویسے بھی آپ لیٹ ہو چکی ہیں۔“

اس کے حتمی لہجے پر وہ بے بس ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ باس تھا شو فروں کی طرح اس کے انتظار میں رکا نہیں رہ سکتا تھا۔ کار میں وہی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جو اس کے حواس سلب کرتی تھی۔ اس کے اتنے پاس بیٹھنا اس کی خوشبو کو محسوس کرنا یہ سب کوئی خواب لگ رہا تھا اور وہ ہمیشہ کے لیے اس خواب میں رہنا چاہتی تھی اس نے چور نظروں سے اسے دیکھا وہ مکمل طور پر ڈرائیونگ کی طرف متوجہ تھا گھور سیاہ آنکھیں سامنے فوکس تھیں۔ ہانیہ نے کبھی کسی کی اتنی سیاہ آنکھیں نہیں دیکھی تھیں اتنی کللی اور چمکدار آنکھیں مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی تھیں سیاہ گھنی پلکیں جڑے ہوئے ابرو اس کی آنکھوں کی خوب صورتی کو برساتے تھے وہ بہت شاندار شخصیت کا مالک تھا۔ وہ نظر حرا کر ہی بات کرتی تھی۔

”پتا نہیں کون خوش نصیب اس عالی شان بندے کی بیوی بنے گی۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔

”ویسے گاڑی میں اے سی تو چل رہا ہے۔“ یہ اس کی ٹھنڈی سانس پر کمنٹ آیا تھا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

”جی جی سر۔“

”اچھا میں ایک بات کلینے کر دوں مجھے کراچی کے سارے راستوں کا علم ہے لیکن میں کسی کو اس کے گھر تک بغیر ایڈریس معلوم کیے نہیں پہنچا سکتا۔“ اس کے بیٹھے طنز پر ہانیہ کا شرمندگی سے برا حال ہو گیا تھا۔

”میں ایڈریس بتاتی ہوں سر۔“

ایک نے مسکراہٹ چھپانے کو ہونٹ بھیج لیے تھے۔ وہ ایڈریس بتاتی گئی اور گاڑی کو اس کے بتائے ہوئے ایڈریس کے مطابق گھماتا مطلوبہ روڈ تک لے آیا۔

”بس سر یہ روڈ کرا اس کر کے آگے گلی میں ہمارا گھر ہے۔“

اس نے گاڑی روکی۔ وہ شکر یہ ادا کرتے ہوئے اتر آئی۔

”آئیے سر ہمارے گھر تشریف لائیے۔“

اس نے اخلاقاً ”دعوت دی“ لیکن اس وقت حیران رہ گئی جب اس کے گاڑی سے اترتے دیکھا۔

”چلیے“

”جی جی۔“ وہ اتنی تیزی سے مڑی کہ اس کے ہونٹوں پر پھیلتی مسکراہٹ دیکھ ہی نہ پائی تھی۔ گھر کی نمل بجاتے ہوئے وہ خوف زدہ تھی۔ ایک البتہ حیران سا اس عالی شان عمارت کو دیکھ رہا تھا۔ گیٹ پر تایا جان نمودار ہوئے تھے۔

”اتنی دیر۔“ ایک پر نگاہ پڑتے ہی انہیں بریک لگ گئی۔

”یہ میرے باس ہیں سر ایک تیمور صاحب آج زیادہ دیر ہو گئی تو سر جھمچھم روڑنے کے لیے آگئے۔“

اس نے جلدی سے وضاحت کی، مبادا تایا جان مٹھوک ہو کر کچھ اور سمجھ بیٹھیں۔ باس کاسن کر تایا جان کا رویہ یکسر تبدیل ہو گیا۔ ”آئیے تشریف لائیے۔“

”نہیں اب میں چلتا ہوں۔ اوکے مس ہانیہ۔“ وہ روڈ سے لہجے میں معذرت کرتا واپس چلا گیا۔ وہ تایا جان کے پیچھے چلتی لاؤنج میں آئی تھی۔

”یہ تمہارے آنے کا ٹائم ہے اور یہ مالکان کب سے اپنے دروازے کو گھروں تک چھوڑ کر آنے لگے؟“

”نہیں تایا جان سر کبھی کسی کو چھوڑنے نہیں جاتے“ آج بہت دیر ہو گئی تو شاید اس لیے مجھے بھی اپنی گاڑی میں بیٹھالیا، آج کل کام بہت ہے۔ میں کتنی ہی کوشش کر لوں مگر ٹائم پر حتم نہیں کپاتی۔“ اس نے بے بسی سے انگلیاں چٹخا میں۔

”اچھا جاؤ اپنے کمرے میں آج شیریں گھر پر نہیں ہے سمانہ کے ساتھ اپنی فرینڈ کی بیٹی کے انگیج منٹ ڈنکشن میں گئی ہوئی ہے ورنہ تمہاری اتنی تاخیر پر بہت غصہ کرتی۔“

اس کی تو آدمی تھکن ہی اتر گئی تھی۔ تائی امی کے

گھر پر موجود نہ ہونے کا سن کر، ورنہ تو آتے ہی ان کی عدالت میں حاضر ہونا اور ان کے فضیحتے سننا۔

ہانیہ کے امی، ابو ایک ایک سیڈنٹ میں انتقال کر چکے تھے۔ تایا جان کو مجبوراً اسے اپنے پاس لانا پڑا تھا۔ مائی جان تو بہت مجبوری میں اسے برداشت کر رہی تھیں۔ اس کا بے پناہ حسن انہیں ہولائے دیتا تھا۔ ان کے چار بچے تھے۔ دو بیٹے، دو بیٹیاں، عاصم بھائی سب سے بڑے تھے، انگلینڈ گئے تھے بڑھنے کے لیے پھر وہیں جا کر رہی اور وہیں شادی کر گئے وہیں کے ہو گئے۔

رومانہ شادی کے بعد وہی چلی گئیں۔ پیچھے عرصہ اور سامنے تھے۔ بے حد لاڈ و پیار سے پلے ہوئے۔ مائی امی کو خطرہ اس کے حسن بے مثل سے تھا، وہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتی تھیں کہ وہ ان کی بھانجی زرش کو چھوڑ کر ہانیہ کا نام ان کے سامنے پیش کرے، حالانکہ عرصہ بہت لاپالی سا لڑکا تھا جو اپنی ہی دلچسپیوں میں مشغول رہتا تھا اور سامنے اپنے حسن کی تابناکیوں میں اضافہ کے لیے پارلوں کے چکر لگانے کے علاوہ جو ٹائم بچتا اس میں اسی حسن میں گرفتار اپنے پروانوں سے فلن پر بالمشافہ ملاقاتوں میں مصروف رہتی تھی۔ اب ایک وہی فالٹو بچتی تھی۔ جس پر مائی امی اپنے ستم آزماتی رہتی تھیں۔ اگر وہ جا ب نہ کر رہی ہوتی تو ہر وقت مائی امی کی طنز و تشفوح سن کر پاگل ہو گئی ہوتی۔



”ہانیہ لگتا ہے سر، تمہارے لیے ”کچھ کچھ“ محسوس کرنے لگے ہیں۔“ مومنہ بڑے شرارتی لہجے میں اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

وہ گڑبڑا گئی۔ ”کیا مطلب؟ فضول مت بولو۔“

”خیر فضول تو ہرگز نہیں ہے، یہ تمہاری ٹیمیل کے پاس آکر رک جانا، کچھ لمحوں کے لیے ہی سہی۔ بلاوجہ تمہیں مخاطب کرنا اور کتنی کتنی دیر تک تمہیں دیکھنا بلکہ دیکھتے ہی رہنا۔“

”مومنہ پلیز۔“ وہ شرم سے سرخ پڑ گئی تھی۔

مومنہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

”اوہ ہانیہ صاحبہ کے دل میں تو لٹو پھوٹ رہے ہیں اور کیوں نہ پھوٹیں، سر! ایک کوئی عام انسان تو نہیں، اگر وہ تمہارے ساتھ سیولس ہیں تو یہ تو تمہاری خوش قسمتی ہے۔“

”بس کرو مومنہ پلیز، کسی نے سن لیا تو کتنی سبکی ہوگی۔ ضروری نہیں جو تم سمجھ رہی ہو وہی بات ہو اور اگر یہی بات ہو تب بھی اتنا آگے کا سوچنا ٹھیک نہیں ہی میں ہوں تو ان کی ملازم ہی بنا۔“

”یار ایسے تو نہ کہو۔“ مومنہ نے خفگی سے کہا۔

”کیسے نہ کہوں مومنہ، میری مائی عرصہ بھائی کو مجھ سے یوں بچا بچا کر رکھتی ہیں کہ کسی طرح میں انہیں متاثر نہ کر لوں تو سر! ایک کی والدہ نے اپنے اسٹینڈرڈ کی لڑکی نہیں ڈھونڈی ہوگی ان کے لیے، ایک آفس ورکر ان کی چوائس کبھی نہیں ہو سکتی۔“

”شاید“ مومنہ اس بڑھیلی پڑ چکی تھی۔

”میں اسی لیے اتنے اونچے خواب ہی نہیں دیکھتی۔“ وہ افسردگی سے کہہ کر سر گری کی بیک پر رکھ کر آنکھیں موند کر خود کو ریلیکس کرنے کی کوشش کرنے لگی، مگر دل بھر آیا۔ کتنے ہی آنسو دائیں بائیں کپٹیوں میں جذب ہوتے رہے۔ مومنہ خاموشی سے اپنی جگہ پر چلی گئی تھی۔ کافی دیر بعد جب بل ہلکا ہو گیا تو وہ چہرہ پو پھرتی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی سامنے نظر پڑی تو دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بالکل سامنے کھڑا تھا۔ سینے پر ہاتھ باندھے بہت سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے متوجہ پا کر دو قدم آگے بڑھ آیا۔ ”مائی براہم مس ہانیہ؟“

”تو سر! کک کچھ نہیں۔“ وہ ہٹکاسی گئی۔

”تو آپ رو کیوں رہی تھیں ابھی؟“

”یونہی می، پاپا یاد آگئے تھے۔“ اسے بہانہ سوجھ ہی گیا۔

”تو رونے کی کیا بات ہے، مل آئیں ان سے کہاں ہیں وہ؟“ وہ حیران سا تھا۔

”ان کی تو وفات ہو چکی ہے۔“ ہانیہ کی آنکھیں لبالب بھر گئیں۔ ایک تولا بستانہ سا کھڑا رہ گیا تھا۔

”اوہ، سو سیڈ“ پھر وہ ہلکے سے کھنکارا۔

”نہیں، بس چائے منگوائی تھی پی کر میں آئی۔“
اس نے مومنہ کو ٹٹل دیا، لیکن سچ تو یہ تھا کہ اسے ایک
کے لیے میں موجود تبدیلی کا سرغل مل گیا تھا۔



سر ایک کے بڑے بھائی کی شادی تھی، سارے
آفس کو کارڈز بانٹے گئے تھے۔

”تم چلو گی ہانیہ؟“ مومنہ نے پوچھا۔
”کچھ کہہ نہیں سکتی، اگر پریشن ملی تو۔“ اس نے
بے بسی سے کندھے اچکائے۔

”کارڈ کتنا شاندار ہے۔“ مومنہ نے توصیفی
نظروں سے کارڈ کو دیکھا۔

”ظاہر ہے جیسا پیسہ ہوگا ویسی ہی چیز ہوگی۔“

”صحیح بات ہے۔ ویسے نام تو دیکھو کیسے شاہانہ ہیں۔
بیرک تیمور، سن آف زرک تیمور اور ہمارے سر ہیں
ایک تیمور اور ایک بہن ہے ان کی سبک تیمور، ایک
دفعہ سر کے فادر کے ساتھ آئی تھی، اسکول کی
اسٹوڈنٹ ہے۔“

”تہنی چھوٹی؟“ ہانیہ حیران ہوئی۔

”ہاں، چوہ، پندرہ سال کی ہوگی، چلو پھر تم گھر سے
پوچھ کر تاؤ تو ذرا تیاری تو کریں۔“
”ٹھیک ہے، میں بتا دوں گی۔“



ہانیہ کی توقع کے برعکس اسے بہت آرام سے
اجازت مل گئی تھی۔ بارات والے دن وہ ہال میں کچھ
لیٹ ہی پہنچی تھی۔ ہال کچھ بھرا ہوا تھا، اتنے ہجوم
میں کسی شناسا چہرے کو ڈھونڈنا بھی کوئی آسان کام نہ
تھا۔ اتنے میں اس کے سیل پر کل آنے لگی۔ اس نے
دیکھا مومنہ کا نام ہلنک کر رہا تھا۔ ”ہاں مومنہ! کہاں
ہو؟“

”لہفٹ رو سے تیسری ٹیبل پر۔“ اس نے باتیں

طرف دیکھا، مومنہ کھڑی ہو کر دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر اسے
متوجہ کر رہی تھی۔ وہ تیزی سے وہاں پہنچی، مومنہ کے
ساتھ تین اور آفس کی خواتین بھی تھیں۔ مل کر وہ بھی

”آپ اب اٹھ جائیں۔ ہاتھ منہ دھو کر فریش
ہو جائیں، میں چائے منگواتا ہوں۔“ وہ منع کرنے لگی،
لیکن اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ وہ اٹھ کر واش روم
چلی آئی۔ تھوڑی دیر بعد آئی تو وہ اپنے آفس جا چکا تھا۔
مومنہ نے بتایا کہ وہ اسے بھی بوہیں آنے کا کہہ گیا ہے۔
وہ اندر آئی جہاں بیون چائے ٹیبل پر رکھ رہا تھا۔

”بیٹھیں۔“ وہ بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں سوچ سی
گئی تھیں اور ناک اور گل سرخ ہو رہے تھے۔ وہ اتنی
خوب صورت لگ رہی تھی کہ ایک مبہوت سا اسے
دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہ خاموشی سے چائے پی رہی تھی کہ
ایک کی نظروں کے ارتکاز نے چونکا دیا۔ اس نے اس
کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ ہانیہ کو
اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ سرخ موڑ کر سامنے رکھی فائل کی
طرف متوجہ ہو گیا۔ ”یا حیرت!“ ہانیہ کو جھٹکا سا لگا تھا۔
پہلی ملاقات سے لے کر اس دن تک اس نے کبھی
اپنی نظروں کا رخ نہیں موڑا تھا جب بھی دیکھتا تھا۔ نظر
جما کر دیکھتا تھا وہ کنفیوژ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگ جاتی
رہے یونہی دیکھتا رہتا۔ اب اسے اس تبدیلی سے جھٹکانہ
لگتا تو کیا ہوتا۔ بغیر دیکھے ایک نے اس کی حیرت کو
محسوس کر لیا تھا اور لبوں پر بے ساختہ در آنے والی
مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے چائے کا کپ منہ سے لگا
لیا تھا۔ چائے ختم کر کے وہ اٹھ گئی۔ ”میں جاؤں سر؟“
ایک نے سر کی جنبش سے اجازت دی تھی، فائل
میں اس کا اٹھنا قابل دید تھا، حیران پریشان ہانیہ جیسے
کسی جادو کے اثر میں اپنی کرسی پر آکر بیٹھی تھی۔ وہ
یوں ٹٹنکی باندھ کر دیکھتا تھا تو شرم آمیز گھبراہٹ اسے
گھیر لیتی تھی اور جب بے نیاز ٹٹنکی دیکھتا رہا تو الجھن
ہونے لگی۔

”ہانیہ! سرنے کچھ کہا تم سے؟“ وہ آکر بیٹھی ہی تھی

کہ مومنہ آئی۔

”کیا مطلب کچھ کہا؟“

”میرا مطلب ہے کہ وہ ہمارے بالکل پیچھے ہی

کھڑے تھے جب ہم ان ہی سے متعلق باتیں کر رہے

تھے تو سن لینے کے بعد کوئی رسپانس تو نہیں دیا۔“

ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔

”اللہ ہانیہ، کتنی پیاری لگ رہی ہو، ماشاء اللہ سے۔“ مومنہ نے بے اختیار اس کی تعریف کی۔ وہ مسکرا دی تھی۔ مہجنتا Majenta پرپل اور شانگ پنگ کنٹراسٹ کے لباس میں میسجنگ جیولری اور میک اپ نے اس کے حسن کو وہ نکھار دیا تھا کہ مومنہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ اس پورے ہل میں کوئی بھی اس کے مقابلے کی حسین لڑکی نہیں تھی۔

”ہیلو ہانیہ۔“ اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا اور سامنے کودیکھ کر اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ سامنے کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

”حیران ہو گئی ہونا۔ اچھو ملی پایا بھی انوائنڈ تھے، لیکن تمہیں سر پر انزدینے کے لیے نہیں بتایا۔“ ہانیہ مسکرا دی۔ اس نے مومنہ اور سامنے کا آپس میں تعارف کروایا۔ مومنہ سامنے سے متاثر نظر آرہی تھی اور کیوں نہ ہوتی، سامنے اہلٹھٹ کلاس کی نمائندہ جوینی کھڑی تھی۔ منگاترین سوٹ، مہنگے پارلر سے کروایا گیا میک اپ اور وہ بہت متاثر کن نظر آرہی تھی۔

”تائی امی بھی آئی ہیں؟“

”ہاں، وہ اپنی جاننے والیوں کے ساتھ بیٹھی ہیں۔“ اتنے میں دولہا، دلہن اسٹیج پر آگئے، شوخ و شرارتی رسمیں ہونے لگیں، ہر طرف قہقہے بکھر رہے تھے، بہرک بھی ایک ہی کی طرح بہت خوب صورت تھا، دلہن بھی بہت حسین تھی۔ ایک بلیک کرتے اور سفید شلوار میں بہت مختلف اور بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ہنستا، مسکرتا، چھیڑ چھاڑ کرتا ہانیہ مسلسل اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ معاً اسے اس کی نظروں کا احساس ہوا تھا وہ ایک دم مڑا اور ہل میں نظریں دوڑانے لگا۔ ہانیہ نے گھبرا کر رخ موڑا اور سامنے اور مومنہ کی طرف توجہ کر لی تھی۔

”ہیلو۔“ اس کے بالکل نزدیک ایک کی آواز آئی تھی۔ وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ ”السلام علیکم سر۔“

”ہیٹھیں پلیز یہ آس نہیں ہے۔“ وہ بڑی دلگوشی سے مسکرا رہا تھا۔ مومنہ و دیگر بھی احتراماً کھڑی ہو چکی

تھیں، اس کے کہنے پر پھر سے بیٹھ گئیں، مگر ہانیہ اسی طرح کھڑی رہی۔ ایک کے سامنے اس کے حواس یونہی کم ہو جاتے تھے، یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

”اوہ اسی ڈارلنگ، آپ کے ڈیڈ بلا رہے ہیں۔“ ایک بہت ہی خوب صورت اور ماڈ خاتون ایک کے پاس آئیں اس کے بازو سے پکڑ کر ساتھ لے جانا چاہا۔

”لیس مام، میں چلتا ہوں، آپ ان سے ملیجے۔“ وہ فردا فردا سب کا تعارف کرواتے سامنے پر آکر رک گیا۔

”یہ میری کزن ہیں سامنے بلال۔“ ہانیہ نے تعارف کروایا۔

”آئی میں مسز شیریں بلال کی بیٹی ہوں۔“ سامنے نے بتایا۔

”اوہ لیس، میں پہچان گئی، آئی ہیں ناشیریں، میں ملتی ہوں ان سے۔“ پھر وہ ہانیہ کی طرف مڑیں۔ ”آپ کیا نام بتایا آپ نے؟“

”ہانیہ منصور۔“

”ہاں، ہانیہ بیٹا، میں آپ سے دوبارہ ملنا چاہوں گی کبھی فرصت میں، آج تو ٹائم کی بہت کمی ہے۔ بہت اچھا لگا آپ سے مل کر، سو کیوٹ اینڈ پریٹی۔“ انہوں نے پیار سے اس کا گال چھوا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ ہنس پڑیں، اسی پل ایک کم عمری پیاری سی لڑکی انہیں پکارتی ہوئی پاس چلی آئی۔

”مام اینڈ بھائی، ڈیڈ آپ کو بلا رہے ہیں۔ اوہ مائے گڈ نیس۔“ اس کی نظر ہانیہ پر پڑی تو وہ بات ہی بھول گئی۔

”ہاؤ بیوٹی فل شی از“ وہ ہانیہ کے پاس آئی اور اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ آئی ایم سبک۔

”ہانیہ۔“ اس نے تعارف مکمل کیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”آپ کا تو نام بھی آپ ہی کی طرح خوب صورت ہے۔“

”آپ بھی بہت پیاری ہیں۔“ وہ حقیقتاً بہت کنفیوژ ہو رہی تھی۔ اس کی کیفیت سمجھ کر ہی ایک

نے اپنا رخ موڑ لیا تھا۔

”آپ ولیمہ فنکشن میں بھی آئے گا“ میں آپ سے فرینڈ شپ کروں گی اور آپ ہمارے گھر بھی آئے گا“ اسی بھائی۔

”اب آپ کو دیر نہیں ہو رہی“ آپ تو ہمیں بلانے آئی تھیں۔“ ایک نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا۔

وہ تینوں کے حلے جانے کے بعد گرنے کے سے انداز میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ اتنی تعریف اور وہ بھی ایک کی موجودگی میں جس کے لبوں پر مسلسل مسکراہٹ رقص کر رہی تھی، ایک نظر اسے دیکھنے کے بعد پھر وہ اسے دیکھ ہی نہیں پائی تھی، بن دیکھے اسے سب محسوس ہو رہا تھا اور صرف اس کے ہی نہیں، مومنہ اور سمانہ کو بھی سب کچھ نظر آیا تھا۔

”آپ نے دیکھا سمانہ، لوگ کیسے اس کے حسن سے امپر نہیں ہوتے ہیں؟“ مومنہ نے شرارت سے ہانیہ کو دیکھا۔

”یہ ایک صاحب آفس میں بھی یونہی مسکرا مسکرا کر ہانیہ کو دیکھتے ہیں۔“ سمانہ نے ایک کٹھلی نظر اس پر ڈالی تھی۔ ہانیہ کا رنگ سفید پڑ گیا تھا، مومنہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے، آفس میں تو بہت سخت لباس ہیں، یہ تو ظاہر ہے ان کے بھائی کی شادی کا فنکشن ہے تو وہ اتنے خوش ہیں۔“ اس نے سنبھل کر محتاط الفاظ کا انتخاب کیا۔ سمانہ کندھے اچکا کر اٹھ گئی۔ ”میں ماما کے پاس جا رہی ہوں۔“

”تو بہ ہے، کتنی تیز ہے اتنی سی دیر میں کیسے ٹھیک اندازے لگا لیے۔“ اس کے جانے کے بعد مومنہ نے لمبی سانس آزاد کی تھی۔ اتنے میں کھانا سرو ہونا شروع ہو گیا چونکہ ٹیبل سروس تھی اس لیے وہ بھی خاموشی سے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ کھانا آخری مراحل میں تھا کہ سبک اور اس کی مام آگئیں، کھانا ٹھیک سے لینے کی ہدایت کر کے وہ تو مسکرائی ہوئی آگے بڑھ گئیں، مگر سبک اس کے پاس ہی ٹک گئی

تھی۔ وہ اتنی پیاری اور معصوم سی باتیں کر رہی تھی کہ کچھ دیر پہلے کی ساری کوفت جالی رہی تھی۔

”میں نے اسی بھائی سے کہا کہ آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ آپ کے آفس میں اتنی پیاری لڑکی آتی ہے میں ان سے ضرور ملتی۔“

”تو انہوں نے کیا کہا؟“ مومنہ نے مسکرا کر پوچھا۔

”Silly girl“ اس نے بھاری آواز بنا کر ایک کی نقل اتاری۔ تینوں ہی ہنس پڑی تھیں۔

”ڈیڈ۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر آواز دی۔ زرک صاحب مسکراتے ہوئے پاس آئے۔ ”یس؟“

”ڈیڈ ان سے ملیں یہ ہانیہ ہیں۔ اسی بھائی کے آفس میں ہوتی ہیں۔ کتنی کیوٹ ہیں نا۔ میں نے ان کو اپنی فرینڈ بنا لیا ہے۔“ وہ تیز تیز بول رہی تھی اور وہ مسکراتے ہوئے اسے سن رہے تھے۔ ہانیہ اور مومنہ نے اٹھ کر انہیں سلام کیا تھا۔ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اب میں جا سکتا ہوں؟“

”جسٹ آمنٹ“ وہ اٹھ کر ان کے پاس گئی اور بچوں کے بل اونچی ہو کر ان کے کان میں کچھ کہنے لگی، وہ تھوڑا سا اس کی طرف جھکے ہوئے تھے، اس کی بات سن کر انہوں نے باقاعدہ ہانیہ کو دیکھا تھا اور ان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ پھر انہوں نے بھی اس سے سرگوشی میں کچھ کہا اور واپسی کے لیے مڑ گئے

تھے۔ سبک بھی ان کے پیچھے ہی گئی اور کچھ ہی دیر میں ایک کا ہاتھ پکڑ کر آتی دکھائی دی، ہانیہ تو ویسے ہی نروس ہو رہی تھی، اب توجیح بیچ پزل ہو گئی، جلدی سے سیدھی ہو کر بیٹھی اور کولڈ ڈرنک بھی سائیڈ پر رکھ دی۔

مومنہ ایک کو آتے دیکھ کر واش روم کے بہانے کھسک گئی اور دیگر خواتین آپس میں مصروف تھیں۔

”اسی بھائی، آپ ہانیہ کو بولیں کہ ولیمہ میں بھی ضرور آئیں اور ہمارے گھر بھی۔“

”گھر تو آپ انوائٹ کریں، ولیمہ سرمنی کے لیے میں آپ کو پرسنل انوائٹ کر رہا ہوں کہ آپ ضرور آئیں۔“ وہ سبک سے اور ہانیہ سے بیک وقت مخاطب ہوا تھا۔

”پیس سر میں ضرور آؤں گی۔“ اس نے نظریں جھکائے جھکائے کہا تھا۔ سبک نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ”اور ہمارے گھر؟“

”وہاں بھی آؤں گی ان شاء اللہ۔“ اتنے میں سیل پر تایا جی کی گل آنے لگی وہ اسے باہر بلا رہے تھے۔ ”اوکے میں اب چلوں۔“

”ہانیہ میں آپ کے ساتھ ایک Snap بنوالوں؟“ اب وہ سٹیٹائی تھی۔ ”مجھے دیر ہو جائیں گی۔“

”نہیں بس فیو منٹس بھائی جلدی کریں۔“ وہ ہانیہ کے ساتھ کھڑی ہوئی۔ ایک نے اپنا سیل نکالا اور اس میں ان دونوں کی تصویر کھینچ لی تھی۔ اس نے اپنے چہرے کے تاثرات بالکل نارمل رکھے تھے کیوں کہ ہانیہ کی کیفیت دیکھ کر تو یہی لگ رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہونے والی ہے۔

”اچھا اب تو جاؤں نا؟“ وہ مری مری آواز میں بولی تھی سبک اس سے لپٹ گئی۔ ”آئی لو یو ہانیہ اینڈ سی یو۔“

اس نے مسکرا کر اس کے گل پر پیار کیا۔ بہت ہی پر خلوص بچی تھی۔ اسے واقعی بہت پیاری لگی۔ ایک کے ساتھ باہر تک اسے چھوڑنے آئی تھی۔



دیمہ فنکشن میں اس کا سوٹ گرین اور بلیک کنٹراسٹ میں تھا۔ وہ بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔ اس بار اسے کچھ اور ہی طرح سے دیکھ کر کیا گیا تھا۔ زرک تیمور اور ان کی مسز بہت پیار سے اس سے ملے تھے اور رو میسہ تیمور نے اسے اپنی چند دوستوں سے بھی ملوایا تھا۔ ایک بلیک سوٹ میں اپنی شان دار لک کے ساتھ موجود تھا۔ اس سے سرسری سامنے کے بعد اسٹیج پر ہی مصروف رہا تھا سبک البتہ اسے پورا ٹائم دے رہی تھی۔ آج اس کی دوست بھی اس کے ساتھ تھیں جن سے اس نے ہانیہ کا تعارف کروایا تھا۔ وہ گفت دینے کے لیے اسٹیج پر آئی تو ایک آکر اس کے

بالکل ساتھ کھڑا ہو گیا تھا۔ ”بھئی! یہ مس ہانیہ ہیں۔“

سبک نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“

”تھینک یو۔“ اس نے مسکرا کر گفت اور بکے باری باری دونوں کے حوالے کیے۔

”آئیں بیٹھیں نا۔“ علیشا نے اپنے برابر ہاتھ رکھا۔

”نہیں میں اب چلتی ہوں لیٹ ہو جاؤں گی۔“

”یہ ہمیشہ لیٹ ہونے کے ڈر سے لیٹ ہو جاتی ہیں۔“ ایک کے تبصرے پر وہ دونوں ہنس پڑے تھے جبکہ ہانیہ خفت سے سرخ پڑ گئی تھی۔ وہ مڑی تو علیشا کی آواز کانوں سے ٹکرانی۔ ”کتنی خوب صورت ہے یہ اسی بھی ٹھیک۔“ آگے وہ سن نہیں پائی تیز تیز قدم اٹھاتی وہ ہل سے باہر جا رہی تھی۔

”کیا ہل میں ہم پلاسٹ ہونے کی اطلاع آئی ہے جو آپ یوں اسپید سے یہاں سے نکلنا چاہ رہی ہیں۔“ اپنے بالکل پاس ایک کی آواز سن کر یوں اچھلی کہ گرتے گرتے بچی تھی۔

”ریلیکس“ وہ اس کے بالکل ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

”سر پلیز میں چلی جاؤں گی۔“ اس نے اسے منع کرنا چاہا۔

”نہیں کب کہہ رہا ہوں کہ آپ ہمیشہ یہیں رہیں گی۔“ وہ ہمیشہ کی طرح لاجواب ہو گئی۔

”آئیے“ وہ اسے ساتھ لیے اپنی گاڑی تک آیا اور دروازہ کھول کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”سر آپ زحمت نہیں کریں میرے تایا جی آئے ہوئے ہیں انہوں نے کہا تھا میں گفت دے کر آ جاؤں وہ یہیں ہوں گے۔“ اس نے سر گھما کر چاروں طرف دیکھا۔

”وہ جا چکے ہیں۔“ وہ بہت رساں سے بولا تھا۔ ہانیہ کی متلاشی نگاہیں تھک کر ایک کے چہرے پر آئیں جو بہت اطمینان سے اسے دیکھنے میں مصروف تھا اس نے رخ موڑ لیا تھا اس کے موبائل پر رنگ نیل ہونے

فون پر مصروف تھا۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے اس نے فون ٹھالیا تو سیل فون گنگنا نے لگا تقریباً "دس منٹ وہ بات کرتا رہا" اسے بند ہی کیا تھا کہ اکرام صاحب آگئے۔ ظاہر ہے وہ اتنے دن بعد آیا تھا تو کام بھی پیچھے ٹھیک ٹھاک جمع ہو گیا تھا۔ ان سے ڈسکشن کرتے ہوئے چند منٹس مزید گزر گئے، وہ رخصت ہوئے تو وہ لمبی سانس لیتا اس کی طرف متوجہ ہوا جو کب سے چپ چاپ بیٹھی اپنے بلوائے جانے کی وجہ جاننے کی منتظر تھی۔

"کیسی ہیں آپ اور کام کیسا چل رہا ہے؟"

"سب ٹھیک ہے سر۔"

"آپ سے کچھ پرستل سوال پوچھ سکتا ہوں؟"

"پرستل سوال؟" اس کا دل دھڑک گیا۔ "جی سر"

"آپ جا ب کیوں کرتی ہیں؟"

"جی سر؟" وہ حیران رہ گئی تھی اس سوال پر۔

"آپ کے انکل تو ویل آف ہیں ان کی اپنی بیٹی بھی

کوئی جا ب وغیرہ نہیں کرتی تو آپ کیوں کر رہی ہیں کیا وہ آپ کو سپورٹ نہیں کرتے؟"

"میرے خیال میں یہ بہت زیادہ پرستل ہے۔" وہ

خشک لہجے میں اپنی طرف سے بات ختم کرتے ہوئے بولی۔

"آپ گھر بیٹھنے کو قید سمجھتی ہیں؟"

"پلیز سر، یہ میرا اپنا پرستل میٹر ہے۔" وہ اٹھ کر

کھڑی ہو گئی۔ "میں جاسکتی ہوں اب۔"

وہ سپاٹ تاثرات کے ساتھ اسے دکھاتا رہا۔ وہ ابھی ابھی سی باہر آئی تھی۔



دن بہ دن ایک کا رویہ بدلنے لگا تھا، وہ بلاوجہ ہی ہانیہ کو جھڑک دیتا تھا، اس کے کاموں میں نقص نکالنے لگا۔

"یہ کیا کیا ہے آپ نے۔ یہ دیکھی ہیں آپ نے اپنی غلطیاں۔ میں کیا یہی ٹھیک کرتا ہوں گا پھر آپ کیا کرنے آتی ہیں۔ دلغ کہاں ہوتا ہے آپ کا؟" اس

گئی۔ تایا جی تھے۔
"ہانیہ بیٹا میں تمہیں بتا نہیں سکا، مجھے ایمر جنسی میں اسپتال آنا پڑا ہے، میرے دوست شفاعت کا ایک سیڈنٹ ہو گیا ہے، تم آ جاؤ گی یا میں عرصہ سے کہہ دوں۔"

"میں آرہی ہوں تایا جی۔" اس نے فون بند کر دیا۔

بیشہ وہ نئے سرے سے دکھ محسوس کرتی تھی۔ ہونا تو یہ

چاہیے تھا کہ وہ عادی ہو جاتی پر وہ نہیں ہوتی تھی۔ اب

بھی دل میں یہی خیال آرہا تھا کہ اگر سمانہ یہاں اس کی

جگہ ہوتی تو کیا تب بھی تایا جی یونہی چلے جاتے اس کا

کھلا ہوا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ ایک بہت غور سے اس کے

چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ "چلیں آئیں" میں

آپ کو پہنچا دوں۔"

"آپ کو زحمت ہوگی۔"

"Don't mention" وہ اپنی گاڑی نکال

کر روش پر لے آیا۔ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

"آپ کو ہماری فیملی، آئی مین۔ میرے بہن بھائی،

مام، ڈیڈ سب کیسے لگے۔"

"بہت اچھے بہت ہی اچھے ہیں سب۔"

"اور میں، میں کیسا ہوں؟" اس نے مسکراتے

ہوئے پوچھا۔ ہانیہ کے چہرے پر سرخی لہرائی "آپ بھی

بہت اچھے ہیں سر۔"

"اپنی تعریف تو میں نے زبردستی کروائی ہے، پھر بھی

تھینکس۔" اس کے شرارت سے کہنے پر وہ

کھلکھلا کر ہنس پڑی اور یہی ایک چاہ رہا تھا کہ وہ

افسردگی جو اس پر چھا گئی ہے وہ دور ہو جائے۔



بیرک کی شادی کے بعد وہ لندن چلا گیا تھا۔ تقریباً دو ہفتوں کے بعد واپس آیا تھا۔ آتے ہی اس نے فون کر کے ہانیہ کو اندر بلایا تھا۔

"لو۔ بہت دن ہو گئے دیکھے ہوئے، آتے ہی

بلالیا۔" مومنہ شرارت سے کھنکاری تھی۔ وہ بغیر کوئی

جواب دیے آگے بڑھ گئی۔ دروازہ ٹاک کر کے آئی تو وہ

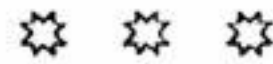
نے فائل زور سے سامنے ٹیبل پر پٹنی تھی۔ ہانیہ ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

”اب کھڑی کیا دیکھ رہی ہیں، جائیں یہ سب ٹھیک کر کے آئیں۔“ وہ فائل لے کر آئی، اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں اور چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا، اس کے پوائنٹ کیے ہوئے الفاظ کو دوبارہ سے صحیح کیا۔ اندر آئی تو اکرام صاحب اور اسرار صاحب کو بیٹھے دیکھ کر اسے مزید گھبراہٹ نے آن گھیرا۔ ان کے سامنے بھی اگر سر نے کچھ کہہ دیا تو وہ تو مارے شرمندگی کے مر جائے گی۔ اس نے فائل ایک کے سامنے رکھی۔ اس نے ایک نظر اس پر ڈالی اور فائل کھول کر دیکھنے لگا۔

”ٹھیک ہے آپ جائیں۔“ اس بار لہجے میں نرمی تھی۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر تیزی سے باہر آئی تھی۔ مومنہ اس کے پاس آئی۔

”کیا ہوا ہانیہ! کیا سر نے کچھ کہا ہے؟“
”نہیں، بس کچھ غلطیاں ہو گئی تھیں، وہ ٹھیک کی ہیں۔“

”مجھے تو تم ٹھیک نہیں لگ رہیں، کیا بات ہے؟“
”طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ میں گھر جا رہی ہوں۔“ اس نے ہنڈ بیگ اٹھایا اور مسز جنید سے اجازت لے کر گھر آگئی۔ اپنے کمرے میں آکر وہ بری طرح سے رو پڑی تھی۔ پتا نہیں وہ کیوں اتنا بدل گیا تھا۔ کیوں اس کی اس طرح انسلٹ کر دیتا تھا۔ وہ یہ سب برداشت نہیں کرا رہی تھی۔



گھر میں خاصی چہل پھل سی تھی۔ تائی جی کاموڈ بھی خاصا اچھا رہنے لگ گیا تھا۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ہنس بول لیتی تھیں۔ یہ راز اس دن کھلا جب انہوں نے اسے بتایا کہ اس اتوار کو سلمانہ کی منگنی ہے۔ ”کہاں اور کس کے ساتھ؟“ یہ نہ انہوں نے بتایا نہ اس نے پوچھا۔ اسے شریک کیا جا رہا تھا یہی بڑی بات تھی۔ منگنی کا فنکشن بڑے پیمانے پر ہو رہا تھا، اس لیے ہوٹل میں اردن جمنٹ کی گئی تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا

تھا کہ لڑکے والے کوئی زوردار پارٹی تھے۔ اسے بھی ظاہر ہے شرکت کے لیے اچھی طرح ڈریس اپ ہونا تھا، تو یہ عرصہ کے ساتھ بازار آئی تھی، وہ گاڑی سے اتر رہی تھی جب اس کی نظر ایک پر پڑی۔ وہ اس شاپنگ مال سے باہر آ رہا تھا۔ عرصہ گاڑی پارکنگ میں لے گیا تھا۔ وہ اکیلی ہی آگے آئی۔

”السلام علیکم سر“

”وعلیکم السلام یہ کون تھے آپ کے ساتھ؟“

”سر، وہ میرے کزن ہیں عرصہ بھائی۔“

”بھائی؟“ اس نے طنزیہ اسے دیکھا۔ ”اور کتنے بھائی ہیں آپ کے؟“

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں سر؟“ اس بار اس کا لہجہ بھی تیز ہو گیا تھا۔

”آپ اچھی طرح سمجھ چکی ہیں۔“ وہ تلخی سے کہتا

تیزی سے وہاں سے چلا گیا۔ وہ سن سی کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ اس پر شک کر رہا تھا۔ اس کی کس بات، کس حرکت سے اسے اس پر شک ہوا تھا۔ وہ اپنے چکراتے داغ کے ساتھ سوچ رہی تھی اور مزید الجھ رہی تھی کہ عرصہ نے اسے چونکا یا۔ ”ہانیہ، کیا یہیں کھڑی رہو گی۔“



وہ سب تیار ہو کر ہوٹل پہنچے تو تائی جی نے اسے اپنی بہن کے پاس بٹھا دیا، وہ ان کے ساتھ باتوں میں ایسی ابھی کہ لڑکے والوں کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

”اللہ کا تو ماشاء اللہ سے بہت ہی پیارا ہے۔ بہت اچھا کپل بنا ہے دونوں کل۔“ آنٹی کے کہنے پر اس نے چونک کر اسٹیج کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کو تو آنکھوں میں اندھیرا اتر آیا۔ سلمانہ کے ساتھ ایک بیٹھا ہوا تھا۔ ”تو یہ وجہ تھی اس کے بدلنے کی۔“

اس نے دکھ سے سوچا۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ چہرے کا رنگ خطرناک حد تک سفید ہو چکا تھا۔ ابھی تو اس نے اس کے حوالے سے خواب دیکھے ہی شروع کیے تھے، ابھی تو اسے اپنا سمجھنے کی خوشی کو

”نہیں، ٹھیک ہوں، بس کچھ سست ہو رہی ہوں۔“
اس نے مسکراتے لٹانے کی کوشش کی تھی، وہ کچھ دیر
اسے دیکھتی رہیں، پھر کھانے کی طرف توجہ کر لی تھی۔



وہ دو دن آفس نہیں چلائی تھی، اپنے آپ کو
سمجھانے کے لیے دو دن کافی تو نہیں، پھر بھی بہت حد
تک اس نے خود پر قابو پایا تھا۔ ایک نے اس سے
کوئی وعدے نہیں کیے تھے حتیٰ کہ محبت کا اظہار تک
نہیں کیا تھا پھر وہ خوش فہمیوں میں گھری تو اس کی اپنی
غلطی۔ اس نے اپنے لیے بہر حال اپنے اسٹینڈرڈ کی
لڑکی ہی چنی تھی۔ یہ ایک حقیقت تھی جسے تسلیم کرنا
ہی وقت کا تقاضا تھا۔ ایک اور سمانہ اکثر باہر ملنے لگے
تھے سمانہ کی توجہ خود پر بہت بڑھ گئی تھی۔

اس دن بھی وہ ڈزیر اس کے ساتھ باہر گئی ہوئی
تھی۔ ہانیہ اپنے آفس کے لیے کپڑے رہیں کر کے
ہنگ کر رہی تھی جب کل نیل کی آواز گونجی۔ گھر پر
کوئی بھی نہیں تھا۔ تیا جان اور تانی جی کسی کے انتقال
پر گئے ہوئے تھے اور عرصہ اپنے دوستوں کے ساتھ سی
ویو گیا ہوا تھا سو ہانیہ ہی کو گیٹ پر آنا پڑا تھا۔ ”کون؟“
”ہانی میں ہوں سمانہ۔“ اس نے گیٹ کھولا، سمانہ
کے پیچھے ایک بھی تھا، وہ پیچھے ہٹ گئی۔ وہ لاؤنج میں
آگئے۔

”ہانیہ کلنی پلاو دیار۔“ وہ سر ہلاتی ہوئی کچن میں
آگئی۔ دودھ بوائے ل کر تے، کلنی پھینتے ہوئے کہتے ہی
آنسو اس کے گالوں کو بھگوتے رہے۔ اسے اندازہ ہی
نہیں ہوا۔ کافی تیار کر کے اس نے چینی الگ سے رکھی
اور اچھی طرح سے منہ صاف کر کے ٹرے لے کر
لاؤنج میں آگئی۔ سمانہ نہیں تھی، وہ اکیلا بیٹھا اپنے سیل
کو چیک کر رہا تھا۔ اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھی۔ ”کتنی
چینی سر؟“

وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ ”ایک
چمچ“ اس نے ایک چمچ چینی ملا کر کپ اس کی طرف
برہمایا۔ اس نے کپ یوں تھا کہ ہانیہ کی انگلیاں بھی

محسوس بھی نہیں کی پائی تھی کہ وہ پرایا بھی ہو گیا تھا۔
اسے خود پر قابو پانا بہت مشکل لگ رہا تھا، مگر سہا کوئی
ایسی جگہ بھی نہیں تھی جہاں وہ چھپ سکتی۔ اتنے میں
عرصہ اسے بلانے آگیا۔ ”مئی بلارہی ہیں۔“

وہ اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ عرصہ اس کے
ساتھ ساتھ چل رہا تھا، کچھ باتیں بھی کر رہا تھا جو اس
کے سر سے گزر رہی تھیں، اپنی کیک پاتی ٹانگوں پر قابو
پا کر وہ اسٹیج پر پہنچی جہاں تانی جی اور دو عرصہ آئی
موجود تھیں۔ بہت پیار سے اس ملیں۔

”آؤ ہانیہ، بہن کے ساتھ مووی بناؤ، تصویر
کھنچو آؤ۔“ کیسا شہد چسا لہجہ تھا، لیکن وہ اس کی لذت
سے بے بہرہ ہو چکی تھی۔ حالانکہ وہ بہت کوشش
کر رہی تھی خود پر قابو پانے کی، مگر دل و دماغ میں کوئی
رابطہ ہی نہیں تھا۔ وہ سمانہ کے ساتھ بیٹھی اور کچھ ہی دیر
میں اٹھ گئی۔ کھانا شروع ہوا تو وہ پلیٹ میں تھوڑے
سے چاول ڈال کر چمچ سے ادھر ادھر کرتی رہی۔ کھانے
کے لیے جس خواہش کی ضرورت تھی، وہ اسے تھی ہی
نہیں۔

”ہانیہ میں آپ کو جوائن کر سکتی ہوں۔“ دو عرصہ
کی آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔
”جی جی آئی“ وہ اس کے پاس بیٹھ گئیں، اس نے
پلیٹ ان کی طرف برہمائی انہوں نے مسکراتے تھے۔
”آپ سب کا نہیں پوچھیں گی؟“ اس نے نا جھی
سے انہیں دیکھا۔

”وہ امریکا گئی ہوئی ہے، بہرک اور علیشا کے ساتھ،
وہاں اپنی آئی کے پاس ایک مہینے تک کے لیے گئی ہے،
ایک نے اتنی جلدی مچائی کہ ان کی غیر موجودگی میں ہی
یہ فنکشن کرنا پڑ گیا۔ اب اسے پتا چلے گا تو بہت شور
کرے گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بتا رہی تھیں۔ وہ
بہت مشکل سے ہلکا سا مسکرائی تھی۔

”آپ ٹھیک تو ہیں؟“ انہوں نے اب غور سے
اسے دیکھا تھا۔

”جی ٹھیک ہوں۔“ وہ سنبھل کر بیٹھی۔

”مجھے تو کچھ آپ سیٹ سی لگ رہی ہیں۔“

انوائٹ کیا تھا، سب گئے تھے سوائے ہانیہ کے اس کے نہ جانے سے کسی کو کوئی فرق پڑتا بھی نہیں تھا۔ وہ کھانا کھا کر چائے لے کر کمرے میں آئی تو اس کے سیل پر نیل ہو رہی تھی۔ اس نے بغیر دیکھے آن کر لیا۔ ”ہیلو“

”ہیلو ہانیہ! میں ایک بات کر رہا ہوں۔“

ہانیہ کو جھٹکا سا لگا اور وہ بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

”جی سر؟“

”آپ کیوں نہیں آئیں؟“

”جنہیں جانا چاہیے تھا، وہ تو چلے گئے، میرا جانا کوئی ایسا ضروری تو نہیں تھا۔“

”مصرصم تو آئے ہیں۔“

”تو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تو آپ کو بھی تو آنا چاہیے تھا۔“

”اچھا مصرصم بھائی جہاں جائیں گے، مجھے بھی وہاں جانا ہو گا۔ کیوں، میری تو سمجھ میں نہیں آیا۔ اب ان کی بہن کی سسرال میں پارٹی ہے تو انہوں نے جانا ہی تھا۔“

”آپ کا کوئی ریلیشن نہیں۔ ان سے ہم سے؟“

وہ کچھ دیر کے لیے چپ رہ گئی تھی۔ اس نے کچھ بات بدل دی۔

”چلیں جانے دیں، یہ بتائیں آپ آرہی ہیں تو میں ڈرائیور کو بھیج دوں۔“

”نہیں سر بہت بہت شکریہ آپ کے پوچھنے کا۔“

میں اب سونے لگی ہوں۔“

”نیند آجاتی ہے آپ کو؟“ اس کا لہجہ بہت عجیب تھا۔

”جی۔“ وہ اچنبھے سے بولی تھی۔ ”کیا مطلب؟“

”کچھ نہیں۔ چھوڑیں گڈ بائے اینڈ گڈ نائٹ۔“

اس نے فون بند کر دیا۔ وہ حیران پریشان فون ہاتھ میں لیے کتنی ہی دیر بیٹھی رہ گئی تھی۔



دو دن سے سمانہ نہ صرف گھر پر تھی بلکہ اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ ”ہانی، ایک مجھ سے ناراض ہو گیا

اس کی گرفت میں چلی گئیں، اس کے تو پورے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا اس نے تیزی سے اپنا ہاتھ کھینچا اور کھڑی ہو گئی۔

”آپ کے چولہے سے کیا دھواں بھی نکلتا ہے؟“

”جی؟“ اس نے حیرت سے ایک کو دیکھا۔

”آپ کی آنکھیں اتنی ریڈ کیوں ہو رہی ہیں؟“

ہانیہ کے ہونٹ بھیخ گئے تھے۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ اس کی آنکھیں رونے کی چغلی کھا رہی ہیں۔ اتنے میں سمانہ اندر داخل ہوئی۔

”سوری ایک، میری فرینڈ کی کل آگئی تو دیر ہو گئی۔“

”میں بھی اب چلتا ہوں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”کیوں؟ ابھی کچھ دیر تو بیٹھو۔“ سمانہ نے اصرار کیا۔

”مجھے کچھ کام ہے، ڈیڈ بھی ویٹ کر رہے ہیں۔“

ہانیہ جاتے جاتے رک گئی۔ ”سر آپ نے کافی تو پی ہی نہیں۔“

”بہت کڑوی ہے۔ شاید چینی کی جگہ نمک ڈال دیا آپ نے۔“ اسے تو ہانیہ کو دیکھنے کا بہانہ مل گیا تھا۔ بغیر سمانہ کا خیال کیے وہ مسلسل اسے دیکھ رہا تھا۔ ہانیہ نے گھبرا کر سمانہ کو دیکھا، وہ کافی کا سپ لے رہی تھی۔

”کافی تو ٹھیک ہے۔“ وہ کچھ حیرت سے بولی۔

ایک نے کندھے اچکائے۔ ”مجھے تو یوں لگا جیسے دودھ کے بجائے آنسو استعمال کیے ہوں۔ اپنی دے، میں چلتا ہوں، بائے۔“

وہ پلٹ گیا۔ سمانہ اس کے پیچھے گئی تھی۔ ہانیہ اپنے کمرے میں آگئی۔ تکیے پر سر رکھ کر اس نے سارے آنسو بہا دیے تھے۔ ہر بار ایک اور سمانہ کو ساتھ دیکھ کر اس کی یہی حالت ہوتی تھی۔ اس پر ستم یہ کہ وہ اس کی کیفیت سمجھ لیتا تھا اور پھر بھی اسے دکھ پہنچاتا تھا۔ کتنا بدل گیا تھا وہ، کاش اسے بھی صبر آجائے۔



علیشما کی طرف سے خوشخبری سننے کو ملی تو رومیا نے ایک چھوٹی سی تقریب رکھی تھی اور ان سب کو بھی

ہے پلیز تم میری طرف سے اس سے معذرت کرو اور اسے مناؤ۔" وہ توبدک ہی گئی۔

"میں کیوں مناؤں تم دونوں کا آپس کا معاملہ ہے تم خود مناؤ۔"

"پلیز ہانی وہ نہ تو مجھ سے مل رہا ہے نہ میرا فون ہی اٹینڈ کر رہا ہے تم تو اس کے پاس کام کرتی ہو تمہاری تو وہ بہت رسپیکٹ کرتا ہے۔"

"تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ مجھے اپنے اتنے ذاتی معاملے میں بولنے کی اجازت دیں گے۔"

"وہ کچھ نہیں کہے گا مجھے پتا ہے نا وہ تم سے کتنی۔" وہ یک دم رکی تھی۔ ہانیہ نے بری طرح چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"آئی ہین وہ تمہاری بہت عزت کرتا ہے تمہارے متعلق کوئی بات بھی کرتا ہے تو بڑے احترام سے۔" ہانیہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

"کیا ہوا ایسے کیوں ہو کیہ رہی ہو بات کرو گی نا۔" "وہ دن سے سر آفس بھی نہیں آرہے میں کیسے بات کروں۔" وہ آہستگی سے بولی تھی۔

"تم اس کے گھر چلی جاؤ وہاں بات کر لو۔" "تمہارا داغ ٹھیک ہے سمانہ میں کیوں وہاں جاؤں گی؟"

"تو وہ تمہاری بہن کا سسرال بھی ہے تم کیوں نہیں جا سکتیں۔" (آج وہ بہن ہو گئی) "تم روم حصہ آئی سے بات کر لو وہ سمجھالیں گی۔"

"پاکل تو نہیں ہو گئی۔ یہ میرا اور ایک کا ایٹھ ہے اسے میں ان سے کیسے ڈھکس کر سکتی ہوں۔" "تو میں بھی تو تھرڈ پرسن ہوں میں کیسے بات کر سکتی ہوں۔"

"نہیں تمہارے لیے تو ایک بہت کرلیسی شو کرتا ہے۔ تمہاری بات وہ آرام سے سن لے گا۔"

ایک تیر ہانیہ کے سینے میں پیوست ہوا تھا کسی نہ کسی طرح دباؤ ڈال کر سمانہ نے اسے رضامند کر ہی لیا تھا اگرچہ دل تو چاہتا تھا کہ وہ میری بلا سے مگر وریا میں رہ کر مجھ سے بیر بھی تو نہیں رکھا جاسکتا۔ سمانہ

اچھی اپنے مطلب کے لیے بنی ہوئی تھی۔ وہ اس کی ناراضی سے بچنے کے لیے ناچار اس کے ساتھ ایک کے محل جیسے گھر میں چلی آئی۔ سمانہ اسے ڈراپ کر کے چلی گئی تھی۔ وہ پہلی بار وہاں آئی تھی۔ ملازم اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر ایک کو اطلاع دینے چلا گیا تھا۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھ کر ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگی۔

"چھوٹے صاحب آپ کو اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔" وہ چونک کر کھڑی ہو گئی۔ "کیوں انہیں یہاں بلا میں نا آپ۔"

"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔" وہ کچھ دیر گوگو کی کیفیت میں کھڑی رہی پھر اثبات میں سر ہلا کر ملازم کے پیچھے چل پڑی تھی۔ "اور لوگ کہاں ہیں۔"

"جی وہ سب تو امریکا گئے ہوئے ہیں اپنے بڑے بیٹے کے پاس۔" وہ ٹھنک کر رک گئی۔ "گھر پر صرف سرائیک ہیں۔"

"ہم سب بھی ہیں جی۔" وہ اس کی کم علمی پر مسکرایا۔ ساتھ ہی طویل کارڈ بور کے ایک کمرے کے دروازے پر دستک دی تھی۔ "تیس کم ان"

ملازم نے دروازہ کھول کر ہانیہ کو اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا وہ جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ بہت شاندار بیڈ روم اس کے پتوں بیچ کھڑا وہ شاندار بندہ ایک دم پر فکڑا۔

"السلام علیکم سر۔" "وعلیکم السلام آئیے مس ہانیہ۔" "آپ کی طبیعت کیسی ہے سر۔" وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"اب تو ٹھیک ہوں۔" وہ بھی سامنے بیٹھ گیا تھا۔ ہانیہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ آگے کیا بات کرے۔ ڈائریکٹ موضوع پر آتا تو بہت مشکل تھا۔

پچھلے دنوں ایک کا جو اس سے رویہ رہا تھا وہ کبھی حوصلہ شکن تھا اور سمانہ سے منگنی کے بعد تو اس نے خود بھی اس سے کتراتا شروع کر دیا تھا وہ بھی شاید قسم کھا

کر بیٹھا تھا کہ وہ بولے گی تو ٹھیک ورنہ یونسی چپ چاپ بیٹھے رہنا ہے۔

”آئی اور سب کہاں ہیں؟“ اب کچھ تو کہتا تھا ورنہ ملازم ہتا چکا تھا۔

”سب امر کا گئے ہوئے ہیں۔“ اس کے ہونٹوں پر دلی مسکراہٹ تھی وہ یقیناً ”محفوظ ہو رہا تھا۔“

”کب تک آئیں گے؟“

”شاید۔۔۔ اگلے ہفتے تک“ پچھلے دنوں کی نسبت موڈ خاصا خوش گوار تھا ہانیہ کا حوصلہ بڑھا۔

”سرمانہ بہت پریشان ہے“ اس سے شاید کچھ غلط ہو گیا ہے، وہ آپ سے ایک سکھو ز کرنا چاہتی ہے، مگر آپ شاید اس کا فون انینڈ نہیں کر رہے تو اس نے مجھے بھیجا ہے۔“

”تو اس لیے آئی ہیں آپ“ اس کے ماتھے پر ہل پڑا۔

”وہ کہہ رہی تھی کہ آپ اس سے ناراض ہو گئے ہیں تو۔۔۔“

”تو اس نے آپ کو بھیجا منانے کے لیے۔ اسے کیسے پتا تھا کہ آپ منائیں گی۔“ اس کے لہجے میں سختی آئی تھی۔ ہانیہ کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا۔ مارے شرمندگی کے وہ اٹھ گئی۔

”سوری سر اس نے کہا تھا کہ میں آپ سے اس کی طرف سے سوری کروں، آپ اس کا فون انینڈ کر لیں تو وہ خود۔۔۔“

”یہ میرا اور اس کا مسئلہ ہے۔“ وہ سرد مہری سے بولا۔

”ٹھیک ہے سر میں چلتی ہوں۔“

وہ مڑنے لگی تھی کہ ایک نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ہانیہ کو لگا جیسے انگارہ اس کے ہاتھ سے آگاہ ہو۔ اسے یقیناً ”سخت بخار ہو رہا تھا۔ ہانیہ نے سر اٹھا کر دکھا اس کا چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی ساری شرمندگی و غصہ بھاپ بن کر اڑ گیا۔

”آپ میڈسن لے کر آرام کریں“ آپ کو تو بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔“

”آپ فرسٹ ٹائم آئی ہیں تو ایسے کیسے جا رہی ہیں۔“

”نہیں سر کوئی تکلف نہیں، پھر سمانہ کے آنے کے بعد تو آنا جانا لگا ہی رہے گا“ آپ پلیز میڈسن لیں۔“

”میں چائے منگوانا ہوں، پھر میڈسن لے لوں گا“ بیٹھیں۔“ اس نے انٹرکام پر ہدایات دیں۔ جب تک وہ بیٹھ چکی تھی۔ وہ بھی آکر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

ہانیہ نے گھبرا کر پیچھے کھسکنا چاہا، لیکن ایک نے اس کے کندھوں پر بازو پھیلا کر اس کی یہ کوشش ناکام کر دی تھی۔ ”ریلیکس ہانیہ۔“

ہانیہ پر گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی اس کا لمس اس کی خوشبو اس کے حواسوں پر غالب ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے کانپتے ہاتھ گود میں رکھ لیے۔ ایک نے اس کا ہاتھ تھام کر سامنے کیا۔

”آپ کے ہاتھ بہت خوب صورت ہیں، ہونے بھی چاہئیں، آپ خود جو اتنی خوب صورت ہیں کہ کسی کا ایمان بھی خراب کر سکتی ہیں۔“ وہ اسے دیکھتے ہوئے بڑی دلکشی سے مسکرایا۔ ہانیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے ہوا کیا ہے، کہاں تو وہ اس سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتا تھا اور کہاں یہ رویہ۔ وہ کسمپا کر پیچھے ہونا چاہتی تھی، مگر ایک پوری طرح متوجہ تھا، اس کی گھور سیاہ آنکھوں میں ستارے سے چمک رہے تھے، ایک انوکھا جذبہ، کوئی الگ سا تاثر تھا ان میں۔ اسی وقت دستک ہوئی۔ وہ گہری سانس لیتا ہوا اٹھ گیا۔

ملازمہ چائے کی ٹرالی بلائی تھی۔

”اوکے اب جا میں آپ۔“

دروانہ بند کر کے وہ دوبارہ اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

”چائے آپ بناؤں گی یا میں بناؤں؟“

”جی سر میں بناتی ہوں۔“ اس نے دو کپوں میں چائے بنائی اور اپنا کپ لے کر چائے کے دو تین سپ لپے۔

”یہ بھی لیں نا۔ یہ سب دیکھنے کے لیے تو نہیں رکھا۔“ ایک نے ٹیبل پر موجود لوازمات کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں“ میں صرف چائے لوں گی۔“ وہ جلد از جلد چائے پی کر یہاں سے جانا چاہتی تھی۔

”میں بھی صرف چائے پوں گا۔“ اس نے آرام سے ہانیہ کے ہاتھ میں موجود کپ خود لے لیا اور اسی میں سے پینے لگا۔ وہ بھونچکا رہ گئی تھی۔ تھوڑی سی پی کر کپ دوبارہ ہانیہ کو پکڑا دیا۔

”ہیں۔“

”نہیں سر میں نے بس کر دی۔“

”کیوں کپ تو ختم کریں اور جھوٹا کھانے پینے سے محبت بردھتی ہے۔“ اس نے کپ اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ہانیہ نے بمشکل ایک گھونٹ حلق سے اتارا۔

”سر۔“

”جی سر کی جان؟“ وہ مزید سٹٹا گئی۔ سر کو کیا ہو گیا تھا۔ کیسی بھکی بھکی باتیں اور حرکتیں کر رہے تھے۔

”آپ کچھ کھالیں پھر میڈیسن۔“

”اف آپ ڈاکٹریوں نہیں بنیں۔ جب سے آئی ہیں میڈیسن، میڈیسن، آپ بھی تو کچھ لیں پھر میں بھی لیتا ہوں۔“ وہ تو ہرگز یہ رسک نہیں لے سکتی تھی، چائے والا عمل اگر کباب بسکٹ کے ساتھ دہرایا جاتا، وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

”میں اب جاؤں سر کافی دیر ہو گئی ہے۔“

”سمانہ کو کیا بتائیں گی، مجھے منایا تو نہیں آپ نے۔“ ہانیہ نے حیرت سے اسے دیکھا، وہ تو سمجھی تھی کہ وہ ناراضگی ختم کر چکا ہے۔

”چلیں مجھے منائیں۔“ وہ ڈٹ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ تھی۔ ہانیہ بھی بے اختیار مسکرا دی۔

”میں آپ سے سمانہ کی طرف سے معافی مانگتی ہوں، پلیز سراس سے جو بھی گستاخی ہوئی ہے، اس کے لیے اسے معاف کر دیں۔“

”اونہوں، یہ تو ایلیکیشن ہے، جیسے اسکول میں دی جاتی ہے۔“

”تو آپ ہی بتادیں۔“ اب وہ زچ ہو گئی تھی۔

”بڑے افسوس کی بات ہے ویسے کہ آپ کو منانا

بھی نہیں آتا، آپ سے ناراض بھی سوچ سمجھ کر ہونا چاہیے، خیر میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کس طریقے سے آپ کو مجھے منانا چاہیے تھا۔“

بڑے آرام سے اس نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ہانیہ کو تو 440 والٹ کا کرنٹ لگتا تھا۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔“

”ابھی تو میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔“ وہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ہانیہ کو اب صورت حال کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی، مگر اس نے اپنی گرفت مزید سخت کر دی تھی۔

”آپ بہت غلط کر رہے ہیں سر۔“

”محبت اور جنگ میں کچھ بھی غلط نہیں ہوتا۔“

اس کے پاس ہر بات کا جواب موجود تھا۔

”محبت تو آپ سمانہ سے کرتے ہیں نا؟“

”آپ کو اچھی طرح پتا ہے کہ میں کس سے محبت کرتا ہوں۔“ وہ اس کی اس بات پر اتنی حیران ہوئی کہ سب کچھ بھول کر ہکا بکا سی اسے دیکھنے لگی۔ وہ دلکشی سے مسکراتے ہوئے اس پر جھکا اور اس کی حیرت سے کھلی آنکھوں میں جھانکا۔

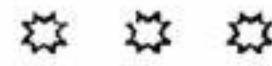
”آپ اتنی سرپرائزڈ کیوں ہیں۔ کیا نہیں جانتیں کہ مجھے کس سے محبت ہے؟“

ہانیہ نے بے اختیار نظریں پھیر لی تھیں۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اتنی غیر متوقع بات نے اس کی مزاحمت کو کمزور کر دیا تھا۔ اسے ڈھیلا پڑتے دیکھ کر ایک کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کے بالوں میں لگا کچھو کھول دیا۔ گھنے لمبے پیل آبشار کی طرح اس کی پشت پر موجود ایک کے بازو پر گرے تھے۔ اس نے نرمی سے انہیں سہلایا۔

”بیوی فل“ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا، ہانیہ کو پھر پریاں سی آرہی تھیں۔ بہت مشکل سے اس نے کہا۔

”سر پلیز مجھے جانے دیں، بہت دیر ہو گئی ہے، سمانہ انتظار کر رہی ہوگی۔“ اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔ وہ بغیر کوئی جواب دیے جھکا اور اس کے گلے کو

چھو لیا۔ ہانیہ تڑپ کر پیچھے ہوئی، مگر کتنی پیچھے اس نے دو سرا ہاتھ اس کے سر کے نیچے رکھ کر اسے مزید نزدیک کر لیا۔ ہانیہ اس کے بازوؤں میں پھڑپھڑا رہی تھی، مگر رہائی کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اچانک اس کا سیل فون بجنے لگا نہ چاہتے ہوئے بھی ایک کا دھیان بٹ گیا تھا۔ ہانیہ نے مہلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دانت اس کے بازو میں گاڑ دیے تھے۔ وہ سی کر کے پیچھے ہٹا تھا۔ ہانیہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی، لیکن اس نے بغیر کوئی لمحہ ضائع کیے اسے پھر سے اپنی گرفت میں لے لیا اور کھینچتا ہوا اپنے بیڈ پر لے آیا تھا۔ وہ بری طرح مزاحمت کر رہی تھی، اس نے چیخنے کے لیے بھی منہ کھولا تھا، مگر ایک کا ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس کی ہر مزاحمت دم توڑ گئی۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب اتنا دباؤ برداشت نہ کر سکے اور وہ بے ہوش ہو کر اس کی بانہوں میں جھول گئی تھی۔



وہ صرف بے ہوش نہیں ہوئی تھی، اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ بند رہ دن اسے ہسپتال، نرژور کھا گیا۔ گھر آنے کے بعد بھی اس کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں تھی۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔ کسی نے بات کی تو دل چاہا۔ جواب دے دیا ورنہ خاموشی، لیکن جہاں کہیں بات کرتے ہوئے کسی نے اسے ہاتھ بھی لگا دیا تو وہ چیخنا شروع کر دیتی تھی۔ ”چھوڑو مجھے، دور ہو جاؤ، مت چھوؤ مجھے“

”تو بہ ہے، یہ تو اودھم مچا دیتی ہے۔“ تائی امی بڑبڑائیں۔

”خدا کا خوف کرو شیریں، پتا نہیں بچی کس کیفیت سے گزر رہی ہے، کیا ہوا ہے جو ایسی ہو گئی ہے۔“

تایاجی کی آواز اندیشوں سے لرز گئی۔ انہیں ایک نے اس کی بے ہوشی کی اطلاع دی تھی اور اسپتال والوں کے مطابق اسے اسپتال بھی وہی لایا تھا۔ سامنے نے بتایا کہ وہ اسی کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ ان کی اطلاع کے مطابق تو ساری فیملی امریکا گئی ہوئی تھی۔ اس کا

مطلب وہ گھر میں اکیلا تھا، خدا نا خواستہ اس نے اسے کوئی نقصان۔ وہ کنب سے گئے۔ ہونے والے داماد کا ان کی بھتیجی کے ساتھ کوئی بھی غلط حرکت کرنے کا مطلب دو طرفہ تباہی تھا۔

”یا اللہ، کوئی غلطی ہوئی ہے تو معافی دے دے۔ مجھے میرے بھائی کے سامنے روز آخرت سرخو رکھنا۔“

سامنے نے البتہ ایک سے پوچھا تھا کہ ہانیہ تو اس کی طرف آئی تھی پھر اس کے ساتھ کیا ہوا کہ وہ ان حالوں کو پہنچ گئی۔ اس نے سرد مہری سے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ ”میں آپ کے سوالوں کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔“



”اسی ڈارلنگ، آپ مجھے تھوڑا سا ٹائم دے سکتے ہیں۔“ وہ ڈنر کے بعد ٹیبل سے اٹھا تو مام نے پکارا۔

”شیور مام۔“

”اوکے، میرے کمرے میں آجائیں۔“ وہ ان کے ساتھ، ان کے بیڈ روم میں آگیا، ڈیڈ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ وہاں کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

”آپ کی اور سامنے کی کیا مس انڈر اسٹینڈنگ چل رہی ہے۔“

”بس یونہی، اس نے مجھے تھوڑا ڈس ہارٹ کیا تھا۔“ اس نے شانوں کو لاپرواہی سے جنبش دی تھی۔

”اس نے آپ سے سوری نہیں کہا؟“

”میں نے موقع ہی نہیں دیا۔“

وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہیں۔ ”سامنے سے میری بات ہوئی تھی اس نے مجھے بتایا کہ ہانیہ سے متعلق کسی بات پر آپ اتنے ناراض ہو گئے۔ آپ کا ریلیشن تو سامنے سے ہے نا، ہانیہ سے تو نہیں، پھر ہانیہ کی وجہ سے سامنے سے ناراض ہونا کچھ ٹھیک تو نہیں ہے۔“ وہ بالکل خاموش تھا۔ وہ کچھ دیر اس کے بغور دیکھتی رہیں۔

”آپ کو اور سامنے۔ دونوں کو اپنا ٹیمپرامنٹ انگریز کرنا چاہیے، اب اگر ہانیہ اتنی بیمار نہ ہوئی تو آج کل میں

آپ دونوں کی شادی کے دن ملے ہو رہے ہوتے۔“
اس بات اس نے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ بولا مگر اب
بھی نہیں تھا۔

”اور سمانہ بتا رہی تھی کہ ہانیہ کے بیمار ہونے کا بھی
آپ سے کوئی تعلق ہے، وہ سمانہ کی طرف سے
معذرت کرنے یہاں آئی تھی اور اس کے بعد
ہسپتال پہنچ گئی۔“

ایک بم تھا جو انہوں نے ایک کے اعصاب پر دے
مارا تھا۔ ”آپ نے اسے ٹارچ کیا تھا منٹیلی یا
فرہنگلی؟“

”سمانہ نے کیسے یہ سب کہہ دیا۔ اس نے ہانیہ سے
پوچھا ہے یا اسے میرے ساتھ دیکھا ہے؟“ وہ بھڑک
اٹھا تھا۔

”رضیہ اور شاہد نے تو دیکھا ہے“ اسے یہاں آتے
آپ کے بیڈروم میں جاتے اور اسے بے ہوشی کی
حالت میں اٹھا کر باہر لے جاتے سب دیکھا ہے۔“

اس کے ڈیڈ ہیڈ سے مام کی صلاحیتوں کے معترف
تھے کہ وہ بہت ٹھنڈے مزاج کے ساتھ یوں معاملات
کو ہینڈل کرتی تھیں کہ آہستہ آہستہ گھیر کر اس پوائنٹ
پر لے آئی تھیں کہ کوئی راہ فرار نہیں چھوڑتی تھیں۔
ایک تو سانس لیتا بھی بھول گیا تھا۔

”کیا کیا تھا آپ نے اس کے ساتھ کہ وہ بچی
ابنا مہلشی کی لہٹس کو پہنچ گئی ہے۔“ اس بار ان کے
لہجے سے برہمی چمک رہی تھی۔

”میں ہمیشہ براؤڈ فیل کرتی رہی کہ میرے بچے آج
کل کی کسی برائی میں ملوث نہیں ہیں، نہ اسموگنگ
کرتے ہیں نہ ڈرنک، کسی قسم کی گرل فرینڈز بھی
نہیں۔ لیکن یہ سب تو ظاہر کر رہا ہے کہ آپ نے ہر
لمٹ کو کراس کیا ہے۔ میں ان ماؤں میں سے نہیں
ہوں جو اپنے بچوں کی غلطیوں پر پردے ڈال کر انہیں
شہرہ دیتی ہیں۔ آپ نے یہ غلطی ہمیں گناہ کیا ہے اور
اس کے لیے آپ کو پے کرنا پڑے گا۔“

”آپ غلط سمجھ رہی ہیں مام، ایسا کچھ بھی نہیں
ہوا۔“

ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”لو کے، تو پھر وہ بے ہوش
کیوں ہوئی، اسے نروس بریک ڈاؤن کیوں ہوا؟“ وہ
خاموش ہو گیا۔

اس بار بار کی خاموشی سے میں کیا سمجھوں؟“
”آپ ہرٹ ہوئیں اس کے لیے سوری مام، لیکن
میں نے اس کے ساتھ کچھ بھی نہیں کیا۔ ٹرسٹ می
مام، میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا، جس کی وجہ سے
آپ شرمندگی محسوس کریں ورنہ مجھے اس پر اتنا غصہ
تھا کہ۔“

”ہانیہ پر غصہ۔“ وہ حیران رہ گئیں ”کس بات کا
غصہ۔“ وہ جھجک سا گیا۔

”مجھے شروع سے ہی بہت اچھی لگتی تھی۔ میں
نے آپ کو اس کے بارے میں بتانے کا سوچا لیکن بونی
کی شادی میں آپ سب کو ایک ساتھ اتنی پسند آئی کہ
سب نے فردا فردا مجھے اس کے ساتھ شادی کا مشورہ
دیا۔ ان ہی دنوں سمانہ اور اس کی ممی نے مجھ سے مل کر
اس کی بے راہ روی کا بتایا کہ اس کے تو بہت سارے
بوائے فرینڈز ہیں۔ اپنے حسن سے وہ ہر کسی کو دیوانہ
بناتی ہے، وہ جاب بھی اسی لیے کرتی ہے کہ نئے نئے
شکار پھانس سکے۔ سمانہ کا بھائی عرصہ بھی اس کے ساتھ
انوالو ہے بلکہ عرصہ کے ساتھ تو بہت زیادہ اٹیچ ہے۔
میں نے اپنے آپ کو بہت روک کے رکھا ہوا تھا ورنہ
اپنے جذبات کی توہین پر میں اسے معاف کرنے کے
لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اس دن سمانہ کی طرف سے
معذرت کرنے کے لیے خود ہی آگئی۔ اسے نہیں آنا
چاہیے تھا۔ مجھے اس پر اتنا غصہ تھا کہ اگر وہ بے ہوش
نہ ہو جاتی تو میں واقعی آپ کے سامنے آنے کے قابل
بھی نہ رہتا۔ غصے نے میری عقل بھی چھین لی تھی اور
آپ کا سامنا کرنے کا خیال بھی، آئی ایم ریسکی ویری
سوری مام۔“

”اور اس کا سامنا کرنے کا کوئی خیال نہیں آیا کہ
خدا نا خواستہ اسے کچھ ہو جاتا یا وہ جس کیفیت میں اب
ہے۔ اس میں ہوتی تو کیسے فیس کرتے یا کہیں عتاب
ہو جاتے۔“ وہ مہذبہ کے جھبھتے لہجے پر اس نے سر

جھکایا۔ کتنی ہی دیر یہ اذیت ناک خاموشی چھائی رہی جسے رومی صبر سے ہی توڑا تھا۔

”یہ کس قسم کی پسندیدگی تھی کہ کسی نے بھکاپا اور آپ بھگ بھی گئے۔ آپ کے دل نے کوئی گواہی نہیں دی کہ وہ کیسی لڑکی ہے۔ میں نے ایک نظر میں دیکھ لیا تھا کہ وہ بہت معصوم ہے۔ بوبی کی بارات والے دن اس نے صرف ایک دفعہ میرے سامنے آپ کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں سے جھلکتی محبت نے مجھے اس کا دیوانہ بنا دیا۔ اتنی حسین بچی اور میرے بیٹے سے اتنی محبت کرے اور میرے دل میں نہ اترے۔ آپ کے ڈیڈ نے مجھ سے کہا اس بچی کو ابھی کے لیے ریزرو کر لیں، ابھی بھی اس میں انٹرنلڈ ہے۔ محبت تو خود ایک گواہی ہے۔ اپنے وجود کا خود ہاتھ دیتی ہے یہ محبت تو تھی ہی نہیں، یہ تو وقتی جذبات تھے۔ اگر وہ خدا نخواستہ ایسی لڑکی ہوتی بھی تو وہ آپ کے ساتھ کسی رشتے میں جڑی ہوتی تو نہیں تھی نا کہ آپ اس سے بے وفائی کا انتقام لیتے پھرتے، صرف شک کی بنیاد پر آپ نے اپنا اعتماد بھی کھو دیا۔ وہ اعتماد جس کے سہارے وہ آپ کے بیڈ روم تک چلی آئی تھی۔ وہ اعتماد ٹوٹا تو وہ خود بھی ٹوٹ گئی۔ بلال صاحب بتا رہے تھے کہ سوتے میں سے چیختی ہوئی اٹھ جاتی ہے، کوئی کندھے پر ہاتھ رکھ دے تو اتنا چیختی چلا آتی ہے کہ وہ لوگ بلا وجہ اس کے پاس بھی نہیں جاتے، اسے ٹرکولا نرز پر رکھا جا رہا ہے۔ اس کی سو کا لڈ بے وفائی پر آپ کو زیادہ اذیت ہوئی تھی یا وہ زیادہ اذیت میں ہے؟“ وہ سخت للال میں گھری ہوئی تھیں۔

”آپ کیا سمجھتے ہیں۔ بلال صاحب اور ان کی فیملی کو کچھ معلوم نہیں ہوا، انہیں سب پتا چل گیا ہے کہ اس دن آپ اکیلے گھر میں تھے اور اسے اسپتال بھی آپ نے پہنچایا ہے تو اس کی حالت کی وجہ بھی خود بخود معلوم ہو چکی ہے۔ وہ حفظ مراتب میں چپ ہیں۔ ورنہ ایسے لڑکے کو داماد بنا کر انہیں کون سی خوشی مل جائے گی جو ان کے ہی گھر کی دوسری لڑکی کے ساتھ زیادتی کی کوشش کر چکا ہو۔“ ایک کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا تھا۔

”اب صرف ایک صورت ہے اس کی طبیعت کے بحال ہو جانے کے بعد آپ میرے ساتھ چلیں گے ان کے گھر اور سب کی موجودگی میں ہانیہ سے معافی مانگیں گے، نہ صرف معافی بلکہ اعتراف بھی کریں گے کہ اس سارے معاملے میں صرف آپ قصور وار ہیں، وہ بچی بالکل بے گناہ ہے۔“ ایک دم بخودوں کی شکل دیکھ رہا تھا اتنی سخت سزا۔

”اگر منظور کرتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میں سمجھوں گی میرا ایک ہی بیٹا ہے بوبی۔ آپ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔“

”مام، اس کی آواز میں بے یقینی تھی۔

”آپ مجھے ڈس اون کر رہی ہیں؟“

”نہیں۔ ابھی مجھے آپ کے جواب کا انتظار ہے۔“ وہ بڑے ٹھنڈے کبجے میں سخت بات کہتی تھیں۔

”اوکے، آپ جب کہیں، میں ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔“ اس کے ایک دم کہنے پر ان کے دل کو کچھ ہوا مگر یہ وقت کمزوری دکھانے کا نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے اب آپ جائیں آرام کریں۔ گڈ نائٹ“

”گڈ نائٹ مام۔“ وہ چلا گیا تو کتنے ہی آنسو ان کی آنکھوں سے چھلک گئے تھے۔ کتنی مشکل صورتحال سے دوچار کر دیا تھا ایک نے انہیں اور خود کو۔



اپنے کمرے میں آخر وہ خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ دل پر رکھا بوجھ مزید بڑھ گیا تھا۔ ندامت و شرمندگی کا بوجھ۔ وہ تو پہلے ہی ضمیر کی ملامت کا شکار رہتا تھا، مام کی باتوں نے اسے مزید نادم کیا تھا۔ اپنی ہی الجھنوں میں اسے علم ہی نہیں ہوا کہ مام کس طرح ان سے رابطے میں ہیں اور ہر چیز ان کے علم میں ہے۔ اس شام وہ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے بستر میں ہی تھا جب شاہد نے آکر اسے ہانیہ کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ حیران رہ گیا، ”کون؟“

”سر میں ہانیہ ہیں، آپ سے ملنا چاہتی ہیں؟“ کتنی ہی دیر اسے یقین نہیں آیا۔ وہ کیسے یہاں آسکتی ہے۔ پھر اس نے کبل اتار اور بستر سے نکل آیا۔

”آپ انہیں یہیں لے آئیں، میں جب تک فریٹش ہو جاؤں۔“

شاید کے چہرے پر اترتی حیرت کو نظر انداز کرتا وہ واش روم چلا گیا تھا۔ فریٹش ہو کر آیا تو دستک دے کر وہ اندر آئی تھی۔ گلابی لباس، خود بھی گلابی گلابی سی، کتنی پیاری کتنی معصوم نظر آنے والی، اندر سے کتنے کالے دل والی، ایسی ایکٹنگ کرتی تھی کہ شبہ نہیں ہو پاتا تھا کہ وہ کس کریکٹر کی مالک ہے۔ اس کے بخار کا علم ہونے کے بعد تو وہ اتنی بے چین ہوئی کہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے گولیاں اسے کھلا کر ہی جاتی۔ وہ دل ہی دل میں اس کی اداکاری کو سراہ رہا تھا۔ وہ اس کے پاس آکر بیٹھا تو اس کی خوب صورت قربت اسے بہکانے لگی۔ وہ جو چاہ رہا تھا اس کا ماحول تو خود بخود بن رہا تھا سو وہ مزید بہکتا گیا۔ وہ ہراساں ہو کر خود کو چھڑوانے کی کوشش کرنے لگی مگر کسی تو ایک نازک سی لڑکی، تھک کر ہار گئی۔ وہ جیسے ہی ہوش و حواس سے بیگانہ ہوئی۔ اس کا سارا نشہ بھی ہرن ہو گیا۔ اس کے گال تھپتھپائے۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے لیکن بے سود۔۔۔ بے اختیار اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور اسپتال لے آیا۔

جب ڈاکٹر نے اس کے نروس بریک ڈاؤن کا بتایا تو اس کے اپنے حواس جاتے رہے۔ اس نے بلال صاحب کو اطلاع دی اور جب تک وہ انہیں گئے۔ وہ وہیں رکا رہا۔ وہ بار بار یہی پوچھتے رہے کہ اسے ہوا کیا ہے؟ آپ ان ہی سے پوچھئے گا۔

وہ وہاں سے آگیا۔ جب تک وہ ہوش میں نہیں آئی وہ عرصہ سے اس کی خیریت پوچھتا رہا۔ زندگی اتنی بری اور اتنی مشکل ہو گئی کہ اسے گزارنا ایک عذاب بن گیا تھا، جو سزا ہانیہ کو دینے لگا تھا وہ خود اس کے اپنے لیے سزا بن گئی تھی۔ مام نے صحیح کہا تھا کہ اس نے اس کے بعد کا نہیں سوچا تھا، وہ اسے دور سے دیکھتا تھا تو بے خود

ہو جاتا تھا، اسے چھو کر تو اس نے اپنے آپ کو ایک امتحان میں مبتلا کر لیا تھا، اپنا کمرہ جو اسے جنت لگتا تھا، وہاں آنا ہی ایک اذیت بن گیا تھا۔ ہر طرف ہانیہ ہی نظر آتی تھی، مسکراتی، جھجکتی، روتی، تڑپتی، ایک دم بے جان ہو کر اس کی بانہوں میں جھولتی ہوئی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں کتنی بے یقینی تھی، ایک اس حد تک جاسکتا ہے، اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اسی بے یقینی نے اسے بے ہوشی کے غار میں اتار دیا تھا۔ ایک کا سارا غصہ، ساری نفرت اس کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی۔ ایک پچھتاوا تھا جو اسے جینے نہیں دیتا تھا۔

اس نے جیب میں سے اپنا سیل نکالا اور گیلری کے آپشن میں جا کر اس کی تصویر اپنے سامنے کر لی۔ جھہنہی سی، شرمائی سی، لیکن بہت خوب صورت بھی، وہ روز رات کو اس تصویر کو دیکھا کرتا تھا۔ وہ انتہائی دل فریب بقوش جنہیں اس نے چھو کر محسوس کیا تھا اور اب؟ اس کون بند کیا اور سائیڈ ٹیبل کی بوراز سے نیند کی گولیاں نکالیں اور دو گولیاں ایک ساتھ پانی کے ساتھ نگل لیں۔

”اسے ٹرکولا نزر پر رکھا جا رہا ہے“ مام کی آواز اس کے کانوں میں پھر سے گونجی، ایک حزیں مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیلی تھی۔ وہ تین ہفتوں سے ٹرکولا نزر ہی لے رہا تھا، ورنہ اسے لگتا تھا اس کے دماغ کی نسٹس پھٹ جائیں گی۔ اس نے نائٹ سوٹ پہنا اور آگر دو بارہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ جب تک نیند سے آنکھیں بو جھل نہیں ہو جاتی تھیں، وہ بیڈ پر نہیں جاتا تھا۔ بیڈ کی طرف تو دیکھتا بھی نہیں تھا، ورنہ ہانیہ پھر سے اس کے حواسوں پر سوار ہو جاتی۔ اس نے اپنی آستین پٹی بازو پر ابھی بھی ہلکا سا نشان تھا، اس نے انگلی سے اس نشان کو چھوا تھا۔

”مائے لو، مائے سوٹ ہارٹ آئی ایم ایکسٹریلی سوری۔“ وہ آہستہ سے بڑبڑایا اور دونوں ہاتھوں سے بالوں کو پیچھے کیا اور ہاتھ پیچھے گدی سے باندھ لیے۔ صوفے کی پشت پر سر نکالے وہ چھت کو دیکھ رہا تھا۔

”آپ کو سب کے سامنے معافی مانگنی ہوگی۔“ وہ جھری جھری سی لے کر سیدھا ہو گیا۔ ”یا اللہ مجھے حوصلہ دے اور معافی بھی۔“

دعا مانگتے مانگتے اس کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں اور وہ وہیں صوفے پر ہی سو گیا تھا۔



بہت آہستہ آہستہ مگر تدریج ہانیہ کی ذہنی حالت بہتر ہونے لگی۔ دو بار اس سے ملنے کے لیے روم مہصہ آئی تھی، نرمی سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں اور وہ بھی بہل سی گئی۔ ان کی وہ بہت عزت کرتی تھی، وہ بہت اچھی تھیں، اس میں کوئی شک نہ تھا، مگر وہ ایک کی ماں بھی تھیں، بے شک ایک نے اسے پاگل پن کی سرحدوں تک پہنچا دیا تھا، لیکن اس نے تو اس سے سچ سچ محبت کی تھی۔ اس سے وابستہ ہر رشتہ اسے بہت عزیز تھا۔

مومنہ بھی آئی تھی۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے اچانک کہا۔ ”سرا ایک اسکاٹ لینڈ گئے ہوئے ہیں۔ جانے سے پہلے مجھ سے تمہارے متعلق پوچھنے آئے تھے۔ اب تو تم کافی بہتر ہو، آفس آؤ گی نا، میں تمہیں بہت مس کرتی ہوں اور۔“ وہ شرارت سے بولی۔ ”سرا ایک بھی۔“

”سڈ اپ مومنہ۔ وہ سامنے کے فیانیسی ہیں۔“

”اوہ سوری یار، میں بھول ہی گئی تھی۔“ مومنہ نے فوراً معذرت کی تھی۔

”اٹس اوکے۔“ وہ آہستہ سے بولی، سر پر جیسے کوئی وزن آگرا تھا وہ آنکھیں موند کر لیٹ گئی مومنہ کو شاید کبھی اپنے کبے پر اتنا افسوس ہوا ہو۔ جتنا اب ہوا تھا وہ نہیں جانتی تھی کہ اس نے ہانیہ کے کچے زخم کو کھریا دیا تھا۔ وہ اس کے تصور کو جھٹک جھٹک کر ٹوک چکی تھی، مگر وہ تو اس کے اعصاب پر اتنا حاوی تھا کہ سوتی تو خواب میں اور جاگتی تو سوچوں میں، ارد گرد وہی نظر آتا تھا، وہی محسوس ہوتا تھا، اپنا آپ اس کے بازوؤں کے حصار میں، اس کے وجود کی خوشبو میں گھیرا ہوا لگتا۔

اپنے چہرے کے ہر نقش پر اس کے ہونٹوں کا دکھتا ہوا لمس، اس کی بے چینی کو سوا کر دیتا، وہ رگڑ رگڑ کر منہ دھوتی، مگر اس احساس سے پچھانہ چھڑا پاتی۔

وہ تو سامنے کی امانت تھا پھر اتنی بڑی بددیانتی، وہ خود کو سامنے کی مجرم سمجھتی تھی۔ نماز پہلے بھی پڑھتی تھی، مگر اتنی باقاعدگی سے اب ہی پڑھنے لگی تھی، بس وہی لمحات تو ہوتے تھے جب وہ اس کیفیت سے آزاد ہو پاتی تھی ورنہ تو اسے لگتا تھا اس کے اعصاب جواب دے جائیں گے۔ اس وقت بھی وہ عصر کی نماز پڑھ کر تسبیح ہاتھ میں لیے استغفر اللہ پڑھ رہی تھی، جب اس کے سیل پر نبل ہونے لگی، نیا نمبر تھا، اس نے کچھ دیر سوچا پھر اینڈ کر لیا۔ ”ہیلو۔“ ”جو اب“ خاموشی تھی۔ اس نے فون کان سے ہٹا کر حیرت سے دیکھا، پھر کان سے لگا لیا۔

”کیسی ہیں آپ ہانیہ؟“ وہ ایک تھا۔ ہانیہ کو جیسے فون نے کرنٹ مارا تھا۔ اس نے فون دور پھینک دیا، ایک ماہ بعد اس کی آواز نے اس پر وہی اثر کیا تھا جو ایک ماہ قبل اس کے عمل نے کیا تھا۔ وہ پوری کی پوری کانپنے لگی۔ اس نے تو سم ہی چینیج کر دی تھی۔ پھر اس نے یہ نیا نمبر کس سے لیا، وہ کچھ دیر خود پر قابو پاتی رہی، پھر فون اٹھا کر اسے آف ہی کر دیا۔



یہ اس کے کچھ دن بعد کی بات تھی جب روم مہصہ ان کے گھر آئیں اور بہت محبت سے اسے اپنے ساتھ لے جانے پر اصرار کرنے لگیں۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی تھی۔ ”نہیں آنٹی پلیز میں نہیں جاسکتی۔“

”بیٹا پارک تک چلنا ہے، سبک بہت اصرار کر رہی ہے، چلیں بیٹا ذرا دل بہل جائے گا۔“

”چلی جاؤ ہانیہ، بیٹا فریش ہو جاؤ گی۔“ تایا جی نے بھی کہا تو کپڑے تبدیل کر کے ان کے ساتھ چلی آئی۔ پارک میں بیچ پر بیٹھ کر روم مہصہ نے اپنے سیل پر نمبر ہش کیے۔

”اوہ سبک نے فون ہی بند کیا ہوا ہے، میں اسے بلا

کرلاتی ہوں وہ کینٹین میں ہوگی۔“

ان کے جانے کے بعد اس نے بیچ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ معا“ اسے اپنے برابر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو ساتوں آسمان اس کی نگاہوں میں گھوم گئے تھے ایک اس کے برابر بیٹھا اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ وہ جھٹکے سے اٹھی، مگر ایک نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے دوبارہ بٹھالیا تھا۔ ”کیسی ہیں آپ؟“ ہانیہ نے ہونٹ بیچ لیے تھے۔

”بہت ناراض ہیں مجھ سے؟“ وہ بہت نرمی سے

پوچھ رہا تھا۔ ہانیہ نے سر پھیر لیا۔

”میں آپ سے اہکسکیوز کرنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی نہ سنی ہے۔“

”پلیز ہانیہ، میں اس سب کے لیے سوری کر رہا

ہوں، میں نے مام سے ریکورسٹ کی کہ وہ میری کسی

طرح آپ سے بات کرادیں تاکہ میں آپ سے

اہکسکیوز کر سکوں۔“

”آپ لوگوں کو تو دھوکا دینے کی عادت ہے۔ آپ

ہوں یا آپ کی والدہ، دلغ تو میرا خراب ہے جو ہر بار

یقین کر کے ساتھ چلی آتی ہوں۔“ اس کا لہجہ اگر کھل تھا

تو الفاظ اس سے بھی سواتر ایک کے چہرے کا رنگ

تبدیل ہو گیا۔

”آپ سب کچھ کہہ سکتی ہیں، لیکن صرف مجھے،

مام میری نہیں، آپ کی وجہ سے ہمیں ملوانا چاہتی

تھیں۔ وہ مجھ سے ناراض ہیں، ٹھیک سے بات بھی

نہیں کرتیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں آپ سے

معذرت کروں تاکہ آپ کا کنفیڈنس بحال ہو جائے تو

میں آپ سے سوری کر رہا ہوں۔“

یعنی وہ ماں کی ناراضی دور کرنے کے لیے اسے منا

رہا تھا۔ ہانیہ کے دل پہ لگے زخموں میں ایک نیا زخم یہ

بھی سہی۔ اس نے اٹھ کر تھکے تھکے قدموں سے باہر

جانے کے لیے قدم آگے کو بڑھائے۔

”رکیں ہانیہ۔“

وہ رک گئی، اب وہ کون سا چر کا لگانا چاہتا تھا وہ یہ بھی

دیکھ لینا چاہتی تھی۔ وہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”میں نے آپ سے کہا تھا تاکہ آپ کو اچھی طرح

پتا ہے کہ میں کس سے محبت کرتا ہوں، جس سے محبت

ہو جائے، اسے تو یہ علم ضرور ہوتا ہے، بہر حال میں

آپ سے اعتراف کرتا ہوں کہ میں آپ سے کل بھی

محبت کرتا تھا، آج بھی کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں

گا۔“

پہلی دفعہ اظہار کیا بھی تو کس طرح، ہانیہ کی آنکھیں

جھلملا سی گئیں، وہ تو کہہ کر ایک دم پلٹ کر وہاں سے

چلا گیا، لیکن ہانیہ وہیں بیچ پر دوبارہ بیٹھ گئی تھی۔ جب وہ

اسے ٹھنکی باندھے دیکھا کرتا تھا یا جب دیر ہو جانے

کے احساس سے اسے گھر چھوڑ کر آتا، تب اس کا دل

کتنا خوش امید ہو گیا تھا۔ برک کی شادی میں ایک کی

والمانہ نظروں نے اسے یقین دلایا تھا کہ جذبات دونوں

طرف یکساں ہیں۔

پھر کیا ہوا کہ وہ دن بہ دن بدلتا چلا گیا۔ دکھ تو اسے ہوا

تھا تو شکوہ بھی اسے ہونا چاہیے تھا، مگر اسے تو صبر کی

عادت تھی سوائے سارے جذبات کا خون ہوتے دیکھ

کر بھی چپ ہو گئی۔ شکایت کرتی بھی تو کیا کرتی۔ ایک

نے کون سا اس سے کوئی وعدے کیے تھے۔ حالانکہ یہ تو

وہ جذبات تھے جن کے لیے اظہار کی ضرورت نہیں

تھی۔

وہ سمانہ کے ساتھ منگنی کے بندھن میں بندھ گیا۔

آئے دن اس کے ساتھ گھر آتا اسے ساتھ لے کر

ہولٹنگ، اونٹنگ کرنے جاتا، وہ کس اذیت میں مبتلا

ہو جاتی تھی، یہ تو وہی جانتی تھی اور اس دن جب وہ سمانہ

کے کہنے پر ایک کے گھر گئی اور جو کچھ ہوا اس میں وہ

خود کو ہی قصور وار گردانتی تھی۔ وہ ایک غیر مرد کے بیڈ

روم میں کیا سوچ کر چلی گئی جبکہ گھر میں کوئی دوسرا فرد

موجود بھی نہ تھا۔ سوائے ملازمین کے جو اپنے مالکوں

کے کسی کام میں مداخلت نہیں کر سکتے۔ ایک نے جو

کچھ کہا، وہ تنہائی میں مرد و عورت کے درمیان موجود

شیطان لعین کو آتا ہے۔ اب جبکہ وہ اللہ تعالیٰ سے

معافی کی طلب گار تھی تو ایک نے اسے پھر سے

|| 218 || اکتوبر 2015

ڈسٹرب کر دیا تھا۔



بازو اس کے ہاتھوں سے چھڑا کر اسے اپنے ساتھ لگایا۔ کمرے میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی کہ دروازہ ٹاک کر کے ملازمہ ٹرائی دوں گھیلیتی ہوئی کمرے میں آئی۔

”چائے دیوں آپ کو؟“

”میں بتاتی ہوں آئی۔“ ہانیہ نے پہلے چائے بنا کر انہیں دی، دوسرا کپ ایک کے سامنے رکھا اور اپنا کپ لے کر رومبصہ کے پاس بیٹھ گئی۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

میں جب آپ کو دیکھنے گئی تو مجھے خدشہ تھا کہ آپ مجھ سے ملیں گی تبھی نہیں۔ ایک کی ماں ہونے کے ناطے میں بھی برابر کی شریک جرم نہ سمجھی جاؤں، لیکن آپ نے مجھے حیران کر دیا۔ ایک کے سامنے میں نے ایک شرط رکھی ہے کہ یہ آپ سے سب کے سامنے اہکس کر دے گا تاکہ سب پر آپ کی بے گناہی ثابت ہو جائے۔ اب آپ ڈیٹائیڈ کریں کہ کب آج کل یا کسی اور دن جب آپ کہیں یہ سب کے سامنے۔“

”نہیں آئی۔“ وہ تھرا گئی تھی۔ ”پلیز نہیں۔“

”کیوں اس نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا اس کے بعد یہ اسی کا مستحق ہے۔“

”انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا جس کے لیے انہیں یہ کرنا پڑے۔ بلوی آئی، سر نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔“

”پھر آپ اپ سیدھے۔“

”ہاں نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا اس میں سر کا کوئی قصور نہیں ہے، سر نے مجھ سے کچھ بھی نہیں کیا۔“

جلدی جلدی وضاحتیں دیتی، گھبرائی ہوئی رومبصہ کے دل میں اترتی چلی گئی۔ انہوں کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ انہوں نے اسے ساتھ لگا کر اس کا ہاتھ چوم لیا تھا۔ ”آئی لو یو ہانیہ، آئی ریلی ویری ریج لو یو۔“

”اب میں جاؤں۔“

”پھر آئیں گی نا؟“ وہ کچھ دیر چپ رہی پھر اثبات میں سر ہلایا۔

”ہانیہ ڈارلنگ، کچھ رہ فرمینٹ لیں گی۔“ رومبصہ کی آمد کا اسے علم ہی نہیں ہو پایا تھا، سبک بھی ان کے ساتھ ہی تھی۔

”نہیں آئی، مجھے گھر جانا ہے۔“

”آج میرے ساتھ، میرے گھر چلیں۔“

”نہیں۔“ وہ ایک دم اٹھ گئی۔ ”میں گھر جاؤں گی۔“

”مجھ پر بھی اعتماد نہیں ہے؟“ ان کے لہجے میں کیا تھا کہ وہ چپ رہ گئی اور انہوں نے اپنا بازو اس کے گرد پھیلا دیا اور باہر لے آئیں۔ سبک بھی چپ چپ سی تھی۔ ان کے گھر کو دیکھتے ہی ہانیہ پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔

”میرے روم میں چلتے ہیں، سبک آپ اپنے کمرے میں جائیں، ابھی ہانیہ نہیں ہیں۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ ”ریلیکس ہو کر بیٹھیں، میں چائے منگوا لوں۔“ انہوں نے انٹرکام پر چائے کا آرڈر دیا اور پھر اپنے فون سے مختصر بات کی۔ ”میرے روم میں آئیے گا۔“ پھر مسکرائی ہوئی اس کے پاس آ بیٹھیں۔

”ان کے ڈیڈ تورات تک نہیں آنے والے، آپ ایزی ہو کر بیٹھیں۔“ اسی اثنا میں دستک ہوئی۔ ”پلیز“ دروازہ کھلا اور ایک اندر داخل ہوا، ہانیہ کا رنگ متغیر ہو گیا، ظاہری بات تھی کہ فون انہوں نے ایک کو ہی کیا تھا۔

”ہانیہ، ایک آپ کے سامنے ہے، آپ کا جو دل چاہے وہ سلوک اس کے ساتھ کر سکتی ہیں، اگر آپ چاہیں تو میں یہاں سے چلی جاتی ہوں آپ۔“

”نہیں آئی پلیز۔“ اس نے رومبصہ کا بازو دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ وہ ایک کے ساتھ کمرے میں تنہا رہنے کے خیال سے ہی لرز گئی تھی۔ رومبصہ نے انتہائی ملامت بھری نظروں سے ایک کو دیکھا تھا۔ اپنا

”ایک آپ کو چھوڑ آئے؟“ وہ خاموش ہی رہی۔ وہ اسے ساتھ لیے پورچ میں آئیں۔ ایک بالکل خاموش تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے فرنٹ ڈور کھولا۔ ہانیہ بیٹھ گئی تو وہ میصہ نے تھوڑا اندر ہو کر ایک سے کہا۔ ”اب مجھے آپ کی شکایت نہیں ملنی چاہیے۔“ اس نے ایک نظر ماں پر ڈالی اور خاموشی سے ونڈا سکرین سے باہر دیکھا رہا۔

”اوکے“ اللہ حافظ۔“ انہوں نے دروازہ بند کیا تو اس نے گاڑی اشارت کی۔ وہ خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی جب گاڑی رکنے پر چونکی۔ حیرت سے ایک کو دیکھا جو بہت سکون سے اس کی طرف متوجہ تھا۔ ”اگر اجازت ہو تو کچھ باتیں کرنی ہیں آپ سے۔“

”کون سی باتیں؟“ اس کا لہجہ تلخ تھا۔ وہ مسکرا دیا۔ ”میں نے جب فرسٹ ٹائم آپ کو دیکھا تو آپ مجھے بہت اچھی لگیں، لو ان فرسٹ سائٹ والا معاملہ تھا۔ دن بہ دن میں اور سے اور آپ کی محبت میں مبتلا ہونے لگا بہت جلد مجھے احساس ہوا کہ معاملہ یکطرفہ نہیں ہے، میں خواجواہ کے اظہار محبت سے آپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا تھا۔ ماں سے بات کر کے، انہیں آپ سے ملواؤں گا اور تھروپر اپر آپ کو حاصل کروں گا، ماں سے بات کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی اور بولی کی شادی میں سب ہی آپ کے دیوانے ہو گئے، اس کی شادی کے دوسرے دن ان سب نے مل کر میرا وہ ریکارڈ لگایا کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔“

آپ کی آنٹی اور سمانہ نے بھی سب محسوس کر لیا تھا۔ وہ کئی بار مجھ سے ملیں اور آپ کی بے راہ روی کے قصے سنائے کہ آپ کی بہت سے لڑکوں کے ساتھ فرینڈ شپ ہے، ان کے بھالی عرصہ کے ساتھ تو معاملہ بہت آگے بڑھا ہوا ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے ان کی باتوں پر یقین آنے لگا۔ میں نے غصے سے، آپ کو اذیت دینے کے لیے سمانہ سے انکیپنجنٹ کی تھی ورنہ مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں ان دنوں بہت زیادہ

ڈسٹرب تھا یہ دکھ کہ میں نے دل کی گہرائیوں سے جسے چاہا، وہ ایسی کیریکٹریس لڑکی تھی۔ مجھے چین نہیں لینے دیتا تھا۔ جب آپ کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تو عرصہ سمانہ کو ساتھ لے کر میرے پاس آیا۔ اس نے سب کچھ بتا دیا۔ سمانہ بھی بہت رو رہی تھی۔ اسے آپ کی کنڈیشن سے بہت دکھ پہنچا تھا۔ وہ اپنے کیے پر بہت شرمندہ تھی۔ اسی نے ماں کو بھی کلیئر کیا ورنہ وہ مجھ سے بہت زیادہ ناراض تھیں، اتنی کہ میں نے پہلے کبھی انہیں کسی سے بھی ایسے ناراض ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ ”ہانیہ ساکت بیٹھی تھی۔“

”سمانہ نے میرے متعلق یہ سب کہا، کیوں، میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟“ اس کے دماغ میں زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ اب اسے ایک کے بل بل بدلتے رہیے اور عرصہ کے متعلق طنزیہ باتوں کی سمجھ آرہی تھی۔ اس نے سر سیٹ کی بیک سے نکا دیا۔ کتنے ہی آنسو اس کے گل بھگور رہے تھے۔ اسے پتا ہی نہیں تھا۔ وہ تو جب ایک نے ٹشو سے اس کے آنسو صاف کرنے چاہے تو وہ ہوش میں آئی۔ اس کے ہاتھ سے ٹشو لے کر اس نے خود اپنا چہرہ صاف کیا۔

”میرا خیال ہے، مجھے آپ کو یہ سب نہیں بتانا چاہیے تھا۔“

”نہیں اچھا کیا آپ نے بتا دیا۔ ورنہ میں تو ساری عمر یہ معجزہ حل نہ کہانی کہ آپ کے یکا یک بدلنے کی وجہ کیا تھی؟“

”اچھا یعنی ٹینشن تھی میرے بدلنے کی۔“ وہ شرارت سے بولا۔ ”جو اب“ ہانیہ نے اسے باقاعدہ گھورا تھا۔ ایک نے مسکراتے ہوئے کانوں کی لووں کو چھوا۔ وہ بھی ہنس پڑی تھی۔

”اب تو دوستی ہے نا؟“ ایک نے ہاتھ بڑھایا۔ ہانیہ نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ وہ سمجھ کر ہنس پڑا۔

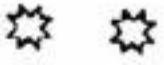
”نام کو بتاؤں نا کہ آپ کی ناراضی ختم ہو گئی ہے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ یہ لاسٹ چانس ہے اگر آپ آج ہانیہ کو نہ مناسکے تو پھر ہمیشہ کے لیے اسے کھودیں گے

کی رنگت دیکھ کر ایک کے حلق سے بے اختیار تہقہ برآمد ہوا تھا۔ ہانیہ نے اسے کبھی اتنا کھل کر ہنستے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہنستے ہوئے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اسے محویت سے اپنی طرف دیکھتے پا کر اس نے شرارت سے بائیں آنکھ دیاہی۔ وہ گڑبڑائی۔

”مجھے دیر ہو رہی ہے، پلیز مجھے چھوڑ آئیں۔“
 ”آپ کو چھوڑنے کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ اس نے ہانیہ کو اپنے ساتھ لگایا۔

”سنیں، میرے دل کی ہر دھڑکن ہانیہ، ہانیہ پکار رہی ہے، کان لگا کر سنیں۔“ ایک نے اس کا سراپے سینے سے لگا کر اس پر اپنی ٹھوڑی ٹکا دی اور دھیرے سے گنگنایا۔

ہانیہ نے سکون سے آنکھیں موند لی تھیں، محبت کا آئینہ جو بدگمانی کی دھول نے دھندلا دیا اب صاف ہو کر کتنے خوب صورت منظر دکھا رہا تھا، آنکھیں سہانے خواب بن رہی تھیں، محبت کی شاہراہ پر ان دونوں کی زندگی کی گاڑی اب بہت رواں رہنی تھی۔ اس کا دونوں کو ہی یقین تھا۔



اور میں آپ کو کھو نہیں سکتا تھا۔“ وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ ”اور میں آپ کا بہت تھینک فل ہوں کہ آپ نے مجھے اس شرمندگی سے بچا لیا جو سب کے سامنے اہکسکیوز کرنے سے مجھے ہوتی، میں تو یہ سوچ کر بھی سینے میں ڈوب جاتا تھا۔“ اس نے جھرجھری سی لہ۔
 ”میں آپ کو شرمندہ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”تو پھر اتنی ناراض کیوں تھیں؟“
 ”جو کچھ آپ نے کیا اس پر مجھے ناراض بھی نہیں ہونا چاہیے تھا؟“ اس نے ناراضی سے اسے دیکھا۔
 ”حالاتنگہ میں نے کیا کیا تھا؟“ وہ اتنی معصومیت سے بولا کہ ہانیہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی تھیں۔ یہ اچانک کیسی قلابازی کھائی تھی اس نے۔
 ”پیار ہی تو کیا تھا آپ کو اور میرا تو پھر سے وہ سب کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔“

وہ سرگوشی میں کہتا اس کے قریب ہوا۔ اس بار ہانیہ نے اسے دونوں ہاتھوں سے پیچھے دھکا دیا تھا اور تیزی سے مڑ کر دروازہ کھولنے لگی۔ ایک نے اس کا بازو پکڑ کر واپس کھینچ لیا۔ وہ جس طرح ہنس رہا تھا۔ ہانیہ سمجھ گئی کہ وہ شرارت کر رہا تھا، اس کے اڑتے ہوئے حواس واپس آنے لگے۔ ایک نے اسے پیچ مچ ڈرا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تلچ رہی تھی۔
 ”مام کو بیجوں پر پوزل کے لیے؟“ وہ خاموش ہی رہی۔

”اچھو سلی میں چاہتا ہوں اب کسی غلط فہمی کے امکان کو ختم کرنے کے لیے آپ کو اپنے پاس لے آوں اور دوسری بات یہ کہ۔“ وہ ہلکے سے کھنکارا۔
 ”جس چیز کا زائقہ معلوم نہ ہو اس کے بغیر تو گزارا ہو جاتا ہے، لیکن جس کے ذائقے کو چکھ لیا جائے اس کے بغیر رہنا بہت مشکل ہے۔“

ہانیہ نے حیرت سے اس کا فلسفہ سنا۔ تا سبھی سے اسے دیکھا تو وہ بہت معنی خیز انداز میں مسکرایا تھا۔
 اس کی بات اب ہانیہ کی سمجھ میں آئی تھی۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹی اور دروازے کے ساتھ لگ گئی۔ اس

خواتین ڈائجسٹ
 کاٹھن کے لیے

دل کی بات

سائزہ رضا

قیمت - 300 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
 37، اردو پبلشرز، 32735021

ماہنامہ کرن 221 اکتوبر 2015

میں ہوں کا

سینٹل تھے۔ سال دو سال میں ایک چکر لگاتے بہت ساری مجبوریاں بتاتے ڈھیر سارا پار حتماتے اور پھر چلے جاتے۔ اب تو ان کے بغیر رہنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔ خدیجہ آیا اور وقار صاحب یہیں رہتے تھے۔ خاندان والے چکر لگاتے رہتے تھے خیریت معلوم کرنے کے لیے۔ صفیہ بھی ان ہی میں سے ایک تھی گھر قریب ہونے کی وجہ سے وہ روز ہی چکر لگاتی تھی اور چھوٹے بڑے کئی کام نمٹا کے جاتی۔

صفیہ ان کی نند کی بیٹی تھی بہت سا دل اور پر خلوص۔ چھبیس برس کی ہو چکی تھی۔ ابھی تک ہمیں رشتہ طے نہیں ہوا تھا اس سے چھوٹی بہنیں کب کی گھربار کی ہو چکی تھیں۔ ایسا نہیں تھا کہ اس کے رشتے نہیں آئے تھے، لیکن خدا جانے ہر بار ایسا کیا ہوتا کہ رشتہ ہوتے ہوتے رہ جاتا۔ رضیہ بھابھی نے تو صاف کہہ دیا تھا۔

”صفیہ تیرے رشتے میں کسی نے بندش کرا دی ہے اس لیے کہیں بات نہیں بنتی۔“ بات کیوں نہیں بنتی تھی اور یہ بندش کیسی تھی۔ سب ہی کو معلوم تھا سوائے صفیہ کے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ سکھڑ تھی اور یہی بات اس کی بد قسمتی بن گئی تھی۔ ہر چیز قرینے سے رکھی سارا گھر دھودھلا کے رکھتی۔

”ہائے صفیہ تمہارا گھر تو ایسے لشکارے مار رہا ہے جیسے ابھی بنوایا ہو۔“ مدحت اس کی خالہ کی ہونے سزاہتی نظروں سے گھر کو دیکھا۔

”لا تمیں آبا جی میں کر دیتی ہوں۔“ صفیہ نے خدیجہ کے ہاتھ سے چاول کی پرات لے لی۔
”ارے رہنے دو صفیہ میں کر لوں گی ابھی تو تم آئی ہو۔ کرتی رہنا کام بھی۔“ خدیجہ شرمندہ ہو کر کہنے لگیں۔

”لو بھلا ابھی کرنا یا بعد میں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سچ پوچھیں تو آپا مجھ سے فارغ بیٹھا نہیں جاتا۔“ صفیہ چاول چنتے ہوئے فخر سے بتانے لگی۔

”یہ تو بہت اچھا ہے صفیہ تم خوش نصیب ہو جو کام کرنا مشکل نہیں لگتا اور پھر تمہاری اسپنڈ بھی اچھی ہے جو کام میں ایک گھنٹے میں کروں گی ہم جھٹ پٹ کر لیتی ہو۔ میں تو وقار سے بھی کہتی ہوں۔ اپنی صفیہ جس گھر میں جائے گی اس کی قسمت کھل جائے گی۔“ خدیجہ کی تعریف سے صفیہ پھولی نہیں سار ہی تھی۔

”یہ لیں آبا جی چاول صاف کر کے میں نے چڑھا بھی دیے ہیں اور کوئی کام تو نہیں۔“ صفیہ دوپٹے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولی۔

”ارے نہیں بس چاول ہی پکانے رہتے تھے۔ باقی سالن تو میں نے دوپہر کا ہی پچا کے رکھا تھا وہ ہی گرم کر لوں گی۔ قیمہ بنایا تھا آج دوپہر کو ویسے کاویا رکھا ہے یہاں ہوتا ہی کون ہے کھانے والا ہم دو ہی تو میاں بیوی ہیں بچے تو اپنے اپنے روزگار سے لگے پردیس چلے گئے۔“ خدیجہ بچوں کو یاد کر کے اداس ہو گئیں۔

ان کے دو بیٹے ایک سعودیہ اور ایک دہلی میں نوکری کرتے تھے اور اپنے بل بچوں کے ساتھ وہیں

کہاں۔ بہت سارے صفیہ سارا دن خود کو ہلکان کے
 رکھتی ہے، دوسروں کے مسکھ کی خاطر۔ ”مدحت نے
 بظاہر ہمدردی جتاتے ہوئے چوٹ کی۔
 ”ارے نہیں نہیں بھابھی میں تو خود ہی کچھ نہ کچھ
 کرتی رہتی ہوں اپنی مرضی سے، مجھے ہاتھ پے ہاتھ
 دھر کے بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔ جانے لوگ کیسے بیٹھ
 جاتے ہیں مجھے تو الجھن ہونے لگتی ہے۔“ صفیہ اس
 خیال سے کہ گھر میں کسی کو برا نہ لگ جائے الٹا
 صفائیاں دینے لگی۔ مدحت نے ترحم بھری نظروں سے

”ہاں تو کیوں تانگے سارا دن جان کھپاتی ہے۔ وہ دل
 چین سے نہیں بیٹھتی۔ آج کل ایسی لڑکیاں کہاں ملتی
 ہیں۔ سارا دن چارپائیاں توڑتے رہنے سے تو گھر صاف
 ہونے سے رہا۔“ خالہ نے لگے ہاتھوں بہو کو بھی سنا
 ڈالی اور صفیہ کو مزید پانی پہ چڑھایا۔ مدحت سمجھ تو خوب
 گئی ساس کا اشارہ کس طرف ہے، لیکن خون کا گھونٹ
 بھر کے رہ گئی پرانے گھر میں کھل کے بول نہیں سکتی
 تھی سب بات منٹوں میں پورے محلے میں پھیل جاتی۔
 ”ہاں لہلہ! واقعی آج کل کے دور میں ایسی لڑکیاں



رفیعہ جب یہ فارغ ہوگی تو میں خود توقیر کو بلوالوں
گی۔ فی الحال چند دن کھرجاؤ۔“ سلمیٰ نے گویا ہری
جھنڈی دکھائی۔

رفیعہ بہن کی بات سے بد مزہ ہو گئیں اور پلیٹ سے
پکوڑا اٹھا کے خفگی سے بولیں۔

”چھاپتا ہونا پھر۔“ ان کے بچھے بچھے چہرے کو دیکھ کر
صفیہ خود کو مجرم سمجھنے لگی۔



”صفیہ یار پرسوں میلاد ہے اور میں نے ابھی تک
کوئی تیاری نہیں کی۔ ٹائم اتنا کم ہے اور کام بہت زیادہ
سو کے قریب لوگ ہوں گے میں تو سچ مچ میں بوکھلا کے
رہ گئیں ہوں کیسے ہو گا سب؟“ عفت ’تایا کی بہو فون
پے میلاد کی دعوت دینے کے بعد اپنی پریشانی شہر
کرنے لگی تو صفیہ کا دل ہمدردی سے لبریز ہو گیا۔

”ارے بھابھی یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔ کر لیں گے
مل جل کے یہ کوئی پہلی دعوت تو نہیں خاندان میں ایسی
کتنی ہی تقریبات تن تہا بگٹا چکی ہوں۔ آپ بے فکر
ہو جائیں میں سنبھال لوں گی۔“

”صفیہ تمہاری یہی بات مجھے اچھی لگتی ہے۔ میری
آدھی سے زیادہ فکر تم نے کم کر دی۔ میرے تو سوچ
سوچ کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے کہ کیسے ہو گا یہ
سب پھر عاطف نے ہی مجھے کہا کہ صفیہ ہے نا وہ مدد
کرے گی تمہاری۔ آج کل کے دور میں اپنی سگی
نندوں سے بھی مجھے مدد کا آسرا نہیں تھا۔ اگر تم نا
ہو تیں تو میں یہ سب کچھ کبھی نا کہ پاتی۔“ الفاظ تھے یا
تہنغے جو صفیہ کو پے در پے اپنے شانوں بے سختے محسوس
ہوئے۔ وہ ہواؤں میں اڑنے لگی۔ لوگ کتنا مجھے

چاہتے ہیں کتنی قدر کرتے ہیں۔ وہیں میلاد میں جب
وہ منتظم بنی ادھر سے ادھر سب کو سروس دیتی پھر رہی
تھی۔ اور کھانے کے قہل بھر بھر کے ڈشوں میں الٹ
رہی تھی۔ میمونہ بیگم نے اسے اپنے بیٹے کے لیے
پسند کر لیا۔ صفیہ اس بات سے بے خبر تھی میمونہ بیگم
عفت کی ممالی کیوں بار بار اس سے ہم کلام ہونے کی

اسے دیکھا کاش سکھڑاپے کے ساتھ تھوڑی عقل بھی
ہوتی تو کب کی اپنے گھر کی ہو چکی ہوتی۔ صفیہ نے
چائے کے ساتھ پکوڑے اور وہی بھلے بھی بنائے تھے
ساتھ میں بیسن کا گرم گرم حلوا بھی تھا خالہ تو نمل ہی
ہو گئیں۔

”میری بچی اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے۔ سچ
بتاؤں سلمیٰ میرا اگر توقیر کے علاوہ دوسرا کوئی بیٹا ہوتا تو
میں صفیہ کو اس کی دلہن بناتی۔“ رضیہ خالہ نے
حسرت سے کہا۔ اتنا تو سب ہی سمجھ چکے تھے کہ اگر توقیر
کے علاوہ ان کے چار اور بیٹے بھی ہوتے تو وہ قبول
صورت سفید پوش صفیہ کو کبھی بہو نہ بناتیں۔ وہ ہمیشہ
پیسہ اور حیثیت دونوں دیکھ کر بہو ڈھونڈتی تھیں۔
ورنہ جوڑ تو توقیر کے ساتھ بھی اس کا خوب بننا۔ سلمیٰ
نے بہن کی بات پر بد مزہ ہو کر پہلو بدلا۔

”بس بہن یہ تو قسمت کے کھیل ہیں جس کا جہاں
نصیب لکھا ہو گا وہیں رشتہ ہو گا۔ نکل جتو اور والے کے
پاس طے ہوتے ہیں۔“ سلمیٰ نے مفاہمتی انداز میں
بات کو سمیٹا۔

رفیعہ کو اچانک کچھ یاد آیا وہ چائے کا برسا گھونٹ
نگل کے جو بولیں۔

”اے لومیں تو بھول ہی گئی۔ صفیہ بیٹی تم کل شام
تک فارغ ہو کر مجھے کل کرنا میں توقیر کو بھیجوں گی
تمہیں لینے کے لیے۔ تھوڑا سلائی کا کام رہتا ہے وہ
مجھے پورا کر کے دو مجھے تو اب سوئی میں دھاگہ ڈالنا
مشکل ہو رہا ہے۔ نظر کی کمزوری کی وجہ سے۔ کتنے
دنوں سے لحافوں کے کور بنانے کے لیے کپڑا لا کر رکھا
ہے وہ ہی سی کے دینے ہیں۔“ رفیعہ خالہ شکر گھلے لہجے
میں بولیں تو صفیہ انکار نہ کر پائی۔

”چھا خالہ میں سی دوں گی۔ آپ بھیجے گا کل توقیر
بھائی کو۔“ سلمیٰ بیٹی کے اس سیدھے پن سے عاجز
آچکی تھیں۔

”ارے کل کیسے جاؤ گی تمہارے آسرے سارے
بستر کھلوائے ہیں دھوپ دینی ہے۔“ تکیے کھول کے
روٹی دھکنی ہے۔ پتا نہیں کتنے دن لگیں۔



کہتے ہیں جو دن نکاح کا لکھا ہوا سے کوئی نہیں ٹال سکتا۔ سمیر کے رشتے میں گھر بھرنے جتنے کیڑے نکالنے تھے خوب نکالے۔ کسی کو وہ عمر میں زیادہ لگا تھا۔ کسی کو بولنے میں تلخ۔ حالانکہ وہ ذرا اسٹریٹ فارورڈ تھا، جو بات ہوتی صاف صاف کرتا۔ لگی لپٹی رکھنے والا نہیں تھا اور سات آٹھ سال کا فرق کچھ خاص بھی نہیں تھا۔ لیکن مفت کی سہولت کون اٹھا کے دوسرے کی جھولی میں ڈالنا چاہے گا۔ بھابھیوں نے جو جو روڑے اٹکانے تھے وہ اٹکانے غصے کی تیز ہے، گھنی ہے، لیکن سب بے کار گیا۔ میمونہ بیگم بھی اپنے نام کی ایک تھیں۔ انہوں نے جو ہیرا تلاش کیا تھا اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھیں۔ لڑکی والوں نے جو اعتراض کیے سب پورے کیے۔ جہانگیرہ خاتون تھیں خوب سمجھتی تھیں سب کی چالیں۔ گھر بھر کو مفت کی نوکرائی ملی ہوئی تھی کوئی بھی اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔

دکھ تو اس بات کا تھا کہ سگی ماں کو بھی اپنے بڑھاپے کی فکر تھی۔ صفیہ کے بعد ان کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ کھانا کھلانا منسلانا دھلانا سب صفیہ کرتی تھی بھابھیوں کو تو ابھی سے ہول اٹھ رہے تھے پتا نہیں ساس کس کے حصے میں آئیں گی۔

سارا گھر ان دنوں بھانت بھانت کے مشوروں کا گڑھ بن چکا تھا۔ کوئی کسی کی بات سے متفق نہیں ہو پا رہا تھا۔ میمونہ بیگم نے بھی چوکھٹ پکڑ لی۔ تھک ہار کے سب کو ہتھیار پھینکنے پڑے اور یوں صفیہ، صفیہ سمیرون گئی۔



آج اس کی شادی کا ساتواں دن تھا۔ حمیرا اس کی جٹھانی پھلی سامنے رکھے کھڑی برے برے منہ بنا رہی تھی۔ صفیہ کچن میں چائے کا کپ رکھنے آئی تو چونک کر پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا بھابھی ریشان لگ رہی ہیں۔“ حمیرا نے

کوشش کر رہی تھیں مارے خلوص کے ان کو اپنے ہاں آنے کی دعوت بھی دے آئی۔

بہت ذمہ داری سے اور بھرپور طریقے سے اس نے میلاد کی پوری تقریب نمٹائی تھی۔ تھکن سے اس کا بدن چور چور ہو رہا تھا لیکن چہرے بے سجدی مسکراہٹ ایک لمحے کو ہونٹوں سے الگ نا ہو پائی تھی۔ مہمان چلے گئے وہ عفت بھابھی کے ساتھ بیٹھی آج کی تقریب کو ڈسکس کر رہی تھی۔ جب عاطف اندر آیا۔ ”بہت تھک گیا یار آج مہمانوں کو نمٹاتے نمٹاتے“ اس نے زور سے انگڑائی لی اور صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

”میرا تو سرد رکھ رہا ہے بول بول کے مسلسل اتنے لوگوں کو ڈیل کرنا آسان نہیں ہے۔“ عفت نے اپنی ناسازی طبیعت کا اعلان کرتے ہوئے عاطف کو کسی بھی مزید فرمائش سے روکا۔ بیوی تھی خوب جانتی تھی آگے کیا کہا جانے والا ہے۔ دوسری طرف صفیہ تھی پوری تقریب تن تماشوں پے اٹھائے رہی پورا دن اور اب بھی بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ اسے اچھا نہیں لگتا تھا او ویلا مچانا۔ تھکن تو سب کو ہوتی ہے کام کرنے سے یہ اولیٰ۔ آ۔ اوجھ۔ کیا ہوتا ہے وہ نہیں جانتی تھی اور اس بے خبری کا نتیجہ اسے اگلے پل ہی مل گیا عفت اور عاطف دونوں کی نظروں میں ابھی وہ تازہ دم تھی یا پھر وہ جان بوجھ کر آنکھیں چرا رہے تھے۔ مل مفت دل بے

رحم۔

”صفیہ یار چائے پلاؤ میرا تو سرد رو سے لگتا ہے پھٹ جائے گا۔“ عفت کنپٹیوں کو دباتے ہوئے بولی۔ ”جیو بیگم جیتی رہو میرا بھی یہی دل چاہ رہا تھا۔“ کام کوئی اور کرے اپر سیشن ملے کسی اور کو یہی دستور زمانہ تھا۔ عفت نے مسکرا کے شوہر کو دیکھا۔

”اچھا میں بنا دیتی ہوں۔“ سدا کی مور کی صفیہ کمر کس کے کھڑی ہو گئی حالانکہ تھکن سے اس کا بھی برا حال تھا۔

”سنو صفیہ تھوڑا گاجر کا طوہ بھی گرم کر کے لے آنا۔“ عاطف نے پیچھے سے آواز لگائی۔

ایک نظر اس پے ڈالی اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔
 ”کیا بتاؤں صفیہ تم تو ابھی نئی آئی ہو آہستہ آہستہ
 ماحول کو سمجھنے لگو گی۔ پتا نہیں امی کو مجھ سے کیا پیر ہے
 ہزار مرتبہ کہا ہے مجھ سے پچھلی صاف نہیں ہوتی
 الٹی آنے لگتی ہے اس کی بوسونگھ کے۔ لیکن نہیں ان
 کو تو مجھے نچا دکھانے کا شوق ہے۔ ہر دو سرے تیسرے
 دن پچھلی منگوا لیتی ہیں۔ کب سے ایسے کھڑی ہوں
 ہمت ہی نہیں ہو رہی ہاتھ ڈالنے کی۔“ حمیرا بے چارگی
 سے بولیں۔

”ارے اتنی سی بات کو لے کر اتنا پریشان کھڑی
 ہیں۔ لائیں میں صاف کر دیتی ہوں۔“ صفیہ آستین
 چڑھا کے آگے آئی۔

”ارے تمہیں نہیں سمیر بھائی نے دیکھ لیا تو خیر
 نہیں بہت سنا میں گے پھر۔ اور اچھا بھی نہیں لگتا
 ابھی تمہاری شادی کو ٹائم ہی کتنا ہوا ہے۔“ حمیرا سما
 منع کرنا نہیں بھولی تھی مبادا کسی نے دیکھ لیا تو یہ تو کہہ
 سکے گی کہ میرے منع کرنے کے بعد بھی نہیں مانی۔

”کچھ فرق نہیں بڑتا شادی نئی پرانی ہونے سے اور
 سمیر کو پتا بھی نہیں لگے گا اس بات کلا۔“ صفیہ دھودھو
 کر پیس دو سرے برتن میں رکھنے لگی۔

”پتا تو خوب لگے گا دلہن رانی جب اسے تم سے کچی
 پچھلی کی بو آئے گی ہائے بے چارا۔“ کھی کھی کھی۔ حمیرا
 دل ہی دل میں ہنسنے لگی۔



صفیہ بیٹی آج شازیہ کو دیکھنے کچھ لوگ آرہے ہیں
 تم ایسا کرنا دھوپ کے کھانے میں کوفتے بریانی کباب اور
 نہاری بنا لیتا۔ نان باہر سے منگوا لیتا ہاں سلاڈ راتہ
 ضرور ہونا چاہیے ورنہ دعوت ادھوری سی لگتی ہے۔
 حمیرا کو بھی میں نے کہہ دیا ہے۔ کام آپس میں بانٹ لو۔
 دو چیزیں تم بناؤ دو حمیرا بنا دے گی۔“ ساس کی بات پے
 سرہلائی وہ حمیرا بھابھی کے کمرے میں آگئی۔ حمیرا سر
 تک کبل لیے بیٹھی تھی۔ صفیہ کو دیکھتے ہی بولی۔
 ”ہائے کب سے دعائیں کر رہی تھی کوئی کمرے

میں آئے لیکن کسی نے جھانک کر بھی نہیں دیکھا کہ مر
 گئی ہوں یا زندہ ہوں۔ شکر ہے پھر بھی تمہیں تو خیال
 آیا۔“ صفیہ جو ہاتھ بٹانے کا کہنے آئی تھی ہکا بکا ہو گئی۔
 ”ارے آپ کو کیا ہوا بھابھی طبیعت تو ٹھیک ہے نا
 ایسے کیوں لیٹی ہیں۔“ صفیہ فکر مندی سے بولی۔

”صبح سے لی پی لو ہو رہا ہے چکر سے آرہے ہیں۔
 شہباز کو کہا بھی کہ آفس مت جاؤ کہنے لگے گھر میں
 اماں اور صفیہ بھابھی ہیں نا تمہارا خیال رکھنے کے
 لیے۔ میں آفس سے چھٹی نہیں کر سکتا۔“

”ہاں تو ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے میں ہوں نا اور
 آپ نے مجھے بتایا تک نہیں۔ اب بھی اگر میں خود
 سے نا آئی تو کبھی پتا نہ چلتا۔“ صفیہ کی زبان پے
 اپنائیت بھرا شکوہ آگیا۔

”اس حالت میں مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا سیڑھیاں
 اتر کر نیچے تک کیسے آئی۔ تم پلیز مجھے نمکول بنا کے
 دے دو عجیب گھبراہٹ ہو رہی ہے۔“ صفیہ سر ہلا کر
 واپس آگئی جو کام کہنے گئی تھی وہ کہنے کی ہمت ہی نا ہوئی

بھلا ایسی حالت میں وہ کیسے ہاتھ بٹاتیں۔ حمیرا کو نمکول
 دے کر وہ کچن میں واپس آئی اور کمر کس کے دعوت
 کے کھانے بنانے میں جت گئی۔ سمیر دو بار بلانے آیا تھا
 لیکن اسے اس بری طرح کام میں الجھا دیکھ کر واپس
 پلٹ جاتا۔ تیسری بار وہ کافی غصے میں لگ رہا تھا۔

”کب سے تمہیں بلارہا ہوں تم آ کیوں نہیں
 رہیں۔“

”سمیر آپ دیکھو تو رہے ہیں کتنا کام ہے۔ مہمان
 پہنچنے والے ہوں گے اور میں نے ابھی ادھا کام بھی
 نہیں نمٹایا نا ہی تیار ہوئی ہوں۔“ وہ بے چارگی سے
 بولی۔

”اتنا کچھ بنانے کی ضرورت کیا تھی دو چیزیں
 پکالیتیں۔“

”چھا نہیں لگتا سمیر! شازیہ کے سسرال والے ہیں
 کل کو خدا نا خواستہ۔“ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے
 ہی سمیر نے بیچ میں اچکل۔

”تو شازیہ کو دھیان کرنا چاہیے تھا وہ خود پکاتی۔ تم

”اچھا۔“ مختصر سا جواب دے کر وہ اپنے کام میں لگی رہی۔ حمیرا نے اس کی خاموشی کو محسوس کیا تو خود ہی بول پڑی۔

”میرا تو کمرے سے نکلنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ پھر سوچا، شازیہ کی سرال کا معاملہ ہے لوگ باتیں گھڑتے ہیں، اسی لیے منہ پے دو چار پھینٹے مار کے کپڑے بدل لیے، ایسے تو اٹھ کے نہیں آسکتی تھی نا۔“ حمیرا کے صفائی دینے پہ صفیہ شرمندہ ہوئی۔ حقیقت کیا تھی اور وہ خواہ مخواہ غلط فہمی پالے بیٹھے تھی۔ ”آپ چل کر بیٹھیں میں لے آئی ہوں چائے۔“ صفیہ خود کو لعن طعن کرتی چائے کپوں میں اٹڈیلنے لگی۔



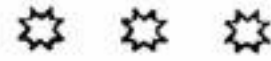
کل سے اسے تیز بخار تھا تکلیف کی وجہ سے ہلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ میر نے سختی سے اسے اٹھنے سے منع کیا تھا۔ دوپہر کے تین بج چکے تھے کسی نے کھانا بنانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ دوپہر کا کھانا صفیہ ہی بناتی تھی۔ وہ بیمار تھی تو سب کو ڈر تھا کہیں انہیں ہی بنا کر پڑے۔ شازیہ تو کمرے سے باہر ہی نہیں آئی تھی۔ امی

کیا باور چن گئی ہو اس کی۔ ہر کام پے کمر کس لیتی ہو۔ اور حمیرا بجا بھی کہیں ہیں۔“ میر کسی سے ڈرنے والا نہیں تھا لہذا اس سے کتراتے تھے۔

”آہستہ بولیں کوئی سن لے گا۔ حمیرا بجا بھی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی میں نے ان سے کتنا مناسب نا سمجھا۔“ وہ دھیمی آواز میں بولی۔

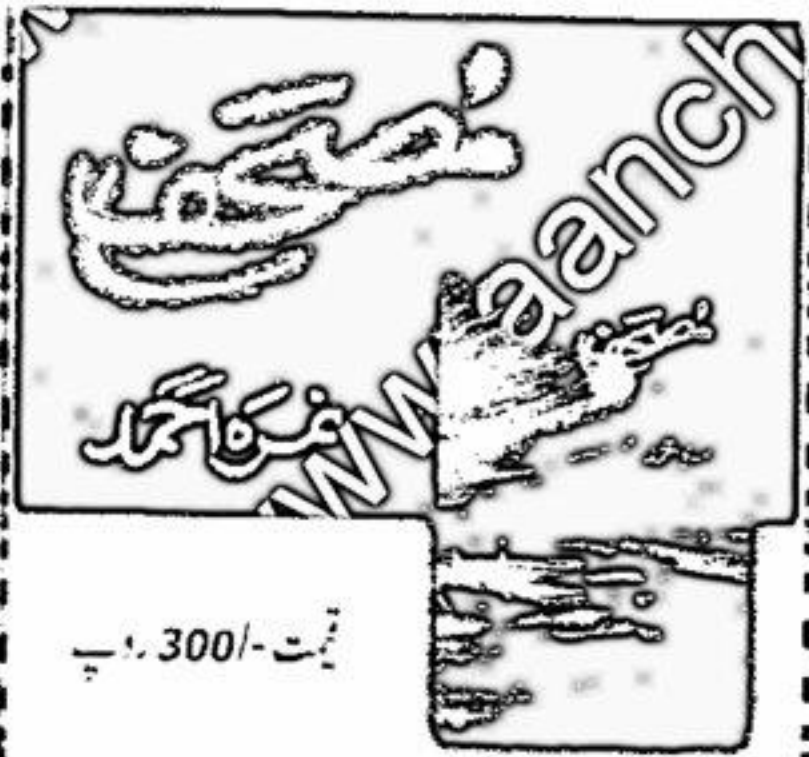
”حمیرا کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ شازیہ کی سرال والے آرہے ہیں، وہ کیسے کام کرے۔ امی بوڑھی ہیں ان کو نہیں کہہ سکتی۔ سچ تو یہ ہے صفیہ تمہیں سب کا خیال ہے سوائے اپنے، یہاں سب عقل مند ہیں ماسوائے تمہارے ایسے ہی تو امی تمہیں ڈھونڈ کے نہیں لائیں۔ خود کو سنبھالو صفیہ ورنہ دنیا والے تمہیں روند کے چلے جائیں گے۔ ابھی دیکھنا تھوڑی دیر تک حمیرا بجا بھی تیار ہو کر آجائیں گی۔ بیماری کا بہانہ بنا رہی ہیں وہ۔ میں پچھلے کئی سال سے جانتا ہوں انہیں، تم جی دیکھ لیتا۔“ میر کا بس نہیں چل رہا تھا کیسے اس کم عقل لڑکی کو سمجھائے۔

”اچھا اب بس کر دیں۔“ وہ عاجز آگئی۔ میر پیر پختا واپس چلا گیا صفیہ سر جھٹک کر کام میں لگ گئی۔ اس وقت اس کے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔



مہمانوں کے آنے کے بعد حمیرا تیار ہو کر ان کے ساتھ بیٹھ گئی اسے دیکھ کر کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ بیمار سے البتہ صفیہ کے چہرے بے چہکن واضح تھی جسے وہ مسکراہٹ کے پیچھے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ صفیہ کو حیرت تو بہت ہوئی، لیکن چپ رہی میر کی کسی گئی باتیں اس کے دماغ میں چکرانے لگیں۔ مہمانوں کے جانے کے بعد وہ اپنے لیے اور میر کے لیے چائے بنانے لگی جب حمیرا وہاں پہنچی۔

”اچھا تو نہیں لگ رہا تمہیں کہتے ہوئے تم بہت تھکی ہوئی ہوگی لیکن کیا کروں طبیعت ابھی تک سیٹ نہیں ہے۔ اگر ایک کپ چائے مل جائے تو۔“ وہ صفیہ ہی کیا جو انکار کر دے۔



قیمت - 300/- روپے

مصنفانہ کا ہند

مرکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر:
32735021

37، اردو بازار، راولپنڈی

|| 2270 کورن اکتوبر 2015 ||

نے چائے میں ڈبل روٹی بھگو کے کھلی حمیرا کو بچوں کی وجہ سے آنا پڑا۔ چار انڈے فراہمی کیے ڈبل روٹی ملی اور کمرے میں گھس گئی۔ اسے تو جیسے سب بھول ہی گئے تھے۔ بخار کچھ کم ہوا تو شدید بھوک کا احساس ہوا۔ نقاہت سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ اس نے شازیہ کو فون کیا وہ دوسری لائن پرے مصروف تھی پھر حمیرا کا نمبر ڈائل کیا، نکل ہوئی رہی کسی نے اٹینڈ نہیں کیا۔ مجبوراً اسے اٹھنا پڑا۔

”ارے صفیہ بھابھی آؤ۔ آؤ اب کیسی طبیعت ہے۔“ حمیرا کا لہجہ شدت گھلا ہوا تھا۔

”اب بہتر ہوں بخار اتر گیا ہے۔ نقاہت باقی ہے۔“ حمیرا نے سر ہلادیا۔

”نکل سے کچھ کھانے کو دل نہیں کر رہا تھا اب زور کی بھوک لگی ہے۔ آپ کو اس لیے فون کر رہی تھی کچھ کھانے کو ہے تو دے دیں۔“ وہ تڑھل ہونے لگی۔

”آں۔ ہاں۔ فون تو شاید سائنلٹ پے لگا ہو گا۔ اسی لیے آواز نہیں آئی۔“ حمیرا گڑبڑا گئی۔

”تم بسکٹ اور دودھ کھاؤ گی۔ ابھی دیتی ہوں۔ ویسے بھی بخار میں ہلکی غذا لینی چاہیے۔“ وہ اٹھ کر فریج سے دودھ نکالنے لگی۔ صفیہ انکار کرنا چاہتی تھی۔ اسے بھوک لگی تھی۔ لیکن حمیرا نے تباہ صفیہ نے بمشکل دو بسکٹ کھائے۔

”آج میرا امی کی طرف پروگرام تھا سامان بند کر دیا ہے بس شہباز کے آنے کا انتظار ہے۔ کھانا بھی وہیں ہے۔“ حمیرا ادھر ادھر الماریوں میں جھانکتی خود کو مصروف ظاہر کرنے لگی۔ کھانے کا نام سن کر اسے پھر بھوک نے آگھیرا۔

”آج دوپہر میں کیا بنا تھا۔ اسی سے کچھ لادیں میرے منہ کا ذائقہ خراب ہو رہا ہے۔“ صفیہ کو اپنی بے بسی پے رونا آ رہا تھا۔

”ہاں نہیں۔ بھابھی میں تو گئی نہیں کچن میں صبح سے یہیں مصروف ہوں۔“ حمیرا صاف مگر گئی حالانکہ

صبح سے دو تین بار کچن سے ہو کر آئی تھی۔ صفیہ مایوس ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ شازیہ کا کمرہ اندر سے لاک دیکھ کر وہ واپس جاتے ہوئے حمیرا کے کمرے کے پاس سے گزری تھی۔ اس کا فون بج رہا تھا۔ صفیہ کے چہرے پر پھلکی ہنسی پھیل گئی۔

”ہیلو۔ ہاں شکر ہے گئی مصیبت ایک تو صبح سے اس کی وجہ سے بھوکوں مر رہے ہیں اوپر سے آئی فرمائی پروگرام کرنے۔ میں نے تو ہری جھنڈی دکھادی۔ نا بھئی مجھ سے نہیں ہوتیں یہ خوشامدیوں وہ ہی کرتی پھرے سب کی۔ گھر کو سنبھالوں بچوں کو سنبھالوں۔“ صفیہ میں مزید سننے کی تاب نہیں تھی۔

حمیرا کی باتیں اب سمجھ میں آرہی تھیں۔

”اپنی آنکھوں سے سب اچھا کاروبار ہٹا کے دیکھو صفیہ، بظاہر جھوٹی تعریف سے لوگ تمہیں پوچھتے ہیں بنا رہے ہیں۔ سب اچھے دکتے ہیں کیوں کہ تم ان کی ضرورت بنی ہوئی ہو۔ جب وہ تمہاری ضرورت بنیں گے تب تم دیکھو گی کون کتنا اچھا ہے۔“ صفیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ حمیرا سیرسیرہیاں چڑھتا ابھی اوپر آیا تھا۔ صفیہ نے جلدی سے آنکھیں خشک کیں۔

”تم رو رہی ہو۔“ حمیرا نے پریشان ہو کر اس کی پیشانی کو چھوا۔

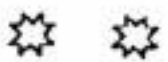
”طبیعت تو۔“

”بھوک لگی ہے بہت۔“ وہ بچوں کی طرح بے بسی سے رو پڑی۔ حمیرا کو ہنسی آگئی۔

”جی سی بات شکر ہے۔ جناب کو دو دن بعد بھوک تو لگی۔ یہ تو تمہاری پسند کارول کباب۔“ اس نے شاپر صفیہ کو تھمایا۔

”آپ کو کیسے ہوتا۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”کیوں کہ میں آپ سے زیادہ دنیا کو جانتا ہوں۔ آج یقیناً“ حمیرا بھابھی میکے جا رہی ہوں گی۔“ حمیرا نے یقین سے کہا۔ تو صفیہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔



تعمیر



غزالہ بڑی عقیدت سے وہ موم جامہ کیا ہوا سفید خوشبو میں بسا، چو کورتہ کیا کاغذ تھامے بغور اپنے سامنے بیٹھی اکلوتی نند صائمہ کو دیکھ رہی تھی۔ نہ صرف دیکھ رہی تھی بلکہ بہت توجہ سے اس کی جانب متوجہ بھی تھی۔ یوں تو نند بھانج کی آج سے قبل کوئی ایسی خاص دوستی نہ تھی مگر کہتے ہیں تاکہ وقت بڑنے پر اگر گدھے کو۔ بس فی الوقت غزالہ کے پیش نظر یہی معاملہ تھا۔ سو وہ بڑی توجہ اور فکر کے ساتھ صائمہ کی جانب متوجہ تھی۔ جو کہہ رہی تھی کہ۔

”تم لاکھ مجھے اپنا دشمن سمجھو۔ مگر میں نے ہمیشہ تمہیں بھابھی نہیں بلکہ اپنی چھوٹی بہن سمجھا ہے۔ اسی وقت کے آنے سے ڈراتی تھی تمہیں مگر تم نے میری باتوں پر ذرا کان نہ دھرے۔ خیر۔“ وہ بولتے بولتے جیسے خود پر قابو پا کر پھر بولنا شروع ہوئی۔ اس دوران غزالہ بڑی مسمی سی صورت بنا کر بیٹھی رہی۔

”یہ تعویذ میں نے بڑے جتن کر کے صرف تمہارے اصرار پر ایک اللہ والے بزرگ سے حاصل کیا ہے۔ مگر انہوں نے تعویذ کے ساتھ ساتھ دو تین عمل بھی کرنے کو سختی سے کہا ہے، وگرنہ یہ تعویذ بالکل بے اثر ثابت ہوگا۔“ اس نے ڈنڈا دیا۔

”اف اللہ۔ کیا چلہ کاٹنا ہوگا۔ یا پھر مخصوص اوقات میں کہیں جا کر کوئی دیا یا موم بتی وغیرہ جلائی پڑے گی۔ سکو نے تو ایسا ہی کچھ بتایا تھا۔“ اس نے بڑی پریشانی سے اپنی کاموالی کا ذکر کیا۔

”ایک تو تم نے عقل عورتوں کی طرح اپنے گھر اور خاوند کی باتیں سکو سے کرنا چھوڑ دو، کیا تمہیں

تعویذات کے نام پر اس سے بے وقوف بن کر بھی عقل نہیں آتی۔ ”صائمہ سخت برا فروختہ ہو گئی تو غزالہ بوکھلا کر بولی۔

”ارے نہیں باجی۔ اسے تو میں نے اس کا فراڈ سامنے آتے ہی فارغ کر دیا تھا۔ اب تو میرے ہاں فی الحال کوئی کام کرنے والی نہیں۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔ فی الحال گھر کا سارا کام تم اپنے ہاتھوں سے انجام دو۔ کیونکہ ان بزرگ کا کہنا ہے کہ

گھر کو بے انتہا صاف ستھرا رکھنا ہے۔ ذاتی صفائی ستھرائی کا بھی از حد خیال کرنا۔ پنج وقتہ نماز کا اہتمام تو لازم ہے اور ان کی خاص تاکید ہے کہ ہرگز ہرگز بھی اپنے میاں کے آگے زبان نہیں چلانی بلکہ اگر وہ کچھ برا بھلا بھی سنائے تب بھی منہ بند کر کے دل ہی دل میں لاجول پڑھنی ہے اور اس کی خدمت میں کوئی کمی نہیں اٹھا رکھنی۔ اب بھئی تم دیکھ لو۔ میں جانتی ہوں یہ سارے کام تمہارے جیسی عورت کے لیے کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، مگر بات یہ ہے کہ اگر تمہیں اپنی گھر گریہ ہستی عزیز ہے تب اتنی قربانی تو تمہیں دینی ہی پڑے گی۔“ آخر میں صائمہ بے انتہائی سے بولی۔ پہلے کا وقت ہوتا تو غزالہ اس ”تمہارے جیسی عورت“ کی اچھی طرح وضاحت مانگتی، مگر اب بات ذرا دوسری ہو گئی تھی، اسی لیے روکھے لمبے میں جلدی سے بولی۔

”نہیں باجی۔ میں آپ کی باتوں پر پورا عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔ بس آپ ناصر کو یہ بات ہرگز نہ پتا لگنے دینا کہ میں نے آپ سے تعویذ منگوا یا ہے۔ وہ پہلے ہی سکو سے تعویذات منگوانے پر مجھ سے بہت ناراض ہیں۔“ آخر میں آواز گلو گیری ہو گئی۔

”ہاں۔ ہاں۔ میں کیوں بتانے لگی، میں تو بس یہی چاہتی ہوں کہ میرے بھائی کا گھر بس جائے اور اس کی گریہ ہستی، خاندان میں تماشانہ بنے۔ اچھا اب میں چلتی ہوں، تمہارے تو قیر بھائی کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ پھر بچے بھی کوچنگ سے لوٹنے والے ہوں گے۔

میں گھر واپسی پر انہیں نہ ملوں تو انہیں اچھا نہیں لگتا۔“ وہ ایک مطمئن سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے اٹھ کھڑی ہوئی۔ غزالہ نے بطور خاص اس کے وجود سے جھلکتی آسودگی کو محسوس کیا تھا۔



غزالہ اور ناصر کی شادی خالصتاً ”ناصر اور صائمہ کی والدہ، ناہیدہ کے فیصلے کا نتیجہ تھی۔ غزالہ ان کی چھوٹی بہن شاہدہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ شاہدہ ایک چھوٹے سے

قصبے میں بیاہ کر گئی تھیں۔ اس چھوٹے سے قصبے اور وہیں کے رنگ ڈھنگ کے مطابق غزالہ کی پرورش کی گئی تھی۔ ہاں شکل صورت کی وہ بہت اچھی تھی۔ اسی لیے جب شاہدہ نے مرض الموت میں مبتلا ہو کر بڑی دل سوزی سے غزالہ کے لیے فکر مندی کا اظہار کیا تب کچھ بہن کی بگڑتی حالت اور غزالہ کی موہنی صورت کی وجہ سے ناہیدہ نے جھٹ اپنے اکلوتے نیک پڑھے لکھے برسر روزگار بیٹے کا رشتہ نہ صرف پیش کر دیا بلکہ کراچی آ کر اسے حسب روایت جذباتی واروں سے نڈھال کر کے فون پر نکاح بھی کر دیا۔ گو کہ صائمہ بھی ان کے اس فیصلے پر کچھ تالاں سی تھی، مگر وہ بھی ہاں کے آگے مجبور ہو گئی۔

یوں شاہدہ کی وفات کے بعد وہ اسے رخصت کروا کر گھر لے آئیں اور یہاں دھوم دھام سے ولیمہ کیا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ناصر بھی اس من موہنی صورت دیکھ کر رام ہو ہی گیا تھا۔ بس اس کی کچھ عادتیں تھیں، جس پر وہ معترض تھا۔ شادی کو سہ ماہی بھر ہوا تھا، جب ناہیدہ بھی دوسرے جہاں چل بسیں۔ غزالہ کو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ رہا۔ اسے کھلا میدان مل گیا اور اس کی ناپسندیدہ عادتیں پختہ ہو کر ناصر کے لیے وبال بن گئیں۔

یوں تو وہ فطرتاً ہی بری نہیں تھی، مگر اس میں ایک بڑی واضح بری عادت تھی اور وہ یہ کہ اگر اسے کوئی (اور یہ کوئی صائمہ یا ناصر کے علاوہ کون ہوتا بھلا؟) اچھی

بات سمجھانے کی کوشش کرتا، اول تو وہ منہ پھلا کر اس کے خلاف دل میں بغض پال لیتی۔ پھر رویدو پوچھتا: بحثی پر اتر آتی۔ کچھ کچھ عادیانہ "ست اور کابل بھی تھی۔ آسودگی اور فراغت نے مزید کام چور بنا ڈالا۔ کام والی آکر سارے کام کر جاتی تو ٹھیک، ورنہ ایسے ہی بڑا ریتا۔ کئی بار ناصر نے ٹوکا کہ وہ سکو کے سر پر سوار ہو کر اپنی نگرانی میں تمام کام کروایا کرے۔ وگرنہ تو وہ ویسے ہی اٹلے سیدھے ہاتھ مار کر جھاڑو سے کچرا یہاں وہاں کوٹنے کھدروں میں دھکیل کر گیلانیلا پوچھا فرش پر پھیر کر فرش مزید گندا کر کے صفائی سے فارغ ہو جاتی۔ یہ ہی حال چکن کا تھا۔ ابتری اور گندگی نے اس "امریکن چکن" کو تیسری دنیا کا کوئی پسماندہ ملک بنا رکھا تھا۔ مگر غزالہ نے تو کیا سکو کے سر پر سوار ہونا تھا۔ الناولہ اپنی عیاری اور مکاری سے اس کے حواسوں پر سوار ہو کر اسے نت نئی الٹی سیدھی پٹیاں ہمدردی کے لبادے میں لپیٹ کر پڑھانے لگی۔

"باجی جی۔ مجھے تو آپ سے سخت ہمدردی ہوتی ہے، جب آپ کی وہ گھنی مہسنی بن بن کر بولنے والی نند آکر آپ کو کھری کھری سنار ہی ہوتی ہے تب۔ تب جی باجی میرا بڑا کلیجہ سڑتا ہے۔" وہ آنکھیں مگول گول مگھا کر کہتی۔

"کھری کھری کب سنائیں مجھے باجی نے۔" غزالہ چونک اٹھی۔

"اے لکے۔" اس نے ٹھٹھا لگایا۔ "آپ تو جی جی میں بڑی معصوم سی ہو۔ وہ آپ ہی کو تو سنار ہی تھی کہ چھوٹے قصوں سے بڑے شہر میں آکر بسنے والیوں کو کیا پتا کر شہری گھر کیسے سنوارا جاتا ہے اور پھر پانی کے چاول ذرا سے نرم ہو جانے پر وہ کیسے جتا رہی تھی کہ چاول میں پانی ہمیشہ حساب سے ڈالنا چاہیے۔"

"ارے ہاں۔ ان باتوں پر تو میں نے غور نہیں کیا۔" اس نے غصے سے کہا اور پھر چھوٹی چھوٹی بے معنی باتوں کو اس نے اس زانے سے دیکھنا شروع کیا کہ صائمہ جیسی سلجھی ہوئی عورت نے بہت جلد ہی اسے نصیحت کرنے سے توبہ کر لی۔ اس کے گھر آنے

سے حتی المقدور اجتناب بھی برتنے لگی۔ ناصر الگ اس کی عادتوں سے سخت کبیدہ خاطر تھا۔ پہلے اسے پار سے سمجھانا چاہا جو کہ ظاہر ہے اس نے سمجھ کر نہ دیا۔ پھر ناراضی دکھانی چاہی۔ جو کہ غزالہ نے دیکھنے سے صاف انکار کر دیا، اس کے بعد جو ہو سکتا تھا وہی ہوا۔ یعنی بالا خراس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو کر اس روز چھلک ہی بڑا کہ جس روز وہ گھر کی صفائی ستھرائی اور کھانے پر اہتمام کرنے کی بطور خاص تاکید کر کے گیا تھا۔ دراصل اس روز اس نے اپنے ایک دیرینہ دوست، جس کی فیملی اب لاہور میں سکونت پذیر تھی اور خود وہ سعودیہ میں بغرض روزگار مقیم تھا اور آفس کے کسی کام سے صرف دو دن کے لیے کراچی آیا تھا، کو اپنے ساتھ لے کر اپنے گھر آنا تھا۔ حالانکہ نوید تو ہوٹل میں اپنی بکنگ بھی کروا چکا تھا۔ مگر ناصر اسے زبردستی اپنے ہاں ٹھہرانے پر بضد رہا۔ وہ صبح اس کے ساتھ ہی آفس کے لیے نکلتا اور شام میں واپسی بھی ساتھ ہی ہوتی تھی۔ لہذا پردے وغیرہ کا بھی ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا۔

ناصر۔ اسے لے کر گھر پہنچا تو یہاں کا نقشہ ہی الناولہ تھا۔ بے ترتیب لاؤنج میں صوفے پر آڑی تر چھی لیٹی غزالہ اور سکو بڑے اطمینان اور فراغت سے نمکو اور کولڈ ڈرنک سے انصاف کرتے ہوئے کسی انڈین فلم سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ آن واحد میں ناصر کے دماغ کا میٹر گھوم گیا۔

"یہ کیا حال بنا رکھا ہے تم نے گھر کا؟" وہ اس کے سر پر پہنچ کر چلایا۔ دونوں بری طرح اچھل پڑیں۔ سکو تو ناصر کے تیور بھانپ کر فوراً "ہی چکن میں جاگھسی، جبکہ غزالہ اس کے غصے یا ناراضی کی پروا نہ کرتے ہوئے خم ٹھوک کر رویدو مقابلے کو تیار ہو گئی۔

"کیوں۔ کیا ہوا گھر کے حال کو؟ کیا طوفان آگیا ہے؟" وہ جمالت سے بولی۔

"میں تم سے صبح کہہ کر بھی گیا تھا کہ آج تو گھر کو صاف ستھرا رکھنا۔ مگر تم نے میری بات پر کلن نہ دھرے۔"

”نہیں نوید۔ غزالہ کو تو باجی سے ملنی پیر ہے۔ وہ تو انہیں کسی خاطر ہی میں نہیں لاتی۔ اب مجھے ہی اپنے لیے کچھ کرنا ہوگا۔“ اس کے لہجے میں سنجیدگی اور انداز فیصلہ کن تھا اور نوید جانتا تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے وہ کر گزرے گا۔ اسے لیے وہ آسودگی سے مسکرا کر لہجہ آؤر کرنے لگا۔



پھر تو جیسے اس کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے۔ اب نہ وہ گندے گھر کو دیکھ کر ناک بھون چڑھاتا نہ بد مزہ کھانا پکانے پر غزالہ کو ٹوکتا۔ ایک عجیب سی بے نیازی اور سرشاری بھرا رویہ تھا۔ بے نیازی تو سمجھ میں آئی تھی۔ مگر یہ اس کے وجود سے پھوٹی سرشاری، ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ آنکھوں سے جھلکتی مستی۔ اپنے لباس پر وہ پہلے سے زیادہ دھیان دینے لگا تھا، رفیوم بھی ڈھیروں چھڑکتا، لبوں پر محبت بھرے نغمے چلتے رہتے۔ آدھی آدھی رات کو غزالہ نے اسے سیل فون کان سے لگائے ٹیرس پر ٹہلتے بھی دیکھا۔

”باجی جی۔“ سکو نے ایک روز بڑی رازداری سے اسے مخاطب کیا۔ ”مجھے تو کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔ آپ کو ہوتا ہے وہ سیدھے ہاتھ والے بنگلے کا صاب شروع میں ایسی ہی حرکتیں کرتا تھا پھر کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ وہ بیگم صاحبہ پر سوتن لے آیا۔ حالانکہ میں نے تو انہیں بھی خطرے کی بوسونگہ کر پہلے ہی خبردار کر دیا تھا، مگر ناجی۔ مجھ غریب کی سنتا ہی کون ہے۔ بعد میں لگ گیا نا پتا۔ آٹھ آٹھ آنسو روتی رہی پھر اپنے میکے جا بیٹھی۔ آپ کے کو تو جی کوئی اگانہ پچھا (اگانہ پچھا) اگر کچھ ہو، ہوا گیا تو آپ کدر (کدھر) جاؤ گی جی۔“ وہ بڑے ہمدردانہ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

”خدا کے لیے سکو۔ اچھی باتیں منہ سے پھوٹو۔“ وہ تڑپ کر بے چینی سے بولی۔

”میرے بولنے سے کیا ہوتا ہے جی۔ آثار تو یہی بتا

”میں تنگ آگئی ہوں تمہاری اور تمہاری بہن کی ہر وقت کی نکتہ چینیوں سے، جتنی بھی اپنی جان مار لو۔ تم لوگ کسی طرح خوش ہی نہیں ہوتے۔“ وہ ہاتھ نچا کر دھاڑی۔

”صائمہ باجی کا نام بھی مت لینا۔ ارے ذرا جا کر ان کا گھر دیکھو، کیا آئینے کی طرح جگمگاتا ہے۔ شوہر اور بچے ان کے گن گاتے نہیں تھکتے۔“ وہ سختی سے بولا۔

”بڑے مگڑے تعویذ کروا رکھے ہیں انہوں نے تو قیر بھائی پر۔ وہ گن نہ گائیں گے تو اور کیا کریں گے۔“ وہ تمسخرانہ بولی، تب وہ بہت تاسف سے اسے کہنے لگا کہ۔

”بہت افسوس ہوا تمہاری ذہنیت جان کر۔ بجائے ان کی اچھائی اور سلیقہ شکاری تسلیم کر کے ان سے سبق لینے کے بلنا تم ان پر الزام لگا رہی ہو۔ لیکن نہیں۔ تمہارے جیسی پست ذہنیت کی عورت سے اور توقع بھی کیا کر سکتا ہوں میں، تمہیں سمجھانے سے اچھا ہے کہ میں ہی اپنا کوئی بندوبست کر لوں۔“ وہ بڑے عجیب سے لہجے میں کہہ کر پلٹ گیا۔ وہ جو ماش کے آنے کی طرح اکڑی کھڑی جوانی حملے کے لیے تیار تھی، اس کے بیگانگی بھرے ناہم سے انداز پر الجھ کر ڈھیلی پڑ گئی۔ ناصر، نوید کو لے کر ہوٹل ہی چلا آیا۔ وہ خاصا اپ سیٹ سا تھا۔ پھر نوید اپنے کانوں سے سارا معرکہ سن چکا تھا۔ مرحومہ آنٹی کے نامناسب فیصلے پر سر ہلا بلا کر افسوس بھی کر چکا تھا اور ناصر سے ہمدردی بھی۔ مگر یہ بات اتنی معمولی نہ تھی۔ ناصر کی زندگی بھر کا سوال تھا جو محض ڈیڑھ سال ہی میں جنم کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ اسی لیے کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”میری ماں تو صائمہ باجی سے مشورہ لو۔ وہ بہت زیرک اور معاملہ فہم سمجھ دار عورت ہیں۔ شاید کسی تدبیر سے بھابھی کو ان کی غلط روش کا احساس دلا سکیں۔“

رہے ہیں۔“ اس نے مدبرانہ بے نیازی خود پر طاری کرنے کی کوشش کی اور مزید مکار دکھائی دی۔ غزالہ سوچ میں پڑ گئی پھر ناصر کی مزید کھوج میں لگ کر اس پر مزید انکشافات ہوئے۔ وہ واقعی کسی لڑکی سے باتیں کر رہا تھا اس نے اپنے گناہ گار کانوں سے سنا اور پھٹ پڑی۔

”ہاں تو پھر۔۔۔ کر رہا ہوں میں سونو سے بات۔۔۔ تم کیا کر لوگی میرا۔“ ناصر نے نہ انکار کیا نہ بہانے بنائے جھٹ اقرار کر کے غزالہ کو ششدر کر دیا۔ وہ تو سوچے بیٹھی تھی کہ وہ گھبرا جائے گا، گزربڑا کرو ضاحتیں دے گا تب وہ اس کی اچھی طرح پھینٹی لگائے گی، مگر اس غیر متوقع صورت حال نے اس کے اوسان خطا کر دیے۔

”کون ہے وہ ڈائن۔“ اتنا تو وہ کہہ ہی سکتی تھی۔ ”جو بھی ہے۔۔۔ تم سے بہت اچھی، خوب صورت پڑھی لکھی اور سمجھ دار ہے۔“ ناصر درشتی سے بولا۔ ”تو لے آؤ نا اسے یہاں بیوی بنا کر میں بھی دیکھتی ہوں کتنے دن رہ لے گی وہ تمہارے ساتھ۔“ وہ آگ بگولہ ہو کر بولی۔

”جلد ہی لے آؤں گا۔ مگر اس سے پہلے تمہارا بندوبست ضروری ہے۔“ وہ ٹھنڈے برف سے لہجے میں اطمینان سے کہہ کر گھر سے باہر چل دیا۔ وہ چلا چلا کر بین ڈالنے لگی۔ سکواہیر جنسی سروس کی طرح حاضر تھی۔

”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔“ اس نے رٹ لگا رکھی تھی اس کی باغچیں کھلی پڑ رہی تھیں متوقع ”آمدنی“ جو پیش نظر تھی۔

”ہائے میں لٹ گئی سکوس۔ برباد ہو گئی نجانے کون چڑیل ہے جو میرے معصوم سے میاں کو پھانس بیٹھی۔“ وہ زمین پر بیٹھ کر دائیں بائیں ڈول رہی تھی۔ ”فکر مت کریں باجی جی۔ میں پیر سائیں سے ایسے توینڈ (تعویذ) لا کر دوں گی کہ وہ چڑیل خود ہی جل کر جھسم ہو جائے گی۔ انا صاحب جی آپ کے پیروں میں گرے پڑے ہوں گے دیکھنا۔ ایسے ہی جلالی دھاگے دیتے ہیں وہ۔“

”تم سچ کہہ رہی ہو۔“ وہ رک کر پوچھنے لگی۔ ”دلیس۔۔۔ مجھے جھوٹ بول کر جہنم میں جانا ہے کیا۔“ اس نے دھڑلے سے کہا تب جا کر غزالہ کے دل کو کچھ قرار ملا۔



پھر اپنے جیب خرچ سے بچا کر جمع کیے گئے بیس ہزار روپے صرف کر کے سکو سے اس نے تعویذات منگوائے تھے۔ ناصر کی چائے میں چینی گھول دھاگا اپنے پیر میں باندھ اور تعویذ ناصر کے تکیہ میں دبا کر وہ اپنی ساری فکر اور پریشانی فراموش کر کے، مزید شیرینی بنی گھوم رہی تھی اسے اس انقلابی دن کا انتظار تھا کہ جب ناصر اس کے پیروں میں گرا اپنے کرہ ناکرہ گناہوں کی

معافی مانگتا دکھائی دیتا۔

وہ دن تو فی الحال اس کی زندگی میں نہ آیا البتہ ایک دن ایک طرح دار ماڈرن سی حسینہ ناصر کے ساتھ گھر آکر گھر کا معائنہ کرنے لگی۔ وہ دونوں آپس میں گھر کے پینٹ، انیٹریٹرو وغیرہ پر مسکرا مسکرا کر تباہ خیال کر رہے تھے اور غزالہ جو تعویذات پر تکیہ کیے بیٹھی تھی اس صورت حال پر بھونچکی رہ گئی۔ اور اس بھونچکے پن میں اس سے اتنی عقل مندی ضرور سرزد ہوئی کہ وہ اس حسینہ کے سامنے ناصر سے الجھنے سے باز رہی (ذہن میں یہ بات بھی مخفی تھی کہ اگر ناصر نے ”ہونے والی سوتن“ کے سامنے ہی عزت افزائی شروع کر دی تب اس کی کتنی سبکی ہوگی) بس خلاف فطرت اتنا ضبط ہی بہت تھا۔ اس کے جاتے ہی وہ ناصر کا گریبان پکڑ کر پوچھنے لگی۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی، میرے گھر میں کسی غیر عورت کو لے کر آنے کی۔“ ناصر نے تحمل سے اپنا گریبان چھڑوایا اور سکون سے بولا۔ ”یہ گھراب اس کا ہونے والا ہے۔ تم کسی زعم میں مت رہنا بہت جلد میں اسے یہاں بلاساؤں گا۔“ ”میں صائمہ باجی سے شکایت کروں گی۔ سارا

خاندان اکٹھا کر لوں گی۔“ اس نے دھمکایا تو وہ بے

ساختہ ہنس پڑا۔

”تم نے کبھی کسی سے ہٹا کر رکھی یا کسی کو خوش دلی سے گھر میں خوش آمدید کہا ہے جو ایسے دعوے کر رہی ہو۔ جاؤ غزالہ لی بی۔ یہ بچکانہ دھمکیاں کسی اور کو دینا۔“ وہ کہہ کر چلتا بنا۔ اس نے سکو کو گھور کر دیکھا۔

”یہ ہے تیرے لائے تعویذات کا اثر۔“ دوسرے دن سکو نے بتایا۔

”پیر سائیں نے کہا ہے کہ مخالف پارٹی نے بھی صاحب پر بڑے ٹکڑے تعویذ کروا رکھے ہیں۔ اس کے توڑ کے لیے چلہ کائنا پڑے گا آپ کو۔ گھر کے ایک کونے میں روز مغرب کے وقت دھونی دے کر چراغ جلانا ہو گا مل کے تیل کا پھر دیکھنا اس چرٹیلن کا تیل کیسے لکھا ہے۔“

”چھا۔ چراغ تو جلا لوں گی، مگر چلے۔“ یہ کام مشکل تھا۔

”کوئی مسئلہ نہیں، آپ صرف سات ہزار سات سو ستر روپے مزید دے دیں پیر سائیں آپ کے بدلے چلہ کاٹ لیں گے، آپ کا کام ہو جائے گا۔“ اس نے جھٹ اس کی پریشانی کا حل پیش کیا۔ سات ہزار سات سو ستر اور چلے کا کیا مال میل تھا یہ سوچنے کا غزالہ کے پاس وقت نہ تھا۔ اب حقیقتاً ”اسے اپنا گھر بچانے کی فکر لاحق ہو چکی تھی۔ اب تک وہ ناصر کی شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھاتی آئی تھی، مگر اب اسے صحیح معنوں میں ناصر نے اپنے اختیارات کا مزہ چکھادیا تھا۔ چلہ بھی کاٹ لیا (پیر سائیں نے)۔ تل کے تیلوں کے چراغ بھی روز جلنے لگے (غزالہ کے ہاتھوں) مگر کچھ نہ ہوا۔ سوائے اس کے کہ ناصر کو پتا چل گیا کہ وہ سکو کے لائے تعویذات کے چکر میں پڑ گئی ہے۔ وہ خوب گرجا برسا، اسے چراغ، تعویذ دھاگے سمیت سکو کو بھی گھر سے نکالنا پڑا۔ غزالہ تنہا رہ گئی۔ ایسے میں سوائے اللہ اور مرحومہ ماں کے بعد اسے صائمہ کے علاوہ بھلا کون یاد آتا۔ ان کے ہاں گئی۔ خوب روٹی دھوئی۔ ماجرا کہہ

سنایا۔ صائمہ دنگ رہ گئی۔

”باجی۔ بس اب آپ ہی میرا آخری سہارا ہو۔ ناصر نے مجھے طلاق دے دی تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔“ وہ روتے ہوئے گڑ گڑاتی۔

”اللہ سے اچھی امید رکھو۔ ماہوس مت ہو میں ناصر کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔“ اس نے حوصلہ، تسلی سب کچھ دیا مگر غزالہ کو کچھ اور درکار تھا۔

”نہیں باجی۔ آپ کو اللہ کا واسطہ مجھے بس آپ وہیں سے تعویذ لادیں جہاں آپ ہر جمعہ کو جاتی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ناصر بھی میرا ویسا ہی گرویدہ ہو کر رہے جیسے تو قیر بھائی آپ کے ہیں۔“ اس نے لجاجت سے کہا۔ صائمہ ہکا بکا رہ گئی۔ ہر جمعے کو وہ بعد مغرب قریبی مسجد میں درس وغیرہ سننے بڑی پابندی سے تو قیر ہی کے ساتھ جاتی تھی، مگر وہاں تعویذات وغیرہ کا تو کوئی سلسلہ نہ تھا یہ بات اس نے غزالہ کو بھی سمجھانے کی

بہت کوشش کی، مگر اس کی چھٹی سی عقل میں یہ بات سمائی ہی نہیں کہ دنیا کی ساری کرامات صرف تعویذات ہی کے مرہون منت نہیں ہیں۔ تب صائمہ نے ٹھنڈی سانس لے کر بس اتنا کہا۔

”چھا ٹھیک ہے میں صرف تمہارے خاطر وہ تعویذ حاصل کرنے کی کوشش کروں گی۔“



اور اب غزالہ وہ تعویذ حاصل کرنے کے بعد بڑی پابندی سے بزرگ کے فرمودات پر عمل پیرا تھی اور جلد ہی کسی نتیجے پر پہنچنے کی منتظر بھی۔ یونہی چھ ماہ گزر گئے نہ ناصر کے رویے میں فرق آیا نہ غزالہ کے پائے استقامت میں، مگر وہ گھبرا ضرور جاتی۔ تب صائمہ کی ”صبر۔ صبر“ کی تلقین اسے حوصلہ دیتی۔ سکو کے بعد ناصر نے اسے کوئی نوکرانی رکھ کر نہ دی۔ اسے سارا کام، گھر کا انتظام و انصرام خود کرنا پڑتا۔ تب بھی ناصر کے ماتھے کے بل درست نہ ہوتے۔ وہ اسے بے وجہ سخت ست ہی سنایا وہ سر جھکا کر دل میں لاجول پڑھتی

میں اسے سمندر میں ڈلوادوں گی۔ اچھا اب رکھتی ہوں
دوپہر کے کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔“ اس نے فون کان
سے ہٹایا۔ سامنے صوفے پر بیٹھانا صبر بھر پور انداز سے
مسکرا کر بولا۔

”آپ کے لائے تعویذ نے تو کمال کر دیا۔“
”یکومت۔“ صائمہ مسکراہٹ دیا کر مصنوعی خفگی
سے بولی۔

”سب تمہارا کیا دھرا ہے اگر تم سونو والا ڈرامہ
رچانے سے قبل مجھے اعتماد میں لے لیتے تو غزالہ کو
کسی اور طریقے سے بھی سمجھایا جاسکتا تھا۔“

”میں ہر طریقے پر غور کر چکا تھا۔ بہت ٹیڑھی کھیر
ہے وہ۔ اول تو وہ کسی کی نصیحت خاطر ہی میں نہیں لاتی
کیونکہ وہ اپنے طرز عمل کو غلط سمجھتی نہیں تھی۔ اسی
لیے اسے خوفزدہ کر کے جذباتی دھچکا دینا اشد ضروری
تھا۔“ وہ قطعیت سے بولا۔

”مگر وہ تعویذ والا کھڑا کھڑا کرنے کی کیا ضرورت
تھی۔ یقین کرو مجھے عجیب سی شرمندگی ہو رہی ہے۔“
”مریض کو دیکھتے ہوئے اس کے مطابق طریقہ
علاج اختیار کرنا چاہیے مائی ڈیئر باجی، اگر آپ اسے
یونہی اپنے طور پر سب سمجھانے کی کوشش کرتیں تو
میں دعوے سے کہتا ہوں وہ کبھی تنہی سے ان باتوں پر
عمل نہ کرتی۔ ویسے آپ نے اس تعویذ میں لکھا کیا
تھا؟“ وہ شرارت سے پوچھنے لگا۔

”محبت فارح عالم کے سوا کیا لکھ سکتی تھی میں۔“
وہ سر جھٹک کر مسکرائی۔
”ہا ہا۔“ اس نے قہقہہ لگا۔

”اس سے پہلے کہ ہماری پول کھل جائے بہتر ہے
کہ آپ جلد ہی اس سے وہ تعویذ واپس لے لیں۔“
”ہاں جاؤں گی کل۔ ابھی تو چلو سچ کا وقت ہو رہا
ہے۔“ وہ اندر بڑھ گئی۔ اور ناصر سوچنے لگا کہ اگر انسان
ذرا سی عقل استعمال میں لا کر تدبیر کر لے تو زندگی کے
بہت سے مسائل کو ذرا سی کوشش سے سلجھایا جاسکتا
ہے۔

☆ ☆

رہتی۔ بلکہ اب تو ناصر کے پہلے کے رویے اور اپنی
کچھلی روش پر اسے شرمندگی، ملاں پشیمانی سب کچھ
محسوس ہونے لگا تھا۔ اور وہ منتظر تھی اس دن کی آمد کی
جب سب کچھ پہلے جیسا ہو جاتا تھا۔ مگر وہ نادان نا
واقف تھی کہ گزرے ہوئے پل کبھی واپس نہیں
آتے۔ ☆ ☆ ☆

”میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں باجی آپ نے
میری بد تمیزیوں کو نظر انداز کر کے اس مشکل وقت میں
میری مدد کی۔“ غزالہ فون پر خوشی سے چمک رہی تھی۔
”مدد گار تو وہ ہی رب ہے سب کا۔ ہم تو صرف
وسیلہ بنتے ہیں۔“ صائمہ انکساری سے بولی۔

”پھر بھی باجی اگر آپ مجھے وہ تعویذ نہ لا کر دیتیں تو
میرا کیا بنتا۔“

”(اف اللہ۔ پھر وہی تعویذ۔)“ صائمہ نے سخت
بد مزگی سے سوچا۔ مگر بولی۔

”دیکھو غزالہ۔ ایک بات، اچھی طرح ذہن نشین
کر لو ہر امر حکم ربی ہے۔ اگر وہ نہ چاہے تو کوئی تعویذ کچھ
نہیں کر سکے گا۔ اور دوسری بات جیسا کہ تم نے ابھی
بتایا کہ ناصر کا رویہ اب تم سے بہتر ہونے لگا ہے۔
تمہارے پکائے کھانے کی تعریف بھی کی۔ تمہیں
شاپنگ پر بھی لے کر گیا۔ مگر ایک بات یاد رکھنا۔ مرد اگر
اپنی کرنے پر اتر آئے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔
ناصر تو یوں بچی گھر سے باہر کا راستہ دیکھ چکا ہے۔ اب یہ
تم پر ہے کہ تم اسے کس طرح اپنا بنا کر رکھ سکتی ہو۔ سبانی
میری ہمدردی اور دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“

”جی باجی۔ میں نے بھی اپنی غلطیوں سے سبق
سیکھا ہے۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گی
کہ آئندہ وہ غلطیاں نہ دہراؤں۔ اس نے نام لےجے
میں کہا، پھر پوچھنے لگی۔

”اچھا اب اس تعویذ کا کیا کروں؟ کیا ہمیشہ اسے
اپنے پاس رکھنا ہوگا؟“

”ارے نہیں۔“ صائمہ بے ساختگی سے بولی
ویسے بھی تمہارا مقصد تو پورا ہو ہی چکا ہے۔ میں کچھ
دن میں چکر لگاؤں گی تب تم مجھے واپس کرونا

رہائے گناہ

سوبا اور مایا دونوں بہنیں اپنی ماں کے ساتھ گھر کی اوپری منزل میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے والد کی وفات ان کے بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔

گھر کی چکی منزل میں ان کے تایا اور تائی اپنی دو بیٹیوں عفت اور ناملہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ تایا اکثر بیمار رہتے ہیں۔ حدید انس عفت اور ناملہ کے خالہ زاد ہیں۔ ناملہ انس میں دلچسپی رکھتی ہے۔ مگر انس سوبا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار اپنی خالہ اور سوبا کی مائی کے سامنے کر دیتا ہے۔ خالہ کو بے پناہ دکھ کا احساس ہوتا ہے، مگر ظاہر راضی خوشی اس کا رشتہ لے کر اپنی دیورانی کے پاس جاتی ہیں۔ سوبا کی والدہ یہ رشتہ خوشی خوشی قبول کر لیتی ہیں۔ ناملہ باقاعدگی سے اپنے والد کو اسپتال لے کر جاتی ہے۔ وہاں اسپتال کے کلرک شبیر حسین عرف شبوسے روابط بڑھ جاتے ہیں کہ اچھے برے کی تمیز کو بھول جاتی ہے۔

سوبا اور انس کی شادی کی تقریبات بہت اچھے طریقے سے انجام پاتی ہیں اور سوبارخصت ہو کر انس کے گھر آ جاتی ہے۔ حدید کسی کو ذرا پ کرنے جاتا ہے اور اس کا ایک سیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

سوبا کے اکیلے پن کی وجہ سے عفت اس کے پاس رک جاتی ہے۔ گھر کے کاموں کے علاوہ حدید کا بھی خیال رکھتی ہے۔ حدید عفت کے دل میں اپنے لیے پسندیدگی کو جان لیتا ہے اور سوچ لیتا ہے کہ اس بار خالہ کو مایوس نہیں کرے گا۔ ناملہ شبیر حسین سے ملنا نہیں چھوڑتی اور آخر کار اپنی عزت گنوا بیٹھتی ہے، جس کا اندازہ اس کی ماں کو بھی ہو جاتا ہے اور وہ اپنی عزت بچانے کے لیے حدید کے ساتھ ناملہ کی شادی کا فیصلہ کر لیتی ہیں اور اس بات کا اظہار انس اور مایا سے بھی کر دیتی ہیں۔

حدید انس کی نہ طر ناملہ سے شادی کرنے کے لیے رضامند ہو جاتا ہے اور شادی کے بعد پوری سچائی سے ناملہ کو بیوی کا درجہ دینا چاہتا ہے، مگر ناملہ نے حدید کو مجبوری کے تحت اپنی زندگی میں قبول کیا اور اس کو وہ مقام نہ دیا جو اس کا حق تھا۔ حدید





خاموش ہو گیا کہ وقت کے ساتھ ساتھ ناملہ اس کو قبول کرنے لگی، مگر حید کی شرافت اور خاموشی کو دیکھتے ہوئے ناملہ دماغ میں کچھ اور ہی منصوبے بالا ہی بالا تشکیل پانے لگے، جس پر ناملہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑی کامیابی سے عمل پیرا تھی کہ وہ اس کی نہ ہو سکی تو سوہا اور انس کو بھی جدا کر دے گی۔

ماہا کی شادی حسیب سے بخیر و خوبی ہو جاتی ہے۔ ماہا حسیب کے ساتھ دینی چلی جاتی ہے، ماہا حسیب سے شادی کے بعد اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت لڑکی سمجھنے لگتی ہے، مگر اس کو پتا چلتا ہے کہ حسیب ایک بیٹے کا باپ ہے اور وہ فوراً پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔

سوہا امید سے ہوتی ہے، مگر ناملہ بڑی عمدگی اور کامیابی سے سوہا کو اس خوشی سے محروم کر دیتی ہے اور اس حادثے کے بعد انس کو اپنی زیادتی کا احساس ہوتا ہے اور وہ سوچ لیتا ہے کہ اب سوہا کو کوئی غم نہیں دے گا۔ ناملہ اسپتال میں شبیر حسین کو دیکھ کر چلکرا جاتی ہے، وہ سمجھتی ہے کہ شبیر حسین نے اس کو نہیں دیکھا، مگر شبیر حسین ناملہ کا پیچھا کرتے کرتے اس کے گھر پہنچ جاتا ہے اور ناملہ نہ چاہتے ہوئے بھی شبیر حسین کے جال میں گھر جاتی ہے۔

حسیب ماہا کو منالیتا ہے اور پاکستان آجاتا ہے، مگر ماہا پھر غلط فہمی کا شکار ہو جاتی ہے اور حسیب کے ساتھ جانے سے منع کر دیتی ہے۔ حسیب اکیلا ہی دینی جانے کے لیے روانہ ہو جاتا ہے کہ اس کا ایک سیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ عفت کا نکاح معراج کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ جس کا حید کو پتا چلتا ہے تو وہ حیران ہو جاتا ہے۔

(اب آگے پڑھئے)

گیارہویں قسط

حید رآبلدی دھوپ سے تڑختی زمین پر چاند کی نرم کرنوں کی ٹھنڈک اتر آئی تھی۔ یہ کرائے کا مکان ایک کمرے اور چھوٹے سے والان پر مشتمل تھا۔ صد شکر تھا کہ مالک مکانوں نے کونے سے اوپر کی طرف جاتی لکڑی کی سیڑھیاں کرائے داروں کے لیے کھول رکھی تھیں۔

شدید گرمی اور جس میں جب لوڈ شیڈنگ مہربان ہو جاتی تو تقریباً "ہر روز وہ پسینے میں بھیگا جسم اپنی چادر اور تکیہ اٹھا کر اوپر چلا آتا۔ ایسے میں اسے اپنے گھر کی چھت اور اس کا نازک اندام وجود بہت شدت سے یاد آتا۔ جسے اللہ نے اس کے دل کی مرضی جانتے ہوئے اس کی زندگی میں شامل کر دیا تھا، لیکن آج معاملہ مختلف تھا۔

آج سوہا کی یاد کے ساتھ دو اور فکریں اس کے ذہن پر سوار تھیں۔ ایک تو اس کے کمرے اور الماری کے کھلے دروازے اور دوسرے ناملہ کا اچانک بے ہوش ہو جانا۔

سربانے لگے موبائل کی لائٹ جلی، واٹریشن ہونے لگی۔

"سوہا کالنگ لمحہ بھر میں سارے خیالات اس کے ذہن سے یوں اڑن چھو ہوئے جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ وہ سب بھول گیا سوائے اس آواز کے، جو ابھی ابھی اس کی سماعتوں میں اتر کر اس کی روح کو اطمینان دینے کے ساتھ ساتھ اس کے وجود کو اضطراب بخشنے والی تھی۔ اس کی نشنگی برہانے والی تھی۔

"کیا حال ہیں جان من!" اس کا مسکراتا لہجہ سن کر سوہا کے لبوں پر بھی چمک پھوٹنے لگی۔

"حال وہی ہے جو آپ چھوڑ کر گئے تھے۔" وہ رکی پھر بولی۔

"سوہا!" چند لمحوں بعد اس نے بڑی سنجیدگی اور گہمیرتا سے پکارا۔

"جی۔" وہ بھی ذرا کی ذرا سنجیدہ ہوئی۔

"بہت یاد آرہی ہے تمہاری یا۔۔۔" بے بسی بے بسی تھی۔

"مجھے بھی۔" دونوں خاموش ہو گئے اور یہ خاموشی ایسی ہی تھی کہ کہنے کو دونوں کے پاس کچھ نہ کچھ تھا، لیکن وہ اپنے علاوہ کسی اور کی بات کرنا نہیں چاہتے تھے۔ خاموشی طویل ہونے لگی اور یہ دوری انس پر جھنجلاہٹ اور سوہا پر

اداسی طاری کرنے ہی لگی تھی کہ انس کو کچھ یاد آگیا۔
 ”اچھا سنو! ایک بات بتا رہا ہوں تمہیں دھیان سے سنتا۔ آج جب میں تمہیں چھوڑ کر گھر گیا تو۔“ اس نے
 کمرے کے کھلے دروازے سے لے کر نائکہ کی مشکوک حالت تک سب کہہ ڈالا۔ سوہا اچھے میں گھری سنتی گئی۔
 ”میرا نہیں خیال کہ یہ نائکہ کی حرکت ہے۔“

”لیکن میرا یہی خیال ہے۔ نائکہ کے سوا اور کون جاسکتا ہے کمرے میں۔ جبکہ وہ اکیلی بھی تھی۔“
 ”پتا نہیں وہ کن چکروں میں ہے۔ آپ اس کے بارے میں کوئی گمان مت رکھیں۔ وہ کچھ بھی سوچ سکتی ہے
 اور کچھ بھی کر سکتی ہے۔ یاد نہیں میں نے بتایا تھا نا! کہ اس کا رویہ میرے ساتھ کتنا برا ہے۔“ سوہا کو ایک بار پھر
 نائکہ کی برائی کرنے کا موقع مل گیا۔

”رویہ جو بھی ہو، لیکن وہ کمرے میں کیا کرنے لگی ہوگی میں تو یہ سوچ رہا ہوں۔“
 ”اچھی طرح تلاشی لیتے کوئی چیز کم تو نہیں ہوئی۔“
 ”نہیں میں نے دیکھ لیا ہے اور تم بھی کیا بات کر رہی ہوں انڈین ڈراموں والی وہ کیا کمرے میں چوری کرنے
 تھسی ہوگی۔“ اس نے کان پر سے مکھی اڑائی۔
 ”اگر وہ کسی بری نیت سے نہیں گئی تب بھی گئی وہی ہے۔ مجھے یقین ہے۔ تب ہی تو آپ دونوں کے سوالات
 سے بچنے کی خاطر بے ہوش ہو گئی۔“

”ابے یار کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ وہ کوئی نائک نہیں کر رہی تھی۔“
 ”آپ کو اندازہ نہیں وہ کتنی بڑی نوٹنگی ہے۔“ سوہا ٹھونک بجا کر بولی۔
 ”اندازہ تو مجھے بھی نہیں تھا کہ تم اتنی بی جمالو ہو۔“
 ”اوہ۔ میں بی جمالو ہوں۔“ حسب توقع وہ فوراً ہی برامان گئی۔
 ”اچھا اچھا بس زیادہ منہ پھلانے کی ضرورت نہیں۔ میں اتنی خوب صورت کال کو ناراضی پر اینڈ نہیں کرنا
 چاہتا۔ کل ایک نئی جگہ اپلائی کیا تھا وہاں انٹرویو کے لیے جانا ہے۔ اس لیے تم بھی سو جاؤ اور مجھے بھی سونے دو۔“
 ”ہوں۔۔۔۔۔۔“ سوہا خاموش رہی۔ پھر بولی۔
 ”نیند کس کم بخت کو آتی ہے یہاں۔ آپ کو آجائے گی نیند۔“ اس کے لہجے میں ایک وفا شعار بیوی کی محبت
 بول رہی تھی۔

”ابھی جائے گی۔ لیکن میں کمبخت نہیں ہوں۔“
 ”انس۔“ سوہا کی ہنسی نکل گئی۔
 ”ہاں میں بہت بخت آور ہوں۔ کیوں کہ میرے نصیب میں تم لکھی گئیں۔“ اس کا لہجہ مہک رہا تھا۔



آنکھیں بند کر لینے سے ضروری نہیں کہ نیند آ بھی جائے۔ بہت برا تجربہ تھا۔ وہ شدید بے زار ہوا۔
 ”کیوں رک گیا میں خوا مخواہ۔ اس نے تو کوئی بات نہیں کی۔ نہ کوئی بات کرنے کا موقع دیا بس۔ اطمینان
 ہو گیا تو چلی گئی اور اب۔ کیا کرتی ہوگی۔ اطمینان سے گہری نیند سوتی ہوگی اور ایک میں پاگل ہوں۔“ وہ پہلی بار ان
 کیفیات سے نہیں گزرا تھا۔ اس کی ایک خانہ آبادی پہلے ہو چکی تھی۔ وہ ایک بچے کا باپ بھی تھا۔ سوان کیفیات
 پر اس کی جھنجلاہٹ بے حد فطری تھی۔ حیرت اسے عفت کے اطمینان پر تھی۔
 اور عفت۔ وہ محبت کا ذائقہ چکھ چکی تھی۔ استحقاق کا حسن پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ اگر دل کے بہت

مجبور کرنے پر وہ ایسے دیکھنے باہر آ بھی گئی تو کیا؟ کوئی اس سے سوال نہیں کر سکتا، لیکن اصل حیرانگی اسے اپنے دل کے پلٹا کھانے پر تھی۔ بھلا کوئی یوں بھی رنگ بدلتا ہے کیا؟

”شاید اسی کو نکاح کے بولوں کی طاقت کہتے ہیں۔“ بے حد جھجکتے ہوئے اس نے دل میں اعتراف کیا اور کاریڈور میں آگے کی طرف قدم بڑھائے۔ دل ہی دل میں خود سے الجھتا جھنجھلاتا معراج گلابی آپٹل کا سایہ دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ سنان راہ داری میں کوئی آہٹ گئی نہ کوئی ذی روح۔۔۔ صرف ایک وہ تھی۔ گلابی پیراہن میں کپٹی ایک نازک سی لڑکی۔ جو اس کے دل میں یوں دھڑلے سے گھس آنے والی دوسری صفت نازک تھی۔

ابھی عفت کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی۔ وہ بہت دھیرے رک رک کر قدم بڑھا رہی تھی۔ وہ اسے دیکھے گیا اور جب یقین ہو گیا کہ اب وہ یہاں تک آئے بغیر واپس نہیں پلٹے گی تو جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ عفت وہاں آئی۔ اس نے ذرا کی ذرا جھانک کر دیکھا۔ وہ سامنے ہی لیٹا تھا۔ عفت کچھ دیر اسے دیکھتی رہی۔ اس کا لمبا چوڑا سراپا اس وقت محو خواب تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔

نماز پڑھنے کی جگہ اور کوئی دو سرا مرد نہیں تھا ایک سولہ سترہ سال کی عمر کا نو عمر لڑکا دیوار کی طرف کروٹ لیے سو رہا تھا۔ اس نے نظر بھر کے معراج کے وجود کو دیکھا۔ معراج آنکھوں میں جھری بنائے اس کی کسی پیش قدمی کا غمگین رہا، لیکن وہ بس چند لمحے وہاں ٹھہری پھر واپس پلٹ گئی۔ اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ گلابی آپٹل دھیرے دھیرے دور جا رہا تھا۔ وہ گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ اپنی بے موقع ایکٹنگ پر خود سے خفا بھی ہوا۔ پھر تیزی سے اٹھ گیا۔

”جب تم بھی جاگ رہی ہو اور نیند ہمیں بھی نہیں آتی۔ تو کیا ضروری ہے کہ جھوٹے ڈرامے کر کے ایک دوسرے کو جانے کیا سمجھانے کی کوشش کی جائے۔“ وہ تیز قدموں سے رضوانہ کے کمرے کی طرف گیا۔ ڈبولی پر موجود نرسیں اور نیلی فون آپریٹر کاؤنٹر پر سرگرائے اور نگہ رہے تھے۔ ان میں سے کسی کی توجہ اس لکا چھپی کے کھیل کی طرف نہیں تھی۔ اس نے چند لمحے سوچا پھر ہلکی سی دستک دے کر دروازہ کھولا اور اندر قدم رکھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ رضوانہ گہری نیند سو رہی تھیں۔ وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔ دل ہی دل میں شرمندہ بھی ہوا۔

”کیا ضرورت تھی نو عمر لڑکوں کی طرح یہ فضول حرکت کرنے کی۔“ اب باہر جانے یا یہیں ٹھہر کر انتظار کرے۔ واش روم کا دروازہ کھل بند نہیں تھا جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ عفت کمرے میں نہیں آئی۔

تھوڑی دیر یہاں وہاں اس کی موجودگی کے آثار اور اس کے وجود کی خوشبو کو محسوس کرنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ کسی کا بیڈ روم نہیں اسپتال کا کمرہ تھا۔ وہاں صرف دو اوڑ اور اسپرٹ کی بوتلی اور بالکل خاموشی۔ گہری سانس لے کر اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور واپسی کے لیے پلٹا۔ تب ہی عفت کھلے دروازے سے اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کے دو کپ تھے۔ معراج نے محسوس کیا وہ زندگی میں اس سے زیادہ کھیا نہ کبھی نہیں ہوا۔

”آنکھ کھلی تو خیال آیا۔ آپ کو بھی دیکھ لوں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔“ اپنی آواز میں شامل کھیا ہٹ کے عنصر کو وہ خود بھی چھپانے سے قاصر تھا۔

”میں بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوں۔ نیند نہیں آرہی۔ تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہی ہوں۔“ عفت نے گرم چائے کا کپ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

”جی جی۔۔۔ آپ جا میں۔ میں بیٹھا ہوں یہاں۔“

”آپ۔۔۔ وہ رک سی گئی۔“

”آپ کو یہاں رکنے پر کوئی زحمت تو نہیں ہوگی۔“

”نہیں نہیں۔ آپ شوق سے چلی جائیں۔ میں بیٹھا ہوں۔ آپ جائیں۔“ دل کچھ اور چاہتا تھا۔ زبان کچھ

اور کہتی تھی۔ عفت باہر نکلی تو لبوں پہ بھرتی ہنسی کو بمشکل قابو کیا۔ ابھی چند قدم ہی چلی تھی اور راہ واری کے موڑ تک بھی نہیں پہنچی تھی کہ اپنے نام کی پکار سنی۔ وہ مڑی تو معراج تیز تیز قدم اٹھاتا اس تک پہنچا۔

”میں نے سوچا میں بھی چلا چلوں باہر۔۔۔ آئی تو بہت ریلیکسڈ ہیں۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔ تو۔“ عفت نے اس کا چہرہ دیکھا۔ پھر نظریں جھکا میں۔ لب کا کونادانتوں میں دبایا اور چل پڑی۔ احاطے کے اندر موجود گھاس کا قطعہ سنان پڑا تھا۔ دور کہیں کسی اکاد کا سنگی ہنچوں پر کوئی سویا ہوا تھا۔

”میں چائے بنانے جا رہی تھی۔ تو سوچا آپ سے بھی پوچھ لوں کہ آپ۔۔۔“ اس نے بہت محتاط انداز میں بات کی، لیکن مکمل نہیں کر سکی۔

”جی میں نے دیکھ لیا تھا آپ کو۔ جب ہی تو اٹھ کر آیا تھا کہ کہیں آپ۔۔۔“ اس کے لبوں سے روانی میں جوچ نکلا تھا اور جتنی تیزی سے عفت کے چہرے پر اک شرارتی مسکان چھوئی۔ اس نے معراج سے بات مکمل کرنا مشکل کر دیا۔

”تو۔۔۔ کہیں کسی چیز۔۔۔“ ایک پل کو ان کی نظریں ملیں۔ اگلے پل دونوں ہنس رہے تھے۔



وقت ہمیشہ ایک سا گزرتا ہے۔ صرف لوگوں پر کیفیات الگ واد ہوتی ہیں تو ایسی وقت کو ہمہیے لگ جاتے ہیں۔ کہیں ادھ مرے جانور کی طرح گھسینتا ہے۔ وہ رات بھی ایک ایسی ہی رات تھی۔ الگ الگ انسانوں کے لیے الگ طرح کی ایک ہی رات۔۔۔ سوہا کے لیے وہ رات، بھری کی اضطراب میں گھلی تھی۔ نائلہ کے لیے وہ رات سخت سزا سے مشابہ تھی۔ ماہا کے لیے وہ رات صرف خدشوں اور وہموں والی رات تھی اور عفت کے لیے وہ رات بے حد حسین۔ ایک نئی مکمل اور خوب صورت زندگی کی طرف پہلے قدم کی رات تھی۔

بجر کے بعد ہی جب سورج کی روشنی نے ذرا کی ذرا اچھپ دکھائی تھی۔ اس نے جلتی آنکھوں کو مسلا اور کروٹ لینے کی کوشش کی۔ پورے جسم میں شدید تھکن کے آثار جاگے۔ شاید یہ شب بے واری کا نتیجہ ہے۔ اس نے خود ہی اندازہ لگایا اور بستر سے اٹھ کر واش روم کی سمت بڑھ گیا۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ اس نے کتنی دیر نرم اور نرم پھواروں کو جسم پر بننے دیا۔ بند دروازے کے باہر بیڈ روم میں زندگی جاگنے کی نشانیاں نمودار ہونے لگی تھیں۔ شاید خود اس کی طرح نائلہ بھی پوری رات ڈھنگ سے سو نہیں پائی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور تھا۔

”یہ بے چین جاگتی راتیں اس نے خود اپنا نصیب بنائی ہیں۔“ پتا نہیں اس کے اندر اتنا غم اور غصہ کیوں بھر گیا تھا۔ یہ ایک مرد کی اتنا پرچوٹ پڑنے کا نتیجہ تھا جو عورت کے ہاتھوں پڑی تھی یا پھر یہ ایک مبہم خواب ایک خیالی تصوراتی خوشیوں بھری دنیا کے ٹٹ جانے کا ماتم تھا۔

عفت کے نکاح کی خبر کوئی انہونی تو نہیں تھی، لیکن اس کے اعصاب اور حواس پر پتا نہیں کیوں کسی بم کی طرح پھٹ پڑی تھی۔ اس نے چہرہ اوپر اٹھایا اور شاور سے نکتے پانی کو جلتے پونوں پر تڑا تڑا برسنے دیا۔ نائلہ اور عفت۔۔۔ اس کے لیے دو عورتیں، نہیں دو سمتیں بن گئی تھیں۔ وہ ایک سمت کی طرف بڑھنا چاہتا تھا اور کوئی اسے دوسری سمت دھکیلتا تھا۔ وہ ان دونوں سمتوں کے درمیان دھکم پھیل میں تھکا جا رہا تھا۔ اسے بھائی نہیں دیتا کہ آگے کا راستہ کیا ہوگا۔ حالانکہ آگے راستہ صاف ہی تھا۔ دفعتاً اس کا کھویا کھویا ذہن بے دار ہوا۔ شاور سے پانی بننے کی رفتار دھیمی پڑ رہی تھی اور واش روم کے دروازے بردستک ہو رہی تھی۔

”ناشتا تیار ہے۔“ نائلہ کی آواز بیٹھی بیٹھی سی تھی۔ گلے میں پھنسی ہوئی۔ اس نے شاور بند کر دیا۔ ناشتا ہمیشہ

کی طرح اس کی پسند کا تھا، مگر وہ بنا کوئی رسپانس دیے نوالے نکلتا رہا۔
”آپ آفس جائیں گے یا۔۔۔“

”یا۔۔۔؟“ اس نے بے حد ناگواری سے نائلہ کو یوں دیکھا جیسے کوئی گھن آتی ہوئی چیز کو دیکھتا ہے۔ نائلہ بھی اس انداز کو سمجھتی ہی تھی۔ اس کے دل میں کوئی تیر سا گڑ گیا۔

”یا اسپتال۔۔۔ وہاں عفت رات سے اکیلی ہے اور۔۔۔“ نائلہ نے بات مکمل نہیں کی۔ حدید نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ بے چینی سے منہ ہاتھ دھو کر باہر کی طرف لپکا تھا۔ نائلہ نے بے تاثر چہرے سے اس کی بے چینی دیکھی اور رُے اٹھا کر چن میں لے گئی۔ فل اسپڈ سے بائیک اسپتال کی طرف اڑاتے ہوئے ایک ہی سوال بار بار ذہن میں اٹھ رہا تھا۔

”میں بھول گیا۔۔۔؟ میں کیسے بھول گیا کہ عفت اکیلی ہے۔ اس نے میرا کتنا انتظار کیا ہوگا۔“ وہ ایک بات اور بھول رہا تھا کہ عفت اب اتنی بھی اکیلی نہیں۔۔۔
”اس نے میرا کتنا انتظار کیا ہوگا۔ میں نے ایک فون تک نہیں کیا۔ نائلہ نے اپنے چکروں میں اتنا الجھا کر رکھا کہ۔۔۔ اف۔۔۔! وہ بے چاری اب تک میرا انتظار۔۔۔“



صبح ساڑھے چھ کا وقت تھا۔ گرمیوں کے موسم میں سورج جلدی چڑھ آتا ہے۔ ابھی دھوپ میں چھین کے اثرات اتنے زور اثر نہیں ہوئے تھے پھر بھی اسے لگا کہ اس نے ہاتھ میں موجود شاپر عفت کی جانب بڑھایا جس میں ناشتے کا سامان صاف دکھائی دے رہا تھا۔

”آپ سینڈویچ کھالیں چچی جان!“ عفت اب رضوانہ کی طرف متوجہ تھی۔
”میں اب چلتا ہوں عفت۔۔۔ یہ سامان رکھ لیں۔“ عفت نے اس کے ہاتھ سے شاپر پکڑا اور پھر سے رضوانہ کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”او حدید کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ بیٹا! یہ عفت کو دیکھو مجھے بالکل ہی مریض بنا ڈالا ہے، میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔“ رضوانہ کی محبت بھری آواز پر تینوں نے مسکرائے کی کوشش کی۔ تینوں کی کوشش ناکام رہی۔
”اور تم اتنی جلدی کیوں جا رہے ہو۔ تھوڑی دیر رک جاؤ بیٹا۔“ غالباً رضوانہ یہ سمجھ رہی تھیں کہ وہ صبح ناشتا دینے کے بہانے عفت کو دیکھنے دوبارہ آیا ہے۔

”نہیں جانے دس چچی۔ یہ رات میں یہیں رک گئے تھے۔ بہت تھک گئے ہیں۔ اب جا کر آرام کر لیں تو بہتر ہے۔“ اسپتال کے ایم ماریک والان میں بنے اس ٹھنڈے کمرے میں تیز دھوپ نکلی اور سیدھی اس کی آنکھوں میں کھب گئی۔ اس کی سوچیں ادھوری رہ گئیں اور اسے لگا اس کا وجود بھی ادھورا رہ گیا۔ عفت اکیلی نہیں تھا۔ وہاں کوئی اور بھی تھا۔ وہ وہی شخص تھا جو عفت کے تمام حقوق اپنے نام کروا چکا تھا اور فرائض کی بجائے آوری کے لیے دل سے تیار تھا۔

”اتنی صبح صبح آپ یہاں۔۔۔ خیریت۔۔۔“ حدید سے مسکرایا بھی نہیں جا رہا تھا اور اس نے کوشش بھی نہیں کی۔

”جی بس۔۔۔“ اس سے مصافحہ کرتا معراج اس عجیب و غریب لہجہ و انداز پر گڑ بڑا گیا۔
”یہ حدید ہیں۔ میری بہن نائلہ کے شوہر اور میرے خالہ زاد بھائی بھی۔“ عفت بھی حدید کو دیکھ کر اور اس کی بات سن کر حیران ضرور ہوئی تھی، لیکن حدید کی کیفیت کو اگر وہ نہ سمجھتی تو کون سمجھتا۔ اس نے بروقت خود کو سنبھال

کر پر سکون کر لیا۔ معراج پھیکے پن سے مسکرایا۔ عفت کی آواز بالکل اسی طرح نرم تھی، مگر اس کی پشت پر بیٹھا ہوا
 حدید ساکت ہو چکا تھا۔
 معراج سلام کر کے چلا گیا۔ عفت رضوانہ کو سینڈوچ کھلانے لگی، لیکن وہ اپنی پشت پر حدید کے پتھر ہوئے وجود
 کو محسوس کر سکتی تھی۔

معراج نے گھر میں داخل ہوتے ہی اپنی ماں کے ٹولتے انداز کو محسوس کر لیا تھا۔
 ”کہاں تھے تم رات بھر۔“ وہ سلام کے جواب میں سوال کرنے لگیں۔
 ”بتایا تو تھا ایک دوست کی طرف گیا تھا۔“ وہ ہتھکے ہتھکے انداز میں سلام کر کے نزدیکی صوفے پر گر سا گیا۔
 ”ایسا کون سا دوست نکل آیا تمہارا۔ جس کے لیے تم یوں اپنی راتیں کالی کرو اور آفس سے چھٹیاں کرتے
 پھرو۔“ اماں کی آواز میں شک نہیں بس ایک واضح الجھن سی تھی۔
 ”او فوہ اماں آپ بھی بس۔ بتایا تو تھا عفت کی چچی کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا ان کی عیادت کے لیے گیا تھا۔“
 ”ہاں تو۔۔۔“ وہ اب بھی نہیں سمجھی تھیں۔
 ”تو بس۔۔۔ وہیں رک گیا تھا۔“

”ہیں؟“ وہ یوں اچھلیں جیسے پچھونے ڈنک مارا ہو۔
 ”رک گیا تھا مطلب۔۔۔ پوری رات سے تم وہاں تھے۔“ انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔
 ”جی وہیں تھا۔۔۔“

”لیکن کیوں کیا ضرورت تھی تمہیں وہاں رکنے کی۔ ان کے یہاں کوئی مرد نہیں ہے۔“ حسب توقع اماں برا
 مان چکی تھیں۔ معراج نے ایک گہری سانس لی۔ رات والا ٹرانس گزر چکا تھا۔ عفت عنقریب اس گھر میں آنے
 والی ضرور تھی، لیکن ابھی آئی تو نہیں تھا۔ یہی سوچ کر اس کی پلکیں غیند سے جڑی جا رہی تھیں۔
 ”مرد ہیں، لیکن اس وقت نہیں تھے۔ بہنوئی ہیں عفت کے۔ ایک کو حیدر آباد جانا تھا۔ دوسرا اس کی بہن کے
 پاس تھا۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“

”اور وہ ان کی چچی محترمہ ان کے پاس کوئی نہیں تھا جو تمہیں کرنا پڑا۔“ ان کا لب و لہجہ تیکھا ہو گیا۔ بیٹے کی زبان
 پر چڑھی ایک دن پرانے سسرال کی مصروفیات انہیں ایک آنکھ نہیں بھائی تھیں۔
 ”تھی نا! عفت وہاں تھی اکیلی۔ اسی کا خیال کر کے رک گیا تھا میں۔“ اس نے اپنی منکوحہ نہیں بلکہ سالوں
 پرانی بیوی کی طرح عفت کا ذکر کیا تھا، لیکن عفت کے نام پر اس کے چہرے کا جو رنگ بدلا تھا۔ وہ ان جیسی جماندیدہ
 خاتون سے کیسے چھپ سکتا تھا۔ اور سے معراج کی بات۔ اس نے گویا ان کے پیروں میں پٹاخا پھوڑا۔
 ”ہیں۔۔۔ ہیں۔“ وہ بدک کر آگے پیچھے سرکی۔۔۔ جربز ہوئیں۔

”تو تم اس کے ساتھ تھے۔۔۔ رات بھر۔“
 ”جی رات بھر اپتال میں۔“ معراج بھی ان کے انداز پر زرا کسمسایا۔ پھر اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھا۔
 ”سورہا ہے ابھی جاگا نہیں۔ اٹھاؤں کیا۔“ دل میں ہوتی پکڑ دھکڑ کی وجہ سے ایک بے تکلی بات ان کے لبوں
 سے نکلی۔

”نہیں اماں پلیز اور اگر اٹھ بھی جائے تو میرے پاس مت بھیجیے گا۔ رات بھر کا جاگا ہوا ہوں۔ ذرا دیر تک سوؤں
 گا۔“ اس نے فی الفور انہیں منع کیا۔ پھر اٹھ کر ڈھیلے ڈھالے انداز میں چلتا کمرے سے نکلا۔
 ”مناشتا نہیں کرو گے۔“ انہوں نے صدمے سے باہر نکل کر اسے پکارا وہ دہلیز پر لمحہ بھر کر رک کا پھر منفی میں
 سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔

”اے ہے۔ یہ کیا ہو گیا گل کو۔ ابھی تو دوسرا دن نہیں گزرا نکاح کیے کہ ایسے لٹو ہو گئے۔ مانو اپنی نیندیں قربان کرنے کو تیار۔ اے لڑکی ہے کہ جا دو گرنی۔“ بات ہی ایسی تھی۔ پیٹ میں درد تو ہوتا ہی تھا۔ جھٹ سے بیٹی کو بلوا بھیجا۔

”اور اماں دیدہ دلیری دیکھیں خود بھی اکیلی تھی وہاں اور اسے بھی روک لیا۔ آئے ہائے کیسی بے شرمی کی بات ہے۔“

”اور نہیں تو کیا۔“ اماں نے پان کی گلوری کلمے میں دبائی۔ اور بیٹی کے سامنے مزید پھپھولے کے لیے پوزیشن سنبھالی۔

”لو پورے خاندان میں کسی کو خبر نہیں ہوئی اور یہ دونوں وہاں رات بھر اکیلے پڑے رہے۔“
 ”یہ تو ہمارے بھائی کی شرافت ہے کہ ہمیں بتا دیا۔ پتا نہیں اب اس نے بھی کسی کے کان میں یہ بات ڈالی کہ نہیں۔“

”اے لو۔ وہ کیوں بتائے گی۔ ایسی ملاقاتوں کی کسی کو بھنگدوی جاتی ہے کیا۔“
 ”مگر میں تو اماں چپ نہیں رہوں گی۔ باتوں باتوں میں عفت کی ماں سے کہوں گی ضرور۔ ان کی ناک کے نیچے یہ کھیل تماشے ہمارے خاندان میں نہیں ہوتا ایسا۔“ بیٹی ان کے جلتے پھپھولوں پر ہمدردی کے پھاہے رکھنے لگی۔
 آخر اسے بلایا کس لیے تھا۔

”چل چھوڑ۔ رہن دے۔ پتا نہیں راجو کو کیسی لگے یہ بات۔“ اب بیٹی جذباتی ہونے لگی تو ماں کو خیال آگیا۔
 ”کیسی لگے کیا مطلب۔ جیسی بھی لگے۔ بات ہے ہی غلط۔ ایک تو ہمارے علم میں لائے بغیر رات بھر وہاں رکا رہا۔ اور وہ بھی عفت کے ساتھ۔“ بہت غلط بات ہے۔“ صحیح بات کو غلط کہتے سے وہ بالکل بھول گئیں کہ عفت کوئی اور نہیں ’شرعا‘ اور قانوناً ان کے بیٹے کی عزت اور اس گھر کی بہو تھی۔ گو کہ ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس کی حیثیت کو دنیا کی کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اماں نے بیٹی کو گرم ہوتے دیکھا تو بنا کچھ کہنے گلے میں دبا پان چبانے لگیں۔

صبح اپنا ٹھنڈا روپ لے کر جانے کو تیار تھی۔ جب ماہا اور سوہانا شتالے کر اسپتال پہنچیں۔ رضوانہ نے جو دونوں بیٹیوں کو ساتھ آتے دیکھا تو سکھ کا سانس لیا۔

”سوری عفت ہمیں آنے میں تھوڑی دیر ہو گئی اصل میں رات میں اس قدر دیر سے آنکھ لگی کہ۔“ سوہانری سے عفت سے بات کرنے لگی۔ حدید خاموش سا تھا۔ مگر ان تینوں نے ایک دوسرے میں لگ کر اس کی خاموشی کو محسوس نہیں کیا۔ ان دونوں کے آنے سے پہلے عفت اور حدید کے درمیان ایک تناؤ کی سی کیفیت تھی۔ تھوڑی بہت بات چیت رضوانہ نے ہی کی حدید سے۔ اس کے بعد وہ باہر چلا گیا تو واپس نہیں پلٹا۔ یہاں تک کہ سوہانے اس سے بہت دل چاہنے کے باوجود نالکھ کی خیریت تک نہیں پوچھی۔

وہ جانتی تھی۔ حدید کے دل و دماغ میں کیا چل رہا تھا۔ وہ سوچیں نہیں تھیں۔ ایک لاوا تھا۔ جو اس کے چھیڑنے پر پھٹ پڑتا۔ اور کچھ خبر نہیں تھی اس کے عزت اور بھرم کے ساتھ ساتھ کردار کو بھی جھلسا کر رکھ دیتا۔ اس نے خاموشی اور لا تعلقی میں ہی عافیت جانی۔ یہی بہتر تھا۔

ماہا اور سوہانے کے آنے کے بعد ماحول بدل گیا۔ تینوں ہنسی مذاق کرنے کے ساتھ ساتھ ناشتا نکالنے لگیں۔ ماہا کا دل مستقل حسیب میں ہی انکا ہوا تھا۔

وہ جلد از جلد حدید اور مزہ آپی کی مشاورت سے حسیب کی گمشدگی کی رپورٹ پولیس میں کروانے والی تھی۔ اس کے علاوہ اب اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔

”رات میں معراج آئے تھے۔ چچی جان کو دیکھنے۔“ ناشتے کے بعد جب تینوں چائے پینے کے لیے باہر کا ریڈور میں نکلیں تو عفت نے جھکی پلکوں سے انہیں بتا دینا مناسب خیال کیا۔ بعد میں اگر بات کھلتی تو شاید اس کا رنگ وہ نہیں رہتا۔ جو خود سے بتا دینے میں تھا۔

”اوہو۔ وہوہ۔ اچھا۔ پھر۔“ سوہانے شوخی سے عفت کو کہنی ماری۔ وہ ہنس دی۔ ماہا بھی مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی۔

”یہ۔ یہ۔ یہ ہو رہا ہے۔ ڈیٹھیں لگ رہی ہیں۔ بھئی۔ اور وہ بھی اسپتالوں میں۔“ سوہانے کی بات پر وہ سرخ پڑ گئی۔

”جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ تو عیادت کو آئے تھے پھر۔“ وہ رک گئی۔

”پھر کیا۔“ سوہانے لا پرواہی سے مک منہ سے لگایا۔ ان دونوں کے ہی گمان میں نہیں تھا کہ وہ اگلی بات کیا بتانے

والی ہے۔

”پھر مجھے اکیلا دیکھ کر یہیں رک گئے۔“ سوہانے جلدی سے مک یوں منہ سے ہٹایا کہ اسے اچھو لگتے لگتے بچا۔ ماہا کا بھی منہ کھل گیا۔ اور اتنی دیر تک کھلی آنکھوں اور منہ سے اسے دیکھتی رہی کہ سوہانے کو صفائیاں پیش کرتی عفت نے اس کے گال پر ایک پھٹر رسید کر دیا۔

”کیا ہو گیا۔ کیا دیکھ رہی ہو پانگلوں کی طرح۔“ بری طرح جھینپ رہی تھی۔

”سوہانے دیکھو اس کو۔ کتنے مزے سے کہہ رہی ہے۔“

”ہاں تو ٹھیک ہے نا! اس میں حرج ہی کیا ہے۔“ سوہانے کھلے دل سے اس بات کو قبول کر لیا۔

آتے جاتے لوگ، نرسز اور ڈاکٹرز کے ساتھ ساتھ دور کھڑے حدید نے بھی پلٹ کر انہیں دیکھا۔ پھر ان کی طرف چلا آیا۔

”تم لوگ باہر کیوں آگئیں۔“

”ڈاکٹر آئے ہوئے ہیں راونڈر تو ہمیں باہر آنا پڑا۔“

”میں پوچھ کر آتا ہوں۔ چھٹی کب تک مل جائے گی۔“ وہ ڈاکٹرز کو دیکھتا آگے بڑھ گیا۔ ماہا کو اسے دیکھ کر ایک بار پھر حسیب کا خیال آیا۔ وہ اس سے بات کرنے کے لیے سوہانے اور عفت کو وہیں چھوڑ کر اس کے پیچھے چلی آئی۔ آٹھ دس قدم آگے آکر بھی وہ حدید کو آواز نہیں دے پائی تھی کہ اس نے مغیث حسن کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

”یا اللہ خیر! سر آج پھر یہاں۔ یقیناً“ ان کا کوئی قریبی شخص داخل ہے۔ جب ہی روز چکر لگا رہے ہیں۔“

مغیث حسن بالکل اس کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ وہ اس وقت آگے بڑھ کر سیشن کاؤنٹر تک آگئی تھی۔ جیسے ہی مغیث حسن وہاں تک پہنچے اس نے فوراً ”آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا۔“

”و علیکم السلام۔“ ان کی آنکھوں میں الجھن تھی۔ ماہانے جلدی سے اپنا تعارف کروایا۔

”سر میں آپ کے اسکول میں جا ب کرتی تھی۔ کیمپس فور میں۔“

”او اچھا اچھا۔“ وہ شفقت سے مسکرائے۔

”اور جس سال میں اپائنٹ ہوئی تھی۔ اسی سال مجھے ہسپتال پر فائنل کا ایوارڈ بھی ملا تھا۔“

”اوہ دیش گڈ۔ اب کہاں ہیں آپ۔“

”اب تو سر میری شادی ہو چکی ہے۔“ وہ ذرا جھینپ گئی۔

”یعنی ہم نے ایک قابل استانی کو کھو دیا۔“ وہ خوش گوار لہجے میں بولے۔ ماہا دھیرے سے ہنس دی۔

”سر آپ کے پاس تو میرے جیسے بے شمار ٹیچرز ہیں۔“ اس نے کسر نفسی سے کام لیا۔ وہ کچھ کہنے ہی لگے تھے کہ

کسی کے پکارنے پر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”سربیشنٹ کو دیکھ لیں۔“ وہ شاید ان کا کوئی قریبی ملازم یا سیکریٹری وغیرہ تھا۔ ماہا مسکرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ مغیث حسن سامنے بنے کمروں کی قطار میں سے ایک کی طرف بڑھ گئے۔



یہ وہی آنگن تھا جہاں اس نے زندگی کا پہلا قدم اٹھایا تھا۔ پہلا لفظ لبوں سے ادا کیا تھا۔ پہلی ہنسی، پہلی مسکراہٹ دکھائی تھی۔ پہلا آنسو بہایا تھا۔ اسے پہلی پہلی محبت کا لطف اور درد کا ملا جلا احساس اسی آنگن میں ہوا تھا۔

رخصتی کے سے ملن اور جدائی کے انوکھے سے کے حزن و خوشی میں لپٹے رنگ کا ذائقہ بھی اس نے پہلی بار یہیں چکھا۔ یہیں پہلی بار زندگی میں آنے والے پہلے مرد کی محبت تھی۔ پہلا اعتبار جو خون کے علاوہ کسی رشتے پر اس نے کیا۔ اور وہ پہلا پہلا اعتبار اسی شخص نے توڑا جو اپنی پہلی محبت کا دھوکا لے کر اسے اپنے سنگ لے کر گیا تھا۔

وہ کسی کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت نہیں تھی۔ وہ خود کسی کی پہلی محبت نہیں تھی۔ ہاں اس کی محبت جو پہلی تھی۔ اس سے ملنے والا غم ضرور اول اول کا تھا۔ اور جب یہ غم اس کے دل کا مکین بنا تو لگتا تھا۔ اس کا دل بند کر کے ہی چھوڑے گا۔ لیکن وہ بھول گئی تھی۔

ہریات، ہر واقعہ، ہر خوشی، ہر غم، پہلا تو ہو سکتا ہے مگر ضروری نہیں کہ وہ آخری بھی ہو۔ خالی سونے گھر میں ایک اکیلی اس کی جان تھی۔ اور وہ تھی کہ اب کسی صورت آنسو نہیں بہانا چاہتی تھی۔

”رونے سے نہ مسئلے حل ہوتے ہیں نہ مشکلیں آسان ہوتی ہیں۔“ ایک بار حسیب نے ہی اسے سمجھایا تھا۔ جن دنوں وہ نئی نئی پاکستان سے وہی گئی تھی۔ تو جتنی خوش تھی اتنی ہی خوف زدہ بھی۔ ذرا سی بات پر بری طرح گھبرا جاتی تھی۔ ظاہری بات تھی۔ جس نے کبھی کراچی سے باہر قدم نہ نکالا ہو یا گئی بھی ہو تو بیروں کے ساتھ چھوٹی عمر میں صرف سیرو تفریح کے لیے۔ اس کے لیے اتنی ترقی یافتہ ریاست میں تن تنہا چلے جانا۔ پھر وہیں اپنی نئی زندگی کا آغاز کرنا وہ بھی اپنے کسی گھر والے کے بغیر۔ کوئی مشکل سی مشکل تھی۔

اور اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے حسیب نے اپنی ساری طاقتیں اور توانائیاں محبتوں سمیت اس کے لیے وقف کر دی تھیں۔ ایسے ہی ایک دن جب ایک مال میں حسیب کے ساتھ شاپنگ کرنے کے لیے نکلی تھی تو حسیب سے ذرا سی دیر کے لیے پچھڑ گئی تھی۔ اس نے ہونقوں کی طرح آس پاس مڑ کر گھوم پھر کر دیکھا تھا۔ اور پھر بے حد چمکتی دکتی۔ پیشے کی دیواروں سے بھری اس مہکتی ہوئی دکان سے باہر نکلی تو اس کا چہرہ اس قدر سفید پڑ چکا تھا۔ کہ کوئی بھی اس کی شکل دیکھ کر پہچان سکتا تھا کہ وہ کس مشکل میں پڑ گئی ہے۔

اس نے سامنے لگی گرل سے نیچے جھانکا۔ وہ لوگ اس وقت ایک شاپنگ مال کے فرسٹ فلور پر ہی تھے۔ لیکن اسے یوں لگا تھا جیسے وہ ساتویں آسمان سے بھی اور کہیں کھڑی ہے۔ ہر جگہ اجنبی چہرے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ ہر چند کہ وہاں اردو بولنے والوں کی کثیر تعداد تھی۔ لیکن اسے نہ کوئی آواز آرہی تھی نہ کوئی زبان سمجھ آتی تھی۔ بس کچھ ہی دیر گزری کہ اس کے آنسو ابلنا شروع ہو گئے۔

حالانکہ حسیب دس منٹ سے بھی کم وقت میں اسے ڈھونڈنا واپس پہنچ گیا تھا۔ ماہا اس وقت دھواں دھار آنسو بہاتی دو تین خواتین کے جھرمٹ میں کھڑی تھی اور اس قدر خوف زدہ تھی کہ اپنی جگہ سے ایک انچ سرکنے کو تیار نہیں تھی۔

حسیب کی آواز نے اسے آوازوں کے ہجوم میں سے ڈھونڈا وہ بے قراری سے انٹھی تھی۔ اور حسیب سے چمٹ

کر اسی وقت وہیں اتار روئی تھی کہ اچھا خاصا تماشا ہی لگ گیا تھا۔ حسیب ہنس بھی رہا تھا اور پریشان بھی تھا۔ ابھی بھی اس کے لبوں پر ان لمحات کو سوچ کر ایک بھولی بھری مسکراہٹ آن رکی۔ وہ چند لمبے مسکراتی رہی۔ پھر جانے کیا بات یاد آئی کہ بے اختیار ہنس پڑی اپنی ہی ہنسی کی آواز اس کے لیے اجنبی سی تھی۔ وہ چونکی اپنے ارد گرد دیکھا۔ اور اس کے لب سکڑ گئے۔

”کہاں چلے گئے حسیب، کہاں ڈھونڈوں میں آپ کو۔“ صحن میں پڑی کرسیوں میں سے ایک پر گھٹنے موڑے اس نے بازو لپیٹے اور ان پر سر رکھ دیا۔ کوئی اداسی سی اداسی تھی۔ کوئی مایوسی سی مایوسی تھی۔

کیا ہے سفر وفا کی منزل کا
نہ کوئی حل دلوں کی مشکل کا
دھڑکن دھڑکن بکھری رہ بجشیں
سانسیں سانسیں ٹوٹی بندشیں
کہیں تو ہر لمحہ ہونٹوں پر فریاد ہے
کسی کی دنیا چاہت میں برباد ہے
یا رب دے دے کوئی جان بھی اگر
دلبرہ ہونہ دلبرہ ہونہ کوئی اثر

لفظ کسی دکھ کی صورت گنگناتے ہوئے اس کے دل سے سماعتوں تک کا سفر کر رہے تھے تو تب ہی نیچے سے کچھ چمپل پہل کی سی آوازیں آئیں۔ پھر تائی اماں کی آواز وہ اسے نیچے بلا رہی تھیں۔ وہ ڈھیلے ڈھالے! تہہ موموں سے بیڑھیاں اتری اور سامنے والے کمرے میں داخل ہوئی۔ سامنے ہی کرسیوں پر مزہ آپی براجمان تھیں۔

”آئی۔! آپ۔“ اس کے گمان کی حدوں سے بھی کوسوں دور تھا۔ کہ وہ اس طرح بالکل اچانک اور وہ بھی بغیر اطلاع کے چلی آئیں۔

”ہاں میں۔ کیوں کیا ہوا۔“

”نہیں کچھ نہیں۔“

”کیا ہوا بہت ست لگ رہی ہو۔ لگتا ہے گہری نیند سے جگا دیا میں نے آکر۔“ ان کا لہجہ بہت تیکھا تھا۔

”نہیں میں جاگ ہی رہی تھی۔“ وہ ان کا چہرہ نہیں دیکھ رہی تھی۔ بوکھلا کر اس نے بالوں میں اٹنے سیدھے ہاتھ مارے۔

”اچھا۔۔۔ لگتا تو نہیں۔“ وہ طنز پر طنز کیے گئیں۔ ماہانے اپنی مدد کے لیے تائی اماں کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ تاپا ابا بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

”کیا لیں گی آپ! چائے تو نہیں پیئیں گی۔ آج گرمی بہت ہے میں۔ کولڈ ڈرنک منگواتی ہوں۔“ اسے آداب میزبانی کے بہانے سے ان کے سامنے سے اٹھنے کا موقع مل گیا۔

”نہیں یہاں اپنی خاطر میں کروانے نہیں آئی۔ اکلوتا بھائی لاپتا ہے میرا۔ میری تو بھوک پیاس نیندیں سب اڑ گئی ہیں۔ تمہیں ٹھنڈا گرم سوجھ رہا ہے۔“ ان کے تیوروں کی طرح آواز بھی بگڑی ہوئی اور بلند تھی۔

”میرا بھی آرام چین سکون سب ختم ہو گیا ہے آپی! میں خود بہت پریشان ہوں۔ مگر آپ پلیز کچھ خیال کریں۔ میرے تاپا ابو بیمار آدمی ہیں۔ انہیں حسیب کے بارے میں کچھ نہیں پتا۔“ وہ حتی الامکان آواز سچی رکھ کر منمنائی تھی۔

”کیا بات ہے بہن! کیا ہو گیا۔ کس بات پر ناراضی ہے۔“ تائی اماں یقیناً ”معاہدہ بھانپ گئی تھیں۔ اس لیے کمرے میں آکر رسائیت سے پوچھنے لگیں۔

”یہ تو آپ اپنی بیٹی سے پوچھیں۔ کس بات کی ناراضی تھی اس کی میرے بھائی سے جو اسے اس قدر تنگ کیا۔ اس قدر عاجز کیا۔“

”میرا حسیب سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔“ ماہانے دبی دبی آواز میں جانے کس کو صفائی پیش کی تھی۔

”جھوٹ بولتی ہو تم۔ میں نے خود سنی تھیں آوازیں تمہاری جس دن تم میرے گھر سے واپس آئی ہو۔ حسیب تمہیں لے کر جانا چاہتا تھا۔ اس نے سب بتا دیا تھا۔ مجھے۔“

”بہن آپ بیٹھ کر آرام سے بات کریں۔“ تائی اماں نے ایک اور کوشش کی۔

”نہ مجھے بیٹھنا ہے۔ نہ آرام سے بات کرنی ہے۔“

ماہانے بسی سے دوسری جانب دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں بھرنے لگیں۔ شدید بے بسی کا وہی احساس اسے لپٹنے لگا جو اس شاپنگ مال میں اسے گھیرے میں لے رہا تھا۔ اسے لگا وہ آج ابھی ابھی حسیب سے بچھڑی ہے۔ اور دنیا کے سب سے رحم لوگوں کے درمیان کھو گئی ہے۔ حسیب کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے۔ اب اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔ نہ حالات کی سفاکی سے۔ نہ بے رحم الفاظ کے لپکتے چابک سے وہ حسیب کو کبھی ڈھونڈ نہیں سکے گی۔ ایسی بھی کیا ضد سوار ہو گئی تھی اسے۔ کونسی اڑچن آئی تھی جو یہ اٹھری گھوڑی کی طرح قابو میں ہی نہ آئی۔

”بہت شوق ہے آپ کو سننے کا۔ کیا ضد تھی مجھے۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں سر اٹھایا۔

”تو سن لیں کان کھول کر۔ ہاں میں نے جھگڑا کیا تھا۔ آپ کے بھائی سے۔ ہاں ہاں۔ میں نے بدزبانی کی تھی۔ میں نے انہیں دھتکار دیا تھا۔“ تائی اماں۔ عفت اور مزنا آپی رک کر اسے دیکھنے لگیں۔

”کیونکہ آپ کا بھائی کنوارا نہیں ایک بچے کا باپ تھا۔ اور اس نے یہ بات مجھ سے چھپائی تھی۔ جو اتفاق سے مجھے پتا چلی۔ لیکن میں مان گئی تھی۔ خدا گواہ ہے۔ میں ان کے ساتھ جانے کو رضامند ہو گئی تھی۔ لیکن میرے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس عورت سے آپ کے بھائی کے تعلقات برداشت کرتی۔ جو آپ کے بھائی کے ناجائز بچے کی ماں ہے۔“

عفت کا منہ کھل گیا۔ تائی اماں کی آنکھیں اہل آئیں۔ عفت کے ہاتھ ڈھیلے ہو کر پہلوؤں میں لٹک گئے۔ اور مزنا کے چہرے پر مرگ کی سی سفیدی چھا گئی۔

”کیا بکواس کر رہی ہے لڑکی۔ جو منہ میں آ رہا ہے بولے جا رہی ہے۔“ اب کے وہ بولیں تو ان کی آواز ایسی کھوکھلی تھی۔ جیسے کوئی خالی تانے میں منہ ڈال کر بھونپو بجانے کی کوشش کرے۔ پھٹا ہوا اور بیٹھا ہوا بھونپو۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ اس نے بے دردی سے اپنے گالوں پر بہتے آنسو گر ڈالے۔

”یقین نہیں آتا تو اس عورت کو فون کر سید اور پوچھیں کہ وہ حسیب کے فلیٹ میں کیا کر رہی ہے اتنے دن سے۔“ عفت اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہٹی تھی۔ اس نے صرف گردن گھما کر بولتی ہوئی ماہا اور پھر پھٹی ہوئی آنکھیں لیے مزنا کو دیکھا۔

”ہاں یہ سچ ہے۔“ وہ چلائی اور زور سے بلک پڑی۔

”آپ اس اذیت سے نہیں گزریں جس سے میں گزر رہی ہوں۔ آپ تو کچھ بھی نہیں جانتیں۔“ وہ سینے میں منہ چھپائے بری طرح سک رہی تھی۔ عفت بھی قریب آ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی اسے پکارتے لگی۔ مزنا سر جھکا کر باہر نکل گئیں۔

کچھ دیر پہلے وہ اپنی نیند بھوک اور پیاس اڑنے کا ذکر زور شور سے کر رہی تھیں۔ نیند اڑنا بھوک پیاس مرجانا اور شرم و اذیت کے گڑھے میں اترنا کیسے کہتے ہیں۔ یہ انہیں اب معلوم ہوا تھا۔



حدید کے علاوہ اس وقت اور کوئی مرد اسپتال کے چکر لگانے کے لیے دستیاب نہیں تھا۔ ماہا کی فون پر روٹی روٹی آواز سن کر وہ چونک گیا۔

”کیا بات ہے۔ تم رو رہی ہو۔“ ماہا کے گلے میں پھندے سے لگنے لگے۔

”نہیں بس آپ مجھے لے چلیں امی کے پاس۔“

”اوکے! آس سے آؤں گا تو لے چلوں گا۔“ انداز بتا رہے تھے کہ کوئی بات ہے ضرور لیکن اگر وہ نہیں بتانا چاہتی تھی تو پھر حدید نے بھی اصرار نہیں کیا۔

مغرب کے بعد اس نے نماز ادا کر کے دیر تک امی کی صحت یابی اور اپنی قسمت کی بگڑی لکیوں کی درستی کی دعا مانگی۔ بندے اور دعا کا رشتہ دنیا کا سب سے خاص رشتہ ہے۔ یہ رشتہ انوکھا بھی ہے۔ سب سے مضبوط بھی اور سب سے سچا بھی۔ بندہ جب بھی دعا مانگے دل سے مانگے یا نہ مانگے لیکن جھوٹے منہ کبھی نہیں مانگتا۔ ایسا نہیں ہوتا کہ اس کا دل نہ چاہے اور وہ پھر بھی دعا کرے یا اللہ فلاں بندے کا بھلا کر۔

یہی رشتہ ہے جو ازل سے ابد تک قائم ہے۔ یہی رشتہ ہے جو ربط ہے خالق اور مخلوق کے درمیان بندے اور بندہ نواز کے مابین، یہ وہ رشتہ ہے جس کا رنگ کائنات کی کسی اور شے سے نہیں ملتا۔ جس کی خوشبو دنیا کے کسی پھول سے لیے گئے رس سے نہیں بن سکتی۔ اور اس کا ذائقہ وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں۔ جنہوں نے اس رشتے کو کبھی آزمانے کی کوشش نہ کی ہو۔ کیونکہ یہ دنیا کا بلکہ ماروائے دنیا بھی وہ واحد اور اکیلا رشتہ بھی ہے۔ جو انسان سے اس کی پیدائش کے ساتھ جڑتا ہے اور پھر کبھی ٹوٹتا نہیں۔

اللہ اور اس کے بندے کے درمیان دعا کا رشتہ وہ واحد رشتہ ہے۔ جو انسان کبھی نہیں توڑتا۔ موت کے بعد بھی نہیں توڑنا چاہتا۔ کوئی لاکھ اللہ سے ناراض ہو لیکن پھر بھی کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں اس کے لبوں سے اللہ کی یاد اور اس کی بات ضرور نکلتی ہے۔

بندہ لا شعوری طور پر ہی خدا سے فریاد کرتا رہتا ہے۔ اور شکوہ کناں بھی ہوتا ہے۔

اس نے بھی جائے نماز رکھ کر اپنے چہرہ صاف کرتے ہوئے وہ ازلی سکون دل میں اترتا محسوس کیا۔ جو خدا کے راز و نیاز کے بعد انسان کی رگ سوپے میں اتر کر اسے شانت کر دیتا ہے۔

”حدید بھائی آئے ہیں یا ہریائیگ پر تمہیں بلا رہے ہیں اسپتال جانے کے لیے۔“ تھوڑی دیر بعد جب وہ منہ ہاتھ دھو کر تقریباً تیار ہی تھی۔ تب عفت نے اندر آ کر اسے بتایا۔

”تم چچی کو بتاؤ گی مزہ آپی کے بارے میں۔“ اپنا بیگ اٹھا کر اس میں چیزیں رکھتی ماہا کا ہاتھ رک گیا۔ پھر اس نے عفت کو دیکھا۔

”تم کیا کہتی ہو۔“

”میرا نہیں خیال کہ تمہارا ایسا کوئی ارادہ ہے۔ اور اگر ہے۔ تو بہت غلط“ ماہا نے سر ہلایا اور بیگ کندھے پر ڈال لیا۔ پھر اپنی بھرتی موقوف کر کے قدم قدم چلتی عفت تک آئی۔ عفت جو کسی اور دھیان میں گم تھی۔ اسے یوں اپنے پیاس رکتے دیکھ کر چونکی۔ ماہا نے اس کے کندھے تھام کر آنکھوں میں جھانکا۔

”زندگی کے سفر میں ہم جس پڑاؤ کو منزل سمجھ لیتے ہیں۔ جب ہم پر منکشف ہو جائے کہ یہ ہماری منزل نہیں۔ تو سفر جاری رکھتے ہوئے پڑاؤ کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جانا چاہیے۔
کیونکہ وقتی پڑاؤ چاہے کتنا ہی سرسبز شجر کیوں نہ ہو۔ بہر حال وہ وقتی ہوتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے آگے سفر جاری رکھنے کو ترجیح دی۔

وہ مسکرائی۔ دونوں ہاتھوں سے عفت کے گال سہلائے اور اور پھر تیزی سے اللہ حافظ کہتی باہر نکلی۔ جاتے جاتے تائی اماں کو سلام کیا۔ جو اس کی شام والی باتوں پر ابھی تک دکھ اور گہرے غم کے حصار میں تھیں۔ قریب جا کر جلدی سے مگر نرمی سے ان کے شانے دبائے۔
انہوں نے گہری سانس بھر کر اس کے ہاتھوں کو اپنے بوڑھے ہاتھوں سے تھپکی دی۔ وہ باہر نکل کر حدید کے پیچھے بیٹھ گئی۔



سوا کے سامنے اس نے خود پر ضبط کے کڑے پہرے بیٹھائے لیکن ماں کے سینے سے لگتے ہی کتنے بہت سے آنسو ان کے کمزور سینے میں جذب ہوتے چلے گئے۔ رضوانہ بھی دیر تک اسے خود سے چمٹاتے اپنی ممتا کی پیاس بجھاتی رہیں۔ انہیں اولاد نرینہ کی بہت آرزو رہی تھی۔

اپنے شوہر کی زندگی میں۔ وہ ہمیشہ اپنی مجازی خدا کے سامنے اس خواہش کا اظہار کرتی تھیں کہ ان کا ایک بیٹا بھی ہونا چاہیے لیکن ان کے انتقال کے بعد جب خواہش نے حسرت کا روپ دھارا تو اس حسرت کو دل کے کسی بے حد پوشیدہ نہاں کونے میں دفن کر کے اپنی ساری ممتا ان ننھی نازک بریوں پر نچھاور کر دی۔
ان کی زندگی کا محور و مرکز یہی بیٹیاں بن گئیں پھر ان کے دل سے کبھی اپنے لیے دعا نہیں نکلی۔ سوائے ان بیٹیوں کے نصیب کے انہوں نے باری تعالیٰ سے کچھ نہیں مانگا۔

”کیا بات ہے۔ آج میری بیٹی۔ بہت اداس ہے۔ کیا حسیب کی یاد آرہی ہے۔ جسے ماں کی آڑ میں چھپایا جا رہا ہے۔“ وہ بنا جواب دیے سینے میں منہ چھپائے پڑی رہی۔
اب ان سے کیا کہتی۔ اسے لگا کہنے سننے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا۔ یا پھر اتنا کچھ ہے کہ لفظوں میں سمیٹا جا نہیں سکتا۔

سوا البتہ بہت غور سے سنجیدہ چہرہ لیے اسے دیکھتی رہی۔ ماہا کا اس طرح چلے آنا جبکہ ڈاکٹر آج رات ہی ڈس چارج کرنے کو کہہ رہے تھے۔ اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی جا کر بات کی تھی۔ پھر امی سے یوں لپٹنا اور آنسو بہانا۔ وہ حدید کو امی کے ساتھ مصروف پاتے ہی ماہا کو لے کر باہر نکلی۔
”کیا ہوا۔ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔“

”مزنہ آئی آئی تھیں۔“ اس نے بتانے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اسے فیصلہ کرنے اور نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ سوا کو کوئی بات بتانے یا چھپانے کا فیصلہ کر رہی ہے۔ اسے جلد یا بدیر بات اسے بتانا ہی ہوتی تھی۔ کیونکہ یاں کے بعد وہی اس کی سب سے قریبی رازدار تھی۔ وہ اس سے اپنے دل کی ہر بات شیئر کرتی تھی۔
سوا نہ صرف تسلی سے سن لیتی تھی بلکہ کبھی اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق مشورہ بھی دے دیتی تھی۔
بہنوں کا رشتہ تو اللہ نے بنایا ہے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ہے۔ بہنوں کو کوئی بات بری لگے تو وہ ناراضی کا اظہار بھی کر دیتی ہیں۔ عمر کا فرق زیادہ ہو تو چھوٹیوں کو ڈانٹ بھی پلا دیتی ہیں۔ بہنوں کے بچ بولنے پر جھڑتی بھی ہیں۔

اور پھر اپنے آگے رکھی پلیٹ کا کھانا ان کو دے دیتی ہیں۔ ماں جاتی کو اکراماں کا دو سرا روپ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ اس نے بھی سب سے پہلے بہن کے سامنے اپنا دل کھولا۔

”تو پھر کیا ہوا۔ کچھ کہہ رہی تھیں۔“

”جو باتیں فون پر کرتی تھیں وہی کر رہی تھیں کہ مجھے اپنے شوہر کی گمشدگی کی کوئی فکر نہیں اور میں پتا نہیں کیا

نہیں پوری کر رہی ہوں اور۔ پتا نہیں کیا کیا۔“

”تم نے کیا جواب دیا۔“ ماہا کی نظریں پہلی بار اٹھ کر سوہا سے ملیں۔

”میں نے انہیں جو بھی جواب دیا ہے۔ اب انہیں مجھ سے سوال کرنے سے پہلے سوچنا پڑے گا۔“ دونوں ایک

دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتی رہیں۔ سوہا نے اس سے دوبارہ نہیں پوچھا بلکہ نظریں ہٹا کر داہنی طرف دوڑنے

کاوش کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”بہت اچھا کیا۔ کچھ لوگوں کو شرافت کی زبان سمجھ نہیں آتی۔“

”وہ جو صاحب کھڑے ہیں نا!“ رسمیشن پر۔“ اس نے سوہا کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے موضوع

بدل دیا۔

”میرے اسکول کے اوزر تھے نا! مغیث حسن۔ ان کا لی اے ہے۔“

”اچھا!“ سوہا نے سرسری سا غور کرنے کے بعد اس کی طرف رخ موڑا۔

”مغیث سر بہت ہمدرد انسان ہیں۔ بہت دیر اول۔ جتنا ان کے پاس پیسہ ہے نا! اسی حساب سے خرچ کرتے

ہیں خدا کی راہ میں۔ کبھی کسی ضرورت مند کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے۔“ وہ چند لمحے مزید ان کی تعریف کرتی رہی۔ پھر

سوہا سے بولی۔

”کل میں اور جدید بھائی جائیں گے تھانے۔“ وہ ناخن کھرچ رہی تھی۔ سوہا نے پیار سے اسے دیکھتے ہوئے اس

کے چہرے پر سرسراتی لٹ کان کے پیچھے اڑی۔ اور اسی پیار بھرے لہجے میں بولی۔

”تم فکر مند مت ہو ماہا۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اسے اپنی بہن کی پریشانی کا احساس تھا۔ لیکن وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سوائے زبانی کلامی تسلی

دینے کے۔ اب یہ جو پولیس تھانے کے چکر کل سے شروع ہونے والا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ بظاہر اس سے اتنے

حوصلے سے بات کرنے والی ماہا۔ حقیقت میں اندر سے اس سے بھی زیادہ گھبرا رہی ہوگی۔

وہ بھلا کب گئی تھی زندگی میں تھانے وانے۔ وہ تو اسپتال میں بھی شاید اپنی پوری زندگی میں دو سری بار ہی رک

رہی تھی۔ ماہا نے گہری سانس لی۔ اور تھکے تھکے انداز میں بیچ سے اٹھی۔

اس کا ہر عمل اس کی ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ اور بوجھل اعصاب کا غماز تھا۔ وہ چاہے اظہار بے شک نہ

کرتی۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ بے حد تھک چکی تھی۔ جب سے حسیب کے شادی شدہ ہونے کا انکشاف ہوا

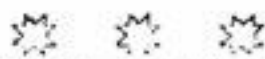
تھا تب سے اب تک اس کی ازویواجی زندگی بے حد لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھ رہی تھی۔

وہ ایک ایسی کشتی میں سوار تھی۔ جس میں کوئی سانول نہ تھا۔ وہ حادثات کے منجھار میں اپنی ناؤ کو ڈوبنے سے

بچانے کے لیے تن تنہا ہی لڑ رہی تھی۔ اور اتنی ہی اناڑی بھی تھی۔ اور اتنی ہی گہرائی میں بھی۔ نہ اپنی ناؤ واپس

موڑ سکتی تھی۔ نہ مہارت سے کھیلنا جانتی تھی۔ بس وقت کی کروٹوں میں دب جانے والے لمحات کھیچتی اور کبھی

پشت پر رہ جانے والے وقت کی یادیں بچاتی جی رہی تھی۔



وہ بہت دیر سے اپنی بیگم کی بے چینی اور مضطرب کیفیات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ وہ کبھی پاس آکر بیٹھ جاتیں۔ چند لمحے پہلو بدلتیں پھر بنا کچھ بولے اٹھ کر چلی جاتیں۔ کبھی بے مقصد آگے پیچھے شہلتیں۔ اس پاس کی چیزیں درست کرتیں۔ پھر گاڑتیں۔ پھر درست کرتیں۔

وہ بہت صبر اور تحمل سے ان کی حرکات و سکنات پر غور کرتے ہوئے اس بات کے انتظار میں تھے کہ اپنی اندر کی سوچوں کے گھمسان سے تنگ آکر وہ خود ہی بول پڑیں گی۔ یہ بات بھی ان کے علم میں تھی کہ پچھلے چند دنوں میں ان کے اکلوتے سارے حسیب کی اچانک گمشدگی نے نہ صرف بیگم بلکہ گھر پر بھی اثر ڈالا تھا۔ نہ صرف گہرا بلکہ بہت برا بھی۔

وہ خود ایک بے حد زمانہ اور موقع شناس آدمی تھے۔ ان کی اور مزہ کی سالہا سال کی بھرپور خوشیوں، بھری رفاقت میں جہاں مزہ کی وفا اور سلیقہ شعاری کی اپنی جگہ تھی۔ وہیں ان کی مزاج کی نرمی اور صلح جو طبیعت کا بھی بہت ہاتھ تھا۔

مزہ نے اپنی ذات اور زندگی سے جڑی ہر خوشی اگر ان کے ساتھ بانٹی تھی۔ تو زندگی کی طرف سے ملنے والے ہر غم پر آنسو بھی صرف ان کے سامنے بہائے تھے۔ ان کی زندگی لاجواب تھی۔ ان کی جوڑی مثالی تھی۔ ان کی ذہنی ہم آہنگی مکمل تھی۔ ان کی رفاقت بھرپور تھی۔ اسی کا اعتماد اور سہارا لے کر وہ مزہ کی طرف سے بات شروع کرنے کے منتظر تھے۔ انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

رات کے کھانے اور نماز کے فارغ ہو کر بہت دیر تک اللہ کے حضور گڑ گڑانے اور آنسو بہانے کے بعد اپنا چہرہ صاف کر کے وہ دودھ کا گلاس لے کر ان کے پاس آئیں، تو نہ صرف خاصی حد تک کمپوزڈ تھیں۔ بلکہ ایک طرح سے کچھ پر سکون بھی لگ رہی تھیں۔

”آج میں گئی تھی ماہا کے گھر۔“ انہوں نے دودھ کا گلاس ان کی طرف بڑھایا۔ اور خود گھوم کر دوسری طرف بیڈ پر آ بیٹھیں۔

”یہ تو آپ نے صبح بھی بتایا تھا مجھے کہ آپ کا ارادہ وہاں جانے کا ہے۔ لیکن اس کی وجہ آپ نے صبح بھی نہیں بتائی تھی۔“

”میں اس کے پاس صرف اور صرف حسیب کی وجہ سے ہی جا سکتی ہوں۔“ حسب توقع اپنی سوچ سے باہر آ کر انہیں چڑنے میں دیر نہیں لگی۔

”لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کو وہاں جانے کی ضرورت کیوں پڑی۔ جبکہ وہ بارہا آپ کو بتا چکی تھی کہ اسے حسیب کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ اور اس کا کوئی جھگڑا بھی نہیں ہوا۔“

”وہ تو۔۔۔ وہ تیزی سے بولنے لگیں۔ پھر بے ساختہ لب بھینچ لیے۔

”میں۔۔۔ میں۔۔۔ آپ کو بتانا چاہتی ہوں لیکن ہمت نہیں پڑتی۔“

”کیا بات کہی ہے۔ کچھ بتاؤ تو سہی۔ کچھ تو بتاؤ۔“

”میں اصل میں اسے دیکھ کر خود پر قابو نہیں رکھ سکی۔ میں نے اس سے دو چار نامناسب باتیں کہہ دی تھیں۔“

بدلے میں اس نے ایسی بات بولی کہ میں میرا صبر و قرار سب کٹ گیا۔ ان کی آواز بھرا گئی۔ گلارندھ گیا۔ ”اس نے کہا کہ حسیب کنوارہ نہیں بلکہ ایک بچے کا باپ ہے اور بچہ۔ بھی۔ نا جائز۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔ صادق صاحب کے گلے میں پھندا لگ گیا۔ انہیں زور کی کھانسی آئی اور دودھ چھلک گیا۔

﴿بندہ کرن 254 اکتوبر 2015﴾

مزنہ اس باقاعدہ رونے لگی تھیں۔

بھرائی ہوئی آواز اور رے رے کے الفاظ میں وہ مستقل ماہا کو ہی برا بھلا کہے جا رہی تھیں۔ جس نے ان کے معصوم بھائی پر اتنا گھناؤنا الزام لگایا تھا۔ صادق صاحب اپنی بیگم کو زندگی میں پہلی بار ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار ہوتا دیکھ رہے تھے۔

گوکہ وہ مستقل ”میرا بھائی ایسا نہیں ہے اور وہ ایسا نہیں کر سکتا“ کے الفاظ دہرا رہی تھیں۔ لیکن شاید وہ خود ہی کہیں اس یقین میں بڑنے والی درازیں دیکھ رہی تھیں۔ انہیں ماہا کی بات کا ذرہ برابر یقین نہیں تھا۔ وہ اسے جھٹلا رہی تھیں، لیکن کھوٹے پن سے۔

مزنہ کے برخلاف صادق صاحب کو ماہا کی کسی گئی بات پر فوراً ہی یقین آ گیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ ان کا سالہا اور اکلوتا سالہا کوئی کردار کا کچا شخص تھا۔ بلکہ ایک حد تک اگر دیکھا جاتا تو اس نے زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے جو جدوجہد کی تھی۔ اس پر انہیں فخر ہی محسوس ہوتا تھا، لیکن جس زمانے کی اور جس ماحول کی یہ بات کی گئی تھی اس میں اس کا بسک جانا، مستقل کام اپنوں سے دوری اور جانوروں کی طرح بے فیض تھکن سے نڈھال ہو کر کچھ دیر کے لیے کسی چھاؤں میں سستا لینے کا عمل اتنا بھی انوکھا یا نرالا نہیں تھا۔

وہ یقیناً ”بعد میں سنبھل گیا ہوگا۔ لیکن لمحوں کی لغزش یوں اسی کی زندگی پر محیط ہو کر اسے اپنوں اور غیروں کے سامنے رو لے گی، یہ اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔ صرف چند منٹوں کے دوران ہی میں وہ حقیقت اور گمان کا کوسوں لبا سفر کر کے واپس لوٹے تھے۔ باہر مزنہ ان کی منتظر تھیں اور انہیں ان سے کچھ تو کہنا ہی تھا۔



سوا اٹھ کر اندر امی کے پاس چلی گئی اور حدید بھی ڈاکٹرز کی طرف بڑھ گیا۔ وہ تب ہی کتنی ہی دیر خالی پن سے وہیں بیٹھی اپنے ہاتھوں کی لکیریں کھوجتی رہی۔ ان آڑی تر چھ لکیروں میں شاید کہیں اس کی زندگی کی وہ خوشیاں چھپی تھیں جو اس سے روٹھ گئی تھیں یا شاید ابھی ان میں مزید آناکائشیں چھپی بیٹھی تھیں۔ حسیب کی گمشدگی کی مشکل جیسی کچھ اور۔۔۔ دل کو مرہ کر دینے والی۔۔۔ لایعنی سوچوں میں گھرے ایک سے دوسرے سمت تک کا سفر کرتے وہ جانے کتنی دور نکل گئی تھی۔ اپنے آس پاس کے ماحول سے بالکل دور اور بے خبر۔

اس وقت کوریڈور میں اچانک ہی ایک ہنگامہ جاگ اٹھا۔ نرسز وارڈ بواٹز اور ان کے ساتھ مینیٹ حسن کی سیکرٹری کو اس نے تیز قدموں سے ایک کمرے کی جانب بڑھتے دیکھا۔

”سرہوش میں آتے ہی سانس اکھڑنے سی لگی تھی۔“

”نورا“ آئی سی یو میں لے کر جا بیٹھے، گوئی کس۔“ ڈاکٹرز کی پیشہ ورانہ آواز اور وہاں مچی ہلچل نے وقتی طور پر ماہا کو کسی گہری سوچ سے باہر نکالا تو وہ ایک دم سہمی گئی۔

”الٹی خیر۔ پتا نہیں کس کی زندگی داؤ پر لگی ہے۔“ وہ گھبرا کر تیزی سے اٹھی اور امی کے پاس جانے کے لیے آگے بڑھ گئی۔ وہ مگر کبھی یہ بات نہیں سوچ سکتی تھی کہ داؤ پر لگنے والی زندگی کسی اور کی نہیں، اس کی اپنی ہے۔ اسے اندر آتے دیکھ کر سوا جو امی کے پاس بیٹھی اٹھ کر کہنے لگی۔

”کینٹین سے چائے ہی لے آؤ۔ سوکھے منہ بیٹھا نہیں جا رہا۔“

”بھی لاتی ہوں۔ باہر ذرا کوئی ایمر جنسی ہے۔“ اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ چند لمبے بیٹھری نسبت اب ذرا سکون تھا۔ وہ باہر نکل کر ست قدموں سے چلتی کینٹین کی سمت بڑھنے لگی۔ کینٹین میں ڈسپوزا بیل گلاس ختم ہو چکے تھے۔ اس نے مجبوراً ”وہیں کے چینی کے کپوں میں چائے اور تھوڑی دیر میں واپس کرنے کا کہہ کر ہاتھوں

میں تھا۔ واپس آئی تو کوریڈور کے آغاز پر ہی حدید مل گیا۔

”کہاں چلے گئے تھے آپ۔ میں چائے لینے گئی تھی تو سوچا آپ کے لیے بھی لے لوں، مگر آپ نظر ہی نہیں آئے۔“ حدید اس کی بات کے جواب میں پھلکے پن سے مسکرا دیا۔ ماہا نے اس کے برابر میں چلتے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔

”کیا بات ہے بڑے چپ چپ سے ہیں۔“

”میں چپ چپ ہوں، نہیں تو ہاں لیکن تم۔“ اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ دوسرے سرے سے کسی مریض کو دوسری جگہ منتقل کیا جا رہا تھا۔ غالباً ”انتہائی نگہداشت میں۔“ حدید جگہ کم ہونے کے باعث تیزی سے آگے نکل گیا۔ حدید چند قدم آگے جا کر رک گیا اور ہٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ نظروں کے تصادم پر وہ ذرا سا مسکرائی اور بالکل برابر سے گزرتے اسٹریچر پر نظر ڈالی۔ ایک بے حد سرسری نظر لمحے سے بھی کم وقت کی اچھتی ہوئی بے معنی۔ اور کبھی کبھی ایک نظر ہماری زندگی بھر کی بھارتوں کو اندھا کر دیتی ہے۔ لمحے بھر کا منظر پوری زندگی کی فلم کو کرپٹ کر دیتا ہے اور کبھی کبھی چلتی پھرتی زندگی محض ایک بل میں فالج زدہ ہو کر وہیں ٹھہر جاتی ہے، جہاں وہ بھاری لمحہ زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ وہ بھاری لمحہ جو ہیتی خوشیوں کے تمام وقتوں کو اپنے ذہنی پیر تلے کچل دیتا ہے اور بڑے بڑے دکھ اس کے آگے ہیچ نظر آتے ہیں۔

اس کی زندگی میں بھی وہ لمحہ بے حد آہستگی سے داخل ہوا اور اس کی شہ رگ پر اپنا پیر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چلتے چلتے ٹھہری۔ پھر ساکت ہوئی۔ پھر بت بنی اور بالا خربے جان۔ ابھی ابھی اس نے اپنے بالکل برابر سے جس شخص کو بے حس و حرکت دوسروں کے سہارے پیوں لگے بستر پر جاتے دیکھا تھا۔ جسے وہ اجنبی سمجھ رہی تھی۔ وہ اجنبی نہیں تھا۔ اس کی پوری زندگی کا عنوان تھا۔ اس کے بے جان ہاتھوں سے لبالب بھرے کپ چھوئے اور ایک چھناکے کی زوردار آواز کے ساتھ ٹکڑوں کی صورت میں زمین پر بکھر گئے۔ شاید اس کے اپنے وجود کی طرح۔ اس نے فقط چند لمحے اسٹریچر کو خود سے دور جاتے دیکھا اور حدید نے اس کو ساکت ہو کر دوبارہ جنبش کرتے کسی شناسا نام کی صورت ایک چیخ اس کے حلق سے نکلی اور دوسرے بل وہ بھاگتی ہوئی جا کر اس بے سدھ وجود سے لپٹ گئی۔

”حسیب۔ حسیب!“ وہ رو نہیں رہی تھی۔ وہ ایک بار کے بعد دوبارہ چیخ بھی نہیں۔

اسٹریچر دھکیلتی نرس اور دوسرے لوگ رک کر اس نیمہائل عورت نما لڑکی کو لہجے سے دیکھنے لگے۔ جو آکسیجن ماسک میں چھپے چہرے اور نلکیوں میں جکڑے ہاتھ پیروں کو بری طرح جھنجھوڑتی شاید اسے جگانے یا ہوش دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

حدید بدحواس سا بھاگ کر آیا اور سارا معاملہ ایک نظر میں سمجھ گیا۔ ڈاکٹر زاب اسے سنبھالنے کی سعی کر رہے تھے۔ حدید نے اسے شانوں سے تھاما۔ گوکہ اس قدر اچانک اور اس قدر شدید ذہنی دوچوکا جو حسیب کو وہاں اس حال میں دیکھ کر اسے پہنچا تھا۔ اس سے خود کو فوری طور پر باہر نکال پاتا۔ نہ صرف خود کو بلکہ جو اس کھوئی ماہا کو سنبھالنا اتنا آسان نہ تھا۔ مگر یہی انسانی فطرت ہے اور یہی زندگی ہے۔ ماہا نے بے حد تڑپ کر اپنے شانے پر جسے حدید کے ہاتھ جھٹکے اس وقت وہ بالکل جلال میں آئی کسی مست انگ کی مانند لگ رہی تھی۔

”پلیز۔ پلیز۔ ان کو سنبھالیں۔ پشنت کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔“ ایک نرس نے وہیں رک کر التجا آمیز انداز میں حدید سے کہا اور ماہا کو تھاما۔

”ریلیکس لی لی! ریلیکس۔“ اس نے تڑپ کر اپنے بانوؤں سے نکلتی ماہا کو دیکھا۔ جواب دہور جاتے حسیب کے بیڈ کو دیکھتی چیخنے لگی تھی۔

”ہشوش۔۔۔ جانے دو مجھے۔“
 ”پلیز انہیں سنبھالیں۔“ ایک ڈاکٹر کی پکار پر اس نے ماہا کو چھوڑا۔ حدید سے کہا اور دوڑتی ہوئی دوپہلی گئی۔
 حدید نے فوراً ”آگے لپکتی ماہا کو دونوں بازوؤں میں جکڑ لیا۔ خود کو چھڑانے کی کوشش کرتی، ماہا تھک کر ناکام ہو کر
 رک گئی اور پھوٹ پھوٹ کر روتی زمین پر ڈھلے گئی۔ اسے بازوؤں سے تھامے اس کے ساتھ بیٹھتا ہوا حدید بے
 بسی کی انتہا پر پہنچ کر اپنے آنسو پیئے لگا۔



رات زیادہ گہری نہیں ہوئی تھی۔ لیکن کمرے میں کھل اندھیرے کی وجہ سے آدھی سے زیادہ بیت جانے کا
 گمان ہو رہا تھا۔ منزہ کا ہموار شخص گہری نیند میں جانے کی گواہی دے رہا تھا۔ وہ پوری طرح تسلی کرنے کے بعد
 کمرے سے باہر آئے اور دھیرے سے دروازہ بند کرتے ہوئے جیب میں پھر تھراتے موبائل کو کچھ کوفت کے ساتھ
 باہر نکالا۔ ان کے موبائل پر مسلسل کسی کی کال آرہی تھی، لیکن منزہ کی خراب حالت کے پیش نظر انہوں نے ان
 کے سامنے کوئی بھی کال اینڈ کرنے سے پرہیز ہی کیا تھا۔ خرد منزہ کا اپنا موبائل انہوں نے کافی دیر ہوئی آف کر دیا
 تھا۔ ورنہ جس قدر بکھری ہوئی ناغی کیفیت میں منزلہ چلی گئی تھیں ان سے کچھ بعید نہ تھا کہ پھر سے ماہا کو کال کریں یا
 اس سے منسلک کسی بھی شخص کو فون کر کے کچھ بھی کہنا شروع کر دیں۔ اسکرین پر چمکتے ان جانے نمبر سے۔ ان کا
 دل بھی انجانے انداز میں دھڑک اٹھا۔ دل ہی دل میں ”یا کریم“ کا ورد کرتے ہوئے انہوں نے فون کان سے لگایا۔
 ”السلام علیکم! میں حدید بات کر رہا ہوں۔ آپ مجھے پہچانئے۔“ آواز اور انداز انہوں سے ملتا تھا لیکن۔
 ”آپ حبیب کے۔“

”جی میں حبیب کا دوست بھی ہوں اور ماہا کے سہوئی انس کا بھائی بھی۔“ اس کی آواز ٹھہری ہوئی اور لہجہ بہت
 ہموار تھا۔ پھر بھی اس نے تعارف کی غیر ضروری تفصیل شاید خود کو سنبھالنے کے لیے استعمال کی تھی۔
 ”جی جی۔ فرمائیے۔“ دوسری جانب اس نے ایک گہری سانس لی اور آنکھوں کو زور سے بند کر کے کھولا۔
 ”حبیب کا پتا چل گیا ہے۔“

”جی۔ کیا۔ کب۔ وہ ٹھیک ہے۔“ ایک پل میں ان کے دل پر کیا کیا نہیں گزر گیا۔ امید۔ خدشہ۔
 قیامت۔ انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی خود کو کسی بھی قسم کی بری خبر کے لیے تیار کر لیا۔ لیکن دوسری جانب جو
 کچھ حدید نے بتایا۔ انہیں سمجھ نہیں آیا کہ وہ نہیں یا رو میں۔ خدا سے شکوہ کریں یا شکر ادا کریں۔
 ”فی الحال وہ کوئے میں ہے۔“

”اومائی گاؤ۔“ وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں صوفے پر گر گئے۔

”منزہ کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ بہت ڈسٹرب ہے۔“

”جی۔“ حدید نے ایک نظر سوہا کے بازوؤں میں بے حال ہوتی ماہا پر ڈالی۔

”اور وہ بچی ماہا۔ وہ کیسی ہے؟“ سے بتادیا۔ ”نہیں بالا خرابا کا خیال آئی گیا تھا۔“

”وہ بھی۔ ڈسٹرب ہے۔“

”اسے بتادیا تم نے۔“

(باقی آئندہ)

یارِ الٹی

”ارے سنا ہے جمال نے ثمن کو طلاق دے دی ہے۔“ عمران نے پاس بیٹھی فرحت کو بتایا تو وہ یہ سن کر اچھل پڑی۔

”ہیں، کیا طلاق دے دی، لیکن کیوں؟“ فرحت نے جواباً آنکھیں پھاڑے پوچھا تھا۔
”اندر کی بات ہم کیا جانتے ہیں۔ جو سنا من و عن تمہیں سنا دیا۔“

”چلو۔ اچھا کیا اندر کی بات بھی پتا چل ہی جائے گی، لیکن یقین نہیں آتا۔“ وہ ابھی بھی بے یقینی کی حالت میں تھی۔

”یقین بھی آجائے گا۔“ عمران مسکراتے ہوئے بولی تھی۔ فرحت محض اسے دیکھ کر رہ گئی۔
”اچھا چائے پیو گی۔“ عمران نے اس سے پوچھا اور کچن کی جانب جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔



”تم نے خبر ہی ایسی ظالم سنائی ہے کہ چائے پینے کا من نہیں کر رہا۔“ فرحت کے لہجے میں دکھ تھا۔ عمران نے جواباً اسے گھور کر دیکھا اور بولی۔

”اری اودھیاری بنی زیادہ جذباتی نہ ہو، چائے پینی ہے تو تیار نہ میں اپنے لیے بنا لاتی ہوں۔“

”اچھا بنا لا۔“ عمرانہ کچن کی جانب بڑھ گئی جبکہ فرحت دھیاری پھر کسی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔



”میں کہتی ہوں، ثمن بتا دے کیوں چپ بیٹھی ہے، طلاق کیوں دی اس نے تجھے۔“ ثمن جب سے آئی تھی چپ چاپ کمرے میں بند تھی، سب وجہ پوچھ چکے تھے، لیکن ثمن لب سے بیٹھی تھی۔

”اماں جب کوئی وجہ ہے ہی نہیں تو کیا بتاؤں۔“ آخر وہ جھنجھلا اٹھی تھی۔

”تو ایسے ہی تجھ منحوس پر طلاق کا ٹھپا لگا دیا اس نے۔“ اماں اس کی بے نیازی پر کھول ہی اٹھی تھیں، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تھی۔

”دیکھ ثمن کچھ تو بتا، آخر اتنی بڑی بات بغیر وجہ کے تو ہو نہیں سکتی۔“

”ٹھیک ہے اماں تجھے وجہ چاہیے ناتوسن، لیکن سننے کی بھی ہمت رکھنا۔“ اماں نے اسے حیران نظروں سے دیکھا تھا۔

”وہ کہتا ہے میں پیسے کی مشین بن جاؤں۔“ آخر اس نے اگل ہی دیا۔

”کیا مطلب؟“

”اماں اتنی بھولی نہ بن سمجھ لے۔“ وہ تلخی سے ہنسی تھی اور یہ سن کر اماں کا لگتا تھا سچ بچ ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔



”ہائے، بس بڑا ہی افسوس ہوا قسم سے سن کر۔“ دوسرے دن ہی عمرانہ اور فرحت ثمن کے گھر آ موجود تھیں۔

”لیکن وجہ کیا ہوئی؟“ فرحت نے کرید اٹھا۔

”بس فرحت، بس کیا بتاؤں نصیب مارے ہوں تو بندے کا کیا قصور۔“ اماں نے اک سرد آہ بھری اور پھر بولیں۔

”کم بخت نشہ کرتا تھا۔ نہ کام کا نہ کالج کا، الٹا ثمن کو مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ بس یہی وجہ تھی، بس (اماں سچ چھپا گئی تھیں۔ آخر سچ بولتیں تو بدنامی اپنی ہی ہوتی نا۔)“ اماں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا جبکہ پیچھے دروازے پر کھڑی ثمن اماں کی اس اداکاری پر داد دیتی رہ گئی تھی۔

”واہ اماں تو بھی کیا کمال کی اداکارہ ہے۔“ وہ ہولے سے بڑبڑائی اور پھر ایک عجیب سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے واپس کمرے کی جانب مڑ گئی۔

”لیکن، بس یہ تو لومیرج تھی نا۔“ عمرانہ بھلا کیسے پیچھے رہتی۔

”کیڑی مرچ۔“ اماں نا سمجھی کے عالم میں بولیں۔

”ارے میرا مطلب محبت کی شادی کی تھی نا۔“

”اچھا ہاں بس اس وقت اس لڑکی کی عقل پر پردے پڑ گئے تھے جو اس کے جھانے میں آگئی، ہائے میری پھول سی پنکی۔“ اماں نے ایک دفعہ پھر رونا شروع کر دیا

تھا جبکہ عمرانہ اور فرحت ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتیں رہ گئیں۔



ثمن اور جمال کی پہلی ملاقات، نازیہ (ثمن کی دوست) کے گھر ہوئی تھی۔ جمال نازیہ کے چچا کے کزن کا بیٹا تھا۔ نازیہ کا چچا سویتلا تھا، لیکن پھر بھی ان لوگوں کا ایک دوسرے کے گھر آ جانا تھا۔ جمال اور ثمن کی پہلی ملاقات نازیہ کی منگنی پر ہوئی تھی۔ پھر دوسری دفعہ ایک ہوٹل میں اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا گیا اور آخر کار یہ ملاقاتیں ایک زور دار محبت میں ڈھل گئیں۔ جمال ایف اے پاس ایک دفتر میں کلرک کے عہدے پر فائز تھا۔ ماں باپ کسی گاؤں میں رہتے تھے، لیکن یہ نوکری کی وجہ سے شہر میں رہائش پذیر تھا۔ شکل صورت اچھی تھی۔ کما بھی اچھا خاصا لیتا تھا۔

بھابھی نے دھمکی دی تھی۔
 ”واہ آری او سن یہ گھر میرے ماں باپ کا ہے تیرا یا
 تیرے شوہر کا نہیں۔ نہ تو میکے سے لائی ہے اس لیے یہ
 تڑی کسی اور کو دکھانا سمجھی۔“ اس نے نخوت بھرے
 لہجے میں کہا اور پیر پختی دو سری جانب بڑھ گئی۔ جبکہ
 بھابھی تو اس کے یہ تیور دیکھ کر جم سی گئی تھیں۔



دن پر لگا کر گزر رہے تھے۔ شمن کو آئے دو ماہ سے اوپر
 ہو گئے تھے۔ گھر والے جمال کو فون کر کے تھک چکے
 تھے، لیکن (باقی گھر والوں کو اصل کہانی کا ابھی تک پتا
 نہیں تھا) نہ جمال فون اٹھا رہا تھا اور نہ خود ان سے
 رابطہ کر رہا تھا۔ شمن کا بڑا بھائی تین دفعہ اس کے آفس
 بھی ہو آیا تھا اور آفس کی زبانی پتا چلا تھا کہ جمال نوکری
 چھوڑ چکا ہے یہ صورت حال کافی کشیدہ ہو گئی تھی اور نہ
 اس معاملے کا کوئی سراہا تھ لگ رہا تھا، لیکن سارے
 معاملے میں صرف ایک شخص مطمئن تھا اور وہ تھی
 شمن۔

جو عورتیں گھر بسانا نہیں چاہتیں وہ کوئی بھی
 معمولی سا بسانا بنا کر گھر کو اور خاص کر کے میاں بیوی
 کے رشتے کو توڑنے میں پل بھر نہیں لگاتیں پھر چاہے
 انہیں طلاق ہو یا کچھ اور انہیں رتی بھر فرق نہیں پڑتا
 کیوں کہ انہیں گھر جو نہیں بسانا ہوتا پھر کا ہے گی
 پروا۔ اور شاید شمن کی سی ایسی عورتیں ہوتی ہیں
 جنہیں نہ رشتوں کا تقدس پتا ہوتا ہے اور نہ لحاظ کا
 پاس۔ انہیں صرف اپنا آپ عزیز ہوتا ہے، عورت تو
 قربانی دے دے کر جیتی ہے اور زیادہ تر قربانیاں عورت
 کے حصے میں ہی آتی ہیں، لیکن کچھ عورتیں شمن جیسی
 بھی ہوتی ہیں جنہیں صرف پیسہ، عیش و عشرت اور اپنا
 آپ ہی اچھا لگتا ہے، رشتوں کو نبھانا ان کی طرف سے
 جائے بھاڑ میں۔ انہیں صرف اپنے آپ سے ہی
 غرض ہوتی ہے بس۔



”جمال تم کہاں چلے گئے تھے بنا بتائے۔“ جمال

شمن کے ماں باپ کو اور کیا چاہیے تھا۔ بس پھر چیٹ
 منگنی ہوئی پٹ بیاہ اور یوں شمن اپنے تین کمرے کے
 مکان سے اٹھ کر دو کمرے کے فلیٹ میں آئی۔ شمن
 اس سب میں خوش تھی آخر محبت کا نیا نیا خمار جو چڑھا
 تھا۔ پورے محلے کو خبر تھی کہ محبت کی شادی کی گئی تھی،
 لیکن اب طلاق کا ہو جانا محلے کے لیے تعجب کی بات تو
 تھی۔

پورا محلہ افسوس کر کے گیا تھا اور ساتھ ساتھ
 قہقہے بھی، لیکن شمن کو کوئی پروا نہ تھی اور ماں بھی اس
 کی لاپرواہی دیکھ کر خاموش ہو گئی تھیں۔ انہیں اپنی
 معصوم اور پھول سی بچی کی بات کا یقین جو آگیا تھا۔ وہ
 اس کے کمرے میں آئیں تو دیکھا شمن بیڈ پر بیٹھی ہزار
 ہزار کے نوٹ گن رہی تھی۔ اس نے اک نظر اماں پر
 ڈالی اور دوبارہ نوٹ گننے میں مشغول ہو گئی۔
 ”ارے تیرے پاس اتنے سارے نوٹ کہاں سے
 آئے۔“ اماں نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

”اتنے سارے! اونہہ! اماں صرف دس ہزار ہیں یہ
 بھی چرالے آئی ورنہ وہ تو ایک پھولی کوڑی تک نہ
 دیتا۔“

”اور وہ جو دو تو لے زیور اس نے ڈالا تھا وہ۔“ اماں کو
 اب زیور کا غم کھائے گیا۔

”اوہو اماں بتایا تو ہے مجھے اتنا موقع نہیں مل سکا کہ
 کچھ اٹھاتی رات کو اس نے کہیں پھینک آنا تھا۔ بس
 میں عزت بجا کر بھاگ آئی۔“ اس نے نوٹ گن کر
 پرس میں ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

”ہائے کیڑے پڑیں اسے، مرجائے ٹرک کے نیچے
 آئے منحوس بارا۔“ اماں پھر بدجسامیں دینا شروع
 ہو گئیں جبکہ شمن اس ڈرامے سے تنگ آکر باہر نکل
 آئی تھی۔

”ارے شمن ذرا کچن تو صاف کر دو۔“ وہ باہر نکلی ہی
 تھی کہ آگے بڑی بھابھی نے حکم نامہ سنا دیا تھا۔

”بھابھی مجھے کام کرنے کی عادت نہیں ہے آپ کو
 پتا ہے۔“ اس نے دو ٹوک کہا۔

”لیکن اب یہاں رہنا ہے تو کام تو کرنا پڑے گا۔“

سب سے پہلے اپنے گاؤں آیا تھا۔

”اماں یہ بڑی لمبی کہانی ہے اور شاید یہ کہانی میری قسمت کی گرہ بھی کھول گئی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ اماں نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

”اماں جس آفس میں میں کام کرتا تھا نا، وہ میرے بچپن کے دوست اکبر کے ابو کا ہے۔“

”کیا رشیدہ کے بیٹے کا۔“ اماں نے حیرانی سے

پوچھا۔

”جی اماں۔ بس یہ سب مجھے اتفاقاً پتا چلا اب اکبر چاہتا ہے میں اس کے دینی کے آفس میں بطور میجر کام کرو، اسی سلسلے میں کراچی چلا گیا تھا اب سب کام منٹ گیا ہے ایک دو ہفتے تک چلا جاؤں گا۔“ اماں نے یہ سب سن کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

”شکر ہے تیرا اللہ، تو نے ہم غریبوں کی سن لی۔“ اماں نے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور اس پاک ذات کا شکر ادا کرنے لگیں۔ جمال نے محض اماں کو مسکرا کر دیکھا۔

”اماں ثمن کا کوئی فون وغیرہ آیا یا نہیں۔“ اس کے چہرے پر اب پریشانی کے آثار تھے۔

”نہیں کیوں؟“ اماں نے غور سے اسے دیکھا تھا۔

”اماں وہ مجھ سے لڑکے گئی ہے، آپ کو پتا تو ہے تھوڑی جذباتی ہے، میں منالوں گا۔“ اس کے لمبے میں یقین تھا اور اس کے جواب میں اماں نے صرف ایک بات ہی کہی ”یہ جو جذباتی بن ہوتا ہے نا یہ عورت کو تباہ کرتا ہے۔“ وہ خاموش ہو گیا تھا۔

جمال کئی مرتبہ ثمن کے موبائل پر ٹرائی کر چکا تھا، لیکن اس کا فون پاور آف مل رہا تھا اس کا پرانا موبائل کہیں کھو گیا تھا جس میں ثمن کے گھر والوں کے نمبرز تھے۔ اب ان سے رابطہ کرنا تو کیسے کرتا، اسے پتا تھا۔ ثمن نے جان بوجھ کر موبائل آف کیا ہوا ہے اسے پتا تھا کہ ثمن کافی ضدی طبیعت کی مالک تھی۔

”میں اسے منالوں گا۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے مسکرایا تھا۔

”ثمن تیاری کر لو کل سب ہم تمہارے ابا کے

گاؤں جا رہے ہیں۔“

”نہیں وہ کیوں؟“ اس نے جواباً پوچھا تھا۔

”تمہارے بڑے تایا کے بیٹے کی شادی ہے انہوں نے دعوت نامہ بھیجا ہے۔“ اماں نے کہا۔

”تو پھر؟“

”کیوں تم نے نہیں جانا کیا۔“ اماں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ ترنت بولی تھی۔ اماں نے اگ نظر اسے دیکھا اور بولیں۔

”چل جیسے تیری مرضی۔“ اماں نے بھی زیادہ اصرار نہ کیا تھا۔



”عمران کل دوپہر کو میرے گھر آجانا۔“ ثمن نے رات کو اسے پیغام بھیجا تھا۔

”مگر تمہارے گھر والے۔“

”وہ شادی پہ گاؤں جا رہے ہیں، اگر ملنا ہے تو آجانا

اور ہاں کوئی اچھا سا گفٹ بھی لے کر آنا۔“

اس نے ساتھ ہی فرمائش کر ڈالی تھی۔

”ٹھیک ہے، پھر کل ملاقات ہوتی ہے۔“

”اوکے بائے۔“ اس نے یہ کہہ کر فون کاٹ دیا تھا۔

اس نے سب کے جاتے ہی داخلی دروازے پر تالا لگا دیا تھا تاکہ یہ ظاہر ہو گھر میں کوئی نہیں ہے، عمران کو اس نے دو بجے کا ٹائم دیا تھا اور دو بج چکے تھے۔ اس نے گھر کی پچھلی سائیڈ والا دروازہ کھولا تھا۔ گھر کے پچھلی سائیڈ والی گلی ویران پلاٹ پر مشتمل تھی اس لیے عمران کو وہاں سے آتے جاتے کوئی نہ دیکھتا۔ وہ پوری تیاری کر کے بیٹھی تھی۔

سوا دو بجے پچھلے دروازے پر کسی نے ہلکی سی دستک دی تھی۔ اس نے فوراً دروازہ کھولا۔ آگے عمران تھا۔ وہ اسے پچھلے کمرے کی جانب لے آئی تھی۔

”پورے پندرہ منٹ لیٹ آئے ہو۔“ وہ مصنوعی ناراضی سے بولی۔

”یار تمہارے لیے گفٹ لینے چلا گیا تھا وہاں دیر

سے بولی تھی اور پھر ایک جھٹکے میں اٹھ کر پلنگ پر
سیدھی بیٹھ گئی، مگر کادرد کہیں دور جاسویا تھا۔
”السلام علیکم! مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ ثمن کے گھر
والے کہاں گئے ہیں، میں جمال ہوں، ثمن کا شوہر۔“ وہ
اس وقت عمرانہ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا پوچھ رہا
تھا۔ عمرانہ کو یہ سب سن کر اپنا سر چکراتا ہوا محسوس
ہو رہا تھا۔

”شش۔ شوہر، مگر ثمن۔“ وہ منہ میں بڑبڑائی۔
”آپ نے کچھ کہا۔“ جمال نے شائستہ لہجے میں
پوچھا تھا۔

”نہیں۔ نہیں کچھ نہیں، آپ چائے پیئیں گے یا
ٹھنڈا۔“
”نہیں، کچھ نہیں، پلیز آپ کے پاس اگر ثمن یا
اس کے گھر والوں کا نمبر ہے تو دے دیں۔“ اس نے
جواباً کہا تھا۔

”یہ شکل سے تو اچھا خاصا منڈب اور شریف دکھتا
سے اور پڑھا لکھا بھی لگتا ہے، مگر ثمن۔۔۔“ اس نقطے پر
آکر پھر اس کی سوچ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔
”پلیز مجھے ذرا جلدی ہے۔“ وہ دوبارہ بولا تو وہ
چونکی۔

”میرے پاس صرف گھر کا نمبر ہے، موبائل نمبر
نہیں ہے آپ تھوڑا انتظار کر لیں، ابھی آتے ہی
ہوگے۔ کُل کے گئے ہوئے ہیں۔“ عمرانہ نے بھی
شگفتہ انداز میں کہا۔

”لیکن امی، ان کا پچھلی گلی والا دروازہ تو کھلا ہوا ہے،
میں سلیمان کے ساتھ گیند لینے پچھلے پلاٹ پر گیا تھا تو
کسی آدمی کو پچھلے دروازے سے جاتے ہوئے دیکھا
تھا۔“ ٹیپو کے بتانے پر جہاں عمرانہ چونکی تھی وہاں
جمال بھی چونک گیا تھا۔

”اوکے باجی آپ کا بہت بہت شکریہ، میں جا کر دیکھ
لیتا ہوں۔“ اجازت لے کر وہ بیرونی دروازے کی جانب
بڑھ گیا تھا اور اس کے جانے کے بعد عمرانہ نے فوراً
فرمت کو فون ملایا تھا۔

ہو گئی تھی۔“

”اچھا کیا لائے ہو۔“ اس نے بے تابی سے پوچھا
تھا۔

”اپنا دل۔“ وہ بوفرانہ انداز سے بولا۔

”بد تمیز بتاؤ نا“

”یہ لو خود دیکھ لیں۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑا شاپرا سے
تھمایا تھا۔

”واہ، میک اپ کٹ۔“ اس نے ڈبا کھول کر دیکھا
اور خوشی سے چلائی۔
”پسند آئی۔“

”ہاں بہت اچھا ہے۔“ وہ مسکرائی تھی۔
”اچھا چائے پوٹے یا ٹھنڈا۔“ اس نے میک اپ کٹ
ڈبے میں ڈالا اور پگن میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی
ہوئی۔

”کچھ نہیں، بس تم میرے پاس بیٹھو۔“ جواباً
عمرانہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”پہلے کچھ تمہاری خاطر مدارت کر لوں پھر۔“ اس
نے ہنستے ہوئے کہا اور بڑے اشائل سے اس کا ہاتھ
جھٹک دیا تھا۔

”ہماری خاطر مدارت یہی ہے کہ تم میرے پاس
بیٹھو۔“ یہ کہتے ہی عمرانہ نے اسے زور کا جھٹکا دیا تھا اور
وہ اس کے اوپر آگری تھی اور اچانک ہی کوئی کمرے
میں داخل ہوا تھا ثمن کی نظر نظر اور پر پڑی اور پھر اٹھنا
بھول گئی تھی۔



”ارے ٹیپو جا کر دیکھ دروازے پر کون ہے۔“ کوئی
بڑی دیر سے دروازہ کھٹکا رہا تھا۔
”دروازہ تڑوائے گا کیا۔“

”سن لیا اماں، تو تو کان کھا جاتی ہے۔“ وہ کمرے
سے باہر نکل آیا تھا۔

”اماں کوئی جمال نامی مرد آیا ہے، ثمن باجی کا پوچھ رہا
تھا۔“ عمرانہ کے سر پر پہاڑ گرا۔

”جمال، ارے اندر بلا اسے، کم بخت۔“ عمرانہ زور



”یہ ثمن نے تالا کیوں لگا دیا۔ دروازے پر۔“ اماں نے گیٹ پر تالا لگا دیکھ کر کہا تھا۔
”تمہیں گنی ہوگی۔“ بڑا بھائی بولا۔
”تو اب کیا یہاں گرمی میں ہی سڑتے رہیں گے۔“ اماں کو غصہ آ گیا تھا۔

”اماں میرے پاس پچھلے دروازے کی چابی ہے چلیں آجائیں سب۔“ درمیانہ بھائی بلند آواز کہہ کر آگے بڑھ گیا تھا اور اس کے پیچھے وہ سب۔



دروازے پر کوئی اور نہیں جمال کھڑا تھا وہ یک دم ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی، لیکن اب دیر ہو چکی تھی کیوں کہ اب ابا، اماں، بھائی، بھابھیاں سب اس کمرے میں آگئے تھے۔ وہ سب کبھی حیرت سے جمال کو دیکھتے اور کبھی اسے۔ وہ ہمیشہ کے لیے گر چکی تھی گندگی کی طرف پستی کی طرف دھڑم دھڑم نیچے بہت نیچے۔ اس کی بساط، الٹ چکی تھی۔ سب خاموش تھے، کوئی کچھ نہ بولا تھا۔ ابا کے کندھے اور جھک گئے تھے بھائیوں کی نظروں اور نیچے ہو گئی تھیں۔ بھابھیاں ایک دوسرے کو دیکھ کر معنی خیز سرگوشیاں کر رہی تھیں اور اماں وہ تو پتھر اگنی تھیں۔ جمال وہ تو ساکت کھڑا تھا، بے جان، لیکن جب سکتہ ٹوٹا تو۔۔۔

”میں اب تمہیں طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، ثمن میں، تمہیں طلاق دیتا ہوں“ کہہ کر نکلا نہیں تھا۔ نکل گیا تھا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ سیدھا راز کھل چکا تھا اس عورت کی اصلیت سامنے آچکی تھی۔ اس عورت کو عورت کہنا تذلیل نہیں ہے عورت کی؟ عورت ایسی تو نہیں ہوتی۔ ثمن سر جھکائے کھڑی تھی۔ کبھی نہ اٹھانے کے لیے۔



”میں کہتی تھی نا یہ ثمن کے لچھن ٹھیک نہیں تو بہ تو بہ مرد کو طلاق کا پتا نہیں اور بیوی نے مشہور کر دیا“

طلاق دے دی۔ لڑائیاں تو ہر گھر میں ہوتی ہیں، لیکن جن عورتوں نے گھر نہ بسا نے ہو وہ تو معمولی بات کو بھی رائی کا پہاڑ بنا لیتی ہیں، ایسی عورتیں کسی ایک کے پاس نہیں نکلتیں۔ شکر ہے جمال کی جان چھوٹی۔“ عمرانہ محلے کے ہر گھر جا کر ثمن نامہ بیان کر رہی تھی۔ لوگوں کا اور کام ہی کیا ہے، پھیلتی بات کو اور پھیلانا۔

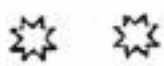


”تو پیدا ہوتے ہی کیوں نا مر گنی ثمن مرجاتی تو اچھا ہوتا۔ ارے مجھے کیا پتا تھا میں ایسی لڑکی پیدا کرنے جا رہی ہوں، جو ہمارے لیے باعث شرمندگی ہوگی تو نے تو ہمیں جیتے جی مار دیا، مرجا گندگی کی پوٹ مرجا۔“ باقی گھر والوں نے تو چپ سا دھلی تھی۔ صرف اماں ہی تھیں جو اسے کوس رہی تھیں، لیکن وہ ساکت تھی خاموش۔۔۔

”بس، تو ایک اور احسان ہم پر کروے تو یہاں سے چلی جا۔“ اماں نے اسے حقارت کی نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ تڑپ اٹھی تھی۔

”میں کہاں جاؤں گی اماں۔“ سکتہ ٹوٹا تو سہم گئی۔
”مست بول اماں میں تجھ جیسی بد کردار کی ماں نہیں ہو سکتی۔“ ایک اور تیر اس کے دل میں کھبا تھا۔ وہ اپنے مقام سے اور نیچے گر گئی تھی۔

”رات گزار لے، صبح ہوتے ہی چلی جانا اور شادی کر لینا اپنے اسی یار سے جس کے لیے تو نے یہ سارا کھیل کھیلنا، جمال جیسا ہیرا تیرے قابل تھا ہی نہیں۔“ اماں چلی گئی تھیں اور وہ اس کے پاس تو کچھ بچا ہی نہ تھا۔ عزت بھی چلی گئی اور میک اپ بھی فرش پر بکھرا اپنی بد قسمتی پر رو رہا تھا۔ ثمن کی بازی اسی پر الٹ گئی تھی عورت کے پاس اور کچھ ہو یا نہ ہو عزت ضرور ہونی چاہیے۔



سیمانت عاصم

خاتون



لوگ یونہی تو نہیں اپنوں کی لغزشوں کو درگزر کر دیا کرتے ہیں۔ رشتے، محبت سے منسلک ہوتے ہیں۔ محبت! جو روح میں اتر جاتی ہے۔ پھر اسے اکھاڑ چھینکنا اتنا سہل کہاں ہوتا ہے۔ انسان ٹوٹ جاتا ہے۔ ہار جاتا ہے۔ جھک جاتا ہے۔ یہ ہار، رشتے کو مضبوط کرتی ہے۔ محبت کی بقا ہے۔

ہم اکثر یہ سمجھتے ہیں
جسے ہم پیار کرتے ہیں
اسے ہم چھوڑ سکتے ہیں
مگر ایسا نہیں ہوتا!!
محبت دائمی بیج ہے
یہ اکثر ٹھہر جاتی ہے
ہماری ذات کے اندر
ہماری بات کے اندر
مگر یہ کم نہیں ہوتی
کبھی بھی کم نہیں ہوتی۔



یہ ایک نہ دو سالوں پر پھیلی کہانی تھی
میری دادی، بیا کے والد کی استاد تھیں۔ انہوں نے
میرے والد کے ساتھ کلام پاک پڑھا۔ ان دونوں کے
درمیان بھی دوستی کا ٹوٹا رشتہ تھا۔ میرے والدین کی
شادی کے کچھ عرصے بعد بیا کے والدین کو محبت نے
آن گھیرا، جو شادی پر منج ہوئی، امی بارات میں شرکت
کے ارادہ سے حج درج کر پھینچیں تو پتا چلا بارات کسی دور،
دراز کے گاؤں جائے گی۔ اس وقت بھائی جان ان کی
گود میں تھے۔ وہ واپس لوٹ آئیں۔ کہ سفر طویل تھا۔
بعد ازاں امی کی بیا کی امی سے گاڑھی چھنی۔ میں اور بیا
تقریباً، ہم عمر تھے۔ میں نے آنکھ کھلتے ہی بیا کا ساتھ پایا
تھا اور گزرتے وقت کے ساتھ ہماری دوستی انٹوٹ ہوئی
چلی گئی تھی۔

میرے پاس آج بھی ان یادوں کی یادگاریں موجود
ہیں۔ تصویریں۔ تحریریں۔ بہت سے انٹرنیٹ پیجے، ساتھ
رہنا۔ کھیلنا، ہنسنا، روٹھنا، منانا، پھر چھت پر جا کر چپکے چپکے

صبا میری کزن تھی اور بڑی بھانج بھی!
”اس کا کہنا کرنا میرے لیے ہمیشہ سے مشکل رہا
تھا۔ یہ بات وہ بھی جانتی تھی۔ اسی لیے، اس رات
شادی کی سالگرہ کا انوشیشن فون پر دینے کے ساتھ، مجھے
ڈنر کی تیاری بھی سوچی تو مجھے اپنے ہزار کاموں کو پھٹکار
کر لیک کہنا ہی تھا۔ یہ اور بات کہ اس سے میرے
فرشتوں تک کو خبر نہ تھی کہ اگلے روز بھائی جان کے
گھر کا صدر دروازہ کھولنے والی تو یہ ہوگی۔ میری دیرینہ
اور عزیز از جان دوست! جو کبھی میرے لیے بیا تھی!
عرصہ ہوا، بس اک لغزش و خلش کے سبب تعلق و
مراسم کی ہر ڈور ٹوٹ گئی تھی۔ شاید میں اگلے قدموں
لوٹ آئی۔ مگر مجھے صبا سے کیے وعدہ کا پاس تھا۔ پھر
عدنان مجھے دروازے تک چھوڑ کے جا چکے تھے۔ مجھے
قدم بڑھانے ہی تھے۔ بیا مسکراتی ہوئی مجھ سے آگلی تو
مجھے بھی تھوڑی بہت گرم جوشی دکھائی پڑی! گھر میں
سنائے گونج رہے تھے۔ پتا چلا بھائی جان، صبا سمیت
عائب ہیں! ان کے ٹھنڈے ٹھار بیڈ روم میں بیٹھ کر چند
لمحے اے سی کی خنکی خود میں اتار کے سائیس بحال
ہوئیں جو اس ٹھکانے آئے۔

مہینہ تو گلابی جاڑوں کی آمد کا تھا۔ مگر گرمی کہتی کہ پڑ
کر اب نہ پڑوں گی! بیا جو اس کے گلاس سمیت وارد
ہوئی تو میں نے بہ غور اسے دیکھا تھا۔ پل بھر کو ماضی کا
اک نقش لہرایا تھا۔ طویل قامت، بھاری بھر کم گول
چہرے اور بڑی بڑی آنکھوں والی سانولی سلونی سی بیا...!
اب قدرے فہر ہو گئی تھی۔ لمبے گھنیرے بال جدید
اشانگی میں ترشے کاندھوں پر پڑے تھے۔
”لگتا ہے جیسے وقت گزرا ہی نہیں۔ سب کچھ
ویسے کا ویسا ہی ہے۔“ میں بے ساختہ کہہ گئی۔

”سامی! کیا رشتے اتنے ہی نازک ہوتے ہیں کہ اک
ذرا سی لغزش پر سارے دروازے بند کر دیے
جائیں؟“ یہ پہلا اور شاید آخری شکوہ تھا۔ اگلے ہی پل
اس کا موبائل بج اٹھا۔ وہ کان سے لگا کر بات کرتی ہوئی
بیڈ روم سے نکل گئی، میں گڑ گڑ گئی تھی۔ اس کی بات
دل میں کھب گئی تھی۔

مگر میرے دل کو نہیں لگی تھی۔ خوب ہی دھول اڑی تھی۔ مانو اس نے مجھے رو کیا تھا! اور اس روز تو میں گڑ کر رہی رہ گئی، جب ہماری اک مشترکہ دوست نے مجھ سے پوچھا۔

”سنا ہے، تو یہ نے گھر سے بھاگ کر شادی کر لی۔ کس سے؟ تمہیں تو پتا ہوگا؟“ یوں جیسے میں اس کام میں اس کی دست راست یا ہم قدم ہی تو رہی ہوں۔ ہمارا ساتھ ہی ایسا تھا۔ مانو اسی پل برسوں کے ساتھ پر مٹی پڑ گئی۔

ذرا سی بات پر برسوں کے یار نے گئے! اور بس اک خلش کا خار دل میں کھب کر رہ گیا! پھر اس کے متعلق خبریں ہی سننے میں آتی رہیں۔ میں سن کر سر جھٹک دیتی۔ مگر یہ اتنا آسان نہ تھا بس اک احساس کسک دیتا رہتا۔ پھر سنا وہ اسلام آباد شفٹ ہو گئی ہے۔ میری بلا سے!



بیا کے لوٹنے تک صرف چند لمحوں میں سالوں کا سفر طے ہوا تھا۔

میری نظروال کلاک پر پڑی اور اگلے ہی پل ہم کچن میں تھے۔ مہینو صبا نے رات ہی رٹو ادیا تھا۔ چکن کڑاہی، مٹن پلاؤ، کباب، دم کا قیمہ، بیٹھے میں جو چاہوں۔ اور ہاں کیک بھی مجھے ہی بیک کرنا تھا۔ وقت کم، مقابلہ سخت تھا۔ فریج میں جھانکا۔ گوشت نکال کر بھگونے کے لیے رکھا۔ کچن باسکٹ میں سارا سامان موجود تھا۔ ہم نے کھانا کھٹ کام بھگتانا شروع کیا اور مانو گزر اوقت لوٹ آیا۔

”بیاتم نے ابھی تک یہ کشرڈ کی ڈشز ڈاؤننگ ٹیبل پر نہیں رکھی ہیں؟“

”کیوں میں تمہاری نو کر لگی ہوں، دیکھتی نہیں ہو میں دھنیا توڑ رہی ہوں۔ خود رکھ کر آؤ۔“

”بیاتم سے خدا سمجھے، ابھی کتنا کام باقی ہے۔ تم ابھی تک دھنیا چھانٹ رہی ہو۔ اس طرح تو رات ہو جائے گی۔“

ڈھیروں ڈھیروں کرتا۔ یہ وہ دن تھے جب عدنان سے میری بچپن کی منگنی باقاعدہ ارنج ہو چکی تھی۔ میں ان سے چھٹی پھرتی۔ اور عدنان مجھ سے بات کرنے اور ملاقات کے لیے بیا کے آگے پیچھے پھرتے۔ آج میرا بیٹا اولیوں میں ہے وقت جیسے گزر کر بھی نہیں گزرا ہے۔ ابو کہتے اگر ہم دوسروں کی خوبیوں پر نظر رکھیں تو ہر انسان میں کوئی نہ کوئی کوالٹی ایسی ضرور ہوتی ہے، جو اسے انمول بناتی ہے مجھے یاد ہے، وہ دلوں میں گھر کرنے کا ہنر رکھتی تھی۔

اور یہ بیا ہی تھی۔ جس نے ایک بار ہنسی ہنسی میں ہی کہا تھا کہ کسی عورت کا گھر اجاڑنے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی۔ مگر وہ اک خوش حال زندگی کے خواب دیکھتی تھی۔

میں ان دنوں انٹر کے ایگزیمز کی تیاری کے لیے کمر بند کیے دن رات سر کھپا رہی تھی۔ جب اڑتی اڑتی سنی۔ بیا کا کسی امیرو کبیر آدمی سے معاشرہ چل رہا ہے میرڈ ہے، بال بچے دار۔ میں نے سر جھٹک دیا۔ مگر رانی ہو تو پر تب بنتا ہے! ایگزیمز میں امی کے حکم کے موجب تمام کاڈٹیکٹ فریز۔ اور نہ ہی یہ موبائلز کا دور تھا کہ اک ایس ایم ایس سے ہی ادھر کی خبر ادھر۔

مجھے ہوا ابھی نہ لگ سکی کہ وہ آج کل کن ہواؤں میں ہے۔

خدا کا کرنا۔ ایگزیمز بھگتا کر میں وہ کیشنز منانے لاہور اپنی خالہ کے گھر چلی آئی، لوٹ کر آئی پتا چلا۔ اس نے کورٹ میں ج کر لی ہے۔ اس بے جوڑ شادی پر گھر والوں کے اختلاف نے سراٹھایا۔ اور انتہائی اقدام کا ارتکاب ہوا۔ بیا گھر سے بھاگ گئی! دنیا انگشت بدنداں تھی۔ دگنی عمر والے آدمی کے لیے یہ رسوائی۔ جگ ہنسالی اور بے مہی! توبہ توبہ!

یہ صرف میں جانتی تھی۔ بیا نے زندگی تنگ دستی کا عذاب جھیلے گزاری تھی۔ کسی نے میسے کی چھب دکھا کر اسے زیر کیا ہوگا۔ وہ خوش حال زندگی چاہتی تھی۔

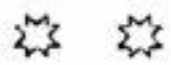
کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

”سداھر جاؤ۔ ورنہ یہی انڈا“ ڈنڈے کی جگہ
تمہارے سر پر پڑے گا۔“
”اف خدایا! میں کدھر جاؤں۔ یا اللہ مجھے موت
دے دے۔“

”آمین۔ آمین۔ آمین۔“ اس نے کہتے کہتے زبان
دانتوں تلے داب لی۔ مگر میں ہنس دی۔ مانو چاروں
طرف اجالا ہی اجالا بکھیر گیا۔ اسی نوک جھونک میں کام
تمام ہوا۔ اور میں نے جانا۔ رجسٹری کی فیسل گزرتے
وقت کے ساتھ بھر بھری ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہمارے
درمیان جیسے گزرا وقت آیا ہی نہ تھا۔ بہت کم وقت میں
شام کی ساری تیاری ہو چکی تھی، ہم ذرا سی دیر سانس
لینے کو بیٹھے تو سالوں کا نچوڑ لحوں میں اگل گئی۔

”شوہر کی بزدلی۔ سوتیلے رشتوں کا عذاب۔ ساری
کھینچ تان جاگیر کے سبب تھی مجھے اندازہ تھا۔ اس
طرح بھی ہوتا ہے۔ اس طرح کے کاموں میں۔“
بھیا بھیا بھی لوٹ آئے تھے۔ مجھے معلوم تھا وہ اپنی
ہر خوشی کا صدقہ غریبوں میں جا کر نکالتے تھے۔ مگر آج
دیر ہو گئی تھی۔

”رجسٹری کی آبیاری سے انسان صرف اچھا وقت
گنواتا ہے۔ حاصل کچھ نہیں ہوتا۔“ بھائی جان نے
ہم دونوں کو خود سے لگایا۔ اور میں لمحے کے ہزاروں
حصے میں جانچ گئی۔ یہی رجسٹری مٹانے کو انہوں نے
ہمیں یہ وقت بخشا تھا۔ میں بیا کے فیصلے پر نہیں اس
کے غلط طریقے کار پر شاکی تھی۔ یہ آج تک کوئی سمجھ
ہی نہ سکا تھا۔ مگر جو وقت گزر گیا، لوٹ نہیں سکتا تھا۔
بھیا کا فرمان درست تھا۔ زخم تو کب کا بھر چکا تھا۔ بس
اک داغ تھا جو گزرے وقت کی یاد دلاتا۔ میں نے ایک
نظر بیا کو دیکھا، وہ ہنوز بھائی جان کے کندھے سے لگی
مسکرا رہی تھی۔ میں بھی مسکرا دی۔



”شکل اچھی نہیں تو بات ہی اچھی کر لو۔ تم نے
مجھے اپنی طرح دھکا اشارت سمجھ رکھا ہے؟“ ہماری
زبانیں تیزی سے چلتے ہاتھوں کو مات دے رہی تھیں۔
مانو بریکیں میل ہو گئی تھیں۔

”اوہ گاڈ! یہ تم نے کہا یوں کا آمیزہ چوپ کیا ہے؟
کسی کے سر پر مارو تو سر ہی پھٹ جائے۔ ستیا ناس
کر دیا! یہ کہا یوں کا آمیزہ ہے کہ اکڑا ہوا آٹا۔“
”اچھا! نیسٹ کرو او پھر پتا چلے گا۔“ وہ ندیدے
بچوں کی طرح میرے قریب آ کر بولی۔
”دور ہو جاؤ سب سمجھتی ہوں میں یہ بہانے
بازیاں۔ ایک ذرہ نہیں ملے گا۔“
”ارے نظر کا صدقہ سمجھ کر ہی دے دو۔ خدا کے
واسطے۔“

”اف! ہائے ری قسمت۔ بخنی میں اتنا لمبا پانی،
ان بیل برابر دیدوں سے تمہیں کچھ نظر آتا ہے کہ
نہیں۔؟“

”ہاں۔ ہاں۔ تم تو بڑی افلاطون ہو۔ جیسے مجھے پتا
ہی نہیں پاسنگ مار کس لے کر اگلی سیڑھی چڑھتی
تھیں۔“

”اور تم۔ تمہیں تو دوسوں کے مار کس پر آگے داخلہ
ہی نہیں ملا تھا۔ منہ چھپا کر گھر میں پڑ گئی تھیں۔ بھول
گئیں۔“

”تم نے بی اے کر کے کون سا تیر مار لیا۔ ڈگریاں
چولھے میں جھونک کے بچہ پال رہی ہو۔“
”خود کو مٹا دینے ہی میں عورت کی عظمت ہے۔“

”ہاہ! مکالے بازی! فضولیات!“
”مکالے نہیں سچائی۔ اور اسے فضولیات نہیں
حقیقت اور خود شناسی کہتے ہیں۔“

”اللہ۔ اللہ۔ جاؤ جا کے منہ دھو کے آؤ پھر آئینے
میں اپنی شکل دیکھو۔ دنیا کا بد نصیب ترین انسان ہے
جس کا مقدر تم سے پھوٹا۔“

”اور خوش نصیب ترین وہ ہے جو تم سے بچ نکلا۔“
”اف باتیں بنانا تو کوئی تم سے سیکھے۔ ارے تم سے
ابھی تک ایک انڈا نہیں ابالا گیا۔ ڈوب مو۔“

کچھ موتی چنے ہیں

ادارہ

میں بند ہو جاتی ہے۔ مرد سمجھتا ہے۔ اس نے عورت کو تسخیر کر لیا ہے۔ بے وقوف مرد۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ یہ خاموشی مرد ذات کی نفی کے لیے اختیار کی گئی ہے اور اس چپ کے پردے میں فقط بے زاری، نفرت اور مصلحت کے جذبے پوشیدہ ہیں۔

(شازیہ چوہدری۔ تو پھر یہ طے ہے کہ)

شازیہ اعجاز۔ لاہور

خالص

ایک جگہ سے ہم خالص پنجاب کا گھی لایا کرتے تھے۔ ہمیں تو کچھ ایسا ناپسند نہ تھا لیکن ایک روز اس میں سے ایک چھلا ہوا آلو ثابت نکل آیا اور ایک چربی کا ٹکڑا بھی تو شکایت کرنی پڑی۔ تب اس بزرگ نے وضاحت کی کہ جناب ”گھی تو یہ بناؤں ہے“ میں نے اس کے اصلی ہونے کا دعویٰ کہاں کیا ہے۔ میں تو صرف اس کا ذمے دار ہوں کہ یہ میں ٹوبہ ٹیک سنگھ سے منگاتا ہوں جو خالص پنجاب میں ہے، سندھ و ندھ میں نہیں ہے۔

(ابن انشا۔ آپ سے کیا پرہ)

صدف نقی۔ کراچی

عورت

میں نے عورت کو ہمیشہ بہت کمزور سمجھا تھا۔ موم کی گڑیا کی طرح، لیکن ایک عمر برتنے کے بعد میں نے یہ جانا ہے کہ عورت موم سے یا پتھر؟ اس کا فیصلہ وہ خود کرتی ہے۔ کسی دوسرے شخص کو اسے موم یا پتھر کا خطاب دینے کا حق نہیں ہوتا، وہ خود چاہے تو محبوب کے اشاروں کی سمت مڑتی رہتی ہے اور پتھر بننے کا فیصلہ کر لے تو کوئی شخص بھکاری بن کر بھی اس کی نگاہ التفات نہیں پاسکتا۔

(بانو قدسیہ۔ راجا گدھ)

شاہدہ نامہ۔ کراچی

شیطان کی سواری

خدا گواہ ہے کہ آپ کی طرح ہم نے بھی آج تک شیطان نہیں دیکھا، البتہ کئی بار شیطان کے معاون کی حیثیت سے اس کی سواری پر سفر کا شرف ہمیں حاصل ہو چکا ہے، نہ جانے یہ بڑے بوڑھے موٹر سائیکل کو شیطان کی سواری کیوں کہتے ہیں۔

منجھلے نوجوانوں کی طرح ہمیں بھی موٹر سائیکل سے والہانہ محبت ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم نے خود کئی مرتبہ شیطان بننے کی اپنی سی کوشش کی لیکن ہر بار گھر والوں نے تعاون زر کا دامن سکیڑ کر ہمیں بال بال بچالیا۔ اس تمام واقعے میں قابل رحم شیطانی سواری یعنی غریب موٹر سائیکل ہے۔ آخر اسے ہی شیطان کی سواری کا خطاب کیوں ملا۔ یہ اعزاز منی بسوں اور رکشا جیسی عظیم الحکمت سواریوں کو لین نہ حاصل ہو سکا۔ بات جہاں تک ہماری۔ معاف کیجئے گا شیطان کی ہے تو یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ سواری کے لیے منی بس پسند کرے، رکشایا موٹر سائیکل۔

اگر آپ چاہیں تو موٹر سائیکل کے ذریعے خدمت خلق بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے آپ کو اتنا کرنا ہوگا کہ اپنی موٹر سائیکل کا سائنسز زفالنار پڑے گا۔ صبح ہی صبح اپنے صحن میں بغیر سائنسز کی موٹر سائیکل اشارت کر کے آپ بیک وقت پورے محلے کو خواب غفلت سے بیدار کر سکتے ہیں۔ اس طرح بچے صبح وقت پر اسکول اور بڑے اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر پہنچ کر آپ کو دعا میں دیں گے۔

(محمد یعقوب غزنوی۔ گستاخیاں)

گڑیا شامہ۔ کھڑوڑپکا

عزت نفس

جب عورت کو عزت نہ ملے تو وہ اپنی ذات کے خول

(عمیرہ احمد۔ بات ہوتے تک)
عظمیٰ۔ ڈی جی خان

نئی نسل

ہماری نئی نسل کسی کے پیچھے چلنے کو تیار نہیں۔ وہ
”میں خود“ کی قائل ہے۔ اس لیے اب گرو کا فرض
ہے کہ خود میں داس کی سپرٹ پیدا کرے، لوگوں کے
پیچھے چلے اور پیچھے چل کر ان کا رخ موڑے۔ آگے
چل کر رخ موڑنا تو آسان بات ہے، پیچھے چل کر رخ
موڑنا بڑی بات ہے۔

(ممتاز مفتی۔ تلاش)
فریدہ افتخار۔ اسلام آباد

ظالم

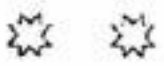
راکا پوشی بہت خوب صورت ہے اور جو خوب
صورت ہوتے ہیں اس سے زیادہ ظالم بھی کوئی نہیں
ہوتا۔

(نموا احمد۔ قراقرم کا تاج محل)
سعدیہ بخٹیار۔ کراچی

روح کا اطمینان

ہم کسی بھی معاملے کی کوئی سی بھی توجیہ دے کر
سامنے والے کا منہ بند کر سکتے ہیں۔ سچی وجہ، جھوٹی
وجہ، ہم جواب دینے سے انکار بھی کر سکتے ہیں مگر
اصل جواز وہ ہے جو ہم اپنے آپ کو دیتے ہیں۔ جب
ہم خود سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ جب ہمیں خود کو بتانا
ہوتا ہے، خود کو سمجھانا ہوتا ہے، دوسروں کو مطمئن کرنا
آسان ہوتا ہے مگر اپنی روح کی طمانیت۔ ہم اسے
قائل کریں تو بات ہے۔

(سائرہ رضا۔ تیسری محبت)
شمس مسکان۔ جام پور



محبت

یہ محبت ہے میری جان! سبیل کا پانی نہیں کہ پیاس
لگی اور کہا ذرا ایک گلاس پانی دینا۔ یہاں پانی اس
قیمت پر ملے گا جس قیمت پر کریٹا کے پاسوں کو ملتا تھا۔
(خلیل الرحمن قمر)
نسرین زمان۔ دیر

سچ

سچ کتنا دکھی اور زخمی ہے آج کے زمانے میں سچ کو
ثابت کرنے کے لیے کتنے ہی ہزاروں سہاروں کی
ضرورت رہتی ہے، کتنے دکھ کی بات ہے لوگ اچھی
نظر رکھنے کے باوجود سچائی کو پہچان نہیں سکتے۔ اسے
ماتھے پر لکھا ہوا دیکھ کر پڑھنا چاہتے ہیں، آنکھیں رکھنے
کے باوجود بینائی سے محروم ہیں لوگ۔
(آسیہ مرزا۔ اے جنون و دشت ہے کہ منزل ہے)
ہما سہل۔ لیہ

تجربات

زندگی کے تجربات اور لیبارٹری کے تجربات میں
بہت فرق ہے۔ زندگی کے تجربات لاعلمی کے اندھیروں
میں ٹھوکیں کھانے کا نام ہے اور لیبارٹری کے
تجربات، تجربات نہیں بلکہ اعادہ ہوتے ہیں۔ تجربہ تو
ایک ہی دفعہ ہوتا ہے اور اسے ہوتا ہے جو اس کا نتیجہ
پہلی دفعہ دیکھتا ہے، اور محسوس کرتا ہے، پھر اس کے
بعد مقلد ہوتے ہیں، تجربہ کار نہیں۔

(رفعت سراج۔ سوال)
سدرہ رحمان۔ بہاول پور

بازی

عورت ہر بازی دل سے کھیلتی ہے مگر کبھی کبھار کوئی
ایک بازی ایسی ہوتی ہے جسے وہ دماغ سے کھیلتی ہے اور
اس وقت کم از کم اس بازی میں کوئی اس کے سامنے
کھڑا رہ سکتا ہے، نہ چت کر سکتا ہے اور وہ بازی۔ وہ
بازی بقا کی بازی ہوتی ہے۔



گوہرِ نایاب

☆ کچھ لوگ نمازیں بڑھتے ہیں، روزہ رکھتے ہیں، پھر وہ کام کرتے ہیں، جس کا حکم خدا نے دیا ہے مگر اپنی زبان سے کئے الفاظ پر غور نہیں کرتے۔ جس سے جانے کتنے خدا کے گھر ٹوٹتے ہیں، یعنی دل۔
☆ آگہی آپ کو اپنے اندر کے پاتال کی خبر دیتی ہے۔ محبت حق نہیں ہوتی، مقدر ہوتی ہے۔

☆ اپنے گناہوں کا شمارہ کرنے بیٹھو کیونکہ جتنی دیر میں تم اپنے گناہوں کا شمار کرو گے اتنی دیر میں تم کئی نیکیاں کر سکتے ہو۔

☆ خوشی میں آنسو چھلکتے ہیں، بہتے نہیں۔
☆ عادت تو بدل سکتے ہیں۔ مگر فطرت نہیں۔ اس لیے شروع سے فطرت کو اچھالی کی طرف راغب کرنا چاہیے۔

☆ خوشیوں کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دو اور دوسروں کو خوشیاں دینے کی کوشش کرو کیونکہ اس طرح خوشیاں تمہارے پیچھے بھاگیں گی۔

☆ جب بھی سائل کو کچھ دو تو اس سے دعا کے لیے کہو۔

فوزیہ شمر۔ مہجرات

ایمان افروز واقعہ

ایک بوڑھی خاتون نے ریڈیو اسٹیشن فون کیا کہ وہ کئی دنوں سے بھوکی ہے اور کئی دنوں سے صرف سوکھی روٹی اور پانی پر گزارا کر رہی ہے اور کہا کہ اللہ کی راہ میں اسے کچھ کھانے کے لیے دیا جائے۔ ایک منکر خدا بھی

غصے پر قابو

ارشادِ ربانی ہے۔ ”جو لوگ فراخی اور تنگی میں (اپنا مال اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور غصے کو روکتے اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایسے نیکو کاروں کو دوست رکھتا ہے۔“

(سورہ آل عمران، 134)

دنیاوی زندگی

ارشادِ ربانی ہے۔ ”جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشایا رکھا تھا اور دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا تھا (اور وہ سمجھتے تھے کہ انہیں ہمیشہ دنیا ہی میں رہنا ہے) تو جس طرح یہ لوگ اس دن (آخرت) کے آنے کو بھولے ہوئے تھے اور ہماری آیتوں سے منکر ہو رہے تھے اسی طرح آج (روزِ قیامت) ہم بھی انہیں بھلا دیں گے۔“

(سورۃ الاعراف۔ 51)

امینہ ملک۔ کراچی

بخار کو برانہ کہو

بارگاہ رسالت میں بخار کا ذکر کیا گیا تو ایک شخص نے بخار کو برا کہا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”بخار کو برانہ کہو، کیونکہ وہ مومن کو گناہوں سے ایسے پاک کر دیتا ہے، جیسے آگ، لوہے کا میل صاف کر دیتی ہے۔“

(سنن ابن ماجہ)

رشیدہ فیض۔ جام پور

اچھی باتیں

- ☆ جو شخص دریائے توحید میں غرق ہوتا ہے اس کی پیاس کبھی نہیں بجھتی۔
- ☆ اپنی سیرت ایسی کلی کی طرح بناؤ جسے سونگھنے سے اچھالی کی خوشبو آئے۔
- ☆ گناہ پر نادم ہونا گناہ کو مٹاتا ہے۔
- ☆ توبہ کرنا آسان ہے مگر گناہ چھوڑنا مشکل ہے۔
- ☆ وہ گناہ سب سے بڑا ہے جو کرنے والے کے نزدیک چھوٹا ہے۔

مدیحہ نورین مہکس۔ برٹلی

غیبت

حضرت سعدیؒ اپنے باپ کے ہمراہ سفر میں تھے دوران سفر ایک دن اپنے باپ کے ساتھ تلاوت قرآن کرتے رہے۔ تہجد کے وقت آپ نے نماز پڑھی۔ نماز پڑھنے کے بعد اپنے باپ سے کہا۔ ”یہ لوگ کیسے بے خبر سو رہے ہیں۔ کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ اٹھ کر دو رکعت نماز پڑھ لیں۔“ باپ نے کہا۔ ”اے جان پدرا اگر تم بھی سوتے رہتے تو اس سے بہتر تھا کہ بجائے اس کے لوگوں کی غیبت کر رہے ہو۔“

سعدیہ غالب۔ نارتھ کراچی

حوالی بیٹی

عورت اور دوا کو کڑوا نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ دوا اگر کڑوی ہو تو مریض کے منہ کا ذائقہ خراب رہتا ہے۔ اور عورت کڑوی ہو تو مرد کا بیڑا غرق ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر اس عورت کو ہرگز کڑوا نہیں ہونا چاہیے۔

جسے ”بیوی“ کہا جاتا ہے۔ ایک صاحب نے روایتی عاشقوں کی طرح پہلے ایک لڑکی سے عشق فرمایا۔ پھر اس سے شادی کر لی۔ وہ بیاں کرتے ہیں کہ جب تک میری بیوی، میری محبوبہ تھی۔ اس وقت تک وہ بڑی شیریں

اس کی گفتگو سن رہا تھا اور اس کو ایک مذاق سوجھا۔ اس نے کھانے پینے کی اشیا خریدیں اور اس بوڑھی عورت کا ایڈریس معلوم کرنے کے بعد اپنے نوکر سے بولا کہ جا کر اس بوڑھی عورت کو دے آؤ اور جب وہ پوچھے کہ کس نے بھیجا ہے تو بتانا یہ شیطان کی طرف سے تحفہ ہے۔“ وہ بوڑھی عورت اتنے زیادہ کھانے کا سامان دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور جلدی اپنے گھر کے کونے میں وہ رکھنے لگی۔ ایسے میں نوکر نے پوچھا کیا آپ معلوم نہیں کرنا چاہیں گی کہ یہ سامان کس نے بھیجا ہے۔“ یہ سن کر وہ بولی۔

”مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ کس نے بھیجا ہے، مگر اتنا معلوم ہے کہ جب میرے رب کا حکم آتا ہے تو شیطان بھی حکم کی تعمیل کرتا ہے۔“

محمد اواجید۔ کراچی

وجہ

حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا۔ ”عورت میں تیری تعریف اس وجہ سے نہیں کرنا کہ تو کائنات میں سب سے زیادہ حسین ہے اور میں اس سبب سے تجھ سے محبت نہیں کرنا کہ تو انسانی راحت کا سب سے موزوں سرچشمہ ہے بلکہ میں اس واسطے تیری تعظیم کرتا ہوں کہ انسانیت تیرے ہی طفیل قائم ہے۔“

فوزیہ۔ گجرات

بات کا وزن

ایک پہلوان نما آدمی ایک بڑا سا لکڑی کا گٹھا سر پر لادے گا لیاں بکنا چلا جا رہا تھا۔ ادھر سے ایک بزرگ کا گزر ہوا، انہوں نے اس سے پوچھا کہ کسے گا لیاں دے رہے ہو۔

”ایک شخص مجھے گدھا کہہ کر گیا ہے۔“ اس نے بتایا، بزرگ نے فرمایا۔ تو اتنا بڑا بوجھ اٹھا سکتا ہے مگر ذرا سی بات کا وزن نہیں برداشت کر سکتا۔

آمنہ میر۔ گجرات

== پانچ منٹ ==

بیوی نے شوہر سے کہا۔ یعنی کے ابو میں ذرا مسز
معین کے پاس جا رہی ہوں آپ آؤ گھنٹے کے بعد
ہنڈیا چولہے پر سے اتار لیں اور ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد
ہنی کو فیڈر تیار کر کے دے دیں۔ میں ابھی پانچ منٹ
میں آئی۔“

فوزیہ ثمرٹ، آمینہ میر، ام ہانیہ، عمران۔ گجرات

== لیڈری ==

مل اور زمین الاٹ کرائی ہے لیڈری
اور کوٹھیوں پہ قبضہ دلاتی ہے لیڈری
بچ اور ڈنر مزے سے اڑاتی ہے لیڈری
عم ساتھ ساتھ قوم کا کھاتی ہے لیڈری
فرصت ملے تو ٹور پر جاتی ہے لیڈری

مجید لاہوری

انیلا مبین۔ پنڈی



جاننے ہو
مجھے کیا پسند ہے؟
برستی بارش
سمندر کی لہریں
پھولوں کی خوشبو
چاندنی راتیں
اچھی شاعری

اور
اور سب سے زیادہ
اس تحریر کا
پہلا لفظ

رباب سرفراز، پتوکی



زبان اور خوش گفتار تھی مگر شادی کے بعد خدا جانے
اسے کیا ہوا کہ ایک دم کڑوی ہو گئی۔ اب یہ حالت ہے
کہ اول تو اس کے منہ سے کوئی بات نہیں نکلتی اور
جب نکلتی ہے تو مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میں ایک
عورت کی باتیں نہیں سن رہا۔ بلکہ گریلے کھا رہا ہوں۔
فوزیہ ثمرٹ۔ گجرات

کولبس کی کامیابی کا راز

کولبس نے شادی نہیں کی اس لیے امریکہ ڈھونڈ
لیا اس سے کسی نے نہیں پوچھا۔

۱ کہاں جا رہے ہیں؟

۲ کس لیے؟

۳ کس کے ساتھ؟

۴ کب واپس آو گے؟

۵ میں بھی چلتی ہوں؟

۶ مجھے امی کی طرف چھوڑ دیں؟

۷ گھر رہ کے ہی ڈھونڈ لو امریکہ۔

۸ آپ چھوڑ دو کوئی اور ڈھونڈ لے گا امریکہ؟

۹ میں اکیلی گھر میں کیا کروں گی؟

۱۰ اچھا بچوں کو بھی لے جائیں؟

۱۱ میرے لیے کیا لاؤ گے؟

۱۲ کوئی اور چکر نہ نہیں؟

۱۳ اچھا واپس میں وہی لیتے آتا؟

شاہدہ عامر۔ لاہور

== فخریہ ==

تم کس دنیا پر فخر کرتے ہو؟
جس کا ”بہترین مشروب“، ”مکھی کا تھوک“
(شہد) ہے۔ اور بہترین لباس ”کیڑے کا تھوک“
(ریشم) ہے۔ مجھے اس دنیا سے کیا لینا؟ جس کے
”حلال“ میں حساب اور ”حرام“ میں عذاب ہے۔

(شیخ سعدی)

حمدا واجد کراچی

[[بندہ کرن 27/3 اکتوبر 2015]]



مگر جب پھول مرجھائے
کہو خوشبو بھلا کیسی
کہا تھا یاد ہے تم نے
کہ میں ہوں دل
غم ہو دھڑکن
مگر دل ٹوٹ جلتے تو
کہو پھر دھڑکنیں کیسی
کہا تھا یاد ہے تم نے
کہ میں ہوں اس
اور تم زندگی میری
مگر جب اس ٹوٹے تو
کہو پھر زندگی کیسی

زبیدہ، مکی ڈائری میں تحریر
امجد اسلام امجد کی غزل
کسی ترنگ کسی سرخوشی میں رہتا تھا
یہ گل کی بات ہے، دل زندگی میں رہتا تھا

کہ جیسے چاند کے چہرے پہ آفتاب کی نو
کھلا کہ میں بھی کسی دوستی میں رہتا تھا

سرشت آدم خاکی، ذرا مہیں بدلی
فلک پہ پہنچا مگر غار ہی میں رہتا تھا
کہا یہ کس نے کہ رہتا تھا میں زملنے میں
بجزم درد، غم بے کسی میں رہتا تھا
کلام کرتا تھا قوس قزح کے رنگوں میں
وہ اک خیال تھا اور شاعری میں رہتا تھا

|| ستمبر 2015 ||

مدد کھ لو رہیں مہک، مکی ڈائری میں تحریر
خمار بارہ بنگوی کی غزل
وہ ہم میں یوں سمائیں، ہم ان میں یوں سمائیں
وہ ہم کو بھول جائیں، ہم ان کو بھول جائیں

جاتی ہیں آسمان تک فرقت کی شب دعائیں
آگے مرا مقدر وہ آئیں یا نہ آئیں

کیوں ان وفا پرستوں پر جاں نہ دیں جفا میں
کھا کھا کے دل پہ چوڑیں جو مسکرائے جائیں

راتیں ہیں خوب واقف اے بدلتی محبت
میں نے تڑپ تڑپ کر دی ہیں تجھے دعائیں

انگڑ ایٹاں نہ لے یوں اوسو کے اٹھنے والے
ان مست انکھڑیوں کے سانچے چھلک نہ جائیں

قوزیہ ٹھہر بٹ، مکی ڈائری میں تحریر
ادب ملک کی نظم

کہا تھا یاد ہے تم نے
کہ میں ہوں چاند
اور تم چاندنی میری
مگر جب چاند چھپ جائے
کہو پھر چاندنی کیسی
کہا تھا یاد ہے تم نے
کہ میں ہوں پھول
اور تم پھول کی خوشبو

گلوں پہ ڈولتا پھرتا تھا اوس کی صورت
صدا کی لہرتھا اور نغمگی میں رہتا تھا

نہیں تھی حسن نظر کی بھی کچھ لے پروا
وہ ایک ایسی عجب دلکشی میں رہتا تھا

یا سہین ملک ما کی ڈاڑھی میں تحریر
جگر مراد آبادی کی غزل

طبیعت ان دنوں بیگناہ غم ہوتی جاتی ہے
میرے حصے کی گویا ہر خوشی کم ہوتی جاتی ہے

قیامت کیا یہ، اے حسن دور عالم! ہوتی جاتی ہے
کہ محفل تو وہی ہے دلکشی کم ہوتی جاتی ہے

وہ ہی مینخانہ و صہبا، وہی ساغر، وہی شیشہ
مگر آواز نوشا نوش مدہم ہوتی جاتی ہے

وہی ہے شاہد و ساقی مگر دل بچھا جاتا ہے
وہ ہے شمع لیکن روشنی کم ہوتی جاتی ہے

وہ ہے زندگی لیکن جگر یہ حال ہے اپنا
کہ جیسے زندگی سے زندگی کم ہوتی جاتی ہے

کرن سرمد، ما کی ڈاڑھی میں تحریر
شان الحق حقی کی غزل

تم سے الفت کے تقاضے نہ نباہے جلتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جلتے

دل کے ماروں کا نہ کر غم کہ یہ اندوہ نصب
درد بھی دل میں نہ ہوتا تو کراہے جاتے

کاش اے ابر بہاری ترے بہکے سے قدم
میری امید کے ٹھہرا میں بھی گاہے جلتے

ہم بھی کیوں دہر کی رفتار سے ہوئے پامال
ہم بھی ہر لغزش مستی کو سراہے جلتے

سے ترے فتنہ رفتار کا شہرہ کیا کیا
گرچہ دیکھا نہ کسی نے سراہے جلتے

کم زگاہی کی ہمیں خود بھی کہاں تھی توفیق
کم زگاہی کے لیے عذر نہ چاہے جاتے

لذت درد سے آسودہ کہاں دل ولے
ہیں فقط درد کی حسرت میں کراہے جلتے

دی نہ مہلت ہمیں ہستی نے وفا کی ورنہ
اور کچھ دن غم ہستی سے نباہے جلتے

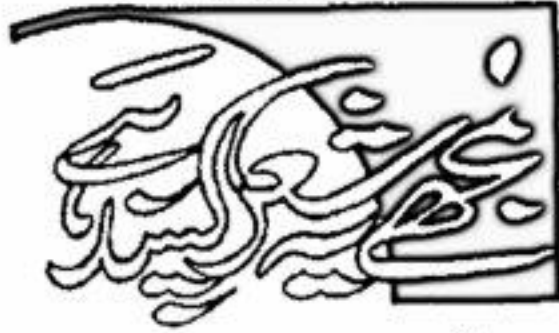
صبا خان، ما کی ڈاڑھی میں تحریر
طارق بدایونی کی غزل

اک نہ اک شمع اندھیرے میں جلائے رکھے
صبح ہونے کو ہے، ماحول بنائے رکھے

جن کے ہاتھوں سے ہمیں زخم نہاں پہنچے ہیں
وہ ہی کہتے ہیں کہ زخموں کو پھپھائے رکھے

کون جلتے کہ وہ کس راہ گزر سے گزرے
ہر گزر گاہ کو پھولوں سے سجائے رکھے

دامن یاد کی زینت نہ بنے سر کرسو
اپنی پلکوں کے لیے کچھ تو بچائے رکھے



فرین ظفر کراچی
کاش کوئی ایسا ہو جو گلے لگ کر کہے کہ
یا گل تیرے درد سے مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے

بینا ظفر کراچی
مجھے بھی پتا تھا کہ بدل جاتے ہیں لوگ
مگر تمہیں کبھی میں نے لوگوں میں گناہی نہیں

ثروت راشد کراچی
کبھی ہونٹوں پہ انگلیاں کبھی یوں سرگوشیاں
اُن کا انداز حق جتنا نا بہت جان لیو ہے

شاہد ظفر کراچی
میرے سجدوں کے تسلسل کو تو کیا جانے میرے ہمد
سر جھکے تیری خوشی مائی باجھائے تیری زندگی مانگی

سیدہ نسبت زہرا کراچی
تینوں میرے ہمد ہیں
خواہش نا تمام، رات اور اداسی
آج پھر تیرے نام کی
شام، رات اور اداسی

صائمہ جمیلی کراچی
اک دل کا کہا مانو، اک کام کر دو
اک بے نام سی محبت میرے نام کر دو
میری ذات پر فقط اتنا احسان کر دو
کسی صبح ملو اور شام کر دو

آسیہ جاوید علی پور چیمہ
باہر تو ہر اک سمت تھا ہنگامہ محشر
سنائے کا پہرہ تو فقط دل پہ لگاتھا

بیاسامہ انجم فیصل آباد
دو دن کی زندگی سے کیا کرو گے الجھ کر
رہو تو پھولوں کی مانند کبھرو تو خوشبو بن کر

شفق راجپوت گوجرہ
تقدیر نے، فلک نے، محبت نے، عشق نے
جس نے بھی چاہا میرا تماشا بنا دیا

فوزیہ نثریٹ بکرات
میرے ہونٹوں میں کھلے ہیں تیرے ہجر کے پھول
کب آئے ان پہ تیرا موسم و فساد دیکھیں
کبھی ہونٹوں بھی کہ وہ آئے اور ہم نہ ملیں
کبھی تو اہل جفا کا بھی حوصلہ دیکھیں

گرگیا شاہ کھروڑ پٹکا
ہمارا تذکرہ چھوڑو ہم ایسے لوگ ہیں جن کو
محبتیں کچھ نہیں کہتیں وفا میں مار دیتی ہیں

حورین زینب کھروڑ پٹکا
ایک وہم ہے یہ دنیا اس میں
کچھ کھوؤ تو کیا اور پاؤ تو کیا
ہے یوں بھی زیاں اور یوں بھی زیاں
جی جاؤ تو کیا، مر جاؤ تو کیا

بریرہ اکرام کراچی
لوگ یاد آتے ہیں بارشوں کے موسم میں
درد مسکرتے ہیں بارشوں کے موسم میں
زیر آب آگئی ہیں بستیاں دل و جان کی
بندوٹ جلتے ہیں بارشوں کے موسم میں

قرات اکرام کراچی
بارش کی دم جھم میں جدائیوں کا موسم ہے
منتظر نگا ہوں میں پائینوں کا موسم ہے
خواب بن کر نگا ہوں میں کوئی نہیں ملے گا
ان جزیروں میں اب رنجگوں کا موسم ہے

مدیحہ نورین مہک برنالی
ابھی تو ساتھ چلنا ہے سمندر کی مسافت تک
کنارے پر ہی دیکھیں گے کنارہ کون کرتا ہے

نمل تاج، ٹینڈ تاج ————— کراچی
وہ بھی رہا بیگانہ، ہم نے بھی نہ پہچانا
ہاں، اسے دلویا نہ اپنا سمجھتا تو ایسا ہو

حمیرہ قلیشی ————— لاہور
مدتوں بعد مجھ کو پھر تیرا خیال آیا
تیرے نہ ملنے کا سمٹ مجھ میں طال آیا
تاریک شب میں تنہا جھیل دکھوں کو
آمد مجھ پر تیری یادوں کا وبال آیا

سیسی ظفر ————— کراچی
بارشوں کے موسم میں بارشیں تو ہوتی ہیں
دل میں بھیگ جانے کی خواہشیں تو ہوتی ہیں
وصل کے اجالوں میں ادھنی میں چھپ کر بھی
بھڑکے اندھیروں کی دشتیں تو ہوتی ہیں

سعدیہ عرفان ————— کراچی
فقط باتیں اندھیروں کی، فقط قہقہے اجالوں کے
چراغ آندولے کر، نہ تم نکلے، نہ ہم نکلے

صبا، اریہ ————— کراچی
سکھا دی بے وفائی بھی، تمہیں ظالم زمانے نے
کہ تم جو سیکھ لیتے ہو، ہم ہی پہ ازماتے ہو

افشاں ————— کراچی
ہم بھی ہیں کیا عجب کہ کڑی دھوپ کے تلے
صحرایا خرید لائے ہیں برسات بیچ کر

صدف عمران ————— کے ڈی اے
حق ہمسائیگی یوں بھی تو ادا ہوتا ہے
دھوپ بھی روگ لی دیوار کو اور پچا کہنے

نادیہ ————— بکرات
جل جاؤ خوشی سے کڑی دھوپ میں لیکن
اپنوں سے — کبھی سایہ دیوار نہ مانگو

نازش رحمان ————— کراچی
مجھ سے مت پوچھو کہ احساس کی حدت کیا ہے
دھوپ ایسی تھی کہ سائے کو بھی جلتے دیکھا

نمرہ، اقرا ————— کراچی
خالی ہاتھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فرات
کس طرح لوگ لیکروں سے نکل جاتے ہیں

اقصی ناصر ————— کراچی
موسم کی مثال دوں یا تمہاری
کوئی پوچھ بیٹھا ہے بدلنا کس کو کہتے ہیں

روبی ————— کراچی
اک لفظ و فاسنا تھا
ڈھونڈا بہت، ملا ہی نہیں

عند انامر ————— کراچی
کبھی حیات کی ضامن کبھی وصال موت
نگاہ یاد! تیرا بھی کوئی اعتبار نہیں

یاسمین ملک ————— کراچی
اس نے ہنسی ہنسی میں عجب کی بات کی
ہم نے قہقہے اس کو مگر نے نہیں دیا

رضوانہ شکیل داؤد ————— لاہور
تسلسل اس کی یادوں کا ہوا ہے ایک یوں جیسے
کسی جوگی کا منتر ہو کسی روگی کی آہیں ہوں

ندا، فضا ————— فیصل آباد
تمہارے ہی ہاتھ میں ہے نبض سکون شاید
قرار دیتے بھی ہو تو ایسے، جیسے ادھار دیتے ہو

حاث ————— عراب پور
سُنو تم خواب ہو میرا
سُنو تم خواب نہ ہونا

مذبحہ فہمید ————— کراچی
کبھی میں خواب تھا تیرا
جو تم نے خواب کر ڈالا

ہم ایسے سادہ دلوں کی نیاز مندی سے
بتوں نے کی ہیں جہاں میں خدائیں کیا کیا

صائمہ جی ————— کراچی
چلتی ہیں دل کے شہر میں، یونہی حکومتیں
جو اس لئے کہہ دیا، وہی دستور ہو گیا

کرن کا دستور

خالد جیلانی

دو تہچے
ایک تہچہ پسا ہوا
ایک عدد
150 گرام
حسب ذائقہ
ایک انچ کا ٹکڑا

سرکہ
گرم مسالا
ٹماٹر
آئل
نمک، مرچ
پپٹا
ترکیب :

ولایتی تکے اشیاء :
گوشت
کالی مرچیں
ادرک
لسن
نمک
آئل
ایک کلو
پسی ہوئی ایک تہچہ
پسا ہوا ایک تہچہ
پسا ہوا ایک تہچہ
حسب ذائقہ
حسب ضرورت

ترکیب :

گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ایک انچ کے
کر لیں۔ سرکہ میں لیموں کا رس اور سب مسالے ملا
دیں۔ اب گوشت شامل کر کے اچھی طرح مکس کریں
اور ریفریجریٹر میں دو تین گھنٹے رکھ دیں۔ پیاز اور ٹماٹر
گول گول کاٹ لیں۔ اب ایک گوشت کا ٹکڑا، ایک

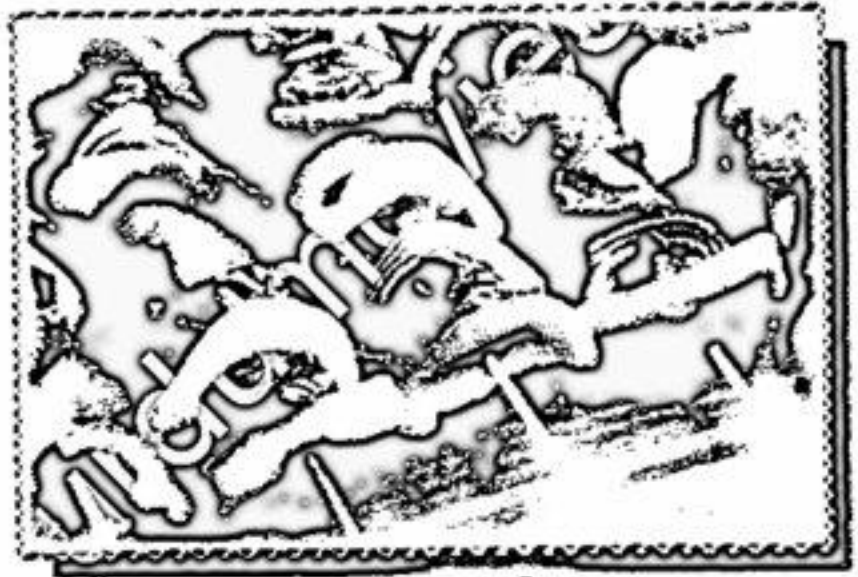
گوشت کو اچھی طرح سے دھو لیں، پھر اس کی چھوٹی
چھوٹی بوٹیاں کر لیں، اب اس میں ادرک، لسن، نمک
اور کالی مرچیں ڈال کر اچھی طرح ملا لیں اور دو گھنٹے کے
لیے رکھ دیں۔

پیاز کا، ایک ٹماٹر اور پھر ایک گوشت کا ٹکڑا سینوں میں
پرو کر کونوں پر اچھی طرح سینک لیں، ساس کے
ساتھ نوش فرمائیں۔

اب آگ جلا میں اور اس پر جالی رکھ کر بوٹیاں جالی
پر رکھ کر سینک کر پختہ کریں۔ اس دوران میں ان پر
تھوڑا تھوڑا آئل ٹپکاتے رہیں۔ اس طرح گوشت جلد
گلتا ہے اور اس کی لذت میں اضافہ ہوتا ہے۔

کڑا ہی قیمہ

اشیاء :
کٹا ہوا قیمہ
ٹماٹر
ہری مرچ
ادرک پیسٹ
لسن
پیاز
سرخ مرچ
دھنیا پاؤڈر
زیرہ پاؤڈر
نمک
12 کلو
ایک پاؤ
آٹھ دس عدد
ایک چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
دو عدد سلائس کٹ لیں
دو چائے کے تہچے
ایک چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ
ایک چائے کا چمچ



شیش کباب

اشیاء :
ران کا گوشت۔ آدھا کلو
لیموں
ایک عدد

|| 278 || 2015 اکتوبر

100 گرام (گٹھلیاں نکلی ہوئیں)	کھجور
150 گرام	سادہ کیک
150 گرام (خوب مسلا ہوا)	سادہ بسکٹ
100 گرام	تل
آدھا چائے کا چمچہ (پسی ہوئی)	دار چینی
ایک کھانے کا چمچہ	کوکوپاؤڈر
حسب ضرورت	کشمش
حسب ضرورت	بٹو پیپر
حسب ضرورت	آئل

ترکیب :

کھجوریں، سادہ کیک، بسکٹ، دار چینی، کوکوپاؤڈر اور تھوڑا سا آئل ملا کر گوندھ لیں۔ اب اس میں کشمش بھی ملا دیں اور گوندھے ہوئے اس آمیزے کو رول کی شکل دے دیں۔ ایک ٹرے میں تل پھیلا کر اس رول کو گھما میں تاکہ تل اس پر لگ جائیں۔ اب اس کھجور رول کو بٹو پیپر میں لپیٹ کر فریزر میں رکھ دیں، جب ٹھنڈا ہو کر سخت ہو جائے تو بٹو پیپر سے نکال کر اس کے ٹکڑے کاٹ لیں اور نوش جان کریں۔

سکھند

چار کپ	دہی
ایک چائے کا چمچہ	الائیچی پاؤڈر
آدھا کپ	خشک دودھ
ایک کپ	شکر
دو کھانے کے چمچے	گھی

ترکیب :

دہی کو ملل کے کپڑے میں ڈال کر لٹکا دیں۔ جب دہی سے پانی نکل جائے تو تمام اجزا کو یکجا کر کے اچھی طرح پھینٹ لیں اور کیک پن کو گھی لگا کر چکنا کرنے کے بعد یہ آمیزہ اس میں پلٹ دیں۔ دو سے تین گھنٹے تک بخٹھنڈا کرنے کے بعد نوش کریں۔



گرم مسالا
آئل
ہرا دھنیا اور ہری مرچ
آدھا چائے کا چمچہ
3/4 کپ
گارنش کے لیے

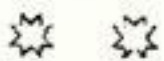
ترکیب :

پہلے آئل کو گرم کریں، پیاز کو ٹرانسپیرنٹ فرائی کر لیں۔ اب قیمہ ڈال کر نمک اور ادک، لہسن ڈال کر تھوڑا سا بھونیں اور ایک کپ پانی ڈال دیں اور جب قیمہ نیم گل جائے پھر کٹے ہوئے ٹماٹر اور ہری مرچ ڈال دیں اور اس وقت تک بھونیں جب آئل اوپر آجائیں آخر میں گرم مسالا اور ہرا مسالا شامل کریں۔ گرم گرم سرو کریں۔



کھجور رولز

اشیاء :



حسن و صیغے تہ

ادارہ

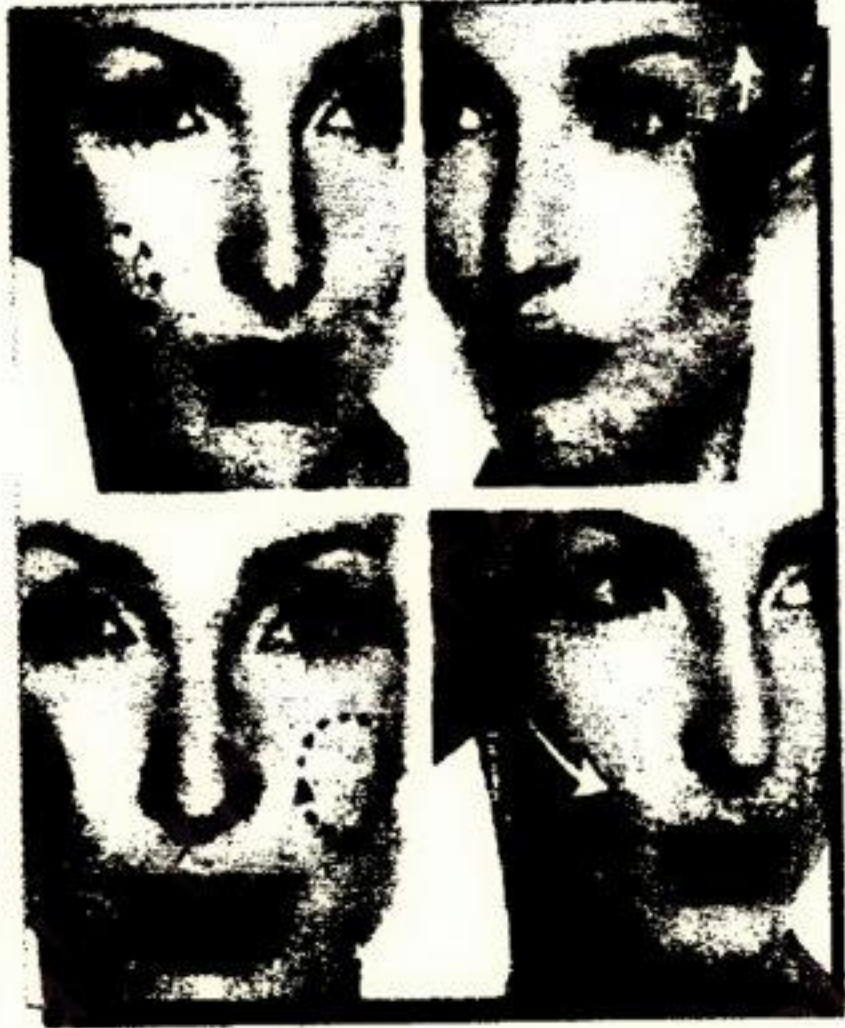
سے بطور خاص آپ کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہلشر لگانے کی کچھ آسان ٹپس بھی آپ کے لیے پیش کی جا رہی ہیں، تاکہ آپ اپنے رخساروں کو گل انار بنا سکیں اور حسن کرشمہ ساز کاراز جان سکیں۔

سرخ اور گلابی

جب بھی ہلشر کے ریڈ یا پنک شیڈز لگانے کا سوال آئے تو یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ آپ کی جلد پتلی ہے یا قدرے موٹی اور اس کا ٹائپ کیسا ہے، یعنی یہ خشک ہے۔ چکنی یا پھر ملی جلی۔ تاہم ریڈ اور پنک کے سوٹ سے لے کر ڈیپ شیڈز میں سے میٹ گلرز اچھے رہتے ہیں۔ فاؤنڈیشن لگانے سے پہلے تھوڑا سا کری می ہلشر لے کر رخساروں پر لگائیں۔ اس سے آپ کے چہرے پر تازگی اور چمک آجائے گی۔ لیکن جب آخر میں ہلشر لگانے کا وقت آئے تو رخساروں کے ابھاروں پر پاؤڈر ریڈ ہلشر لگائیں۔

پتلی اور سبک اور کورل

جب بھی ان تینوں رنگوں میں سے ہلشر کا انتخاب کرنا چاہیں تو انہیں لگاتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ رخساروں کے ابھار کے عین اوپر قدرے گہرے اسٹروکس میں یہ شیڈز لگائیں۔ یہ تینوں رنگ آپ کی شخصیت میں گرم جوشی کا ساتھ پیدا کرنے کے ساتھ تازگی بھی بخشتے ہیں۔ اگر آپ ڈیپ اور سبک ہلشر لگانا چاہیں تو اس کے ساتھ بروئزر بھی استعمال



بلش آن

ہلشر یا بلش آن آپ کے چہرے کا تاثر ایک دم بدل ڈالتا ہے۔ آپ تھکی ہوئی ہوں اور چہرے پر ترو تازگی کا تاثر لانا چاہیں تو اس معاملے میں ہلشر سے زیادہ کوئی آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کب کون سا اور کیسا ہلشر لگایا جائے کہ آپ کا چہرہ ایک دم کھل اٹھے۔ کیونکہ اگر آپ ان میں سے انتخاب کرنا چاہیں تو ہلشر کی لاتعداد اور اسٹی موجود ہے جو آپ کو کنفیوژ کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہاں آپ کے لیے اس بارے میں کچھ تجاویز پیش کی جا رہی ہیں کہ مختلف ہلشرز اور بروئرز میں سے کون

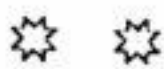
دونوں کے بارے میں ایک مختصر سا جائزہ آپ کے لیے پیش ہے تاکہ آپ اپنے لیے موزوں بلش کا انتخاب کر سکیں۔

پاؤڈر

بلشور کی یہ قسم ان خواتین کے لیے موزوں ہوتی ہے جن کی جلد چکنی ہو۔ کریمی بلشور میں موجود آئل ان کے چہرے پر دانے وغیرہ نکلنے کا سبب بن سکتا ہے، اس لیے چکنی جلد کی حامل خواتین کے لیے پاؤڈر بلشور ہی مناسب رہتا ہے۔ جب بھی پاؤڈر بلشور لگائیں تو برش پر بلشور لگانے کے بعد اسے ہلکے سے جھٹک دیں تاکہ اس پر سے اضافی پاؤڈر جھڑ جائے۔ پھر اسے اپنا لائن کی جانب سے لگاتے ہوئے رخساروں کی جانب لائیں۔ اس طریقے سے بلشور کی ایک یکساں تہ آپ کے رخساروں کو چمکادے گی۔

کریمی

کریمی بلشور لگانا نسبتاً آسان ہوتا ہے اور یہ آپ کی جلد میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ بلیئنڈ ہو جاتا ہے۔ اس سے نہ صرف آپ کی اسکن مونسوجرائز ہو جاتی ہے بلکہ آپ کے چہرے پر تازگی کی جھلک بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کی جلد نارمل یا خشک ہے تو آپ کے لیے کریمی بلشور سے بہتر کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ گرمیوں کے موسم میں بھی آپ کی جلد پر تادیر قائم رہتا ہے۔ کچھ بلشورز جیل کی شکل میں بھی ملتے ہیں جنہیں آئلی اسکن والی خواتین بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ ان کے ٹکڑوں تک ماند نہیں پڑتے اور یہ آپ کی جلد میں بہت اچھی طرح بلیئنڈ ہو جاتے ہیں۔



کریں تاکہ آپ کا میک اپ پرفیکٹ دکھائی دے۔
براؤن اور ڈارک گرے

اس قسم کے گرے بلشور استعمال کرنا چاہیں تو زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ انہیں رخساروں کے ابھار سے بچنے لگائیں۔ اس سے آپ کا چہرہ ہلکا اور پتلاد دکھائی دے گا۔ ان ڈارک شیڈز کو مہارت کے ساتھ اسی مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ ان کی مدد سے آپ کا چہرہ پتلا اور نقوش تیکھے نظر آئیں۔

برونزرز

یہ خواتین میں بہت زیادہ مقبول ہیں کیونکہ ان کے استعمال سے چہرے پر ایک سادہ اور فطری سی چمک آجاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے رخساروں کے ابھار کے عین اوپر برونزر پھیلا کر لگائیں۔ اس کے علاوہ پیشانی، ناک کے درمیان اور ٹھوڑی پر بھی لگائیں۔ جن خواتین کی رنگت گلابی یا سرخی مائل ہو، انہیں سرخی مائل برونزر لگانا چاہیے۔ تاہم پیلے شیڈز پر مشتمل برونزر سب ہی خواتین پر سوٹ کرنا ہے۔

ہائی لائٹرز

یہ آپ کے چہرے کو ایک دم جگمگا سادتا ہے۔ ہائی لائٹرز کا مہارت کے ساتھ کیا گیا استعمال چہرے پر تازگی لانے کے ساتھ کم سنی کا تاثر بھی پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کسی کا چہرہ قدرے لمبا ہو تو ہائی لائٹرز کی مدد سے اسے متوازن لک دی جاسکتی ہے۔ اپنی رنگت سے ایک یا دو شیڈز ہلکا ہائی لائٹرز منتخب کریں اور اس کی مدد سے چہرے کے مطلوبہ حصوں کو ہائی لائٹ کر لیں۔ آپ کا چہرہ چمک اٹھے گا۔

پاؤڈر یا کریمی بلشور؟

بلشورز کا استعمال کرتے وقت یہ مسئلہ بھی غور طلب ہوتا ہے کہ پاؤڈر بلشور استعمال کریں یا کریمی؟ اور یہ کہ کون سا بلشور آپ کو سوٹ کرے گا۔ لہذا ان



حفاظت

بیوی شوہر سے۔۔۔ ”کیا میں کبھی تمہارے خواب میں آئی ہوں؟“
شوہر۔۔۔! ”کبھی نہیں۔“
بیوی۔۔۔! ”کیوں؟“

شوہر۔۔۔ ”کیونکہ میں آہتا الکرسی پڑھ کر سوتا ہوں۔“

بینش خان۔۔۔ اٹک

شامت اعمال

ڈاکٹر۔۔۔! ”آپ کے تین دانت کیسے ٹوٹ گئے؟“
مریض۔۔۔! ”جی وہ میری بیوی نے کڑک روٹی بتائی تھی۔“
ڈاکٹر۔۔۔! ”تو کھانے سے انکار کر دیتے۔“
مریض۔۔۔! ”جی وہ ہی تو کیا تھا۔“

نورین ظفر۔۔۔ راولپنڈی

سچائی

جج۔۔۔! ”کیا ثبوت ہے کہ تم گاڑی اسپید میں نہیں چلا رہے تھے؟“
مجرم۔۔۔! ”سر میں اپنی بیوی کو لینے سسرال جا رہا تھا۔“

جج۔۔۔ ”all Case Dismissed“
”Thats“

حنا کرن۔۔۔ پٹوکی

آزادی

کسی نے ایک شادی شدہ شخص سے پوچھا۔

رحم دل

بیٹا باپ سے۔۔۔ ”ابو جب امی گاتی ہیں تو اپنی آنکھیں بند کیوں کر لیتی ہیں؟“
باپ۔۔۔! ”بیٹا تمہاری امی بہت رحم دل ہیں۔“
بیٹا۔۔۔! ”وہ کیسے؟“

باپ۔۔۔! ”ان کی آواز سننے سے دوسروں کو جو صدمہ ہوتا ہے وہ یہ دیکھ نہیں سکتی۔“
مول آفتاب۔۔۔ کراچی

بے بسی

ایک صاحب اپنے دوست سے اپنے بیٹے کی شکایت کر رہے تھے۔

”برخوردار نے جب سے یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے بڑھائی کی طرف دھیان دینے کی بجائے لڑکیوں کے چکر میں پڑا رہتا ہے۔ لان میں لڑکیوں کے ساتھ، لائبریری میں لڑکیوں کے ساتھ، کینٹین میں لڑکیوں کے ساتھ، حتیٰ کہ یونیورسٹی سے باہر بھی لڑکیوں کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ یونیورسٹیوں میں یہی کچھ ہوتا ہے تو اسے دکان پر بٹھا دیتا اور خود یونیورسٹی میں داخلہ لے لیتا۔“

ثمینہ اعجاز۔۔۔ خان پور

بے خبری

بیوی اپنے شوہر سے۔۔۔ ”تم تو کہتے تھے کہ شادی کے بعد بھی مجھے بہت پار کرو گے۔“
شوہر۔۔۔! ”تو مجھے کیا پتا تھا کہ تمہاری شادی مجھ سے ہی ہو جائے گی۔“

قرۃ العین عمران۔۔۔ اسلام آباد

”آب شادی سے پہلے کیا کرتے تھے؟“

اس شخص کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور وہ بولا۔ ”جو میرا دل کرتا تھا۔“

شامراد۔ لاہور

اگر لڑکیاں نہ ہوتیں

ایک لڑکا اور لڑکی انٹرنیٹ پر چیٹنگ کر رہے تھے۔

لڑکی۔ ”ایک بات پوچھوں؟“

لڑکا۔ ”ہاں ضرور پوچھو۔“

لڑکی۔ ”ہم لڑکیاں نہ ہوتیں تو تم لڑکے کہاں

جاتے؟“

لڑکا۔ ”اللہ دی قسمیں ڈائریکٹ جنت جے۔“

انیلا۔ پھول نگر

حقیقت

لڑکی اپنے نابینا عاشق سے ”کاش تمہاری آنکھیں

ہوتیں تو تم میرے حسن کو دیکھتے۔“

لڑکا۔ ”اگر تم خوب صورت ہوتیں تو کیا آنکھوں

والے تمہیں میرے لیے چھوڑتے اندھا ہوں پاگل نہیں ہوں۔“

فرح اسلم۔ کراچی

حاضر و ماضی

انلی کے ایک قصبے کا حجام نہایت مغرور اور ضدی

طبیعت کا مالک تھا۔ ایک دن گاہک نے بتایا کہ وہ

چھٹیوں میں روم جا رہا ہے اور وہ پوپ سے بھی ملنے کی

کوشش کرے گا۔ حجام نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے

کہا۔

”تم اور پوپ سے ملو گے؟ مجھے تو یہ سوچ کر ہنسی

آ رہی ہے پوپ تو بادشاہوں سے ملتا ہے۔ وہ تم سے

کیوں کر ملے گا؟“

گاہک یہ سن کر خاموش رہا۔ ایک ماہ بعد وہی گاہک

دوبارہ بال بنوانے حجام کے پاس پہنچا۔ حجام نے اس سے

پوچھا کہ

”تمہیں روم کیسا لگا؟“

”بہت مزا آیا اور میں پوپ سے بھی ملا۔“ جواب

ملا۔

حجام نے حجت کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو تم نے مرکزی چوک پر کھڑے ہو کر

دوسرے لوگوں کے ساتھ اسے دیکھا ہوگا؟“

”ہاں! لیکن وہ گارڈ میرے پاس آئے اور کہنے لگے

کہ ”پوپ تم سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہے۔ وہ مجھے

اپنے ساتھ پوپ کے نجی کمرے میں لے گئے۔“

”واقعی! پوپ نے تم سے کیا کہا؟“ حجام نے حیرانگی

کے عالم میں دریافت کیا۔

گاہک اطمینان سے جوابا بولا۔

”پوپ نے مجھ سے سوال کیا کہ تمہارے بالوں کی

اتنی گھٹیا کٹائی کس نے کی ہے؟“

فرح بشیر۔ بھائی پھیرو

جواب

ڈاکٹر نے مریض کی بیوی کو تھوڑا الگ کر کے کہا۔

”آپ کے شوہر ٹھیک ہو سکتے۔ بشرطیکہ کہ آپ

انہیں کوئی سیشن نہ دیں ان کا خیال رکھیں اور ان کی

دل و جان سے خدمت کریں۔“

بیوی واپس آئی تو مریض شوہر نے پوچھا۔

”ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟“

بیوی نے بے زاری سے کہا۔

”ڈاکٹر نے جواب دے دیا ہے۔“

طاہرہ ملک۔ جلاپور پیر والا

لا علمی

ایک صاحب اپنی بیوی کے بارے میں اپنے

دوست کو بتا رہے تھے۔

”شادی سے پہلے مجھے معلوم تھا کہ اس کے باپ

نے اسے اسکول کا منہ نہیں دیکھنے دیا۔ مگر مجھے یہ

شادی کے بعد ہی پتا چلا۔ کہ اس کی ماں نے کبھی

باورچی خانے کا منہ بھی دیکھنے نہیں دیا۔“

ارم۔ کراچی

☆ ☆

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں
یہ سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

ذو عرین



ذکیہ میمن... تھر پار کر
س آج کل کے لڑکے خود کو شہزادہ گلغام کیوں
سمجھتے ہیں؟
ج یہ شہزادہ گلغام کون ہے، ہماری گلی میں تو نہیں
رہتا۔

گل یا مین آرزو... حیدر آباد
س زبان کا گھاؤ تیز ہوتا ہے یا نظر کا؟
ج یہ تو گھاؤ کھانے والے کی ہمت پر منحصر ہے۔
عدیلہ الیاس... گوجرانوالہ
س انکل! اگر خدا گنجے کو ناخن دے دے تو؟
ج کیا سر پر بھی؟

نصرت... مردان
س نین بھیا! میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کو کبھی الٹا
کھڑا دیکھوں حقیقت میں؟
ج آجاؤ کسی دن۔

عظمیٰ عزیز خان... لاہور کینٹ
س نین بھیا! چلتی کا نام گاڑی ہے، بڑھتی کا نام
داڑھی اور کھتی کا نام کیا ہے؟
ج آج کل ساڑھی ہے۔

چودھری رومانہ بشیر، چودھری شمیرن بشیر... نامعلوم
س حسن کو چاند، جوانی کو غزل تو بڑھا پنے کو کیا کہتے
ہیں؟
ج آزاد نظم۔

چاند سلطانہ عروج... کراچی
س نین جی! اگر آنکھوں سے آنکھیں ملیں تو چار
ہو جاتی ہیں لیکن اگر آنکھوں میں لینس لگے ہوں تو؟
ج پھر وہ چار بلکہ لاچار ہو جاتی ہیں۔



شاہین نزہت... کراچی

س اے زلفی! یہ تو بتاؤ عاشق اور الو میں کیا فرق ہے؟
ج سچ تو یہ ہے کوئی فرق نہیں، بس فرق اتنا ہے الو
درخت پر رات بھر جاگتا ہے اور عاشق کو درخت بھی
میسر نہیں۔

غزالہ خان... شورکوٹ

س آج کل کے تہذیب یافتہ دور میں ہم لوگوں کو
کتنی آزادی ملنی چاہیے؟
ج جتنی ملی ہوئی ہے، وہ کیا آپ کے لیے ناکافی ہے۔

عائشہ خاتون... کراچی

س پہلے آغا خان میڈیکل کالج پھر بلدیہ کا گریجویٹ کالج۔
جب اتنے ڈاکٹر تو ہم کہاں جائیں گے؟
ج ڈاکٹروں کے پاس۔



اس ماہ کا خط

رضوانہ ملک۔ جلالپور پیروالا

کرن خوب صورت ٹائٹل سے سجا 13 تاریخ کو ملا۔ کرن کے سارے سلسلے ہمیشہ کی طرح لاجواب تھے "سعید اسپیشل" میں شیفت راحت کو کافی دلچسپی سے پڑھا لیکن انہوں نے کوئی ریسیپی نہیں بتائی۔ حمزہ علی عباسی اور فارس شفیع دونوں سے ملاقات اچھی رہی "مقابلہ ہے آئینہ" میں سدرہ یوسف کو دیکھ کر اچھا لگا اور ان کے جوابات پسند آئے۔

"راپنزل" پہلی قسط سے ہی اچھا جا رہا ہے بس شہین جلدی سے ٹھیک ہو اور خوش رہنا شروع کر دے۔ نینا کی اپنے باپ سے کیوں ناراضی چل رہی ہے وہ کیوں ان سے خفا سی رہتی ہے؟ سلیم تو نینا کو پسند کرنے لگا ہے لیکن نینا نے تو انکار کر دیا ہے اب دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔

فرحین اظفر کا ناول "ردائے وفا" بڑی دلچسپی سے آگے بڑھ رہا ہے جیب بے چارا ہاسپنل میں ہے اور اس کی فیملی کو ابھی تک پتا نہیں چل سکا اس کے بارے میں اور ناول دن بہ دن اپنے شوہر کی نظروں سے گرتی جا رہی ہے۔ معراج ابھی تو اچھا ہے عفت کے ساتھ اللہ کرے آگے بھی یونہی رہے۔

"میں گمان نہیں یقین ہوں" میں زیان کو ایک کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا اور لگتا ہے ایک کو جلد ہی پتا چل جائے گا کہ زیان کو کوئی جن نہیں چمٹا بلکہ وہ ایک سنگ کر رہی ہے اور رنم کو تو پتا چل گیا ہے کہ اس کا باپ زندہ ہے اسے واپس چلے جانا چاہیے تھا۔

"شاید" میں سالار کو ام ہانی سے کس طرح کا پیار ہے کہ اسے اپنے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا، سالار ام ہانی کو کیوں جھکا نا چاہتا ہے۔ سلمی فقیر حسن کا ناول "پھرنہ کتنا" بہت ہی زبردست تھا اس ناول نے بہت ہنسایا ہے جاسوں کا ہاشم علی کو پے و خوف بنانا اور ایک جھوٹ چھپانے کی خاطر اور جھوٹ بولنا اور اینڈ میں ہاشم کا زچ ہو جانا مزا آ گیا اس ناول کو پڑھ کر۔ ڈیزر سلمی جی آپ اس طرح کے ناول لکھتی رہیں گے۔ نیا باب جیلانی کا ناول بھی بہت اچھا تھا اس میں ان کا سات منزلہ مکان اور ساتوں بھائیوں کا آپس میں پیارا اچھا لگا مگر آدرا فاح کی جوڑی سیٹ بھی مبین کو فجر کے حق پہ ڈاکہ نہیں ڈالنا چاہیے تھا جبکہ اسے پتا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور ان کا آپس میں رشتہ بھی ہو گیا ہے لیکن مبین کی ساری کوششوں کے باوجود بھی اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا اور فاح نے مبین کے لیے اچھی مزا تجویز کی تھی کچھ نہ جتا کر۔

"اب نیند ہوئی برائی" بھی بیسٹ ناول تھا جمشید صاحب کی دوش بھی پوری ہو گئی کہ ان کی پوری فیملی سدھرنی اور زینا کی بھی دوش پوری ہو گئی شہزادے سے شادی کرنے کی۔

نادیہ احمد کا افسانہ بھی اچھا تھا اس میں حسن کا رویہ غلط تھا کہ اس نے اپنی پہلی بیوی کا بدلہ دوسری سے لیا لیکن ماہانے اچھا فیصلہ کیا کہ وہ اپنے شوہر کے پاس پلٹ گئی اور رامس کو ماں اور باپ دونوں کا پیار ملا۔ "بس ایک حرف" بھی اچھا افسانہ تھا اور سحرش فاطمہ کا "رواجوں کے قیدی" بھی اچھا تھا۔ "کچھ موتی پنے ہیں" میں صدف سمجھ اور اینلا کرن کا اقتباس پسند آیا نمرا، اقرا اور تحریم کے شعر پسند آئے اور کرن کتاب گوشت کے پکوان میں ساری ڈشمنز لاجواب تھیں۔

10 اکتوبر کو میری سسرطاہرہ ملک کی سالگرہ ہے۔ سو پیسی برتنہ ڈے ٹوٹا ہر۔

ج : پیاری رضوانہ! کرن پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ کا تبصرہ مختصر اور جامع ہے۔

آئندہ بھی اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہے۔ تبصرے کی غیر ضروری طوالت بعض اوقات تبصرے کے حسن کو ختم کر دیتی ہے اور اصل مقصد سے دور کر دیتی ہے لہذا بہنوں سے گزارش ہے کہ غیر ضروری طوالت کی بجائے مختصر اور جامع تبصرے تحریر کریں تاکہ زیادہ سے زیادہ قاری بہنوں کے خطوط شامل کیے جاسکیں۔

ستارہ آئین کو مل۔۔۔ پیر محل

ستمبر کا کرن جلدی مل گیا۔ ماڈل بہت بھلی لگی۔ حمد نعت سے دل و دماغ منور کرتے، شیفت راحت سے ملاقات اچھی لگی، کمال خاتون ہیں۔ حمزہ علی عباسی سے ہائے ہیلو خوب رہی۔ سدرہ یوسف ویری ناکس۔ ”راپنزل“ حسب معمول زبردست ہے۔ نایاب جیلانی نے ”شہ مات“ کے ساتھ بہت انجوائے کروایا ”میں گمان نہیں یقین ہوں“ نبیلہ جی شایاش ”پھر نہ کہتا“ سلمیٰ فقیر حسین کے ساتھ بہت مزا آیا۔ مقدس مشعل نے وہی روایتی کہانی لکھی۔ ”شاید“ فائزہ جی نسیمی گریٹ ہو۔ نادیہ اور سحرش نے بھی اچھا لکھا۔ اب جاتے جاتے اک اچھی خبر ہماری مستقل تبصرہ نگار محترمہ امبر گل اکتوبر کے پہلے ہفتے پیا دیس سدھار رہی ہیں ان کے لیے بہت بہت مبارک باد ڈھیر ساری دعا کریں آپ سب۔ اللہ پاک اسے شادو آباد رکھیں۔

ج کو مل! کرن پسند کرنے کا شکریہ۔ ہماری طرف سے امبر گل کو بہت بہت مبارک ہو۔

ماریہ طفیل۔۔۔ تلمبہ تحصیل، میاں چنوں ضلع خانیوال

ستمبر کے شمارے میں اپنا خط شائع دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور یہ بھی بہت اچھا لگا کہ آپ کو میرا کرن میں شرکت کرنا اچھا لگا۔ اس دفعہ کرن کا ٹائٹل اچھا تھا ”میں گمان نہیں یقین“ میں نیناں (رہنم) کا کردار بالکل بھی اچھا نہیں لگا اور زیان نائک کر رہی ہے یا سچ میں اس کو کچھ ہے۔ فائزہ افتخار کا ناولٹ ”شاید“ بہت اچھا تھا۔ ام ہانی کو سالار سے ہی ملانا کیونکہ سعدا بھی بہت چھوٹا ہے نایاب جیلانی کا مکمل ناول ”شہ مات“ بہت پسند آیا اور ماہ مبین پر بہت غصہ آیا کیونکہ جو لوگ کسی کی خوشگوار زندگی میں زہر گھولتے ہیں ان کا انجام یہ ہی ہونا چاہیے۔

اور ایک سب سے اہم بات یہ کہ پلیز میرے شہر کا نام ضرور لکھیں میں نے جس کو بھی بتایا کہ میں نے کرن میں شرکت کی ہے وہ مانا نہیں پلیز میرے شہر کا نام ضرور لکھیں!

ج : پیاری بہن ماریہ! اب کی دفعہ آپ کے شہر کا نام لکھ دیا ہے۔ آپ کو جو بھی تحریر بھیجی ہو اسی پتے پر بھیجیے جس پر خط بھیجنا ہے۔

تحریر بخاری۔۔۔ مظفر گڑھ

ستمبر کا شمارہ ہاتھ میں ہے سوچ رہے ہیں کہاں سے شروع کریں کرن سے پچھڑے کچھ سال گزر گئے۔ وقت کا پتا نہیں چلتا کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے لیکن آج جب کرن ہاتھوں میں آیا تو خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ اب بات ہو جائے کرن کی تحریروں کے متعلق سب سے پہلے جن تحریروں کو پڑھا ان کا ذکر ہو جائے نادیہ احمد کی تحریر ”بہت دیر سے ملا ہے“ بہت اچھی اور منفرد تحریر ہے۔ شہیار کا افسوس رہا کیونکہ وہ اتنا عرصہ تمی داماں رہا۔

سحرش فاطمہ کا ”رواجوں کے قیدی“ اچھی تحریر تھی لیکن سوچتی ہوں کہ کیا آج کے دور میں بھی ایسی فرسودہ روایات زندہ ہیں۔

”نیند ہوئی پرانی“ بہت ہی زیادہ اچھی لگی۔ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ صدف رحمان کی تحریر ”بس اک حرف“ حقیقت پر لگی۔ باقی تو پڑھنا باقی ہے فی الحال تبصرہ ختم کر رہی ہوں۔ ایک تو وقت کم ہے دوسرے تاریخ گزر گئی تو ”نامے میرے نام“ میں شامل نہ ہو سکوں گی ان شاء اللہ آئندہ ماہ تفصیلی تبصرہ ادھار رہا۔

ج : پیاری بہن محرم! کرن سے اس قدر محبت کا شکریہ۔ آپ چار سال کے بعد کرن میں آئی ہیں۔ امید ہے کہ آپ اب غیر حاضر نہیں ہوگی اور کرن کے لیے وقت نکال ہی لیں گی۔

عاصمہ ابراہیم۔۔۔ تلمبہ

ستمبر کا شمارہ خلاف توقع بہت جلد مل گیا تھا۔ ٹائٹل پسند آیا ”میں گمان نہیں یقین ہوں“ میں لگتا ہے زیان ڈرامہ کر رہی ہے۔ آگے معلوم نہیں حقیقت کیا ہے۔ ایک کتنا خوش تھا اپنی شادی پہ مگر افسوس زیان نے تو ایک الگ ہی صورت حال پیش کر دی۔ نبیلہ صاحبہ سے گزارش ہے اختتام اچھا کریں۔ نایاب جیلانی کا مکمل ناول بھی پسند آیا۔ مبین کتنی چالاک اور خود غرض لڑکی تھی اپنی خوشی کے لیے۔ کسی اور کی خوشی کا بالکل احساس نہیں تھا۔ اور افسوس کے ساتھ کہتا پڑا رہا ہے۔ ”ردائے وفا“ بہت بور ہے۔ باقی ناولٹ افسانے بھی اچھے تھے۔

ج : عاصمہ! آپ کی تحریر مل گئی ہے قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع کی جائے گی۔

سارہ علی۔۔۔ سوہا وہ گجر خان

”کرن“ میرا موٹ فورٹ رسالہ ہے دس سال کی عمر

کرن 286 اکتوبر 2015

میں بڑھنا شروع کیا حالانکہ ہمارے لکھنے پڑھنے پہ پابندی سے مگر سالے میں چھپا کر بڑھتی ہوں خیر اس بار ٹاؤن میں ”گمان نہیں یقین ہوں“ اچھی قسط بھی پڑھ کے مزہ آیا مگر مجھے لگتا ہے زیان خود جان بوجھ کر ایسا کر رہی ہے اس پر کوئی جن دن نہیں۔ آخری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔

”راپنزل“ میں کبھی مجھے لگتا ہے شہرین اور سمجھ سلیم اور نینا ہی ہیں مگر اپنے ہی خیال پہ مجھے کچھ شک سا ہے۔ ”ردائے وفا“ میں حدید کے ساتھ شروع میں ہی میں نے عفت کو سوچا تھا نالکہ کو دیکھ دیکھ کے مجھے غصہ آتا ہے۔ اس بار ”مقابلہ ہے آئینہ“ میں سدرہ یوسف سے مل کے اچھا لگا ویسے سدرہ جی ایک سوال ہے کیا آپ وہی والی سدرہ ہے جنہوں نے چک چکورہ کے ایک جامعہ میں نیچنگ بھی کی عالمہ کی بیچر تھی اگر آپ وہی ہے تو ریلی آئی مس یو۔ تنزیلہ کوڑ میں تم سب کو بھی بہت یاد کرتی ہوں مجبوری ہے تم لوگوں سے مل نہیں سکتی۔ یہی سمجھ لو پنجرے میں قید کیا گیا ایسا پرندہ ہوں جو چاہنے کے باوجود نہیں اڑ سکتا۔ پلیز تم لوگوں سے کوئی بھی مجھے پڑھ رہا ہے مجھے ایک گیارہ ملنے آجاؤ میں تم لوگوں کو بہت مس کرتی ہوں۔

ج : پیاری بہن سارہ! کرن کو پسند کرنے کا شکر یہ۔ امید ہے سدرہ یوسف اور تنزیلہ کوڑ تک آپ کا پیغام پہنچ گیا ہو گا۔ آپ اتنی پابندیوں کے باوجود کرن کا مطالعہ کرتی ہیں۔ قارئین بہنوں کی کرن کی اتنی پسندیدگی کرن کو بہتر سے بہتر کرنے کی تحریک پیدا کرتی ہے۔

طاہرہ ملک۔۔۔ جلال پور پیر والا

خوب صورت رنگوں سے جگمگاتا کرن جو نہی ہاتھوں میں آیا تو بے پایاں خوشی کے احساس نے ہمیں سرشار کر دیا اور یہ خوشی اس وقت مزید بڑھ گئی جب ”نامے میرے نام“ میں خود کو پایا مدیرہ جی آپ اتنے خوب صورت انداز میں جواب دیتی ہیں کہ دل بے اختیار آپ کی محبت سے بھر جاتا ہے۔

حمد و نعت سے دل کو منور کرتے ہوئے ”شیف راحت“ حمزہ علی عباسی ”فارس شفیع سے ملاقات کی“ مقابلہ ہے آئینہ ”سدرہ یوسف سے مل کر بہت اچھا لگا۔

”راپنزل“ کی یہ قسط بھی ہمیشہ کی طرح لا جواب تھی شہرین کی قسمت پہ رشک آتا ہے جو اسے ہیرے جیسا شوہر

ملا۔ صوفیہ کے روپ میں مشرقی لڑکی کی محبت خوب دکھائی اب دیکھتے ہیں کہ کاشف کیا قدم اٹھاتا ہے اور نینا کی باپ سے نفرت کچھ سمجھ نہیں آتی سلیم کا خوش مزاج انداز اچھا لگتا ہے۔

”تو بہت دیر سے ملا ہے“ حسن کی سوچ پہ بہت افسوس ہوا پتا نہیں ایسی سوچ مرد کیوں رکھتے ہیں۔ اینڈ اچھا لگا۔

”شاید“ فائزہ افتخار جی کیا کمال لکھ رہی ہیں آپ۔ سعد بے چارے کی حالت پہ افسوس ہوتا ہے اور سالار میں اتنا غور اسے تو صرف اپنے علاوہ کوئی اور نظر ہی نہیں آتا ایسی محبت کا کیا فائدہ جو دوسرے کا احساس ہی نہ کر سکے امہانی کو صرف سعد خوش رکھ سکتا ہے۔

”رواجوں کے قیدی“ پتا نہیں کب ہمارے ملک سے یہ فرسودہ روایات ختم ہوں گی ”اب نیند ہوئی پرانی“ زینا کی نیند نے ہمیں حیران کر دیا کہ منٹوں، سیکنڈوں میں نیند قربان ہو جاتی ہے چلیں جی بالا خر جمشید عباسی کی دوش پوڈی ہو گئی اور ان کا خاندان بھی سدھر گیا اور زینا کا جائز مقام بھی مل گیا۔

”میں گمان نہیں یقین ہوں“ زیان جی یہ کیا کر دیا آپ نے ہم تو آپ کو بہت محترم سمجھتے تھے بے چینی سے انتظار ہے اب آخری قسط کا۔

”بس اک حرف“ صدف رحمان گیلانی نے بہت اچھا سبق دیا دعا، دعا کے حوالے سے ان کی باتیں دل میں گھر کر گئیں۔ ”ردائے وفا“ حسیب کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے اور اس کے اپنوں کو خبر نہیں حدید کی تو زندگی خراب ہو ہی گئی اب عفت کے ساتھ کچھ برا نہیں ہونا چاہیے۔

”پھر نہ کہنا“ خوب ہنسیا۔ تمام مستقل سلسلے میں سب کا انتخاب اچھا تھا۔ پلیز 10 اکتوبر کو میری سالگرہ ہے آپ یقیناً ”مجھے wish کر کے میری خوشیوں کو دوبالا کر دیں گی آپ سے ایک اور ریکوسٹ کہ آپ کرن میں ایسا سلسلہ شروع کریں جس سے ہم کرن کے through اپنے پیاروں کو مخاطب کر سکیں۔ اور ہاں کرن کتاب میں گوشت کے اتنے اچھے اچھے پکوان بتا کر آپ نے ہماری عید خوب کرادی۔

ج : پیاری طاہرہ! آپ کو سالگرہ مبارک ہو۔ آپ کی خواہش نوٹ کر لی گئی ہے۔

کوئل خان۔۔۔ کراچی

|| کرن 287 || اکتوبر 2015 ||

14 تاریخ کو کرن اپنی نرم گرم گرم گندم کی سنہری خوشوں کی مانند کرنیں بکھیر تاملاتو چند گھنٹوں کے لیے اپنی سول اور کرمینل پروسیجر کورٹ کی کتابوں کو ایک طرف پھینک کر (آہ امتحانات جو اچانک سے دو ماہ قبل ہو رہے ہیں) کرن کی طرف متوجہ ہوئے فائزہ افتخار کا "شاید" میں تمام کردار اپنی اپنی جگہ فٹ ہیں۔

"راپنزل" کی چوٹی پٹڑ کر چڑھنا شروع کیا تھا کہ ارے یہ کیا ابھی تو بہت سے الجھاؤ باقی ہیں بالوں (کرداروں) کے سلجھتے سلجھتے اور چڑھنے میں دقت تو لگے گا نا۔ نایاب جیلانی نام دیکھتے ہی گالوں پہ ڈمپل بڑھے (بچ میں بڑتے ہیں)۔ ہم م... اس بار مسنگ بھی وہ خصوصیات جو کہ نایاب کی کہانیوں کا خاصا ہوتی ہیں پر اچھا لگا۔ مقدس مشعل کی "اب نیند ہوئی پرانی" میں زینا کی نیندوں پر عیش عیش کر اٹھے۔ صدف رحمان گیلانی کے "بس ایک حرف" میں چھپا گہرا پیغام تھا صبر نیت اور کلام میں احتیاط کا۔ عمدہ طرز تحریر اور سبق آموز۔ سلمیٰ فقیر حسین کا "پھر نہ کہنا" اف... ف... آخر میں اتنا الجھا گیا کہ فشار خون تیز کر دیا۔ مزے کی ہلکی پھلکی تحریر تھی۔

"ردائے وفا" ہم عام انسانوں کی پر خطا زندگیوں پر لکھی تحریر۔

ج : پیاری کوئل! شکریہ آپ نے امتحانات قریب ہونے کے باوجود کرن پر توجہ دی۔ بہت اچھے نمبروں سے ہماری دعا ہے کہ آپ امتحان میں کامیاب ہوں۔

آسیہ ارم۔ ملیر

اس ماہ کا کرن 12 ستمبر کو ملا ماڈل اچھی تھی۔ میری ایک تجویز ہے۔ وہ یہ کہ آپ لوگ ٹائٹل پر ہمیشہ خواتین ماڈل کو کبھی دلہن تو کبھی باری و سیر میں دکھاتے ہیں ظاہر ہے یہ تمام ڈائجسٹ خواتین کے زیر مطالعہ رہتے ہیں 99% تو کیوں نہ ٹائٹل پر جس ماڈل کو دکھائیں وہ ہماری آج کی محنت کش خواتین مثلاً "جیسے ڈاکٹر" انجینئر پائلٹ نرس "ٹیچر نیوی شیفت نیوز کاسٹر دفاتر کی ملازمین" گاؤں کی خواتین) اور بھی بہت سی ورکنگ وومن وغیرہ۔

میں نے جب بھی خط لکھا کرن میں، کرن نے اسے ہمیشہ جگہ دے کر میرا حوصلہ مان بڑھایا ہے کرن کی موسٹ فیورٹ کہانی (میری) "شاید" فائزہ مزہ آگیا مگر یہ داداجان کی انٹری اتنی کم کیوں کرتی ہیں سب سے مزے کی

شخصیت ہے ان کی پڑھ کر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتی ہوں۔ اس دفعہ عطا اللہ عیسیٰ کے گانے پر داداجان کے کمینٹس اور حرکتیں مزہ دے گئیں۔ اور ام ہانی اور سالار کا سامنا بھی کم دکھائی ہیں مجھے سالار کی شدت پسندی پسند ہے۔ ویسے ام ہانی نام کی بچیاں ہوتی بڑی پیاری ہیں بھئی مکھن نہیں لگا رہی میرے پاس بھی اک ام ہانی ہے میری سب سے چھوٹی کیوٹ سی بی۔

فرحین اظفر آپ کا "ردائے وفا" اچھا ہے مگر پلیز اسے تھوڑا سہل کیجیے آپ نے اس میں اس قدر فلسفہ گھول دیا ہے کہ آپ ایک سین کھینچ کر اتنا لمبا کر دیتی ہیں جیسے ہاسپٹل سے جدید میسج کرتا ہے نائلہ کو اب اس کے نیچے آپ نے نائلہ کے بارے میں ڈیڑھ بیج (میری رائٹنگ کے حساب سے) کا جو کچھ بھی لکھا ہے پلیز ہم ان دس قسطوں میں اچھی طرح سے نائلہ کو سمجھ چکے ہیں میں تو اب کہانی کا بہت سا حصہ (اسی طرح کا) چھوڑ کر پڑھتی ہوں پلیز ابھی اس میں میرا انٹرسٹ ختم نہیں ہوا مگر اب آپ ویسے بھی اس کہانی کو لمبا کھینچ رہی ہیں قاری بہنیں اگر میری بات سے ایگری ہوں تو ضروری بتائیں۔

تزیلہ ریاض کی "راپنزل" اپنے نام کی طرح منفرد ہے مجھے ایسی پرت در پرت چھپی اسٹوریز بہت پسند ہیں ابھی تک مہر (جو شہزادی راپنزل کا کردار ادا کر رہی ہے) اور اس کے پایا کو سامنے نہیں لائی ہیں آپ اچھا ہے تجس سے بھری یہ کہانی بہت انٹریکٹو ہے جس کا ہر ماہ انتظار رہتا ہے۔

مکمل ناول "شہ مات" نایاب کی بہت اچھی کاوش تھی مگر صرف فجر ماہ میں اور فلاح پر زیادہ توجہ دی تھوڑا اور بھائیوں کی مستیاں شرارتیں دیکھائیں اتنا اچھا پلاٹ تھا۔ نادیہ احمد کا "تو بہت دیر سے ملا ہے" تھوڑا عجیب سا تھا کافی جگہ بے ربط سا لگا۔ "میں گمان نہیں یقین ہوں" نبیلہ ابر راجہ آپ نے پلاٹ تو بہت اچھا چنا تھا مگر کہانی میں کئی جگہ جھول ہیں ہاں اس دفعہ جو نظم آپ نے اس میں شامل کی ہے۔ میری روح تک کو ہلا گئی ہے زبردست۔ صدف رحمان "بس اک حرف" اچھا موضوع لے کر آئیں۔

"رواجوں کے قیدی" سحرش نے گاؤں کی جمالت دکھائی ہے کیا اب بھی ایسا ہوتا تو ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس رب نے ہمیں اک اچھی سوچ رکھنے والی فیملی کا حصہ بنایا ہے۔ مقدس مشعل کا "اب نیند ہوئی پرانی" بہت اچھا تھا خاص کر زینا کی سونے کی عادت سہی

ہر تدبیر ناکام ہو گئی۔ اور شادی کا دن بھی آ گیا۔
 وکھری ٹائپ کے دادا جی کی باتیں ہنساتی رہیں۔
 قسط کا اینڈ ہلا دینے والا تھا۔ ”شہ مات“ بڑی اچھی تحریر
 تھی۔ نگینو کردار ماہ مبین ذرا پسند نہیں آیا۔ مبین کو

ہے بھئی جہاں جگہ ملتی محترمہ سو جاتیں۔ پڑھ کر مزہ آیا اس
 کہانی میں لڑکیوں کے لیے بھی بہت اچھا سبق تھا۔
 ہائے سلمیٰ فقیر جی یہ کیا لکھ ڈالا آپ نے ابھی تک پیٹ
 کی آنتیں ابھی بڑی ہیں سچ جڑے دکھ گئے ہتے ہتے اس کو
 پڑھتے۔ ویل ڈن سلمیٰ امید ہے کہ آئندہ بھی آپ ہمارے
 لیے تفریح سے بھرپور ناول لائیں گی سارے دن کی بے
 زاری اڑن چھو ہو گئی۔

اس کے علاوہ انٹرویوز اور تمام سلسلے بے حد پسند آئے۔
 اب اجازت دیں جب اکتوبر کا شمارہ آئے گا تو عید الضحیٰ
 گزر چکی ہوگی اس لیے میری طرف سے آپ کو پوری نیم
 کو اور میری پیاری قارئین بہنوں کو دلی عید مبارک۔ ج
 : آئیہ جی! آپ نے خط لکھا ہے بے حد شکریہ۔ یقیناً
 محنت کش خواتین ہمارے لیے رول ماڈل ہیں لیکن ٹائٹل
 بر ماڈل بنانا ان کا کام نہیں ہے۔ کہانیوں پر آپ کا تبصرہ بہت
 شاندار اور بھرپور تھا امید ہے آئندہ بھی اپنی رائے سے
 ضرور آگاہ کریں گی۔ آئیہ جی بیٹیاں تو ہوتی ہی پیاری ہیں
 ان کا نام جو بھی ہو۔

فوزیہ شمس، ہائیکہ عمران آمنہ میر۔ گجرات

ستمبر کا شمارہ بارہ کو ہی مل گیا۔ انتہا کی خوشی بھئی اب
 انتظار کی کوفت تو نہیں سہنی پڑتی۔ سرورق ماڈل خوب
 صورت لگ رہی ہیں گمراہوں میں ہیر رنگ لگانے کی تک
 ہماری سمجھ سے تو باہر رہی۔

شیف راحت، حمزہ علی عباسی اور فارس شفیع سے
 ملاقات اچھی رہی۔ ”مقابل ہے آئینہ“ (پچی گل دساں)
 ہیں اے سلسلہ کچھ ساوا دی نہیں رہا۔ سب سے پہلے
 ”راپنزل“ کو پڑھا۔ اس بار بھی قسط اچھی رہی۔ یہ تزیلہ
 جی کے کلم کا کمال ہی تو ہے جو ہمیں بور نہیں ہونے دیتا ہے
 تحریر ابھی تو آغاز میں ہی ہے۔ پھر بھی سارے کردار اپنی اپنی
 جگہ سیٹ لگ رہے ہیں۔

دوسرا مکمل ناول ”ردائے وفا“ اس بار قسط کچھ خاص
 نہیں لگی۔ میرے خیال میں اسے ایسے ہی طویل کیا جا رہا
 ہے۔ نائلہ کو شبیر شیطان سے نجات دلائیں اور حدید اور
 نائلہ کے تمام گلے شکوے ختم کریں۔

”میں گمان نہیں یقین ہوں“ نبیلہ جی نے تو سارے
 انکشافات لاسٹ قسط میں چھپا رکھے ہیں۔ ناولٹ
 ”شاید“ ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد آیا سعد بچارے کی

مشہور و مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین



450/-	سفر نامہ	آوارہ گرد کی ڈائری
450/-	سفر نامہ	دنیا گول ہے
450/-	سفر نامہ	ابن بطوطہ کے تعاقب میں
275/-	سفر نامہ	چلتے ہو تو چمن کو چلیے
225/-	سفر نامہ	گمری گمری پھر مسافر
225/-	طنز و مزاح	خمار گندم
225/-	طنز و مزاح	اردو کی آخری کتاب
300/-	مجموعہ کلام	اس ہستی کے کوچے میں
225/-	مجموعہ کلام	چاند گمر
225/-	مجموعہ کلام	دل وحشی
200/-	ایڈ گرامین پو اب انشاء	اندھا کنواں
120/-	ادہنری اب انشاء	لاکھوں کا شہر
400/-	طنز و مزاح	باتیں انشاء جی کی
400/-	طنز و مزاح	آپ سے کیا پردہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

اس کی ”مکروغ“ سوچ کا آئینہ نہیں دکھایا۔ مکمل ناول ”پھر نہ کہتا“ مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگا۔ معذرت کے ساتھ آپ سنجیدہ تحریر لکھا کرے۔ وہ ہمیں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔

ناولٹ ”نیند ہوئی پرانی“ دادی اماں کا اچھا مقرر تھا۔ شکر دادی اماں کو ناکامی نہیں ہوئی۔

اب کی دفعہ مستقل سلسلوں میں، میں تو کہیں بھی نہیں تھی۔

”نامے میرے نام“ میں سب کے تحریروں کے متعلق، اظہار خیال اچھے تھے۔ مگر یہ کیا جو الائی کے شمارے میں میرے خط کو فیسٹ پہ کر دیا اور ستمبر میں محفل کے اینڈ میں میرے دل کو آپ کی یہ ادا بالکل بھی اچھی نہیں لگی۔ ہاں نا۔

ہمارے گھر میں ”کرن“ کی دو پرستار شیدائی ہو گئی ہے۔ ایک تو میری بہن شازیہ میرر میں اور دوسری میری محترم بھابھی طیبہ صاحبہ۔ دونوں سرکھانی ہیں جو تحریر اچھی ہوتی ہیں ان پہ نشانی لگا دیا کروں، ہم نے پڑھنی ہوتی ہیں۔ اور پھر ان کے بصرے کہ فلاں کا اینڈ ایسے کیوں ہو ویسا کیوں نہیں ہوا۔

ج : نوزیہ! خط شامل تو کر دیا نہ آپ کا نمبر سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ کا بے حد شکریہ جو ہر ماہ پابندی سے کرن کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں اور آئندہ بھی کرتی رہیں گی۔ آپ کی بہن اور بھابھی جی ہماری قارئین کی فہرست میں شامل ہو گئیں بہت خوشی ہوئی۔

حراقریشی بلال کالونی۔ ملتان

لیجئے آپ نے یاد کیا، حرا کو اور حرا الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح جھٹ پٹ حاضر۔۔۔ بھئی ہم تو ایسے ہی خوا خواہ ناراض ہوئے اپنے ہا کر سے، اب کے تو ٹائم سے قبل از وقت مل گیا کرن، سو ناراضی ختم بھی اور شد بھی۔۔۔!

ہماری محبوب من (کرن) سے جو نسبت ہے اس کے آگے غلطی سے بھی فل اشاپ مت لگائیے گا ورنہ ہم (So on) کی علامت لگا دیں گے جو جاری رہتا ہے لا محدود ہوتا ہے۔ لوگ بھاگتے ہیں اسٹیشن پر ٹرین پکڑنے

کے لیے۔۔۔ جناب ہم دوڑتے ہیں تبصرے کے لیے! ”شاید“ طالماں! کہاں بیچارے معصوم غریب دل کو لڑکا دیا ہے۔۔۔ با خدا! تڑپتا ہے ام ہانی کی کیفیت پہ، کوئی پوچھے فائرہ جی سے اتنا دل خواہ بھی لکھتے ہیں بھلا کہ سیدھی سادی

مصروف شخصیت (اپنی بات کر رہی ہوں، جلنے والے منہ پیچھے کر لیں) بھی ایک قسط کو تین دفعہ بڑھے۔

باسبب تمہاری آمد، غنچے ڈالیوں پر چمک اٹھے!

”راپینزل“ شہین کا ایمن کے سنگ رویہ سوالیہ نشان؟ (گتھی کھلنے کے منتظر ہیں) کاشف اور صوفیہ دونوں کو اپنے

روپے میں لچک پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جیبہ کی شوہر کا ایک سینڈنٹ اور پھر موت کی جاں فزا خبر (یہ ناگمانی کلا نمکس چونکا دینے والا ہے) ”ردائے وفا“ دکھ ہی دکھ، افسوس صد افسوس! نائلہ ڈیر پھنس گئی نا، معراج امید کی کرن اور اندھیرے میں روشن چراغ عفت کے لیے ثابت ہونے لگا ہے۔ ”نیند ہوئی پرانی“ جو کام جمشید صاحب اور

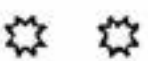
اماں جی کرنا چاہ رہے تھے وہ عبید کے دست نے پلک ٹھپکتے سل کر ڈالا۔ مبارک زینابی بی! ”رواجوں کے قیدی“ ناچاہتے ہوئے بھی ابھی بھی ”خوا“ ان فرسودہ رواجوں کے زیر اثر ہے۔ ”دیر سے ملا ہے“ ماہانے حسن کے لیے انتظار کی بڑی بھاری مشقت کی ادا ہو گئی کی۔ رامس کا ہمراہ ہونا حوصلہ افزائی کا باعث بنا رہا۔ ”بس اک حرف“ عورت ذات کو اتنا

تک و دو کی چکی میں پیسنا ضروری ہے کیا جب بنیادی ضروریات سوچ سوچ کر پوری ہو رہی ہوں لہنی کی بس حد ہو گئی تھی اور شارق میاں اپنے مدعا سے ہنسنے کو تیار نہ تھے (کچھ تو گزربڑ ہوئی تھی نا پھر) ”پھر نہ کہتا“ ارے بھئی! کچھ نہیں کہتے بہت کچھ لکھتے ہیں اور سناتے ہیں! چاروں لڑکیوں کی نوک جھونک، ہاتھ کی برداشت قابل دید ”شہ مات“ زبردست کمال کیتا تسمی ”میں گماں نہیں“

دلچسپی حد درجہ بڑھ گئی ہے۔

نخر اور خوشی کا عنصر غالب آنے لگتا ہے ”جب موتی چنتے ہیں“ اپنا ذاتی اقتباس بھیج سکتے ہیں؟ تمام سلسلوں کو برابر فیصد پر رکھا اب کے۔ لیجئے اختتام کرتے کرتے بھی کچھ نہ کچھ تو فرض ادا ہو ہی گیا۔ آپ کی ہمراہی ہمارے سر چشمہ رہنمائی ہے۔ رب سونا آپ کا حامی و ناصر ہو۔ آپ کی ادنیٰ خاکسار۔

ج : حرا! آپ کا کرن کو پسند کرنے کا شکریہ ”نامے میرے نام“ ہمارا مستقل سلسلہ ہے تو بہتر ہو گا کہ اسی ماہ کی کہانیوں پر تبصرہ کیا جائے۔ موتی چنتے ہیں یعنی کہ کسی کتاب یا ناول میں آپ کو کوئی اقتباس پسند آئے۔ کیونکہ ہم کتاب یا ناول کا نام ساتھ شائع کرتے ہیں۔



کرن کتابچہ

آلہ
کیراٹک

ماہنامہ کیران
۳۷، اردو بازار، کراچی

معدہ

☆ معدے کا نظام درست کرنے کے لیے ترش پھل استعمال کرنے چاہئیں جن میں لیموں، ترش انار، آلوچہ اور آلو بخارا شامل ہیں۔

گردے

☆ گردوں کی صفائی کے لیے پانی زیادہ مقدار میں پیئیں اور آم، انگور، کیلا اور پستیا استعمال کریں۔

اعصابی

☆ انگور، سیب، ناشپاتی، کیلا، انجیر، جامن اور کھجور کا استعمال کریں۔

دانت

☆ دانتوں کی مضبوطی کے لیے سنگترہ، مالٹا، کینو وغیرہ استعمال کریں۔ کیونکہ ان میں کیمیا شیم پایا جاتا ہے جو ہڈیوں کی مضبوطی کے لیے کارآمد ہوتا ہے۔

بلڈ پریشر

☆ ہائی بلڈ پریشر کے لیے ناشپاتی کا استعمال مفید ہے۔



☆ آپ کی بیماریوں کا علاج آپ کے کچن میں

پیشاب کی جلن دور کرنے کے لیے

☆ پیشاب کی جلن کو دور کرنے کے لیے ایک چمچ

گھریلو مسائل کے آسان حل

گھر کی چار دیواری کے اندر رہ کر آپ بہت سے ایسے کام کر سکتی ہیں جو نہ صرف آپ کے لیے معاشی پریشانیوں کا حل ہوں گے بلکہ آپ ان سے بہت سے گھریلو فوائد حاصل کر سکیں گی۔ اس کتاب میں ہم نے روزمرہ کی گھریلو زندگی میں کام آنے والے ٹوٹکے درج کیے ہیں۔ منگائی اور مصروفیت کے اس دور میں یہ گھریلو ٹوٹکے آپ کے لیے گویا ثابت ہوں گے۔ ہر ٹوٹکے کو آسان اور موثر انداز میں درج کیا گیا ہے تاکہ آپ ان سے بھرپور استفادہ کر سکیں۔ یاد رکھیں سنگھڑ عورت وہی ہے جو کم خرچ میں گھر کو جنت کا نمونہ بنا سکتی ہے۔ عورت کی پہچان اس کے گھر کے طریقے اور سلیقے سے ہوتی ہے جو کم آمدنی میں بھی گھر کو صاف اور ستھرا اور خوب صورت بنا سکتی ہے۔

انسانی جسم

☆ انسانی جسم کے لیے پھلوں کی اہمیت۔

دماغ

☆ کھجور، بادام، سیب، انگور، سنگترہ، اخروٹ۔ کیونکہ ان تمام پھلوں میں فاسفورس زیادہ ہوتا ہے۔

دل

☆ دل کی کمزوری دور کرنے کے لیے سنگترہ، انار اور مالٹا بہترین پھل ہیں۔

جگر

☆ جگر خراب ہو جائے تو ٹماٹر، انار، انناس، آڑو اور لیموں استعمال کریں۔ کیونکہ ان پھلوں میں ترشی اور نمکیات ہوتے ہیں جو جگر کے افعال کو درست رکھتے ہیں۔

بھون کر رکھ لیں۔ روزانہ صبح دو بڑے چمچے استعمال کریں اور موسم کے مطابق گرم یا ٹھنڈے پانی کے ساتھ کھائیں۔

زبان کی لکنت کے لیے

☆ زبان کے نیچے تیزبات کا سفوف بنا کر رکھنا یا پھر پتا ہی توڑ کر رکھنا لکنت زبان کو درست کرتا ہے۔

☆ پانی میں دار چینی ڈال کر ابال لیں اور اس سے غرار کریں۔

☆ پانی میں نمک ڈال کر ابالیں اور غرارے کریں۔

قے اور الٹی کے لیے

☆ دھنیا ایک تولہ گھوٹ چھان کر مصری ملا کر کوٹ کوٹ پلا میں قے بند ہو جائے گی۔

بلغھی کھانسی کے لیے

☆ ہلدی کو آگ میں بھون کر باریک پیس لیا جائے اور ایک ماشہ خوراک نیم گرم پانی کے ساتھ کھائی جائے بلغھی کھانسی چند روز میں اچھی ہو جاتی ہے۔

سرخ مرچ کے بیج ایک ماشہ باریک پیس کر ایک تولہ گڑ میں ملا میں اور ان کی گولیاں پندرہ عدد بنالیں ہر روز بوقت صبح ایک گولی استعمال کریں۔ بلغھی کھانسی رفع ہو جائے گی۔

داؤ (چنبل)

☆ روغن کلونجی روزانہ تین مرتبہ مالش کریں۔ ان شاء اللہ چند دنوں میں داؤ ختم ہو جائے گا۔

دانت اور مسوڑھے کا درد

☆ شہد کو سر کے میں گھولیں اور اس کی کلیاں صبح شام کریں دانت اور مسوڑھے مضبوط ہو جائیں گے۔

دکھتے دانت

چائے والا اجوائن خراسانی کا سفوف ہمراہ پانی روزانہ استعمال کریں۔

خشک کھانسی کے لیے

☆ خشک کھانسی اور دمہ کے لیے روزانہ ایک تولہ اسپغول دودھ یا پانی کے ساتھ چالیس روز تک استعمال کریں۔

سر درد کے لیے

☆ سر درد اور مریگی کے امراض میں الپچی کا شربت بنا کر استعمال کرنا مفید ہے۔

آدھے سر کا درد

☆ اگر آدھا سر درد کر رہا ہو تو سر کے جس حصے میں درد ہو رہا ہو اس کی ناک کے مخالف نٹھنے میں شہد کی بوندیں ڈال دیں درد بند ہو جائے گا۔

بد ہضمی کے لیے

☆ دانہ الپچی خور دو تولہ، مرچ سیاہ ایک تولہ، نمک سیاہ ایک تولہ، نوشادر دو تولہ، تمام اشیا کو کوٹ کر چورن بنالیں اور ڈبے یا شیشی میں بند کر لیں۔ حسب ضرورت تقریباً "آدھا ماشہ" ہمراہ پانی صبح دوپہر اور شام ہر کھانے کے بعد استعمال کریں۔

پیٹ کا درد

☆ ایک چنگلی مینھا سوڈا ایک گلاس پانی کے ساتھ استعمال کرنے سے پیٹ کا درد فوراً ہو جائے گا۔

نزلہ زکام کے لیے

☆ بار بار نزلہ زکام ہونے والے حضرات کو بھنے ہوئے چنوں کا آٹا ایک چھٹانک، مغز بادام دس دانے، سونف آدھ تولہ اور تخم خشخاش تین ماشہ ان تمام اشیا کو گڑ میں ملا لیں۔ پھر ہلکی آنچ پر پانچ تولے چینی ملا کر



چھینکیں آئیں تو۔۔

☆ اگر آپ کو بہت چھینکیں آئیں اور رکتی نہ ہوں تو آدھا کلو دودھ میں ایک چائے کا چمچ ہلدی، ایک چمچ اجوائن اور تھوڑی سی دسی شکر لے کر اتنی دیر تک پکائیں کہ دودھ ایک کپ رہ جائے۔ اس دودھ کو روزانہ رات کو ایک ہفتہ تک پییں، نزلہ زکام اور چھینکوں میں مفید ہے۔

کانچ کا معاملہ

☆ اگر غلطی سے کانچ کا ٹکڑا یا زرے کھالیے ہوں تو اس متاثرہ شخص کو بہت سارے کیلے کھلا دیں۔ کانچ نکل جائے گا۔

زہریلے جانور کے کاٹے کا علاج

☆ اگر زہریلا جانور کاٹ لے تو کسی کھل میں مولیاں کوٹ کر کپڑے میں سے چھان کر رس کا عرق نکال لیں، کائی ہوئی جگہ پر دو تین دفعہ لگادیں، ہر قسم کی جلن اور تکلیف ختم ہو جائے گی۔ مولی کا عرق جتنا زیادہ پرانا ہوگا اتنا ہی جلد اثر کرے گا۔ اگر شہد کی مکھی، بچھو یا ایسے ہی دوسرے زہریلے جانور نے کاٹ لیا ہے تو پیاز کا عرق نکال کر کائی ہوئی جگہ پر لگانے سے کالی آرام آجاتا ہے۔

آگ سے جلنے کے داغ

☆ ایک پاؤ سرسوں کے تیل میں آدھا پاؤ کٹا ہوا گڑ ڈالیں۔ ان دونوں کو ہلکی آنج پر اتنی دیر پکائیں کہ گڑ جل کر سیاہ ہو جائے، چولہے سے اتارنے کے بعد گڑ نکال لیں اور تیل کو بوتل میں ڈال کر رکھ دیں۔ روزانہ رات کو سوتے وقت اسے داغ پر لگائیں اور صبح دھولیں، ایک مہینے کے استعمال سے داغ دور ہو جائیں گے۔

☆ دانٹوں کی صفائی نہایت ضروری ہے، لیکن دیکھا گیا ہے کہ اکثر صفائی رکھنے کے باوجود بھی مسوڑھوں سے خون آتا ہے اور ان میں درد بھی رہتا ہے ان کا علاج یہ ہے کہ پھٹکری میں زرا سا نمک ملا کر مسوڑھوں پر مل لیں دن میں دو بار یہ عمل کرنے سے درد اور بلیڈنگ کو کافی افاتہ ہوگا۔

گرمیوں میں جلدی امراض

☆ گرمیوں میں اگر جلدی امراض حملہ کر دیتے ہیں، بعض اوقات خون کے فاسد ہونے کی وجہ سے بھی جسم پر خارش ہو جاتی ہے۔ اس مرض کے دور کرنے کے لیے کریلوں کا رس نکال کر دو چمچ روزانہ صبح کے وقت پییں چند روز کے استعمال کے بعد خون صاف ہو جائے گا اور چہرے کی رنگت نکھرے جائے گی۔

گرم چائے سے جلنے کے لیے

☆ گرم چائے یا کافی پینے سے زبان جل جاتی ہے، اس کے لیے اگر آپ چینی کے چند دانے لے کر اپنی جلی ہوئی زبان پر ڈال دیں تو آپ کی زبان کو فوراً ہی اس پریشانی سے نجات مل جاتی ہے۔

مائیکرین سے نجات

☆ چند کافور کی گولیاں لے کر انہیں پیس لیں اور پھر پانی میں ملا کر سونے سے پہلے اپنی پیشانی پر ملیں۔ مائیکریشن یا آدھے سر کا درد فوراً ختم ہو جائے گا۔

بند ناک کھولنا

☆ تھوڑی سی کالی مرچ اور اجوائن لیں اور انہیں گرم تیل میں ملادیں اور پھر اسے سونگھیں۔ اس عمل سے بند ناک فوراً کھل جائے گی۔ اس کے علاوہ خالص بادام کا تیل ایک قطرہ دونوں ناک کے نتھنوں میں ڈالیں۔ اس سے ناک کھل جائے گی۔

وانے لے کر پیس لیں، ایک چمچ شہد پیا کریں اور دار چینی کے دو تین چھوٹے ٹکڑے دن میں چوس لیا کریں۔

آنکھوں کا درد دور کرنے کے لیے

☆ آنکھیں دکھتی ہوں تو گو بھیجی کے پتوں کی ٹکیہ بنا کر آنکھوں پر باندھنے سے درد رفع ہو جاتا ہے۔

غذا اور غذا سیت

جلے ہوئے گوشت کو ٹھیک کرنے کے لیے

☆ کبھی کبھی گوشت پکاتے ہوئے جل جاتا ہے۔ اس کو ٹھیک کرنے کے لیے پہلے دیگیچی چولہے سے اتار کر جلا ہوا گوشت بغیر جلے گوشت سے علیحدہ کر لیجیے اور مسالا پھینک دیجئے۔ پھر دو سری دیگیچی میں گھی ڈال کر پیاز براؤن کیجیے اور تازہ مسالا بھون لیں اور گوشت تیار ہونے کے بعد تھوڑی سی میتھی بھی ڈال لیں۔ اس طرح جلے ہوئے گوشت کی بو دور ہو جائے گی اور گوشت ٹھیک ہو جائے گا۔

پیاز کو کرپی کرنے کے لیے

☆ پیاز کو کرپی اور اچھا براؤن کرنے کے لیے پہلے سلائس کیے ہوئے پیاز کو پندرہ منٹ کے لیے وہی میں بھگو دیں، پھر فرائی کریں، اس سے پیاز کا رنگ بہت اچھا آتا ہے۔

پیاز خستہ کرنے کے لیے

☆ پیاز کو فرائی کرنے سے پہلے اگر دودھ میں ڈبو لیا جائے تو پیاز خستہ ہو جاتا ہے۔

انڈوں کی بو

☆ ایک میں انڈوں کی بو دور کرنے کے لیے اگر اس آمیزے میں ایک چمچ شہد کا ڈال دیا جائے تو انڈوں کی

لو سے بچاؤ کے لیے

☆ دھنیے کے پانی میں چینی ملا کر پیس۔ گرمیوں کے موسم میں بار بار پانی پیتے رہنے سے لو لگنے کا خطرہ نکل جاتا ہے۔ ایک الاچی ہر وقت منہ میں رکھنے سے اس سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔ آم کی کیری کا شربت پینا مفید ہے۔ لیموں کے رس میں ایک گلاس پانی اور پسی ہوئی مصری ڈال کر پینے سے لو کا اثر کم ہو جاتا ہے۔

خارش کا علاج

☆ خارش خشک و تر کی صورت میں لیموں کا رس پانچ گرام، عرق گلاب دس گرام اور چیمیلی کا تیل پندرہ گرام، تینوں کو ملا کر خارش والی جگہ پر لگانے سے چند روز میں افاقہ ہو جائے گا۔

گردہ اور مثانے کی پتھری کے لیے

☆ گردہ اور مثانہ کی پتھریاں ایک ماہ تک کھیرے کی قاشوں پر کالا نمک اور نوشادر لگا کر کھانے سے پیشاب کے راستے ٹوٹ کر نکل جاتی ہیں۔

خونی بوا سیر کے لیے

☆ کریلے کے پتوں کا پانی پانچ تولہ گائے کے ایک پاؤ گھی میں ملا کر پکایا جائے، جب پانی جل جائے تو باقی ماندہ گھی بوا سیر خونی باوی کے مسوں پر لگانے سے چند دنوں میں مسے غائب ہو جاتے ہیں اور جلن تو ایک ہی دفعہ لگانے سے دور ہو جاتی ہے۔

نظر کی کمزوری دور کرنے کے لیے

☆ اگر آپ روزانہ ایک امروہ نما منہ چالیس دن تک بلا ناغہ کھائیں تو نظر کی کمزوری دور ہو جائے گی۔

قوت حافظہ کے لیے

☆ نسیان دور کرنے کی خاطر کلونجی کے سات عدد

بو نہیں آتی۔

کر گر پڑے تو سمجھ لیں کہ انڈا ابھی کچا ہے۔

بھنڈیوں کو خستہ کرنے کے لیے

کریلوں کی کڑواہٹ

☆ بھنڈیوں کو خستہ کرنے کے لیے پکاتے وقت اس میں چند قطرے لیموں کا رس ڈال دیں یا پھر ایک چمچ وہی ڈال دیں۔

☆ کچا آم لے کر کاٹ لیں۔ تھوڑے سے پانی میں ابلالیں۔ جب جوش آجائے تو اس میں کریلے کاٹ کر ڈال دیں۔ چارپانچ جوش دیں اور کریلے نکال دیں۔

کریلوں کی کڑواہٹ دور ہو جائے گی۔

چاول کی نرمی کے لیے

سالن گاڑھا کرنا

☆ چاول دم پر رکھتے وقت احساس ہو کہ چاول سخت رہ گئے ہیں تو کوئی کپڑا یا اخبار گیل کر کے ڈھکن کے اندر رکھیں اور پھر دم دے دیں تو چاول ذرا نرم ہو جائیں گے اور اگر چاول نرم ہو گئے ہوں تو خشک کپڑا یا اخبار تہ کر کے ڈھکن کے اندر رکھ دیں، زائد پانی خشک ہو جائے گا اور چاول کھلے کھلے پکیں گے، یعنی ہردانہ الگ الگ ہوگا۔

☆ اگر سالن پتلا ہو گیا ہے اور آپ کے پاس ٹماٹریا پیاز نہیں ہے تو بھنی ہوئی سوچی سالن میں ڈال دیں۔ اس سے سالن گاڑھا ہو جائے گا اور ذائقہ بھی اچھا ہوگا۔

مکھن کی نرمی کے لیے

☆ مکھن نرم کرنے کے لیے ایک آسان ساحل یہ ہے کہ ایک کھلے منہ کے پیالے میں گرم پانی بھر کر مکھن اس میں ڈال دیں، مکھن چند ہی منٹ میں نرم ہو جائے گا۔

گوشت کی بساند دور کریں

مٹر کا گلانا

☆ قربانی اور بازار سے خریدے ہوئے گوشت میں اکثر بساند آتی ہے، جو بہت پکانے پر بھی نہیں جاتی۔ اس بساند کو ختم کرنے کے لیے نہایت سستا اور آزمودہ نسخہ ہے، وہ یہ کہ چھلنی میں آٹا چھانسنے کے بعد بیچ جانے والی بھوسی کو جمع کر کے گھر میں رکھیں۔ جب گوشت خرید کر لائیں اور اس میں بساند محسوس ہو تو گوشت پر آئے کی بھوسی اچھی طرح چھڑک کر اسے پندرہ منٹ تک رکھے رہنے دیں اور پھر دھولیں۔ بساند بالکل ختم ہو جائے گی۔

☆ مٹر گلانے کے لیے مٹر کے دانوں کو پانی میں بھگو کر معمولی سی شکر یا کھانے کا سوڈا اور پودینے کی چند پتیاں ڈال کر پکا میں، مٹر کے دانے کم وقت میں گلانے کے لیے یہ نسخہ سب سے آسان اور آزمودہ ہے۔

اناج کو کیڑوں سے محفوظ رکھنا

ابلے انڈے کی پہچان

☆ عموماً گھروں میں مہینہ بھر کا اناج ایک ہی وقت میں خرید لیا جاتا ہے اور اناج میں کیڑے مکوڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ طویل عرصہ اناج ہر قسم کے مضر اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے اناج کے ڈبوں میں تیزبات کے پتے ڈال دیں، اناج تازہ رہے گا اور کیڑوں سے

☆ اگر آپ نے یہ دیکھنا ہو کہ انڈہ ٹھیک طور پر ابلا ہے یا نہیں تو انڈے کو پانی سے نکال کر گھما کر دیکھیں، اگر لٹو کی طرح سے گھوم جائے تو سمجھ جائے کہ انڈا ابل گیا ہے اور اگر ٹھیک سے نہیں گھومے بلکہ لڑکھڑا

کارآمد گھریلو ٹیپس

چاہیے، کیونکہ اس کا زیادہ استعمال چائے کو خراب کر دیتا ہے اور اس کی اگر کمی ہو جائے تب بھی چائے کے ذائقے میں خرابی پیدا ہو جائے گی۔ جھنٹی چائے کی پتی آپ کو درکار ہو اس کی آدھی مقدار ڈالیں اور آدھی پتی کو چھلنی میں ڈالیں جس سے چائے چھانی جاتی ہے۔ جب قہوہ چھلنی سے گزرے گا تو اس میں موجود تازہ چائے کی پتی کی قوت بھی قہوے میں شامل ہو جائے گی اور یوں یہ عمل چائے کو مطلوبہ ذائقہ تک لے جائے گا۔

مچھلی کی بودور کرنے کے لیے

☆ مچھلی کی بودور کرنے کے لیے اسے پکاتے ہوئے ایک دو باتوں کا خیال رکھیں تو مچھلی کی بود پکتے ہوئے کافی حد تک کم ہو جاتی ہے۔ مثلاً "جس مسالے کو بھوننا ہے اس میں تھوڑا سا سرکہ ڈال دیں" اس طرح بود کم ہو جائے گی۔

لیموں دیر تک محفوظ رکھنے کے لیے

☆ لیموں بہت مفید ہے، لیکن یہ سال بھر دستیاب نہیں رہتا، انہیں تازہ حالت میں محفوظ رکھنے کے لیے آسان طریقہ یہ ہے کہ ایک کلو لیموں کا رس نکالیں۔ انہیں برف جمانے کی ٹرے میں ڈال کر جمادیں، جب ضرورت ہو ایک ٹکڑا نکال لیں اور استعمال کریں، ہر موسم میں تازہ لیموں کے رس سے لطف اٹھائیں یہ رس خراب نہیں ہوتا۔

فرش جو تے بیگ سب چمک دار

☆ جی ہاں فلور ویکس لگانے سے بیک وقت آپ کا فرش بھی چمک سکتا ہے اور بیگ جو تے بھی آزمائش شرط ہے۔

فرش کی چمک کے لیے

اناج کی حفاظت ہو جائے گی۔

گاجر دیر تک تازہ رکھنا

☆ گاجریں بہت جلد مرجھاسی جاتی ہیں۔ پکانے سے پہلے گاجروں کو برف کے ٹخ پانی میں بھگو دیں، گاجریں تازہ ہو جائیں گی، صاف اور نکھری ہوئی محسوس ہوں گی۔

سالن میں نمک کا زیادہ ہونا

☆ سالن میں اگر نمک زیادہ ہو جائے تو اخروٹ کے برابر ایک کونٹے کا ٹکڑا سالن میں ڈال دیں۔ دس منٹ بعد نکال کر پھینک دیں، زائد نمک خود بخود ختم ہو جائے گا۔

گوشت جلد گلانے کے لیے

☆ گوشت گلانے کے کئی طریقے ہیں، مثلاً "ایک کلو گوشت میں اگر ایک کھانے کا چمچہ کچا پھینٹا ڈال دیا جائے تو گوشت گل کر خستہ ہو جائے گا یا پھر تربوز کا خشک یا تازہ چھلکا گوشت پکاتے وقت ڈال دیں۔ گوشت کو گلانے وقت تھوڑی سی شکر ڈال دیں تو گوشت جلد گل جائے گا۔ گوشت کی مناسب سے آدھی یا ایک دو چھالیہ کے ٹکڑے ڈالنے سے بھی گوشت گل جاتا ہے۔

پیاز کی جلن سے بچنے کے لیے

☆ پیاز کاٹتے وقت آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ اگر پیاز کاٹنے سے پہلے ریفریجریٹر میں رکھ دیں، پھر کاٹیں تو آنکھوں میں جلن پیدا نہیں ہوگی، نہ ہی آنسو آئیں گے۔

چائے کے بہتر ذائقے کے لیے

☆ چائے کی پتی کا استعمال بڑے محتاط انداز سے کرنا

چھلنی کی صفائی کے لیے

☆ اسٹین لیس اسٹیل کی چھلنی کو صاف کرنے کے لیے اسے آگ پر گرم کریں۔ صاف ہو جائے گی۔
چائے کے مگ صاف کرنے کے لیے

☆ چائے یا کافی کے مگ سے چائے کی پتی یا کافی کے داغ دھبے دور کرنے کے لیے ان میں بیکنگ سوڈا ڈال کر ملکے ہاتھ سے رگڑیں۔ سب داغ صاف ہو جائیں گے۔

تیل کے داغ مٹانے کے لیے

☆ اونچی کپڑوں سے تیل کے داغ مٹانے کے لیے متاثرہ جگہ پر ذرا سادھی لگائیں اور کچھ دیر بعد دھولیں۔ تیل کے داغ صاف ہو جائیں گے۔

ٹوتھ برش کو صاف رکھنے کے لیے

☆ ٹوتھ برش کو بیکٹریا سے پاک رکھنے کے لیے اسے ہفتے میں ایک بار نمک ملے گرم پانی سے دھوئیں۔ برش صاف ہو جائے گا۔

سیاہی کے داغ

☆ سیاہی کے داغ دور کرنے کے لیے آلو کو چھیل کر اس کے دو ٹکڑے کر لیں، پھر جہاں سیاہی کا داغ ہو اس جگہ پر خوب ملیں، معمولی اور ہلکے قسم کے داغ دور ہو جائیں گے۔

شیشے کے برتن چمکائیں

☆ شیشے کے نازک برتن صاف کرنے اور ان برتنوں میں چمک پیدا کرنے کے لیے تین چمچے سرکہ پانی میں ملا کر رکھ دیں، تمام برتن دھونے کے بعد سرکہ ملے پانی سے برتن کھنکال لیں۔ شیشے کے برتن خوب چمک اٹھیں گے۔

☆ فرش اگر پرانا ہو تو صفائی کے بعد بھی چمکتا دکھائی نہیں دیتا، فرش کی کھوئی ہوئی چمک لوٹانے کا آسان نسخہ یہ ہے کہ ایک پیلی میں بیکنگ پاؤڈر ڈال کر ابالیں، جب پانی میں جوش آجائے تو احتیاط سے فرش پر پھیلا دیں، جھاڑو یا برش سے فرش کو رگڑیں، فرش صاف ہو کر چمک اٹھے گا۔ ہر ہفتے یا پندرہ دن بعد یہ عمل کرنے سے فرش کے دھبے صاف ہو جائیں گے اور فرش بھی خوب صاف ہو جائے گا اور اس پر مٹی بھی جمع نہیں ہوگی۔

کپڑوں کے داغ کے لیے

☆ کپڑوں پر سالن یا کسی اور شے کا بد نما نشان ہو تو لیموں کاٹ کر اس کا عرق متاثرہ جگہ پر لگائیں اور کپڑے کو پانی سے دھولیں، داغ صاف ہو جائے گا۔
نان اسٹک برتن کے داغ دور کرنے کے لیے

☆ نان اسٹک کے برتن جب زیادہ استعمال ہوں تو ان میں دھبے پڑ جاتے ہیں، ان دھبوں کو صاف کرنے کے لیے تین کپ پانی نان اسٹک کے برتن میں ڈالیں اور اس میں ایک کھانے کا چمچ سرکہ، ایک کھانے کا چمچ بائچنگ پاؤڈر اور ایک کھانے کا چمچ نمک ڈال کر پانچ سے دس منٹ تک ابالیں، پھر نرم برتن دھونے والے فوم سے اور صابن سے رگڑ کر دھولیں۔ نان اسٹک پین اور پیلیاں وغیرہ بالکل نئی ہو جائیں گی۔

کپڑوں پر بال پین کے داغ دور کرنے کے لیے

☆ کپڑوں پر بال پین کے داغ بہت مشکل سے صاف ہوتے ہیں لیکن اس کے لیے ایک آسان ترکیب یہ ہے کہ بال پین کے دھبے کے اوپر ہری مرچ کاٹ کر خوب ملیں، پھر عام پاؤڈر سے دھو کر استری کر لیں، داغ صاف ہو جائے گا۔



لیکن اگر جوتوں کی پالش میں چند قطرے لیموں کے رس کے ملا دیں تو پالش کرنے سے جوتے میں چمک آجاتی ہے اور وہ بالکل نئے محسوس ہوتے ہیں۔

پان کے داغ

☆ کپڑوں پر پان کے داغ بہت بد نما لگتے ہیں اور کوشش کے باوجود صاف نہیں ہوتے، لیکن اگر پان کے داغ دور کرنے کے لیے ایک کچا امرود کاٹ کر داغ پر ملا جائے اور پھر داغ والی جگہ کو پانی سے دھو ڈالا جائے تو پان کے داغ دور ہو جاتے ہیں۔

کپڑے پر گھی کا داغ

☆ اگر کسی کپڑے پر گھی کا داغ پڑ جائے تو اس حصے پر لیموں اور نمک لگا کر ملیں اور صابن سے دھولیں۔

چائے کے داغ کو دور کرنا

☆ جس جگہ چائے یا کافی گر جائے تو وہاں فوراً نمک چھڑک دیں اور خشک ہونے کے بعد گرم پانی میں سرف ڈال کر دھولیں۔ کافی کے دھبے صاف کرنے کے لیے اسپرٹ سے صاف کر لیں۔ کافی کے گہرے داغ ہوں تو پیتھریول سے صاف کریں۔

ریفریجریٹر کو پھپھوندی سے بچائیے

☆ جب آپ شہر سے باہر جا رہے ہوں تو طویل

قالین کی صفائی

☆ قالین پر برسوں سے پڑے داغ دھبے صاف کرنے کے لیے داغ دھبوں پر پہلے نمک چھڑک کر آدھے گھنٹے کے لیے چھوڑیں پھر قالین دھولیں۔ ہر نوعیت کے ان اور نشانات پہلی ہی کوشش میں میسر صاف ہو جائیں گے۔ قالین بھی چمک اٹھے گا۔

شیشے پر پینٹ کے دھبے

☆ شیشے پر پینٹ کے دھبے پڑ جائیں تو سرکہ گرم کریں، کپڑے کی مدد سے شیشے صاف کریں تو تمام دھبے مٹ جائیں گے۔

تصاویر کی صفائی

☆ گھروں میں آویزاں تصاویر عموماً "گردوغبار" کی وجہ سے کم ہی عرصے میں میلی نظر آنے لگتی ہیں۔ انہیں صاف کرنے کے لیے اسٹینج کی مدد سے نیم گرم پانی سے دھوئیں، پھر ریشمی کپڑے سے تصویر صاف کر لیں۔ اس سے تصویر بالکل شفاف ہو جائے گی، خراب ہونے سے بھی محفوظ رہے گی۔

جوتوں میں نیاپن لائیں

☆ گردوغبار سے جوتوں کا نیاپن برقرار نہیں رہتا،



نیم کی پتیاں رکھ دی جائیں تو کتابیں دیمک سے محفوظ رہتی ہیں۔

چیونگم کا داغ

☆ چیونگم کپڑے پر چیک جائے تو بڑی مشکل سے اترتی ہے، بچوں کو منع کریں، چیونگم کپڑوں پر نہ چپکائیں، چھری ذرا گرم کر کے چیونگم اتار لیں، پھر اسپرٹ میں بھگو دیں اس کے بعد صابن سے دھو لیں۔

موم کے داغ

☆ آج کل لوڈ شیڈنگ کے باعث گھروں میں موم جی استعمال ہو رہی ہے، ویسے تو موم جی کو کسی چیز میں رکھ کر جلایا جاتا ہے، مگر پر بھی اگر آپ کے قالین پر موم کا نشان لگ جائے تو پہلے اس دھبے کو سخت ہونے دیں، پھر تیز دار چیز مثلاً "چھری کی مدد سے اسے اتار لیں اور پھر متاثرہ حصے پر صاف بلائنگ پیپر کا ٹکڑا بچھا کر گرم استری پھیر کر داغ اتار لیں۔ اگر یہ داغ ہلکا ہو تو تارپین کا تیل لگا کر رگڑ لیں۔

مکھن یا چکنائی کے داغ

☆ مکھن کے داغ قالین پر لگنے کی صورت میں اس کی صفائی نشو سے کریں۔ نشو میں جذب کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہوتی ہے۔ کپڑے پر تارپین کا تیل لگا کر صاف کر لیں۔ مگر اس کے قریب سگریٹ یا دیا سلانی نہ جلائیں، کیونکہ اس سے آگ لگنے کا خدشہ ہے۔

گریس کے داغ

☆ گریس کے داغ پر عام استعمال کا ٹالکم پاؤڈر چھڑکیں۔ یہ داغ جذب کر لے گا۔ پھر ٹالکم پاؤڈر کو ویکيوم سے صاف کر لیں۔

خون کے داغ

عرصے تک ریفریجریٹر بند رکھنا چاہتی ہوں تو صاف کر کے خشک کر لیں۔ اب اس کے اندر کافی سارا ٹالکم پاؤڈر چھڑک دیں۔ کافی عرصے ریفریجریٹر بند رکھنے کے باوجود پھپھوندی یا کیڑے نہیں لگیں گے۔

کپڑوں سے زنگ کے داغ دور کرنا

☆ اگر کپڑے پر زنگ کا داغ لگ جائے تو دودھ میں ایک گھنٹہ کپڑے کو زنگ والے حصے کی طرف سے ڈبو دیں، پھر صابن سے دھو لیں۔

جلنے کے نشانات مٹائیں

☆ جلد حادثاتی طور پر جل جائے تو ناصرف بہت تکلیف ہوتی ہے بلکہ جلد پر آبلے پڑ جاتے ہیں، آبلوں سے محفوظ رہنے کے لیے ایک آلوصاف کریں، اس کے چھوٹے ٹکڑے آہستگی سے جلد پر رگڑیں، جلن ختم ہو جائے گی اور آبلے بھی نہیں پڑیں گے۔ یہ نہایت آزمودہ نسخہ ہے۔

جلنے کے داغ

☆ بچوں کی یونیفارم سفید ہوتی ہے۔ صبح سویرے استری کرتے وقت بعض دفع استری سے جلنے کا داغ یونیفارم پر رہ جاتا ہے۔ آپ تھوڑی دیر کے لیے اس دھبے پر کیٹون کا رس اور نمک لگا کر رکھ دیں، دھوپ میں پھیلائیں تو بہتر ہے، پھر سرف سے دھو لیں۔

رنگین کپڑے پر داغ پڑ جائیں تو آپ کارن فلوریا نشاستہ میں پانی ملا کر تپلا کریں، کپڑے پر لگا کر سوکھنے دیں، اس کے بعد دھو لیں۔

نوٹ۔ رنگین کپڑے پر لگائیں تو زنگ کٹ جائے گا۔

الماری کو دیمک سے بچایے

☆ الماری کو دیمک سے بچانے کے لیے اس میں اگر

ہو جائے گا۔

ٹی پائٹ صاف کرنے کے لیے

☆ کیتلی کے زیادہ استعمال سے اندرونی حصہ کالا ہو جاتا ہے، آپ اس کیتلی میں پانی اور میٹھا سوڈا آدھا چائے کا چمچہ ڈال کر تین سے چار منٹ تک ابالیں، اس کے بعد اچھی طرح سے دھو لیں۔ کیتلی دوبارہ چمک جائے گی۔

چینی کے برتنوں کے داغ دھبوں اور چمک کے لیے

☆ چینی کے برتنوں پر اکثر دھبے پڑ جاتے ہیں جو بڑے بد نما لگتے ہیں۔ ان کے اس نقص کو دور کرنے کے لیے سرکے میں ذرا سائمنک ملا کر برتن کو صاف کیا جائے تو یہ دھبے دور ہو جاتے ہیں۔

سلور کے برتنوں کو چمکانا

☆ سلور کے برتنوں پر عام طور پر میل کی تھیں جم جاتی ہیں اور داغ دھبے بری طرح سے برتن کو بد نما بنا دیتے ہیں۔

سلور کے ایسے برتنوں کو جو بد نما اور میل دار ہو رہے ہوں، چمک دار بنانے کے لیے پرانے گوٹے پر صابن یا سرف لگا کر برتن صاف کریں۔

عینک کے شیشے کی صفائی

☆ عینک کا شیشہ جب گندا ہو جائے تو اسے اخبار کے کاغذ سے صاف کریں شیشہ بالکل صاف ہو جائے گا۔

غسل خانے، صحن یا باورچی خانے میں کائی دور کرنے کی ترکیب

☆ غسل خانے، صحن یا باورچی خانے میں مسلسل نمی رہے تو کائی جم جاتی ہے، اسے دور کرنے کے لیے باجنگ پاؤڈر کو متاثرہ مقام پر چھڑک دیں اور بند رہیں

☆ قالین پر خون کے داغ لگنے کی صورت میں اسے ٹھنڈے پانی سے صاف کریں، اس کے لیے بہتر ہے کہ فریج کا پانی لیا جائے۔ اگر خون جم گیا ہو تو اسٹیچ کے ٹکڑے پر ڈر جنٹ لگا کر صاف کریں۔

جوس کے داغ

☆ قالین پر جوس کے داغ لگ جائیں تو اسے ٹھنڈے پانی سے صاف کریں، اگر داغ گہرا ہو تو پانی میں تھوڑا سا سوڈا ملا کر صاف کریں۔

چاکلیٹ کے داغ

☆ چاکلیٹ کے داغ لگ جانے کی صورت میں اسے گرم پانی سے صاف کرنا ہرگز مناسب نہیں، بلکہ ٹھنڈے پانی سے صاف کریں۔ اگر ڈر جنٹ ملے پانی میں سرکہ ملا کر انہیں صاف کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

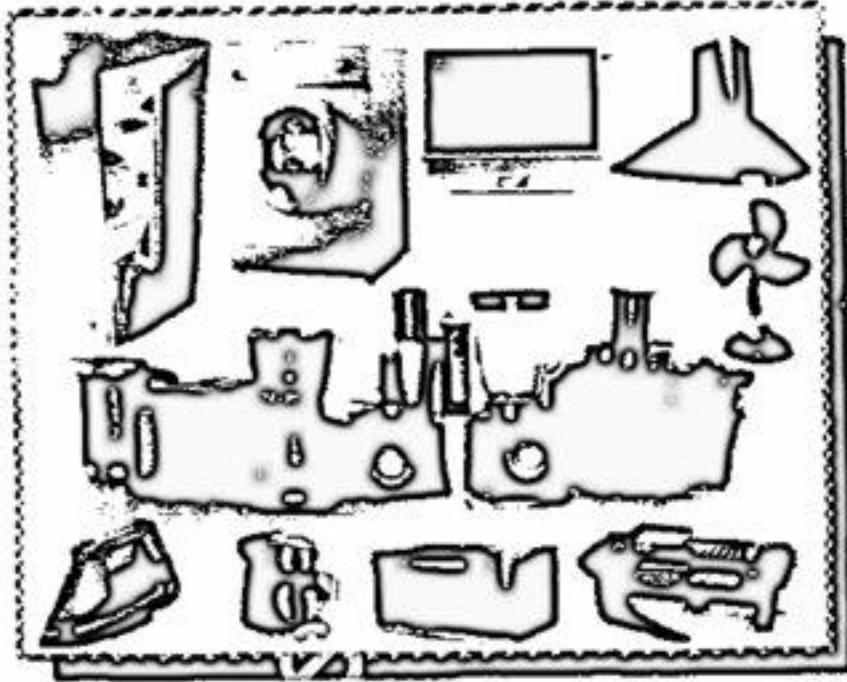
پینے کے داغ

☆ پینے کے داغ اکثر قمیص کی بغلوں پر پڑ جاتے ہیں۔ اگر پانی میں سفید سرکہ ملا میں اور صرف بغلوں والے حصے کو پکڑ کر اسے پانی سے دھولیں اور دھوپ میں ڈال کر خشک کر لیں، داغ صاف ہو جائیں گے۔
لوہے کی کڑا ہی صاف کرنے کے لیے

☆ اگر لوہے کی کڑا ہی بہت زیادہ سیاہ ہو جائے تو اس کا کالی کڑا ہی میں لسی ڈال کر تین دن تک کے لیے چھوڑ دیں۔ بعد میں مانجھ لیں۔ کڑا ہی بالکل صاف ہو جائے گی۔

قمیص کا کالر صاف کرنے کے لیے

☆ اکثر قمیص دھلنے کے بعد اس کا کالر صاف نہیں ہوتا، قمیص دھونے سے پہلے اس کے کالر پر تھوڑا سا شیمپو لگا کر رگڑیں، پھر قمیص دھولیں، کالر صاف



منٹ کے بعد جھاڑو سے اچھی طرح جگہ کو رگڑیں۔
کائی اتر جائے گی۔

فریج کی صفائی کے لیے

☆ فریج کے داغ دھبے دور کرنے کے لیے براؤن شو
پالش لے کر یا قہوے کا پانی ملیں، فریج صاف ہو جائے
گا۔

سونے کے زیورات کے داغ دھبے دور کرنا

☆ ایک پیالی پانی میں ایک چمچ ایمونیا ملا کر سونے کے
زیورات کو اس میں رکھ دیں۔ چند لمحوں کے بعد دھو
لیں۔ داغ دھبے دور ہو جائیں گے۔

فریج کی خراشیں دور کرنا

☆ فریج پر اگر کسی وجہ سے خراشیں پڑ جائیں تو
سیال آیوڈین ملنے پر یہ خراشیں دور ہو جاتی ہیں۔

مشینیں

پلاسٹک کی واشنگ مشین کی صفائی

☆ اگر پلاسٹک کی واشنگ مشین گندی ہو جائے یا
اس پر داغ پڑ جائیں تو انہیں صاف کرنے کے لیے
لیموں کا رس اور نمک ملا کر رگڑیں۔ بعد ازاں کچھ

وقت پڑا رہنے دیں، پھر دھو ڈالیں۔

ریفریجریٹر کی اندرونی پیلاہٹ دور کرنا

☆ اگر فریج کا دروازہ پیلا ہو گیا ہو یا اس پر دھبے پڑ
گئے ہوں تو تھوڑا سا صابن لے کر اسے نیم گرم پانی میں
گھولیں، پھر اس میں لیموں کا رس اور ذرا سا نمک ملا
دیں، پھر اس مخلول سے فریج کو اندر سے صاف کر
ڈالیں، بعد میں اسے کسی سوتی کپڑے سے خشک
کر لیں۔

گرینڈر کے بلیڈ کو تیز کرنے کے لیے

☆ گرینڈر کے بلیڈ کو تیز کرنے کے لیے گرینڈر میں
ایک کھانے کا چمچ بیٹھا سوڈا ڈال کر تقریباً "دس منٹ
تک چلائیں، بلیڈ تیز ہو جائے گا۔

ریفریجریٹر کی صفائی کے لیے

☆ ریفریجریٹر کی صفائی کے لیے گرم پانی میں کھانے کا
سوڈا ملا کر کسی نرم کپڑے سے صفائی کریں۔ ایک پیالی
پانی میں ایک چائے کا چمچ کھانے کا سوڈا کائی ہوتا ہے۔

حسن و خوب صورتی کے ٹوٹکے

☆ کمزور ناخنوں کو مضبوط کرنے کی ترکیب

☆ ہو جائے گی۔ دودھ بڑے فائدے کی غذا ہے۔ اگر کوئی آدھے سر کے درد میں مبتلا ہو تو سورج طلوع ہونے سے قبل گرم دودھ کے ساتھ جلیبی کھانے سے یقینی فائدہ ہوگا۔ گرم دودھ کے ساتھ اسپنول کا چھلکا یا گلقد کھانے سے قبض دور ہو جاتا ہے۔ یہ ترکیب بو اسیر سے نجات کے لیے بھی موزوں ہے۔

جھائیاں دور کرنے کے لیے

☆ اگر چہرے پر جھائیاں نکلتی شروع ہو گئی ہیں تو آپ ایک فیمل اسپون وہی، ایک فیمل اسپون شہد اور ایک ٹی اسپون انڈے کی سفیدی اچھی طرح ملا کر اپنے چہرے پر لگائیں اور چند دنوں میں کمال دیکھیں۔

آنکھوں کے گرد حلقے دور کرنا

☆ اپنی آنکھوں کے گرد بڑے والے حلقوں اور گہرے داغ دھبوں کو صاف کرنے کے لیے ایک ٹی اسپون بادام کا تیل، ایک ٹی اسپون گدڑی کارس اور ایک ٹی اسپون آلو کارس ملا کر لگائیں۔

پان یا کتھے کا داغ دور کرنا

☆ کپڑے، پر پان یا کتھے کا داغ پڑ جائے تو وہ کپڑے دھونے کے صابن سے دور نہیں ہوتا، بلکہ اس کے لیے متاثرہ جگہ کو دودھ سے اچھی طرح دھوئیں۔



☆ اگر آپ کے ناخن کمزوری کی وجہ سے ٹوٹ جاتے ہیں تو ایک گلاس نیم گرم پانی میں ایک چمچہ جیلاٹن ملائیں اور پھر اس میں ایک مازہ لیموں پھوڑ کر گرم گرم پی جائیں۔

جسم کی بدبو دور کرنے کی ترکیب

☆ اگر جسم میں بدبو پیدا ہو جائے تو انگور کے عرق میں تھوڑا سا عرق گلاب ملا کر ایک ماہ تک اس کی جسم پر مالش کریں۔ بدن سے ہر قسم کی بدبو کا خاتمہ ہو جائے گا۔

پپوٹوں کی سو جن دور کرنا

☆ شدید دھوپ کی وجہ سے اگر پپوٹے سو جن جائیں تو ان پر چائے کی استعمال شدہ تھیلیاں رکھیں، سو جن جلد ختم ہو جائے گی۔

لمبی پلکوں کو خمیدہ بنانے کی ترکیب

☆ رات کو پلکوں پر کیسٹر آئل لگا کر سوئیں۔ دن کو منہ ہاتھ دھونے کے بعد ان پر تھوڑی سی ویزلین لگا کر انہیں نیچے سے اوپر کی طرف اٹھائیں، چند روز یہ عمل جاری رکھیں۔

کیل مہاسے اور داغ دھبے دور کرنے کے لیے

☆ شگترے کے چھلکے سکھا کر پیس لیں اور دودھ یا پانی کے ساتھ ملا کر روزانہ ابٹن کی طرح اسے داغ دھبوں پر لگائیں یا جو کے آنے کے ساتھ ملا کر چہرے پر اس کا ٹیپ کریں اور مسل کر اتار لیں۔ چہرہ چند ہفتوں میں ہی کیل مہاسوں اور داغ دھبوں سے پاک ہو جائے گا۔

جلد کا سیاہ پن دور کریں

☆ اگر آپ کی جلد سیاہ ہے یا بے رونق ہے تو یوں کریں کہ روزانہ چہرے پر دودھ ملیں۔ سارے جسم پر اگر مل لیا کریں تو جلد بے حد خوب صورت اور صاف

☆ صبح منہ دھونے کے بعد منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھپکے مارے، اس سے ایک تو مہاسے اور دانے ختم ہو جائیں گے، دوسرے چہرے پر شکستگی پیدا ہو جائے گی۔

کہنی کے سیاہ دھبے دور کرنے کے لیے

☆ لیموں کاٹ کر رس نکال لیں۔ چھلکوں میں آدھا چائے کا چمچہ دودھ ڈالیں اور کہنی پر خوب رگڑیں، چند مرتبہ کے استعمال سے کہنیاں صاف ہو جائیں گی۔

سر کے گج کے لیے

☆ لیموں کے رس میں پسا ہوا آملہ ملا کر سر پر مالش کریں۔ پھر سردھولیں۔ ایک ثابت لیموں کو سرسوں کے تھوڑے سے تیل میں ملا لیں اور تیل چھان کر سر پر مالش کریں۔ لیموں کے بیج پیس کر روزانہ سر پر لیب کریں، جہاں گج ہو پھر آملہ کے پانی سے سردھولیں، خالص کشر آئل رات کو ملیں۔

موٹاپا دور کرنے کے لیے

☆ موٹاپا دور کرنے کے لیے کلونجی لے کر لیموں کے رس میں بھگو دیں اور فریج میں ایک رات رکھ دیں اور پھر بوتل میں رکھ کر دھوپ میں رکھ دیں، اسے گرینڈ کریں اور روزانہ نہار منہ آدھا چمچہ استعمال کریں۔

☆ - دال مسور ایک چمچہ چار گلاس پانی میں ڈال کر پکائیں یہاں تک کہ ایک گلاس پانی رہ جائے، پھر صبح اس میں لیموں کے چند قطرے اور نمک ڈال کر پیئیں، یہ نسخہ چالیس دن استعمال کریں۔ وزن میں واضح کمی محسوس ہوگی۔

چہرے پر اضافی بالوں کا خاتمہ

☆ ایک چمچہ اگر بتی کی راکھ اور اس میں دو حصے پانی یا دودھ شامل کریں، اس مرکب کو بالوں پر لگادیں اور

خشک ہونٹوں کے لیے

☆ بادام اور ناریل کا تیل ملا جلا پانچ ٹی اسپون لے لیں، پھر اس میں نصف لیموں کا رس لیں۔ اس لوشن کو ریفریجریٹر میں رکھ دیں۔ دن میں تین سے چار بار ہونٹوں پر یہ لوشن لگائیں۔ خشک ہونٹ نرم ملائم ہو جائیں گے۔

فیس اسکرُب

☆ چار ٹی اسپون، جو پاؤڈر، دو ٹی اسپون چاول کا پاؤڈر، چٹکی بھر ہلدی اور دو ٹی اسپون ملتانی مٹی ملا کر اچھی طرح پیس لیں اور خشک جاہ میں رکھ لیں۔ استعمال کے وقت ایک ٹی اسپون عرق گلاب میں ذرا سیاہی مرکب ڈال کر چہرے پر لگائیں۔ پندرہ منٹ بعد چہرہ صاف کریں۔ بلیک ہیڈز کا یقینی خاتمہ ہو جائے گا۔

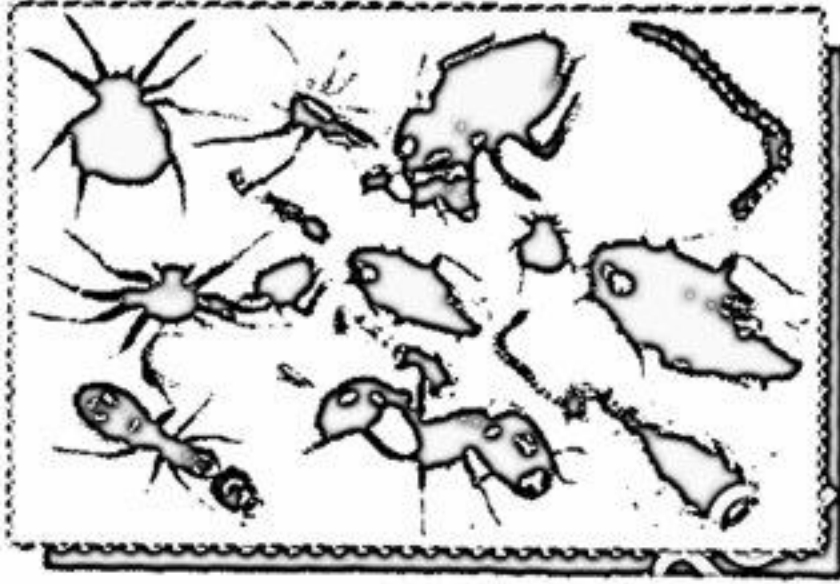


گھر میں مینی کیور کیجیے

☆ ہفتے میں ایک بار گھر پر مینی کیور کرنے کا طریقہ کچھ یوں ہے کہ نصف کپ شہد میں دو لیموں کا رس اور چار ٹی اسپون شکر ملا لیں۔ اب اس مرکب کو اچھی طرح دونوں ہاتھوں پر ملیں۔ پانچ منٹ بعد ہاتھ دھولیں ہاتھ نہ صرف نرم ملائم ہو جائیں گے بلکہ چمک بھی اٹھیں گے۔

مہاسے اور دانے ختم کرنے کے لیے

کیڑوں مکوڑوں کو بھگانے کی ترکیبیں



پسو کو بھگانے کا طریقہ

☆ جس گھر میں پسو ہوں اس میں پہاڑی پودینہ لاکر رکھ دیں۔ اس کی بو سے پسو بھاگ جائیں گے۔

چھھر سے نجات کی ترکیب

☆ تلخی کے پتوں کا رس نکال کر جسم پر مالش کر لیں۔ چھھر آب کے نزدیک نہیں آئیں گے یا یوکلپٹس آئل، روغن سنگتہ، روغن الایچی اور روغن سرسوں کو باہم ملا کر جسم پر لگائیں۔

کھٹل دور کرنے کا طریقہ

☆ گندھک جلا کر اس کی دھونی دینے سے کھٹل بھاگ جاتے ہیں۔

جو میں مارنے کی ترکیب

☆ اگر سر میں جو میں پڑ جائیں تو چقدر کے پتے ایک کلو پانی میں اچھی طرح جوش دے لیں۔ پھر اس پانی سے دو تین روز تک سر کو دھوئیں، جو میں مر جائیں گی۔

مکھیوں کو بھگانے کی ترکیب

☆ مکھیوں کو بھگانے کے لیے نیم کی سوکھی پتیاں جلانی جائیں۔ ان کی بو اور دھوئیں سے یہ بھاگ

خشک ہو جائے تو اوپر کی جانب مل کر مٹائیں۔ یہ عمل روزانہ تقریباً دو ماہ کریں نتیجہ بہترین نکلے گا۔

آنکھوں کے گرد حلقے دور کرنے کے لیے

☆ اس کے لیے ٹھنڈے پانی میں روئی کے دو پھائے بھگو کر نچوڑ لیں اور ان پر عرق گلاب چھڑک کر آنکھوں پر رکھیں، تقریباً پندرہ منٹ روزانہ یہ عمل کرنے سے حلقے دور ہو جائیں گے یا پھر آنکھوں کے گرد حیاتین ای کا تیل لگائیں۔

بالوں کی خشکی دور کرنے کے لیے

☆ بالوں کی خشکی کو دور کرنے کے لیے خشخاش کو اچھی طرح پیس کر اسے دودھ میں گھول کر اس سے سر کو دھوئیں تو خشکی دور ہو جاتی ہے۔

خواتین کے ہونٹوں کے بال دور کرنے کے لیے

☆ خواتین کے ہونٹوں کے غیر ضروری بال ختم کرنے کے لیے ایفون کو سر کے میں حل کر کے پندرہ بیس منٹ تک ایٹن کی طرح لگائیں۔ پھر ہاتھوں سے اچھی طرح رگڑ کر دھولیں۔

چہرے پر سے دھوپ کا اثر ختم کرنے کے لیے

☆ گرمیوں میں تیز دھوپ کی وجہ سے یا لو کے تھپیزے لگنے سے چہرہ بھلس جاتا ہے۔ اکثر دھوپ میں نکلنے سے رنگ بھی کالا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں چہرہ گرم پانی سے دھو کر اس پر ٹماٹر کا رس ملیں۔

چیونٹیاں یا دیمک کے خاتمے کے لیے

☆ گھر میں دیمک لگ گئی ہو یا چیونٹیاں بھر گئی ہوں تو پھنکری سرسوں کے تیل میں ملا کر ڈالیں، سب چیونٹیاں غائب ہو جائیں گی۔

ان پر نکادیں۔ تختہ کو خوب صورت بنانے کے لیے اپنی پسند کا کوئی رنگ کر لیں۔

کپڑوں میں چمک پیدا کرنے کی ترکیب

☆ دس چھٹانک کلف میں ایک چھوٹا چمچ سہاگہ شامل کر دیجیے اور کپڑے اس میں ڈبو کر پھیلا دیجیے، استری کرنے سے کپڑے میں چمک آجائے گی۔

قالین صاف کرنے کا آسان طریقہ

☆ ایک کپڑے کو روغن تارپین اور گرم پانی میں بھگو لیں اور پھر اس کپڑے سے قالین کو صاف کریں تو اچھی صفائی ہوگی۔

پلاسٹک کے جگ اور گلاس صاف کرنے کی ترکیب

☆ اگر پلاسٹک کے جگہ اور گلاس پیلے ہو جائیں تو گرم پانی میں نمک ملا کر اس سے دھوئیں۔

پکے ہوئے کھانے کا نمک کم کرنے کی ترکیب

☆ اگر غلطی سے کھانا پکاتے ہوئے نمک زیادہ ڈال دیا جائے تو مندرجہ ذیل ترکیب استعمال کریں۔

☆ گوندھے ہوئے آٹے کی ٹکیہ بنا بیجیے اور سالن میں ڈال دیں اور کچھ دیر بعد نکال لیں، ایک بار ایسا کرنے سے نمک کم ہو جائے گا۔

☆ لکڑی کا جلتا ہوا کوئلہ لیں، اسے اچھی طرح دھوئیں، سیاہی نکلتی بند ہو جائے تو سالن میں ڈال دیں اور پکائیں، پھر کوئلہ نکال لیں تو نمک کی زیادتی کم ہو جائے گی۔

☆ ایک سفید کانگڑا کا ٹکڑا سالن میں ڈال دیں، تھوڑی دیر کانگڑا نمک کو جذب کر لے گا اور نمک کم ہو جائے گا۔

جائیں گی۔ کلونچی کے دھوئیں سے بھی چمھر اور کھیاں بھاگ جاتے ہیں، صنوبر کی لکڑی کی دھوئی سے یہ ہی فائدہ ہوتا ہے۔

متفرق

پھنسے ہوئے گلاس نکالنے کی ترکیب

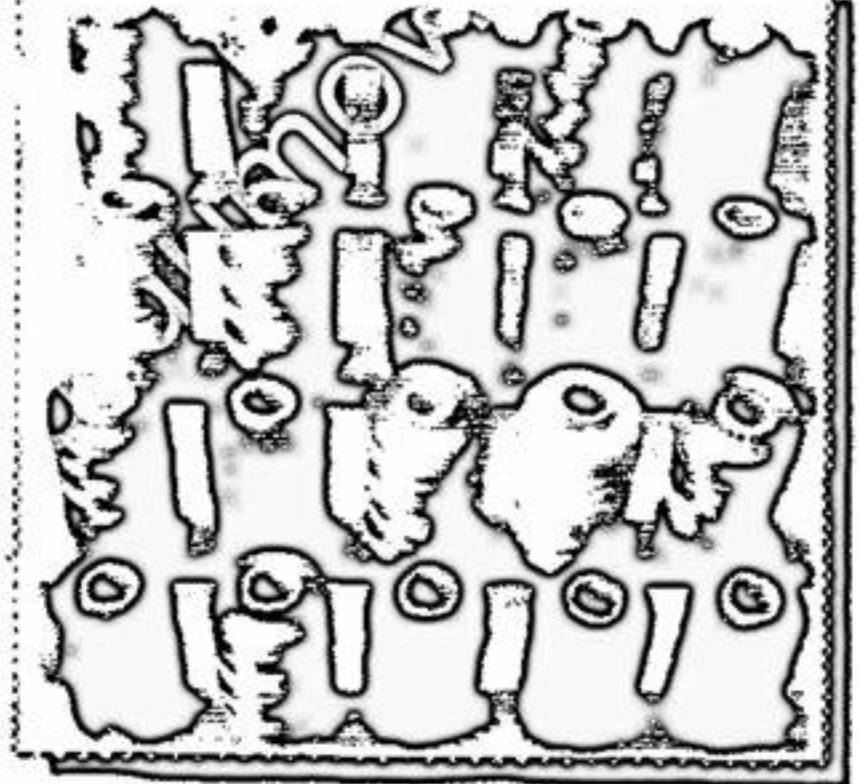
☆ ایک گلاس دوسرے گلاس میں پھنس جائے تو انہیں کھینچ کر نکالنے سے گریز کریں، بلکہ شیشے کے پھنسے ہوئے یہ گلاس فریج میں رکھ دیں، خود بخود علیحدہ ہو جائیں گے۔

بالوں سے چیونگم نکالنے کی ترکیب

☆ چیونگم اگر بالوں سے چپک جائے تو اسے چھڑانا کافی تکلیف دہ ثابت ہو سکتا ہے، اس کے لیے روئی کو بے لی آئل میں بھگو کر بالوں میں لگائیں، چیونگم آسانی سے اتر جائے گی۔

دھاگے کی نلکیوں کو الجھاؤ سے بچانا

☆ دھاگے کی نلکیوں کو الجھنے سے بچانے کے لیے لکڑی کا چھوٹا سا تختہ لے کر اس پر برابر فاصلے سے چند کیل ٹھونک دیں، پھر گھر میں بڑی ہوئی تمام نلکیاں





سیہے جائیں۔

نعلی پھولوں اور پتوں کو تازے کچے دودھ سے صاف کریں، بالکل جھک جائیں گے۔

بلی کے بال صاف کرنے کے لیے

☆ اگر آپ کے گھر میں پالتو بلیاں ہیں اور وہ گھر میں صوفوں پر، بستر پر سوتے ہوئے پالی جاتی ہیں یا قالین پر وہاں سے اٹھتے ہوئے اپنے بال چھوڑ جاتی ہیں جو خاص طور پر چھوٹے بچوں کے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتے ہیں اور کھانے وغیرہ میں بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ صوفے یا قالین پر کھانا کھا رہے ہوں۔ اس کا ایک آسان حل یہ ہے کہ اپنی انگلی پر کوئی چپکانے والی ٹیپ پیٹ کر اسی جگہ پر پھیریں، سب بال وغیرہ اس ٹیپ سے چپک جائیں گے اور آپ کو ایک ایک بال الگ الگ چننا نہیں پڑے گا۔ پھر آپ اس ٹیپ کو آسانی سے انار کر کوڑے دان میں ڈال دیں۔

گوشت گلانے کے لیے

☆ اگر گوشت نہ گلے تو لہسن کے درمیان والی ڈنڈی دھو کر ڈال دیں گوشت فوراً گل جائے گا۔

کولڈ ڈرنک کو جلد ٹھنڈا کرنا

☆ کولڈ ڈرنک کی بڑی بوتل اگر جلد ٹھنڈی کرنی ہو تو اس کا ڈھکن کھولنے کے فوراً بعد مضبوطی سے ڈھکن بند کر کے فریڈر میں رکھ لیں، بوتل جلد ٹھنڈی

ہاتھوں سے مرچ کی جلن دور کرنے کے لیے

☆ اکثر مرچیں پینے سے یا ہری مرچ کاٹنے سے ہاتھوں میں جلن پیدا ہو جاتی ہے، اس جلن کو دور کرنے کے لیے تھوڑا سا نیل پانی میں ملا کر ہاتھوں پر لگائیں اور پانچ منٹ بعد دھو ڈالیں یا پانی میں تھوڑا تیل ڈال کر ہاتھوں پر ملیں۔

آٹے اور چینی کو چیونٹیوں سے بچانے کے لیے

☆ آٹے اور چینی کے مارتانوں میں چند لونگس ڈال دینے سے سرخ چوٹیاں نہیں آئیں۔

تلنے کے دوران تیل کم خرچ کرنے کے لیے

☆ تیل میں تھوڑا سا سرکہ شامل کر دیا جائے تو پکوڑے اور دیگر پکوان تیل کم جذب کریں گے۔

تیل سے مچھلی کی بو ختم کرنے کے لیے

☆ چھلی تلنے کے بعد تیل کو قابل استعمال بنانے کے لیے اس میں لہسن کے دو چار جوے اچھی طرح جلا لیں، مچھلی کی بو ختم ہو جائے گی۔

المونیم کے برتن سے جلی چیز دور کرنے کی

ترکیب

المونیم کے برتن میں اگر کوئی چیز پکاتے ہوئے جل کر چپک جائے تو اس برتن میں ایک پیاز کاٹ کر پانی میں ابالیں، ایسا کرنے سے تھوڑی دیر بعد برتن سے جلا ہوا کھانا چھوٹ جائے گا اور برتن بالکل صاف ہو جائے گا۔

پھولوں کو زیادہ دیر تک تازہ رکھنا

☆ پھولوں کو زیادہ دیر تک تازہ رکھنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ گل دستے میں صابن کے فالتو ٹکڑے رکھ

کر استری سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس صورت میں استری کو آلو سے صاف کرنا چاہیے۔ استری تیز گرم کر کے کھروالے سوتی کپڑے پر فدرے دباؤ دے کر استری پھیری جائے۔ استری کی نچلی سطح صاف ہو جائے گی۔ استری کو بیٹھے سوڈے کے محلول سے بھی صاف کیا جاسکتا ہے۔

گلاب کے پھولوں کو زیادہ پیدا کرنے کے لیے

☆ چائے کی پتیاں جو استعمال کی جا چکی ہوں ان کو گلاب کے پودے میں ڈالنے سے پھول بڑے اور تعداد میں زیادہ نکلیں گے اور خوشنما بھی ہوں گے۔ روزانہ ایسا کرنے سے بہتر اثر ہوگا۔

گلاب کے پھولوں کو بڑا کرنے کے لیے

☆ گلاب کے پھولوں کو بڑا کرنے کے لیے انڈے کے چھلکوں کو پیس کر گلاب کی کیاری میں ڈال دیں، پھول بڑے اور خوب صورت نکلے گے۔

اچار کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے

☆ اگر اچار خراب ہو رہا ہو تو اس میں لیموں کا عرق یا سرکہ ڈال دیں تو ان شاء اللہ خراب نہیں ہوگا۔

سرخ مرچیں باریک پینے کی ترکیب

☆ اگر سرخ ثابت مرچیں پیستے وقت ان کے بیج ثابت رہتے ہوں تو ان مرچوں میں ایک ٹیبل اسپون پکانے کا تیل ڈال کر پیسیں، مرچیں بالکل باریک پس جائیں گی۔

پانی کو جراثیم سے محفوظ کرنے کے لیے

☆ عام پانی کو پینے کے قابل بنانے کے لیے ڈیڑھ لیٹر پانی کی بوتل میں پانی بھر کے سورج کے سامنے رکھیں۔ تین سے چھ گھنٹے میں پانی ہر قسم کے جراثیم سے محفوظ

ہو جائے گی۔

خالص شہد کا پتہ لگانے کے لیے

☆ خالص شہد کا پتہ لگانے کے لیے روئی کو شہد میں قد کر کے جلائیں۔ اگر شہد اصلی ہوگا تو سارا جل جائے گا۔ اس کے علاوہ شہد کے چند قطرے زمین پر گرا کر دیکھیں۔ اگر اسے اٹھانا چاہیں اور یہ موتی کی شکل اختیار کر لیں اور ارد گرد نہ پھیلے تو بالکل خالص ہوگا، ورنہ ملاوٹ آمیز ہوگا۔

پتنگوں سے نجات کے لیے

☆ خصوصاً "برسات" کے موسم میں روشنی دیکھ کر بلب یا لائین وغیرہ کے قریب بہت سے پتنگے یا برساتی کیڑے وغیرہ آجاتے ہیں اور بہت تنگ کرتے ہیں۔

ان کو بھگانے کے لیے بلب، لائین، لیمپ اور ٹیوب لائٹ وغیرہ کے قریب کچھ پیاز کاٹ کر رکھ دیا جائے، پتنگے برساتی کیڑے بھاگ جائیں گے۔

گوٹا کناری کی حفاظت کے لیے

☆ اگر آپ کے پاس گوٹا کناری کافی تعداد میں موجود ہے تو اس کی حفاظت کریں۔ ورنہ کالا پڑ سکتا ہے۔ اس کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ اسے مومی لفافے میں اچھی طرح بند کر کے رکھ دیں۔ اسی طریقے سے دوپٹے اور قمیص بھی جن پر سلمی ستارہ یا تلے کا کام کیا گیا ہو یا گوٹا کناری لگایا گیا ہو وہ ایک تو بھگنے سے بچائیں۔ ان کی تھیں الٹی کر کے لگائی جائیں۔ انہیں نمی اور ہوا سے بچانے کے لیے پلاسٹک کے لفافوں میں بند کر کے رکھا جائے، اس طرح یہ خراب ہونے سے بچے رہیں گے۔

استری کی سطح سے جلے کپڑوں کو صاف کرنا

☆ بعض اوقات ریشمی اور نائیلون کے کپڑے جل

گارا آمد گھریلو ٹیوٹیکے



دوٹی اسپون
دوٹی اسپون
تین نی اسپون

شہ
گلیمبرین
کریم
ترکیب :

ان تمام چیزوں کو ایک پیالے میں ڈال کر اچھی طرح مکس کریں کہ ہر چیز کریم کے ساتھ یک جان ہو جائے۔ اب اس پیسٹ کو چہرے اور گردن پر لگالیں۔ تقریباً پندرہ منٹ لگا رہنے دیں۔ پھر صاف پانی سے منہ دھولیں۔ اس سے جھریاں دور ہوں گی اور جلد شاداب ہو جائے گی۔

مہندی بالوں کی حفاظت کے لیے

☆ ایک کپ مہندی لیں۔ اسے پانی میں گھول لیں۔ آدھے لیٹروں کارس ملا میں چار لوٹکیں پیس کر شامل کریں۔ ایک انڈے کی زردی ملا دیں۔ دار چینی کا

ہو جائے گا۔ یہ پانی ایک ہفتہ تک پینے کے قابل رہے گا۔

پالش سے جوتے چمکانے کی ترکیب

☆ جوتے چمکانے کے لیے پالش میں تھوڑا سا سرکہ ملا کر پالش کریں تو جوتے چمک اٹھیں گے۔

بارش سے گیلا جوتا نرم کرنے کی ترکیب

☆ بارش میں جب جوتا بھیک جاتا ہے تو خشک ہونے پر سخت ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں ویزلین لگا کر اسے نرم کیا جاسکتا ہے۔

رنگ کیسے بنائے جاتے ہیں

☆ آپ مندرجہ ذیل طریقوں سے اپنی مرضی کے رنگ بنا سکتی ہیں۔ مثلاً "نارنجی رنگ بنانے کے لیے سرخ رنگ میں زرد رنگ ملا یا جائے۔ سبز رنگ بنانے کے لیے نیلے رنگ میں زرد رنگ ملا یا جائے، بھورا رنگ بنانے کے لیے سبز اور سرخ رنگ کو ملا یا جائے۔ کانسی رنگ بنانے کے لیے سرخ رنگ کو پیلے رنگ میں ملائیں۔ انگریزی رنگ کے لیے سبز اور سفید رنگ کو ملا یا جائے۔ سیٹی رنگ بنانے کے لیے کالے یا نیلے رنگ میں سفید رنگ ملانا چاہیے۔ گلابی رنگ بنانے کے لیے سرخ اور سفید کو ملا دیا جائے، بادامی رنگ بنانے کے لیے سفید اور پیلا رنگ ملا دیا جائے۔

بالوں کو سفید ہونے سے بچانے کا طریقہ

سیکا کائی ماش کی دال اور میتھی باریک پیس لیں، پھر اس سفوف سے سردھویا جائے، نہ صرف بال سفید ہونا بند ہو جائیں گے بلکہ جھڑیں گے بھی نہیں۔

جھریاں ختم کرنے کے لیے

اشیاء :
میں : ایک نی اسپون

گارا آمد گہری لٹوٹھکے

گی اور آنکھیں بے حد حسین اور پریشانی معلوم ہوں گی۔

چہرے کے گڑھے دور کرنے کا طریقہ

☆ تھوڑی سی ملین مٹی لے کر عرق گلاب میں ملائیں۔ پھر چہرے پر تقریباً "پندرہ منٹ کے لیے لپ کر دیں۔ بعد میں تازے پانی سے منہ دھولیں۔ چند دنوں میں گڑھے دور ہو جائیں گے۔

ہاتھوں کی صفائی

☆ اگر ہاتھوں پر میل وغیرہ جم جائے تو کیلے کے چھلکے بار بار گڑنے سے ہاتھ دور ہو جائے گا۔
☆ گلیسرین میں چند قطرے لیموں کے رس کے ڈال کر ہاتھوں پر ملنے سے بھی ہاتھ صاف اور نرم و ملائم ہو جاتے ہیں۔

☆ نمائز کارس ہاتھوں پر ملنے سے بھی ہاتھ نرم و ملائم ہو جاتے ہیں۔

☆ نیتون کا تیل ملنے سے بھی ہاتھ صاف اور نرم و ملائم ہو جاتے ہیں۔

دانتوں کی پیلاہٹ دور کرنا

☆ ایک چمچ کھانے والا شٹھا سوڈا، نمک، سماگہ لے کر کسی بوتل میں رکھ لیں۔ روزانہ اس سے دانت صاف کریں۔ دانتوں کی پیلاہٹ دور ہو جائے گی۔

☆ سرسوں کے تیل میں ایک چائے کا چمچ نمک ملا کر دانتوں پر لگانے سے دانت سفید ہو جاتے ہیں۔

☆ لیموں کے چھلکے سکھا کر پیس لیں۔ ان میں نمک ملا لیں۔ دانت روزانہ اس سے صاف کرنے سے تمام میل دور ہو جائے گا۔

سفید رنگ کرنے کا طریقہ

☆ کھیرے کا رس نکال لیں، چائے کا نصف چمچ، گلیسرین اور اتنا ہی عرق گلاب سب کو ملا کر لگانے سے

چھوٹا سا ٹکڑا پس کر آخر میں ملائیں اور ہندی کو دو گھنٹہ کے لیے ڈھاگ کر رکھ دیں۔ سر میں اچھی طرح لگائیں۔ دو تین گھنٹے بعد تازے پانی سے سردھولیں۔ بعد میں شیمپو کریں۔ ہمینہ میں ایک بار یہ عمل کریں۔

بیل ملائم کرنے کے لیے

☆ نہانے سے پہلے بالوں میں تیل لگایا کریں تو بیل ملائم ہو جائے گی اور اس طرح ان کی جڑیں بھی مضبوط ہو جائیں گی۔



بھنودیں گھنی کرنے کے لیے

☆ رات کو سوتے ہوئے بھوؤں پر روغن نیتون کی مالش کیجئے۔ اس سے بھنودیں چند دنوں میں گھنی ہو جائیں گی۔ اکثر سوتے وقت نیتون کا تیل پلکوں میں لگایا جائے، پلکیں بھی گھنی اور چمک دار ہو جاتی ہیں۔

پلکیں لمبی اور گھنی کرنے کے لیے

1 - پلکوں کی جڑوں میں روٹی کی مدد سے صاف شدہ کشر آئل لگائیے، اس سے پلکیں لمبی اور گھنی ہو جائیں گی۔

2 - اصلی شہد اور کشر آئل دونوں برابر لیں اور کسی شیشی میں ملا کر رکھ لیں۔ روزانہ رات کو سوتے وقت پلکوں میں لگائیے۔ چند دنوں میں پلکیں لمبی ہو جائیں گی۔

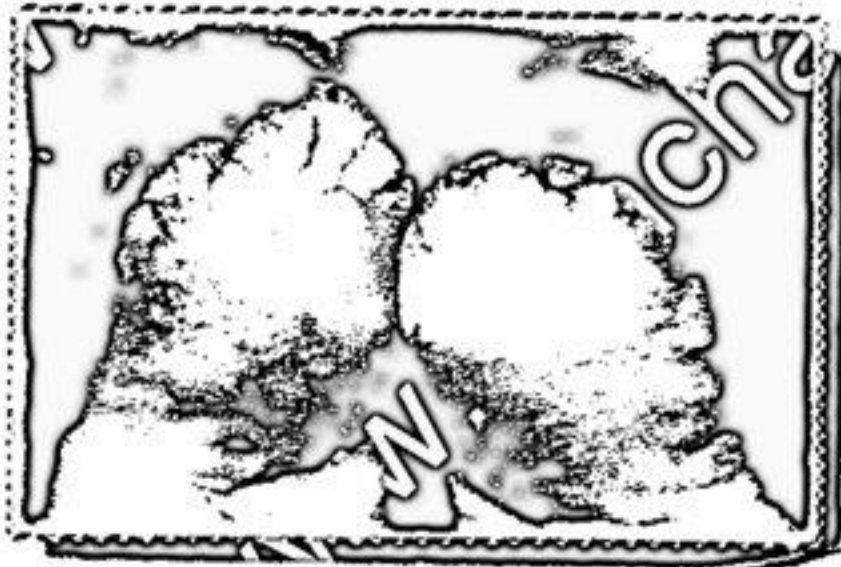
کارآمد گھریلو ٹوٹکے

چمک دار بنانے کے لیے ان پر لیموں کارس ملیں صرف چند بار ایسا کرنے سے ناخن چمک دار ہو جاتے ہیں۔
بال چمکیلے، لمبے اور گھنے کرنے کے لیے

☆ آملہ خشک، ہر خورہ، ریشما اور بیری کے پتے ہم وزن لے کر چار تولہ پانی میں جوش دیں اور ٹھنڈا کر کے رکھ لیں۔ اس سے ہر تیسرے روز بال دھونے سے بال لمبے اور سیاہ ہو جائیں گے۔

☆ سرسوں کی کھلی بھی بالوں کے لیے بہت مفید ہے۔ سردھونے سے دو گھنٹے قبل پانی میں بھگی ہوئی سرسوں کی کھلی کا پانی تھار کر سردھوئیں۔

☆ بیری کے پتے لے کر انہیں چھنی کی طرح باریک پیسیں۔ جھاگ نکال کر بیس منٹ تک سر میں خوب ملیں اور پھر سردھو ڈالیں۔ صابن کا استعمال نہ کریں۔ اس سے بال لمبے، چمکیلے اور گھنے ہو جائیں گے۔



پھٹی ایریاں

☆ سردیوں میں پھٹی ایریاں خاص طور پر تکلیف دیتی ہیں۔ ان سے نجات کا آسان حل یہ ہے کہ چار نیبل اسپون گلیسرین میں لیموں کارس اور ایک چوتھائی پسی ہوئی پھنکری ملائیں۔ دن میں تین بار یہ مرکب پھٹی ایریوں پر لگائیں، چند دنوں کے استعمال سے افاقہ ہوگا۔

رنگ صاف ہو جاتا ہے اور روزانہ رات کو سوتے وقت لگانے سے آہستہ آہستہ اس سے چہرہ ہلکا سا ہلچ ہونا شروع ہو جائے گا۔

ناخن کانیل دور کرنے کے لیے

☆ دروازہ بند کرتے ہوئے یا کسی چوٹ سے اگر انگلی کا ناخن نیلا پڑ جائے تو اس نیلاہٹ کو دور کرنے کے لیے قابل برداشت گرم پانی لیں اور اس میں دس منٹ تک ناخن کو ڈبو رکھیں تو نیلاہٹ دور ہو جائے گی۔

ناخن لمبے کرنے کے لیے

☆ لہسن کا پانی لگانے سے ہی ناخن مضبوط ہو جاتے ہیں۔ آپ ناخن بڑھانا چاہتی ہیں تو لہسن کا پانی نکال کر رات کو سوتے وقت ناخن پر لگایا کریں۔ ایک ہفتہ یہ عمل کریں، آپ کے ناخن تیزی سے بڑھیں گے، ٹوئیں گے نہیں، اگر آپ کی جلد حساس ہے تو اس میں تھوڑا سا کشر آئل ملا لیں۔ اس سے خارش نہیں ہوگی۔

ناخن ٹوٹنے کے لیے

☆ وٹامن سی کی ایک گولی ضرور کھائیں۔ ایک لیموں کارس پانی میں ملا کر روز پیا کریں۔ چار لیموں لے کر ان کارس نکالیں۔ اس میں تھوڑی سی پسی ہوئی پھنکری ملائیں اور شیشی میں رکھ لیں۔ 20 منٹ کے لیے یہ مخلول روئی سے ناخن پر لگا خشک ہونے دیں اور پھر ہاتھ دھولیں۔

ناخنوں کو چمک دار بنانا

☆ جسمانی خوب صورتی میں ناخنوں کو بھی بڑا دخل ہے، لیکن اکثر خواتین ان پر زیادہ توجہ نہیں دیتیں۔ چمک دار ناخن بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ ناخنوں کو

چھوڑنے سے پہلے پیٹ کے نیچے تکیہ رکھ کر اٹھے ہو کر لیٹ جائیں، پندرہ منٹ تک اسی طرح لیٹی رہیں۔ چند ہفتوں میں پیٹ چھوٹا ہو جائے گا۔

ناف میں تیل لگانے کے حیرت انگیز فوائد

- ☆ سرکی خشکی، دماغ کی خشکی۔
- ☆ نسیان اور ضعیف دماغ
- ☆ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جانا اور سر کا چکرانا
- ☆ حتیٰ کہ بعض مریضوں کی آنکھیں پک جاتی تھیں، لیکن جب یہ نسخہ استعمال کیا تو فائدہ ہوا۔
- ☆ ہونٹوں کا پکنا، خشکی کے مسائل ہونا، ہونٹوں کی سیاہی کے لیے اکیسری نسخہ ہے۔
- ☆ ناف میں تیل کا لگانا نگاہ کو تیز کرتا ہے۔ جسم کی سستی، کاہلی اور ڈھیلے پن کو دور کرتا ہے۔

برسات کے موسم میں بستر اور گدوں کو نمی سے بچانے کے لیے

- ☆ برسات کے موسم میں بستر اور گدوں وغیرہ کو نمی اور سیلن سے بچانے کے لیے ٹالکم پاؤڈر استعمال کریں۔ اگر گدے پر تھوڑے سا ٹالکم پاؤڈر چھڑک کر اوپر بیڈ شیٹ بچھائی جائے تو وہ نمی سے محفوظ رہیں گے۔

چائے کی خوشبو میں اضافہ کرنا

- ☆ چائے خوشبودار ہو تو آدمی کو دل کو لبھاتی ہے اور اگر بد ذائقہ ہو تو کوئی بھی اسے پینا پسند نہیں کرتا۔ چائے کی خوشبو کو مزید تیز کرنے کے لیے آگ کے قریب کانڈ بچھا کر اس پر چند منٹ کے لیے چائے کی تیلی بکھیر دیں۔ پھر اس سے چائے تیار کریں۔ چائے کی خوشبو میں اضافہ ہو جائے گا۔

فریزر میں پڑے ہوئے گوشت کو پکانا

- ☆ فریزر میں پڑا ہوا گوشت اگر جم جائے تو اسے پانی

کنگھے صاف کرنے کا طریقہ

☆ کنگھے میلے بہت بڑے لگتے ہیں۔ ویسے بھی کنگھے زیادہ میلے ہو جائیں تو جراثیم پیدا ہونے لگتے ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ ہر 15 روز کے بعد کنگھوں کو دھونا چاہیے۔ ایک برتن میں پانی گرم کریں اور کسی تسلیے میں کنگھے ڈال دیں۔ اب کنگھوں پر سرف چھڑک دیں۔ کھولتا ہوا پانی کنگھے میں ڈالیں اور رکھ دیں۔ پانی نیم گرم رہ جائے تو آپ برش سے کنگھے صاف کریں۔ صاف پانی سے دھو کر تھوڑے سے پانی میں ڈینول کے چند قطرے ڈال دیں۔ اس میں کنگھے بھگو کر نکال لینے کے بعد دھوپ میں سکھالیں۔ کنگھے صاف ستھرے ہو جائیں گے۔

وزن میں جاوٹی کمی لانے والی چائے

- اشیاء :
- | | |
|-------------------|------------------|
| اسپنول | دو کھانے کے چمچے |
| شہد | ایک کھانے کا چمچ |
| کلونجی | ایک چٹکی |
| آدھے لیموں کا جوس | ایک چٹکی |
| کالی مرچ پسی ہوئی | ایک چائے کا چمچ |
| سیب کا سرکہ | دو سے تین تے |
| پورینہ | تین سے چار قطرے |
| چلی ساس | |
- ترکیب :

☆ یہ سب چیزیں ایک گلاس نیم گرم پانی میں ملا کر چھ کپ چائے بنالیں۔ اور دن میں تقریباً "چھ بار" صبح ناشتا سے آدھا گھنٹہ قبل ایک کپ پیئو اور باقی پانچ کپ وقفے وقفے سے پورا دن استعمال کریں۔

پیٹ چھوٹا کرنے کی ترکیب

- ☆ پیٹ چھوٹا کرنے کے لیے روزانہ صبح بستر

کارآمد گھریلو ٹیپس

رکھ دیں۔ خوشبو ہر طرف پھیل جائے گی۔
 تھرماس کی بدبو دور کرنے کے لیے
 ☆ تھرماس بدبو دار ہو جاتا ہے، اگر تھرماس میں تھوڑا

سرکہ ڈال کر ہلا میں اور پھر ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالیں
 تو بدبو دور ہو جائے گی۔

بادام تازہ رکھیں

☆ بادام چند سال تک بالکل تازہ رکھنے کے لیے
 تقریباً "ایک کھانے کا چمچہ چینی اس برتن میں ڈال
 دیں۔ جس میں بادام رکھے ہوئے ہیں۔ بادام بالکل تازہ
 رکھیں گے۔

ٹین کی چیزوں کا زنگ صاف کرنے کے لیے

☆ ٹین کی چیزوں سے زنگ صاف کرنے کے لیے
 واشنگ پاؤڈر میں پسا ہوا نمک ملا کر خوب رگڑ کر
 دھو میں تو داغ دور ہو جائیں گے۔

استری کے داغ

☆ استری کے نیچے براؤن داغ دور کرنے کے لیے ذرا
 سا ٹوتھ پیسٹ مل دیں۔ تقریباً "دس منٹ بعد جب
 ٹوتھ پیسٹ سوکھ جائے تو صاف کپڑے سے پونچھ
 لیں۔

☆ استری جل جائے تو اس کے اوپر یہکنگ سوڈا مل
 دیں۔ تھوڑی دیر بعد ریگ مال سے صاف کر لیں۔

گوشت کی بساند دور کرنے کا حل

☆ گوشت میں اگر ہلکی سی خاص قسم کی بساند محسوس
 ہو تو ایک کھانے کا چمچہ آنے کی بھوسی چھڑک دیں اور
 دس منٹ بعد دھو لیں۔

بوتلوں کی صفائی

☆ بوتلوں کی صفائی کے لیے بوتل میں تھوڑا سا

میں ہرگز نہ ڈالیں، بلکہ اسے اس وقت پڑا رہنے دیں
 جب تک وہ اپنی اصلی حالت پر نہ آجائے، کیونکہ پانی
 میں گوشت کی غذائیت کھو جاتی ہے۔

ابلے ہوئے نرم چاولوں کو سخت کرنا

☆ اگر کبھی اتفاق پابے احتیاطی سے چاول زیادہ ابل
 جائیں اور نرم ہو جائیں تو گرم پانی نچوڑنے کے بعد
 چھلنی میں اوپر سے ٹھنڈا پانی ڈال کر نچوڑ لیں۔ چاول
 سخت ہو جائیں گے۔

روٹی کو نرم بنانے کے لیے

☆ اگر آٹے کو نیم گرم پانی سے گوندھ کر کچھ وقت
 کے لیے پڑا رہنے دیں تو روٹی نرم اور مزے دار بنے
 گی۔

انڈے کا چھلکا با آسانی اتارنا

☆ اگر انڈے کا چھلکا با آسانی نہ اترتا ہو تو تھوڑا سا
 سرکہ لے، اس پانی میں ڈال دیں، جس میں انڈا ابالا گیا
 ہو۔

بلینڈر صاف کرنے کے لیے

☆ بلینڈر کو استعمال کرنے کے بعد صاف کرنے کے
 لیے اس میں اتنا پانی ڈالیں کہ وہ پانی کے اندر ڈوب
 جائیں۔ پھر اس میں صابن یا واشنگ پاؤڈر ڈال کر
 چلائیں۔ ایک منٹ کے بعد سارے پانی نکال کر اس کو دھو
 لیں اور خشک کر کے رکھ لیں۔

ایر فریشنر بنانے کے لیے

☆ بازار میں قسم قسم کے ایر فریشنرز ملتے ہیں، جو خاصی
 قیمت کے ہوتے ہیں۔ آپ خود بہت کم پیسوں میں
 اسے گھر پر اس طرح تیار کر سکتے ہیں کہ سفید سرکے
 میں یو کلپٹس کی پتیاں ڈال کر دو ہفتے کے لیے رکھ دیں،
 پھر چھان لیں اور سرکے کو پالوں میں ڈال کر کمروں میں

دسی سرجری

☆ جسم کے کسی حصے میں شیشہ چبھ جائے تو پیاز آدھا کاٹ کر توڑے پر ہلکا سا گرم کریں اور زخم پر باندھ لیں۔ ایک دو گھنٹے کے بعد پٹی کھول کر پیاز زخم سے ہٹالیں۔ شیشے کی نوک نظر آرہی ہوگی۔ پٹی وغیرہ سے شیشہ نکال دیں۔

گوشت پر لکھیاں نہ بیٹھیں

☆ سفید ممل کا ایک ٹکڑا لے کر اسے سرکہ ملے پانی میں بھگو کر گوشت کے اوپر ڈال دیں۔ لکھیاں نہیں بیٹھیں گی۔

کچن کی ڈراز کو کیڑے مکوڑے سے بچانے کے لیے

☆ کچن کی درازوں میں اکثر کیڑے مکوڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان درازوں میں تیزپات کے پتے رکھ دیں تو کوئی کیڑا دراز کے اندر نہیں آئے گا۔

کپڑوں کی سفیدی قائم رکھنے کے لیے

☆ سفید کپڑوں کی پیلاہٹ دور کرنے کے لیے سوتی کپڑوں کو کھنگالتے وقت پانی میں لیموں کا رس ملا لیں اور پھر کپڑوں کو نچوڑ کر سکھادیں۔ جبکہ ریشمی کپڑوں کی پیلاہٹ دور کرنے کے لیے انہیں کھنگالتے وقت پانی میں سفید سرکہ یا نمک ملائیں۔

میدہ، آٹا اور بیسن کو کپڑوں سے بچانے کے لیے

☆ میدہ، آٹا اور بیسن برسات میں جلد سیل جاتا ہے اور اس میں کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ ان چیزوں کو محفوظ رکھنے کے لیے ان کے برتن میں چند تیزپات کے پتے ڈال دیں۔ میدہ کو نمی اور سیلن سے بچانے کے لیے اس میں بلائنگ پیپر کا ایک ٹکڑا ڈال دیں تو میدہ نمی

واشنگ پاؤڈر اور ایک انڈے کا چھلکا چل کر بوتل کے منہ میں ڈال دیں اور بوتل کو ہلائیں پھر یہ سب الٹ کر باہر نکال دیں اور دھو کر صاف کر لیں۔

آلوؤں کی مٹھاس ختم کرنے کے لیے

☆ اگر آلو زیادہ میٹھے ہوں تو انہیں چھیل کر نمک ملے پانی میں چند منٹ کے لیے بھگو دیں۔ اس طرح سے آلوؤں کی مٹھاس کم ہو جائے گی۔

خراب گلہ کا علاج

☆ آج کل گلہ خراب ہونے کی شکایت عام ہے۔ اس کا بہت ہی آسان اور شرطیہ علاج یہ ہے۔ ایک انچ کا ادراک کا ٹکڑا چبائیں اور 30 منٹ تک کچھ نہ کھائیں اور پھر دیکھیں جاوولی اثر۔ نرم ٹماٹر کو سخت بنانے کے لیے

☆ ٹماٹر اگر بڑے بڑے بہت نرم ہو گئے ہوں تو ان کو نمک ملے پانی میں گھنٹہ بھر کے لیے ڈبو دیں سخت ہو جائیں گے۔

کافی یا چائے کو گرم کرنے کے لیے

☆ چائے کا قہوہ یا کافی اگر ٹھنڈی ہو جائے اور دوبارہ گرم کیا جائے تو ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسے گرم کرنے کے لیے ایک پین میں پانی گرم کر کے چائے یا کافی دانی کو ابلتے پانی میں رکھ کر کچھ دیر گرم ہونے دیں۔ اس طرح ذائقہ خوشبو دونوں ہی قائم رہیں گے۔

ہلدی کا داغ دور کرنے کے لیے

☆ ہلدی کا داغ اگر کپڑوں پر لگ جائے تو ٹائری چھڑک کر صابن سے دھولیں۔ ٹائری نہ ہو تو لیموں کا رس مل کر چند منٹ بعد سرف سے دھوئیں۔

☆ دیمک سے نجات پانے کے لیے مٹی کا تیل چھڑکنا چاہیے۔ اس سے دیمک فوراً ختم ہو جائے گی۔

پودوں کی جڑوں کو دیمک سے بچانا

☆ پودوں کی جڑوں میں بھی دیمک لگ جاتا ہے۔ اگر گھر میں لگائے گئے پودوں کی جڑوں یا کیاری میں دیمک داخل ہو جائے تو مٹی کا تیل چھڑک دینا چاہیے۔ راکھ کو چھان کر کیاری میں ڈالا جائے۔ اس طرح سے پودوں کو دیمک سے نجات حاصل ہوگی اور وہ سرسبز و شاداب رہیں گے۔

چیونٹیوں سے نجات کے لیے

☆ چیونٹیاں گھروں میں جگہ جگہ سوراخ بنا لیتی ہیں اور بہت ہی پریشانی کا باعث بنتی ہیں۔ چنانچہ ان سے نجات پانے کے لیے ان کے بلوں پر مٹی کا تیل ایک چمچ بھر کر ڈال دیا جائے تو چیونٹیوں سے چھٹکارا حاصل ہو جائے گا۔

☆ جہاں چیونٹیاں بھگانا مقصود ہوں ہینگ رکھ دیں تو وہ بھاگ جائیں گی۔ ہینگ کی جگہ ہلدی چھی استعمال کی جاسکتی ہے۔

چھپکلیوں سے نجات کے لیے

☆ گھروں کی کھڑکیاں، روشن دان اور دروازوں کی درزیں چھپکلیوں کا مسکن ہوتے ہیں۔ ان سے نجات

سے بچا رہے گا۔

ڈبل روٹی کے سلائس کاٹنے کے لیے

☆ چھری کو گرم پانی میں ڈبو کر اس سے سلائس کاٹنے جائیں تو آسانی سے کٹ جاتے ہیں۔

گھر کو مکھیوں سے بچانے کے لیے

☆ کچن سے کھیاں بھگانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ کچن میں تازہ پودینہ کھلا رکھیں۔ اس طرح کھیاں نہیں آئیں گی، گھروں میں تازہ پودینے کی جڑیں کسی برتن کے اندر پانی میں بھگو کر رکھ دیں۔

کھٹل سے نجات

☆ سرخ مرچیں پانی میں ملا کر اسپرے کرنے سے کھٹل ختم ہو جاتے ہیں۔

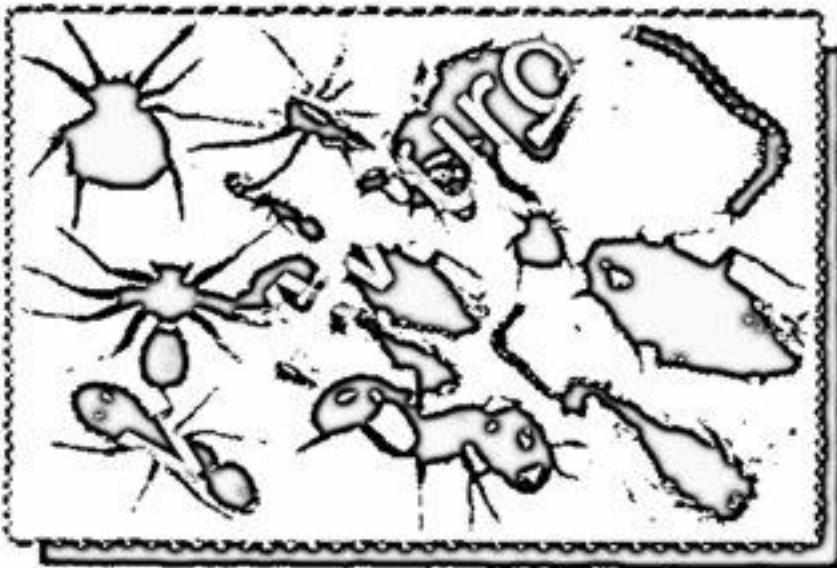
☆ اجوائن پیس لیں اور تیز گرم پانی میں ملا کر اسپرے کریں۔

☆ نیم کے تے رکھ دینے سے اور نیم کے پانی کا چھڑکاؤ دینے سے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔

☆ فرنیچر کی خالی جگہوں پر پودینے کی شاخیں ٹھونس دیں۔

☆ کھٹلوں سے نجات کے لیے نیلا تھو تھا، چونے کی قلعی ملا کر دیواروں اور سوراخوں میں بھر دیں۔

دیمک سے نجات



☆ میں ڈال کر ممل کا کپڑا بھگو کر صاف کرنا چاہیے۔

کچے رنگ کے کپڑوں کے لیے

☆ کچھ کپڑے ایسے ہوتے جن کا رنگ اس قدر کچا ہوتا ہے کہ انہیں پانی میں ڈالتے ہی ان کا رنگ نکلتا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو پانی میں ایک چھوٹا چمچہ پسلی ہوئی پھنکری یا ایک بڑا چمچہ پسا ہوا نمک ڈال دیں تو کپڑے کا رنگ کم اترے گا۔

کریلے کی کڑواہٹ دور کرنا

☆ کریلا بہت کڑوا ہوتا ہے اسی بنا پر لوگ اسے پسند نہیں کرتے۔ اگر کریلے کی کڑواہٹ دور کرنی ہو تو کریلے کو کاٹ کر نمک لگا کر تین چار گھنٹے تک بڑا رہنے دیں، پھر اسے نچوڑ دیں، کڑوا پانی نکل جائے گا اب صاف پانی سے دھو کر پکالیں کڑواہٹ نہیں ہوگی۔

ہچکی روکنے کے لیے

☆ بعض اوقات مسلسل ہچکی لگ جاتی ہے۔ تھوڑی سی چینی کھالینے سے آرام آ جاتا ہے۔
گو بھی کی بو دور کرنے کے لیے

☆ گو بھی کی بو دور کرنے کے لیے پکاتے وقت اگر اس میں تھوڑا سرکہ ملا دیا جائے تو گو بھی کی ناگوار بو دور ہو جائے گی۔

زعفران کی خوشبو تیز تر کرنے کے لیے

☆ زعفران کو اگر لیموں کے رس میں بھگویا جائے یا تھوڑے سے گرم پانی میں بھگویا جائے تو اس کی خوشبو اور اثرات زیادہ دیر پا ہوں گے۔

کوئلہ جلتے وقت کم خرچ ہو

☆ کوئلہ جلتے وقت تھوڑا سا نمک چھڑک دیا جائے تو کوئلے زیادہ دیر تک جلیں گے۔

پانے کے لیے ایسی جگہوں میں مثلاً "روشن دانوں میں انڈوں کے خول رکھ دینے چاہیں۔ چنانچہ تھپکیاں وہاں نہیں آئیں گی اور گھر چھپکیوں کی آمدورفت سے محفوظ رہے گا۔

مکھیوں سے باورچی خانے کو محفوظ رکھنا

☆ باورچی خانے کو محفوظ رکھنے کے لیے جھار پونچھ کر کے پانی میں نمک اور کپڑے دھونے والا سوڈا ڈال کر گرم کریں اور اس سے فرش کو دھولیں۔ اس طرح گھی وغیرہ سے جمی ہوئی چکنائی صاف ہو جائے گی اور دیگر کپڑے، مکھیاں وغیرہ بھی داخل نہ ہوں گے۔

بھڑوں کے چھتے ختم کرنا

☆ گندھک اور لسن کی دھونی دینے سے بھڑ مر جاتے ہیں، اگر ان کے چھتوں پر مٹی کا تیل، سرکہ ڈال دیا جائے تو وہ مر جاتے ہیں۔

پاؤں کا پسینہ کم کرنا

☆ اگر آپ کے پاؤں میں پسینہ بہت آتا ہے تو گرم پانی میں سرکہ یا لیموں کا عرق ڈال کر اس سے پاؤں دھوئیں۔

پکتے ہوئے کھانے میں زہریلی چیز کا شک دور کرنے کے لیے

☆ کھانا پکاتے ہوئے اگر آپ کو شک ہو جائے کہ کھانے میں زہریلی کوئی چیز گر گئی ہے تو چمچہ سے مشکوک چیز لے کر آگ میں ڈال دیں، اگر نیلے رنگ کے شعلے نکلیں تو سمجھ لیں کہ کھانا زہریلا ہو گیا ہے۔

سنگ مرمر کی آرائشی اشیاء کی صفائی

☆ یہ گندی ہو جائیں تو انتہائی بھدی لگتی ہیں۔ اس صورت حال میں امونیا کے چند قطروں کو نیم گرم پانی

گھبراہٹ اور سستی دور کرنے کا نسخہ

☆ موسم گرما میں گھبراہٹ اور سستی محسوس ہوتی ہے اور کام کاج میں بھی دل نہیں لگتا۔ رات کو سوتے وقت یا صبح نہار منہ پودینے کی چائے بنا کر پیئیں سارا دن طبیعت ہشاش بشاش رہے گی۔

نمک کی نمی دور کرنا

☆ نمک کی نمی دور کرنا مطلوب ہو تو نمک دانی میں چند دانے چاولوں کے ڈال دیں نمی دور ہو جائے گی۔

ایٹنی سیپٹک ایجنٹ

☆ ایک گلاس پانی کو لوہے کی کڑاہی میں 20 منٹ تک ابالیں۔ آدھا چمچہ نمک ملا دیں۔ جب ٹھنڈا ہو جائے تو اس محلول کو ایک بوتل میں محفوظ کر لیں۔ یہ محلول ہلکی خراشوں اور معمولی زخموں کے لیے گھریلو ساختہ ایٹنی سیپٹک ایجنٹ کے طور پر فوری دستیاب ہوگا۔

پانی کا کھار اپن دور کرنا

کنویں یا بورنگ کا پانی اکثر نمکین اور بھاری ہوتا ہے۔ اس کو ہلکا کرنے کے لیے آپ ایک بالٹی میں ایک چائے کا چمچہ بورک پاؤڈر اور ایک چائے کا چمچہ سرکہ ملا دیں۔ آپ آسانی سے نہانے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

لیموں کو محفوظ کرنا

جب لیموں سستے مل رہے ہوں تو زیادہ مقدار میں خرید لیں۔ تمام لیموں کا رس نکال کر اسے برف جمانے والی ٹریے میں جمالیں۔ جم جانے کے بعد یہ کیوبز نکال کر تھیلی میں ڈال کر فریزر میں رکھ دیں اور ضرورت کے مطابق ایک ایک کیوب نکال کر استعمال کریں۔

بچے کے نمی رہشز کے آرام کے لیے

☆ بچے کو اگر نمی سے رہشز ہو جائے تو آدھا حصہ سرسوں کا تیل اور آدھا حصہ پانی ملا کر لگائیں اور پیپہر باندھ دیں۔ دونوں کو اتنا ملانا ہے کہ تیل اور پانی کی رنگت دو دھیا ہو جائے۔

گرمی دانوں سے نجات کے لیے

☆ بچوں یا بڑوں کو گرمی دانے نکل آئیں تو ایک پاؤ دہی، مٹل کے کپڑے میں باندھ کر لگادیں جب پانی بخڑ جائے تو جتنا ٹوٹھ پک کے سرے پر نیلا تھوٹھا آتا ہے اتنا اس میں ملا کر دانوں پر لگائیں۔ دو تین دفعہ لگانے سے ہی سکون آجائے گا۔

بو اسیر کے لیے

☆ تین قطرے روغن کلونجی اور تین قطرے روغن نیم ایک ایک سیون شمد میں ملا کر منہ میں رکھ کر اوپر سے پانی پی لیں۔ روزانہ استعمال کرنے سے بو اسیر کو آرام آجائے گا اور وزن بھی کم ہوگا۔

پھوڑے کا منہ بنانے کے لیے

☆ بعض اوقات ایسا پھوڑا نکل آتا ہے جس کا منہ نہیں بنتا اور وہ سخت تکلیف دیتا ہے، ایسے میں پتھر حٹ (ایک بودا) کا ایک پتالے کر اور سرسوں کا تیل اچھی طرح لگا کر توے پر دونوں طرف سے گرم کر کے پھوڑے پر باندھ دیں۔ اگر صبح لگایا ہے تو شام کو دوسرا باندھیں۔ ان شاء اللہ تین سے چار دفعہ کرنے سے منہ بن کر پھوٹ جائے گا۔

سرودی سے آواز بیٹھ جائے تو

☆ اگر سرودی سے آواز بیٹھ جائے تو اس صورت میں تھوڑا سا اورک لے کر اس پر نمک لگا کر کھائیں۔ آواز ٹھیک ہو جائے گی۔



آنکھوں کی کمزوری

آنکھوں کی نظر کمزور ہو تو ایک کپ خشخاش دھو کر سکھالیں۔ اس میں آدھا کپ بادام، آدھا کپ سونف، آدھا کپ سوکھا دھنیا اور مصری ملا کر پیس لیں اور صبح شام ایک کپ دودھ کے ساتھ ایک چمچ کھالیں۔ ان شاء اللہ کچھ ہفتوں میں نمایاں بہتری ہوگی۔

لبے کالے اور گھنے بال

ایک پیالی پانی میں لیموں کا رس نکال کر اس میں آٹے کا سفوف ڈال کر حل کر لیں۔ یہ آمیزہ بالوں پر لگانے سے بال لبے کالے اور گھنے ہو جائیں گے۔

اوون صاف کرنا

اوون صاف کرنے کے لیے گرم پانی اور ویکنگ پاؤڈر کا آمیزہ بنا کر رکھ لیں جب بھی اوون صاف کرنا ہو اسٹیج کے ساتھ یہ آمیزہ لگا کر دھبوں کو صاف کر لیں دھبے آرام سے صاف ہو جائیں گے۔

سبز یوں کے وٹامن ضائع ہونے سے بچائیں
سبز یوں کو یا جنوں وغیرہ کو ابالتے وقت اگر پند قطرے ناریل کا تیل ڈال دیا جائے تو وٹامن ضائع ہونے سے بچ جاتے ہیں۔

لسن زیادہ دیر محفوظ کرنا

لسن کو اگر لبے عرصے تک محفوظ اور تازہ رکھنا ہو تو سارے لسن کو چھیلے اور ایک درمیانے سائز کے شیشے کے جار کے اندر ڈال دیں۔ اس کے بعد جار میں اتنا زیتون کا تیل ڈال لے کہ تمام لسن کے جوئے مکمل طور پر اس سے ڈھک جائیں۔ پھر جار کو اچھی طرح بند کر کے فریج میں رکھ دیں۔

سرسوں کے تیل کی سطح پر جھاگ ختم کرنا

اکثر لوگ جب سرسوں کے تیل میں کوئی چیز فرائی کرتے ہیں تو اس پر بہت سا جھاگ آجاتا ہے۔ اس جھاگ کو ختم کرنے کے لیے سرسوں کے تیل کو اچھی طرح گرم کریں اور فرائی کرنے سے پہلے لسن کے پانچ یا چھ جوئے تیل میں ڈال کر انہیں اچھی طرح سے جلا کر نکال دیں۔ اب اس میں کچھ بھی فرائی کر لیں۔ بار بار کے استعمال کے باوجود بھی تیل پر جھاگ نہیں آئے گی۔

بچے ہوئے صابن کا استعمال

بچے ہوئے صابن کے ٹکڑوں کو کسی پرانے موزے میں جمع کر لیں۔ قیص کے کالر اور کف دھوتے وقت اسے رگڑیں تو وہ جلدی صاف ہو جائیں گے۔

جائفل کو محفوظ رکھنا

جائفل کو زیادہ عرصے محفوظ رکھنا ہو تو چونے کے پانی میں کچھ دیر کے لیے بھگو دیں۔ پھر نکال کر خشک کر لیں۔ کیڑے مکوڑوں سے محفوظ ہو جائے گا۔

ہری سبز یوں کا رنگ برقرار رکھنا

مٹریا پالک جب تک جاتی ہیں تو ان کا رنگ سبز کے بجائے پیلا یا گہرا ہو جاتا ہے اس کے لیے ابالتے وقت ایک چٹکی کھانے کا سوڈا ڈال دیں۔ سبزیاں ہرے رنگ کی ہی رہیں گی۔

اروی کی جلن دور کرنا

اروی چھیلنے اور کاٹنے کے بعد ہاتھ دھو کر اگر ان پر آدھا لیموں کاٹ کر رگڑ لیا جائے تو خارش فوراً ختم ہو جاتی ہے۔

جلی ہوئی دال یا سبزی کی بودا دور کرنا

دیں مرچ کم ہو جائے گی۔

آنکھوں کی سرخی دور کرنے کے لیے

بکری کے دودھ میں روئی کے پھاسے بھگو کر آنکھوں پر رکھیں، چند یوم ایسا کرنے سے آنکھوں کی سرخی دور ہو جائے گی۔

گوشت کی بو دور کرنا

اگر گوشت دانے کپڑے کو سرکہ اور پانی سے تر کر دیا جائے اور گوشت اس میں لپیٹ کر رکھا جائے تو بو نہیں آئے گی۔

منہ کی بدبو دور کرنے کے لیے

رات کو منہ صاف کریں اور اورک کا ایک انچ کا ٹکڑا منہ میں چبائیں اور کوشش کریں یہ رس ایک منٹ منہ میں رہے، اس کے بعد پانی نہ پھنساؤ اور بس۔ صبح دیکھیں بو نام کی چیز کو نہیں پائیں گے۔ اگر یہ عمل ہر کھانے کے بعد کریں تو تمام دن منہ کی بو آپ کے قریب بھی نہیں بھٹکے گی اور آپ کا پیٹ بھی کبھی خراب نہیں ہوگا۔

جلد کی نکھار کے لیے

ایک لیموں میں دو چھوٹے سوراخ کر لیں اور اس میں مصری کے چھوٹے ٹکڑے ڈال دیں۔ پھر سلور فوائل میں لپیٹ دیں۔ اب لیموں کو تقریباً 30 سیکنڈز کے لیے چولہے پر رکھیں اور پھر ٹھنڈا کر کے فریج میں رکھ دیں، استعمال کرتے ہوئے اس کے ایک سے دو قطرے منہ پر لگائیں اور ایک منٹ بعد دھو لیں۔

بچوں کے قبض کے لیے

اگر چھوٹے بچے ہوں تو تھوڑی ہنگ لے کر ایک چائے کا چمچہ گرم پانی میں گھول لیں۔ پھر بچے کی ناف پر

پکاتے ہوئے اگر دال یا سبزی کچھ جل گئی ہو تو اس میں زرے اور نمائز کا بگھار ڈال دیں۔ جلنے کی بو دور ہو جائے گی بلکہ بالکل نہیں آئے گی۔

بیگن کا چھلکا اتارنے کے لیے

بیگن کا بھرتہ بنانے سے پہلے بیگن کے اوپر تیل لگائیں تو چھلکے آرام سے اتر جائیں گے۔

آنکھوں کو چونے سے بچانے کے لیے

آنکھ میں اگر چونے کی چھینٹ پڑ جائے تو تھوڑی سی پھینکری پانی میں گھول کر آنکھوں میں پانی ڈالیں۔ اس سے جلن اور کھٹک دور ہو جائے گی۔

مسور کی دال جلد گلانے کے لیے

مسور کی دال پکاتے وقت اگر اس میں ہلدی یا گھی شروع میں ہی ڈال دیں تو اس سے دال جلدی گل جائے گی۔

پاؤں صاف رکھنے کے لیے

گرم پانی میں دو چمچے سرکہ ڈال کر اپنے پاؤں پندرہ منٹ کے لیے پانی میں ڈال دیں۔ یہ عمل ہفتہ میں ایک مرتبہ دو ہر امیں۔ پاؤں اتنے صاف ہو جائیں گے کہ جیسے کبھی زمین پر اترے ہی نہیں۔

کچے رنگ پکے کرنے کے لیے

جو کپڑے رنگ چھوڑتے ہیں انہیں کچھ دیر کے لیے ملتان میٹھی میں بھگو دیں۔

سالن میں تیز مرچوں کو کم کرنے کے لیے

اگر مرچ تیز ہو جائے تو ایک پیاز براؤن کر کے اخبار

پر پھیلا دیں، تھوڑی دیر میں خستہ ہو جائے گی، ہاتھ سے پھیل کر سالن میں ڈال دیں اور ایک لیموں کا رس ڈال

کارآمد گھریلو ٹوٹکے

ایک عدد گول بیٹن کے چار حصوں میں برابر تقسیم کر کے ایک دیکھی میں سیر بھر پانی اباں لیں۔ جب پانی نیم گرم رہ جائے تو اس سے دونوں پیروں کو لیں۔ ایک دفعہ عمل کرنے سے ایک سال تک پیروں سے بدبو نہیں آئے گی۔ اگر عمل کو ایک ہفتہ پابندی سے کریں تو پیروں سے بدبو ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔

ہاتھوں کی مہندی کارنگ گہرا کرنے کے لیے

ہاتھوں میں لگی مہندی کارنگ گہرا کرنے کے لیے ہاتھوں پر سے مہندی اتارنے کے بعد دونوں ہاتھوں میں سرسوں کا تیل لگالیں۔ تھوڑی دیر بعد رنگ میں گہری چمک آجائے گی۔

بیگ کی زپ صحیح کرنے کے لیے

آپ کے برس، قمیص یا پتلون وغیرہ کی زپ اگر خراب ہو کر پھنستی ہو تو اس پر موسم رگڑ دیں۔ زپ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔

الرحی کے لیے

جب چھینکوں کا سلسلہ شروع ہو جائے اور ناک سے بے تحاشا پانی بہے تو سفیدے کے چار پارچے سبز پتے لے کر ہتھیلیوں پہ مسلیں پھر ان ہتھیلیوں کو ناک

لگا کر سی نرم کپڑے سے سکا لی کریں۔

اگر بڑے بچے ہوں تو ایک منقہ لے کر آدھی پیالی گرم پانی میں ہلکا سا پکائیں۔ پھر رات کو سونے سے پہلے بچے کو منقہ کھلا کر یہی پانی بھی پلا دیں مگر خیال رہے کہ اس کے بعد کوئی اور چیز نہ کھائیں۔

شہد کی مکھی کے زہر سے بچاؤ کے لیے

اگر شہد کی مکھی کاٹ لے تو اس پر پیاز رگڑیں۔ مکھی کے کاٹے کا زہر ختم ہو جائے گا۔

بیٹھی آواز کو درست کرنے کے لیے

اگر آواز بیٹھ جائے تو گڑ ڈال کر چاول پکائیں۔ رات کو خوب پیٹ بھر کر کھائیں اور کچھ دیر بعد پانی کے دو گھونٹ پی لیں۔ دو تین دن ایسا کرنے سے آواز کھل کر سریلی ہو جائے گی۔

کپڑے دھوتے وقت صابن کم خرچ کرنے کے لیے

کپڑوں کو دھونے سے پہلے گرم پانی میں تھوڑی پھٹکری اور چاک کا چورا ڈال دیں۔ یوں صابن کم لگے گا، کپڑے بھی اچلے دھلیں گے۔

پیروں کی بدبو سے نجات کے لیے



لگا دیں جہاں سے بن لو سیا جاتا ہے۔ پھر اسے اچھی طرح خشک ہونے دیں۔ اس کے بعد اس طرح ایک اور کوٹ لگائیں اور اسے بھی مکمل خشک کر لیں۔ اب آپ کے بٹن ٹوٹ کر نہیں گریں گے کیونکہ نیل پالش دھاگوں کو مضبوطی سے ایک جگہ جمادے گی۔

سوئی کو زنگ سے بچانے کے لیے

سوئی دھاگے کی ضرورت ہر گھر میں رہتی ہے، لیکن کراچی کی نم آلود فضا میں سوئیاں بہت جلد زنگ آلود ہو جاتی ہیں۔ اپنی سوئیں کو زنگ سے بچانے کے لیے انہیں سیاہ رنگ کے کپڑے میں لپیٹ کر رکھیں۔ ان پر کبھی زنگ نہیں لگے گا۔

مٹر کو دیر تک محفوظ کرنے کے لیے

مٹر چونکہ صرف سردیوں میں ہی دستیاب ہوتے ہیں۔ اس لیے مٹر محفوظ کرنے کے لیے انہیں چھیل کر کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دیں۔ اگر پانچ کلو مٹر ہوں تو ایک کھانے کا چمچ چینی اور دو کھانے کے چمچے سفید سرکہ ڈال دیں۔ چند منٹ بعد چھلنتی میں ڈال کر پانی نکال دیں۔ ٹھنڈا ہونے پر محفوظ کر دیں۔

جینز کا رنگ خراب ہونے سے بچانے کے لیے

جینز کا رنگ خراب ہونے سے بچانے کے لیے ایک بالٹی پانی میں چار کھانے کے چمچ سرکہ ڈالیں اور اس پانی سے جینز دھوئیں۔

ہونٹوں کی سیاہی دور کرنے کے لیے

اگر آپ کے ہونٹ سیاہی مائل ہوتے جا رہے ہیں تو ایک چائے کا چمچ جو کا آنا، ایک چائے کا چمچ نمائز کا رس اور ایک چائے کا چمچ شہد لے کر مکس کریں اور پورے چہرے کے علاوہ ہونٹوں پر بھی اس کا لپ

کے قریب لے جا کر لمبے لمبے سانس لیں، تقریباً پندرہ منٹ ایسا کریں یہ ہی عمل چار یا پانچ دن مسلسل کریں۔

خونی و بادی بو اسیر کے لیے

بادی و خونی بو اسیر کے لیے شہد خالص لے کر اس کے ساتھ سفوف کرنبوہ ایک ماشا ملا کر چائیں، دوسرے روز دو ماشے، تیسرے روز تین ماشے حتیٰ کہ گیارہ ماشے شہد میں ملا کر چائیں۔ بارہویں روز ایک ماشا گھٹا کر چائیں۔ یعنی دس ماشے تیرہویں روز نو ماشے چودھویں روز آٹھ ماشے پندرہویں روز سات ماشے سولہویں روز چھ ماشے سترہویں روز پانچ ماشے اٹھارویں روز چار ماشے انیسویں روز تین ماشے بیسویں روز دو ماشے اور اکیسویں روز ایک ماشے چائیں۔ ان شاء اللہ خونی بو اسیر ختم ہو جائے گی۔

جوڑوں کے درد کے لیے

کدو کش کی ہوئی تازہ اورک کو ایک پیالی ابلتے ہوئے پانی میں ملا کر پینے سے گھٹیا کا درد ختم ہو جاتا ہے اور طبیعت میں تازگی آجاتی ہے۔ تھرماس میں چائے کی طرح بنا کر رکھ لیں اور دن میں تین دفعہ استعمال کریں۔

منہ کے چھالے دور کرنے کے لیے

منہ میں اگر چھالے پڑ جائیں تو دو تولہ سہاگہ پیس کر ایک تولہ گلیسرین میں ملائیں، پھر پانچ تولہ شہد میں حل کر لیں اور انکلی سے صبح و شام چھالوں پر لگائیں، ایک دن میں چھالیں دور ہو جائیں گے۔

شرش پر لگے بٹنوں کو مضبوط کرنے کے لیے

شرش پر لگے ہوئے بٹن ٹوٹنے سے بچانے کے لیے ٹرانسپیرنٹ نیل پالش لے کر اسے عین اس جگہ

گھبراہٹوں کے

پین میں تھوڑا نمک چھڑک دیں اور پھر اس میں انڈا توڑ کر ڈالیں۔ انڈا فرائی کرنا ہو تو تیل کو زیادہ گرم نہیں کرنا چاہیے۔

برہما ہوا پیٹ کم کرنے کے لیے

حسب ضرورت لوکی، سفید زیرہ، کڑی پتا اور نمک ڈال کر پانی ابالیں، صبح اسے نہار منہ پیئیں۔ اس سے برہما ہوا پیٹ کم کرنے میں مدد ملے گی۔

عینک کے شیشے صاف کرنے کے لیے

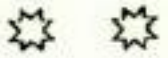
اگر عینک کے شیشے پر داغ پڑ جائیں تو بجھا ہوا جوتایا چاک پانی میں بھگو کر اس پانی سے عینک کے شیشے صاف کریں۔ عینک چمک جائے گی۔

پودوں میں پھول زیادہ اگانے کے لیے

موتیے یا چینی کے پودے میں پھول زیادہ لانے کے لیے کسی یا دودھ والی دیکھی دھو کر اس کا پانی گملے میں ڈالیں۔

پودوں کی حفاظت کے لیے

پودے جلنے لگیں، جڑوں کو کیرا لگ جائے یا مرجھانے لگیں تو تھوڑے سے پانی میں آدھا چمچہ رائی کا گھول کر گملوں یا کیریوں میں ڈال دیں۔



کریں۔ آدھے گھنٹے بعد گیلی انگلیوں کی مدد سے آہستہ آہستہ دائروں کی صورت میں اتار دیں۔ اس عمل کو روزانہ دہرانے سے آپ کا چہرہ چمک اٹھے گا اور ہونٹ قدرتی گلابی نظر آنے لگیں گے۔

گردے کی پتھری دور کرنے کے لیے

گردے میں اگر پتھری ہے تو اس کے اخراج کے لیے بھٹے کے بالوں کو پانی میں ابالیں اور یہ جو شانہ دن میں تین بار استعمال کریں۔ اس سے پیشاب کی نالی کی جلن بھی دور ہوگی۔

آئی ماسک تیار کرنے کے لیے

آئی ماسک تیار کرنے کے لیے ایک کچے آلو کو کش کریں اور چمچے کی مدد سے دبا کر اس کا جوس نکال لیں۔ اس جوس میں استعمال شدہ ٹی پیگنز کو بھگوئیں اور انہیں دس سے پندرہ منٹ کے لیے آنکھوں کے نیچے رکھ لیں۔ پندرہ منٹ کے بعد ٹھنڈے پانی سے دھو لیں۔

ہارمون کی خرابی کی وجہ سے موٹاپا دور کرنے کے لیے

ایک لیٹر کریلے کے جوس میں ایک پاؤ کالے پنے بھگو کر توڑے پر بھون لیں۔ جب سوکھ جائیں تو اس میں ایک کپ میٹھی دانہ، ایک کپ سونف ڈال کر اتنا پکا لیں کہ بالکل خشک ہو جائے۔ پھر اس کو پیس کر پاؤڈر بنا لیں۔ دن میں دو مرتبہ صبح و شام استعمال کریں۔

انڈے کی زردی کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے

اکثر جب انڈا فرائی کیا جاتا ہے تو وہ فرائی پین کے پینڈے سے چپک جاتا ہے اور پلیٹ میں نکالتے ہوئے زردی بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کا ٹوٹنا یہ ہے کہ فرائی